بہنوں کا اپنا ماہنامہ

شعاع

نومبر 2016

NOVEMBER 2016

Join Us on Facebook

Get Notificatons of Newly Uploaded Books

Find us on: facebook®

Follow below Image to Get Notifications of Newly Uploaded Books

انٹرویو

ناول

مکمل ناول

ناولٹ

افسانے

نظمیں غزلیں

زرِ سالانہ بذریعہ رجسٹری

پاکستان (سالانہ)	700 روپے
ایشیا، افریقہ، یورپ	6000 روپے
امریکہ، کینیڈا، آسٹریلیا	7000 روپے

MEMBER APNS CPNE
رکن آل پاکستان نیوز پیپرز سوسائٹی
رکن کونسل آف پاکستان نیوز پیپرز ایڈیٹرز

مستقل سلسلے

نومبر 2016
جلد 31 شمارہ 3
قیمت 60 روپے

خط و کتابت کا پتہ: ماہنامہ شعاع، 37 - اردو بازار، کراچی۔

رضیہ جمیل نے ابن حسن پرنٹنگ پریس سے چھپوا کر شائع کیا - مقام: ۹۱ بی، بی ای سی ایچ ایس سوسائٹی، کراچی
Phone: 32721777, 32726617, 021-32022494 Fax: 0092-21-32766872
Email: shuaa@khawateendigest.com website: www.khawateendigest.com

دستک

شعاع نومبر کا شمارہ لیے حاضر ہیں۔

مقصد تخلیق کائنات انسان ہے اور انسان کی تخلیق کا مقصد انسانیت کا شعور ہے۔ شعور احساس ہے، سماعت ہے، گفتگو ہے، گفتگو انسان کی انسانیت کی پہچان ہے۔ الفاظ انسان کے اخلاق، اس کی تربیت، اس کے خاندان کی پہچان ہوتے ہیں۔ ہمارے الفاظ کسی کی زندگی لے سکتے ہیں اور کسی کو زندگی دے بھی سکتے ہیں، حوصلہ افزائی کا ایک لفظ کبھی کبھی پوری زندگی بدل دیتا ہے۔ کڑی تنقید کبھی کبھی زندگی سے بھی دور کر دیتی ہے۔

ایسے سخت الفاظ جو کسی کا دل توڑ دیں، اس کی ہمت پست کر دیں۔ اس کو زندگی سے بیزار کر دیں تو اس سے بڑا ظلم کیا ہو سکتا ہے۔

ہم خواہ کتنے ہی بلند مقام پر کیوں نہ ہوں اگر ہماری زبان سے کسی کو ذرا سا بھی نقصان پہنچ جائے تو یہ ہمارے لیے عمر بھر کا خسارہ ہے۔ کیونکہ کچھ نقصانات ایسے ہوتے ہیں جن کی تلافی ممکن نہیں رہتی۔

بشریٰ سعید کو صدمہ

حساس دل رکھنے والے لوگ دنیا کا بوجھ زیادہ دیر نہیں جھیل پاتے۔ اسی لیے جلد ہی دل ہار جاتے ہیں اور عدم کی راہ لیتے ہیں۔ اپنے پیچھے وہ کتنے ملال چھوڑ جاتے ہیں، کتنے لوگوں کو دکھی کر جاتے ہیں۔ زندگی اس قدر گراں مایہ اور اس طرح حالات کی نذر ہو جائے۔

بشریٰ سعید کے نوجوان بھائی عمر سعید راہی ملک عدم ہوئے۔

اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْنَ ۝

بہت کم لوگ یہ بات جانتے ہیں کہ عمر سعید ایک فطری تخلیق کار تھے۔ بہت چھوٹی عمر میں جب بشریٰ سعید لکھتی تھیں تو عمر سعید ان کی ادھوری کہانیاں خاموشی سے مکمل کر کے پوسٹ کر دیتے۔۔۔ کبھی انہیں کہانیوں کا موضوع بتاتے، بشریٰ مصروفیت کی بنا پر لکھ نہ پاتیں تو خود ہی لکھ کر پوسٹ کر دیتے۔۔۔ بشریٰ نے ہمیں بتایا کہ "رقص جنوں" عمر کی تخلیق تھی۔ "سفال گر" کا بنیادی آئیڈیا بھی عمر سعید کا تھا۔ بشریٰ علالت کی بنا پر لکھ نہیں پا رہی تھیں۔ چار سال اسی طرح گزر گئے۔ پھر اس بار بشریٰ نے عمر سے خود کہا کہ وہ یہ کہانی لکھ دیں اور یوں "سفال گر" جیسا ناول لکھا گیا۔

عمر سعید کا ارادہ تھا کہ اب وہ سنجیدگی سے لکھنے کی طرف توجہ دیں گے اور اپنے نام سے لکھیں گے۔ انہوں نے دو ناولوں کا آغاز بھی کیا تھا، لیکن شاید یہ قدرت کو منظور نہ تھا۔

عمر سعید کی وفات ادب کے لیے، قارئین کے لیے بہت بڑا نقصان ہے۔ ادارہ شعاع عمر سعید کے اہل خانہ کے غم میں برابر کا شریک ہے اور دعا گو ہے اللہ انہیں صبر جمیل سے نوازے۔ عمر سعید کو جنت الفردوس میں اعلا مقام عطا فرمائے۔ آمین۔

اس شمارے میں

☆ مصباح علی کا ناول۔۔۔ حاصل کشت وخون ☆ ایمل رضا کے ناول پیال ساز کی آخری قسط
☆ سدرہ حیات اور نایاب جیلانی کے ناولٹ ☆ عفت سحر طاہر اور نبیلہ عزیز کے ناول
☆ صباحت عمران، بنت سحر، ثنا عمران، اسماء طاہر، نادیہ جہانگیر، نورین غوری اور امبر خالد کے افسانے ☆ عاصمہ شیرازی اور مدثر کا بندھن، معروف شخصیات سے گفتگو کا سلسلہ۔۔۔ دستک ☆ پیارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی پیاری باتیں۔۔۔ احادیث کا سلسلہ
☆ جب تجھ سے ناتا جوڑا ہے، خط آپ کے اور دیگر سلسلے شامل ہیں، شعاع کا یہ شمارہ آپ کو کیسا لگا۔۔۔؟ آپ کی رائے جاننے کے منتظر ہیں۔

باری تعالیٰ

حمد

کس سے مانگیں، کہاں جائیں، کس سے کہیں
اور دُنیا میں حاجت روا کون ہے

سب کا داتا ہے تُو سب کو دیتا ہے تُو
تیرے بندوں کا تیرے سوا کون ہے

جو ہے سارے جہانوں میں جلوہ نما
اس احد کے سوا دوسرا کون ہے

کس کے ہاتھوں میں کُنجی ہے مقسوم کی
مسند آرائے بزمِ عطا کون ہے

اہلِ فکر و نظر جانتے ہیں تجھے
کچھ نہ ہونے پہ بھی مانتے ہیں تجھے

اے نصیر اس کو تُو فضلِ باری سمجھ
ورنہ تیری طرف دیکھتا کون ہے

نصیر الدین ترابی

رسول مقبول ﷺ

نعت

ہر وقت تصور میں مدینے کی گلی ہے
اب دربدری ہے نہ غریب الوطنی ہے

اس شہر میں بک جاتے ہیں خود آکے خریدار
یہ مصر کا بازار نہیں، شہرِ نبیؐ ہے

اس ارضِ مقدس پہ ذرا دیکھ کے چلنا
اے قافلے والو یہ مدینے کی گلی ہے

نظروں کو جھکائے ہوئے خاموش گزر جاؤ
بے تاب نگاہی بھی یہاں بے ادبی ہے

اقبال میں کس منہ سے کروں مدحِ محمدؐ
منہ میرا بہت چھوٹا ہے اور بات بڑی ہے

سید اقبال عظیم

نبی کی باتیں

زیادہ مال رکھنے والے

حضرت ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

"زیادہ مال رکھنے والوں کے لیے ہلاکت ہے مگر جس نے مال کو اس طرح، اس طرح، اس طرح اور اس طرح (خرچ) کیا۔"

یہ فرماتے ہوئے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے دائیں، بائیں، آگے اور پیچھے چاروں طرف (ہر ایک بار) اشارہ فرمایا۔

فوائد و مسائل :

1۔ مال حرص اور بخل کے ذریعے سے جمع ہوتا ہے اور یہ دونوں مذموم خصلتیں ہیں۔

2۔ جائز طریقے سے کمایا ہوا مال بھی اللہ کی راہ میں اور نیکی کے کاموں میں خرچ کرنا ضروری ہے۔ اپنی ذاتی آسائشات اور تعیشات پر مال صرف کرنا درست نہیں۔

3۔ سخاوت کرنے والا ہلاکت سے محفوظ ہو جاتا ہے کیونکہ اس کا مال اس کے لیے نیکیوں میں اضافے کا باعث بنتا ہے۔ جس قدر زیادہ خرچ کرے گا، اتنا ہی جنت میں بلند درجات کا مستحق ہو گا۔

درجات

حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

"زیادہ مال والے قیامت کے دن (دوسروں سے درجات میں) نیچے ہوں گے مگر جس نے مال کو اس طرح اور اس طرح خرچ کیا اور اس کی کمائی پاک (اور حلال ذرائع) سے ہوئی۔"

فائدہ :

1۔ سخاوت سے اس شخص کو فائدہ ہو سکتا ہے، جس کی کمائی حلال ہو، لہٰذا حرام کمائی سے بچنا انتہائی ضروری ہے۔

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

"زیادہ مال والے زیادہ نیچے ہوں گے، مگر جس نے اس طرح، اس طرح اور اس طرح خرچ کیا۔" (نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے) تین بار (اشارہ) فرمایا۔

سخاوت

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

"اگر میرے پاس احد پہاڑ جتنا سونا ہو تو میں نہیں چاہوں گا کہ مجھ پر تیسری رات آئے اور (اس وقت بھی) اس میں سے کچھ میرے پاس (بچا ہوا) موجود ہو، مگر اتنی چیز جسے میں قرض کی ادائیگی کے لیے سنبھال رکھوں۔"

فوائد و مسائل :

1۔ اس حدیث میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی سخاوت کا بیان اور امت کے لیے ترغیب ہے۔

2۔ احد ایک بڑا پہاڑ ہے، اتنا سونا دو تین دن میں تقسیم نہیں کیا جا سکتا اس کے باوجود نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی خواہش یہی تھی کہ اگر اتنا مال بھی ہو تو وہ بھی دو تین دن میں مکمل طور پر تقسیم کر دیا جائے۔

3۔ قرض کی ادائیگی قرض خواہ کا حق ہے، اس کی ادائیگی سخاوت سے اہم ہے۔

4۔ قرض لینا دینا جائز ہے لیکن قرض لیتے وقت یہ

نیت ہونی چاہیے کہ جلد از جلد ادا کر دیا جائے گا۔

5 ۔ سنبھال کر رکھنے کی ضرورت تب پیش آسکتی ہے جب ادائیگی کا مقررہ وقت آنے میں کچھ وقفہ باقی ہو تاکہ جب قرض خواہ مطالبہ کرے تو ادائیگی کا اہتمام کرتے ہوئے ادائیگی میں تاخیر نہ ہو جائے۔

6 ۔ اگر قرض خواہ قریب موجود ہو تو مقررہ وقت سے پہلے خود جا کر ادائیگی کر دینا افضل ہے لیکن اگر اس سے رابطہ مشکل ہو تو رقم سنبھال کر رکھنا مناسب ہے تاکہ ادائیگی جلد از جلد کی جاسکے۔

مسلمان کے لیے دعا

حضرت عمرو بن غیلان ثقفی رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

"یا اللہ! جو شخص مجھ پر ایمان لایا، میری تصدیق کی اور اس نے (دل سے) جان لیا کہ میں جو (شریعت) لے کر آیا ہوں وہ تیری طرف سے حق ہے، تو اسے کم مال اور اولاد دے، اور اسے اپنی ملاقات کی محبت نصیب فرما اور اسے جلدی موت عطا فرما۔ اور جو مجھ پر ایمان نہ لایا، میری تصدیق نہ کی اور یہ یقین نہ کیا کہ میں جو (شریعت) لے کر آیا ہوں وہ تیری طرف سے حق ہے، اس کو بہت مال اور اولاد دے اور اس کی عمر طویل فرما دے۔"

برکت

حضرت نقادہ (بن عبداللہ) اسدی رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، انہوں نے فرمایا: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھے ایک آدمی کی طرف بھیج کر اس سے ایک اونٹنی طلب فرمائی۔ اس شخص نے (اونٹنی دینے سے) انکار کر دیا۔

پھر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھے ایک اور آدمی کی طرف بھیجا۔ اس نے ایک اونٹنی بھجوا دی۔ جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اونٹنی کو دیکھا تو فرمایا۔

"یا اللہ! اس میں برکت عطا فرما اور اسے بھیجنے والے کو بھی۔"

حضرت نقادہ رضی اللہ عنہ نے کہا: میں نے کہا جو اسے لے کر آیا (اس کے لیے بھی برکت کی دعا فرمائیں۔) نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "اور جو اسے لے کر آیا (اللہ اسے بھی برکت دے۔)"

پھر آپ کے حکم سے اسے دوہا گیا، اس نے بہت دودھ دیا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس پہلے شخص کے بارے میں جس نے انکار کر دیا تھا، فرمایا:

"یا اللہ! فلاں کا مال زیادہ فرما۔" اور جس نے اونٹنی بھیجی تھی اس کے حق میں فرمایا:

"یا اللہ! اس کو روز کا رزق روز دے۔"

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

"ہلاک ہو جائے (تباہ ہو جائے) دینار کا بندہ، درہم کا بندہ، کمبل کا بندہ اور چادر کا بندہ۔ اگر اسے دیا جائے تو خوش رہتا ہے، اگر نہ دیا جائے تو (بیعت والا) وعدہ پورا نہیں کرتا۔"

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

ہلاک ہو جائے دینار کا بندہ، درہم کا بندہ اور چادر کا بندہ۔ ہلاک ہو جائے، اوندھا ہو جائے، اسے کانٹا لگے تو نکالا نہ جائے۔"

فوائد و مسائل :

1 ۔ دنیا کا لالچ مذموم ہے۔ جب محبت و نفرت کی بنیاد محض دنیوی مفاد پر ہو جائے تو خلوص باقی نہیں رہتا۔ اس صورت میں خلیفۃ المسلمین یا اس کے نائب سے بیعت بھی اللہ کی رضا کے لیے اور اسلامی سلطنت کی حفاظت اور خدمت کے لیے نہیں ہوتی، اس طرح یہ عظیم نیکی بھی تمام برکات سے محروم ہو کر برائی میں تبدیل ہو جاتی ہے۔

2 ۔ دینی جماعتوں اور تنظیموں سے تعلق اللہ کی رضا اور ثواب کے لیے ہونا چاہیے۔ اسی نیت سے عہدہ اور ذمہ داری قبول کی جائے۔ اگر محسوس ہو کہ محنت

کرنے کے باوجود جماعت میں اہمیت تسلیم نہیں کی جا رہی تو اکابر سے ناراض ہو کر جماعت سے الگ نہ ہو جائے۔ ہاں' اگر یہ محسوس کیا جائے کہ جماعت یا تنظیم کے عہدے دار صحیح انداز سے کام نہیں کر رہے اور توجہ دلانے کے باوجود اصلاح پر آمادہ نہیں تو خاموشی کے ساتھ تنظیم سے الگ ہو جائے۔

3 ۔ درہم و دینار کے بندے سے مراد وہ شخص ہے جو دنیا کے مال و دولت کی اتنی خواہش رکھتا ہے کہ اس کی تمام سرگرمیوں کا محور حصول دولت بن کر رہ جاتا ہے۔ اس طرح وہ دولت سے خدمت لینے کی بجائے دولت جمع کرنے اور سنبھالنے میں مصروف رہتا ہے' گویا دولت اس کا آقا یا معبود ہے اور وہ غلام یا پجاری۔

4 ۔ دولت کے پجاری کے لیے بددعا کی گئی ہے کہ وہ تباہ ہو جائے۔ منہ کے بل گرنے اور سر کے بل اوندھا ہو جانے سے یہی مراد ہے۔ کانٹا نہ نکالے جانے سے مراد یہ ہے کہ وہ مشکلات میں پھنسا رہے اور اس کی مدد اور نجات کی کوئی صورت پیدا نہ ہو۔ واللہ اعلم۔

قناعت کا بیان

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے' رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:
"امارت سامان کی کثرت سے نہیں ہوتی بلکہ امیری تو دل کی امیری ہے۔" رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:
"یا اللہ! محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کے گھر والوں کو ضروری حاجات کے مطابق رزق عطا فرما۔"

فوائد و مسائل :

1 ۔ انسان کو چاہیے کہ اپنے گھر والوں کے لیے بھی اچھی عادات و خصائل کی خواہش رکھے۔

2 ۔ ضرورت کے مطابق رزق کا مطلب یہ ہے کہ ضرورت سے زیادہ نہ ملے جسے جمع کر کے رکھا جائے۔

3 ۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا زہد و قناعت' امت کے لیے بہترین نمونہ ہے۔

خواہش

حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے' رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:
"قیامت کے دن ہر دولت مند اور نادار کی خواہش یہی ہوگی کہ اسے دنیا میں صرف (زندہ رکھنے کے قابل) تھوڑی سی روزی ملی ہوتی۔"

پوری دنیا

حضرت عبید اللہ بن محصن انصاری رضی اللہ عنہ سے روایت ہے' رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:
"جس کی صبح اس حال میں ہوئی کہ اسے بدن میں عافیت' اپنے بارے میں امن اور دن بھر کی خوراک حاصل ہو' اسے گویا پوری دنیا جمع کر کے دے دی گئی۔"

فوائد و مسائل :

1 ۔ جسے کوئی بیماری اور خوف نہ ہو اور دن بھر کی ضرورت کا سامان موجود ہو تو یہ بہت بڑی نعمت ہے۔

2 ۔ ہم زیادہ کی خواہش میں ان نعمتوں کی طرف توجہ نہیں کرتے جو ہمارے پاس موجود ہوتی ہیں' جس کی وجہ سے دل میں شکر کا جذبہ پیدا نہیں ہوتا۔

3 ۔ جس شخص کے پاس ایک دن کی ضروریات موجود ہیں' اسے اس دن کا شکر ادا کرنا چاہیے اور یہ امید رکھنی چاہیے کہ جب کل کا دن آئے گا تو اللہ تعالیٰ اس کی ضروریات بھی مہیا فرما دے گا۔

اپنے سے کمتر

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے' رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:
"(دنیا میں) اپنے سے نیچے والے (کم مال) کو دیکھو' اپنے سے اوپر والے کو نہ دیکھو اس سے یہ ہوگا کہ تم اللہ کی نعمت کو حقیر نہ سمجھو گے۔"

فوائد و مسائل :

1 ۔ نیچے والے سے مراد وہ شخص ہے جو کسی نعمت میں

ہم سے کم ہے اور اوپر والے سے مراد وہ شخص ہے جو کسی نعمت میں ہم سے بڑھ کر ہے۔

2۔ اپنے سے زیادہ نعمت والے کو دیکھنے سے یہ خیال پیدا ہوتا ہے کہ مجھے یہ نعمت کم حاصل ہے اس کمی کو شیطان اس انداز سے پیش کرتا ہے گویا یہ نعمت حاصل ہی نہیں۔ اس طرح محرومی کا احساس پیدا ہوتا ہے جس سے شکر کے بجائے اللہ سے شکوہ کرنے کو جی چاہتا ہے جو ناشکری کی ایک بڑی صورت ہے۔

3۔ اپنے سے کم تر پر نظر ڈالنے سے حاصل شدہ نعمت کی قدر معلوم ہوتی ہے، جس سے شکر کا جذبہ پیدا ہوتا ہے۔

4۔ ہر نعمت کے بارے میں یہ کیفیت ہے کہ ایک فرد کو وہ نعمت کسی سے کم ملی ہے تو وہی نعمت اسے کسی دوسرے سے زیادہ بھی ملی ہے۔ اس معاملے کا ایک اور پہلو یہ بھی ہے کہ اگر ایک فرد کو ایک نعمت کسی سے کم ملی ہے تو کوئی دوسری نعمت اسے زیادہ بھی ملی ہے۔ جس طرح ایک شخص کسی سے کم دولت رکھتا ہے اور کسی سے زیادہ دولت مند بھی ہے۔ اسی طرح یہ بھی حقیقت ہے کہ اگر وہ اس سے دولت میں کم ہے تو صحت یا قوت میں اس سے بڑھ کر ہے۔ اگر حسن صورت میں کم ہے تو علم و فضل یا حسن سیرت میں اس سے زیادہ بھی ہے لہٰذا احساس کمتری میں مبتلا ہونے کی کوئی وجہ نہیں اور اللہ سے شکوہ کرنے کی کوئی ضرورت نہیں۔

عمل اور دل

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:
"اللہ تعالیٰ تمہاری صورتوں اور مالوں کو نہیں دیکھتا بلکہ تمہارے عملوں اور دلوں کو دیکھتا ہے۔"

فوائد و مسائل:

1۔ خوب صورت یا بد صورت ہونا بندے کے ہاتھ میں نہیں بلکہ یہ اللہ کی مشیت کے مطابق ہوتا ہے۔ کوشش کرنی چاہیے کہ عمل اچھے ہوں تاکہ اللہ تعالیٰ کو راضی کیا جا سکے۔

2۔ اللہ کے ہاں مال دار اور بے زر برابر ہیں۔ مال دار کو محض دولت مند ہونے کی وجہ سے معافی نہیں مل سکتی اور نادار کو محض اس کی مفلسی کی بنا پر مجرم نہیں ٹھہرایا جا سکتا۔

3۔ مال دار ہونا بھی اللہ کی آزمائش ہے اور مفلس ہونا دوسری طرح کی آزمائش۔ اگر مال دار شکر کرے تو اللہ کے ہاں پسندیدہ ہے اور ناشکری کرے تو ناپسندیدہ ہے۔ اسی طرح نادار آدمی صبر کرے تو اللہ کا پیارا ہے اور بے صبری کرے اور حرام کمائی کی کوشش کرے تو اللہ کے قرب سے محروم ہے۔

4۔ انسان اگر نیکی کرنے کی طاقت نہ رکھتا ہو تو اس کی نیت اور خواہش ضرور رکھنی چاہیے۔ ایسی نیت پر بھی ثواب ملتا ہے۔

آل محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی گزران

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے، انہوں نے فرمایا:
"ہم آل محمد صلی اللہ علیہ وسلم، مہینہ مہینہ اس حال میں گزار دیتے تھے کہ آگ نہیں جلاتے تھے۔ (ہمارا کھانا) صرف کھجوریں اور پانی ہوتا تھا۔

فوائد و مسائل:

1۔ اس میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے زہد، استغنا، قناعت اور سادگی کا بیان ہے۔

2۔ حیات مبارکہ کے آخری سالوں میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے سال بھر کے خرچ کے لیے کھجوریں اور جو وغیرہ اکٹھے دینا شروع کر دیے تھے لیکن امہات المومنین سخاوت سے کام لیتے ہوئے جلد ہی خرچ کر دیتی تھیں، اس لیے اکثر روٹی، سالن اور گوشت وغیرہ کے بغیر گزارہ ہوتا تھا۔ بعض اوقات کھجوریں بھی میسر نہیں ہوتی تھیں۔

پورا مہینہ

ام المومنین حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے

روایت ہے' انہوں نے فرمایا:

"حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے گھر والوں پر مہینہ بھر اس طرح گزر جاتا تھا کہ آپ کے کسی گھر میں بھی دھواں نظر نہیں آتا تھا۔

(حضرت ابو سلمہ رحمتہ اللہ نے بیان کیا:) میں نے کہا۔ "پھر وہ لوگ کیا کھاتے تھے؟"

ام المومنین رضی اللہ عنہا نے فرمایا "دو سیاہ چیزیں: کھجوریں اور پانی' البتہ ہمارے کچھ انصاری ہمسائے تھے' وہ مخلص ہمسائے تھے' ان کے گھروں میں پلنے والی کچھ بکریاں تھیں (جنہیں چرنے کے لیے چراگاہ میں نہیں لے جایا جاتا تھا' گھر لا کر چارہ دیا جاتا تھا۔) وہ ان کا دودھ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف (ہمارے ہاں) بھیج دیا کرتے تھے۔"

(راوی حدیث) محمد بن عمرو رحمتہ اللہ بیان کرتے ہیں' وہ نو گھر تھے۔

فائدہ:

عورتوں کو چاہیے کہ حلال آمدنی میں گزارہ کریں اور خاوند کو حرام ذرائع اختیار کرنے پر مجبور نہ کریں۔

بھوک کی وجہ سے

حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ سے روایت ہے' انہوں نے فرمایا:

"میں نے ایک دن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو بھوک کی وجہ سے کروٹیں بدلتے دیکھا کیونکہ آپ کو معمولی سی کھجوریں بھی میسر نہ تھیں جن سے پیٹ بھر لیتے۔

فائدہ:

1۔ اس میں امت کے لیے سبق ہے کہ وہ تنگ دستی کی حالت میں صبر اختیار کریں' حرام کی کمائی کا خیال بھی دل میں نہ لائیں۔

تازہ کھانا

حضرت سلمان بن عمر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے' انہوں نے فرمایا: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہمارے ہاں تشریف لائے تو (ہماری یہ حالت تھی کہ) ہمیں تین رات تک کھانا میسر نہ ہو سکا۔

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے' انہوں نے فرمایا: ایک دن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں گرم کھانا حاضر کیا گیا۔ آپ نے تناول فرمایا۔ جب فارغ ہوئے تو فرمایا:

"اللہ کا شکر ہے' میرے پیٹ میں اتنے دن سے (تازہ اور) گرم کھانا نہیں گیا۔ (کھجور وغیرہ پر گزارہ رہا۔)

حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے گھر والوں کا بستر

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے' انہوں نے فرمایا:

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا بستر چمڑے کا تھا جس میں کھجور کی چھال بھری ہوئی تھی۔

فوائد و مسائل:

1۔ مطلب یہ ہے کہ بستر عمدہ کپڑے کا نہیں تھا جس میں اون یا روئی بھری ہوئی ہو بلکہ چمڑے کا بستر بنا ہوا تھا اس میں کھجور کے درخت کی چھال بھری ہوئی تھی جو سخت اور ناہموار ہوتی ہے۔ لیکن چمڑے کی وجہ سے اس کی سختی زیادہ محسوس نہیں ہوتی۔ اہل عرب چمڑے کو سادہ انداز سے تیار کرتے تھے' جو نہ زیادہ قیمتی ہوتا تھا' نہ خوب صورت۔ اس لحاظ سے چمڑے کا بستر انتہائی سادگی کی مثال ہے۔

آخرت

حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ سے روایت ہے' انہوں نے فرمایا:

میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ہاں حاضر ہوا تو آپ ایک چٹائی پر تشریف فرما تھے۔ میں بیٹھ گیا۔ میں نے دیکھا کہ آپ نے صرف تہ بند پہن رکھا ہے۔ دوسرا کوئی کپڑا زیب تن نہیں۔ میں نے دیکھا کہ آپ کے پہلو پر چٹائی سے نشان پڑ گئے ہیں۔ ایک طرف

صرف تھوڑے سے جو تھے۔ غالباً" ایک صاع ہوں گے۔ اور کیکر کے پتے تھے (جو چمڑے کی دباغت میں کام آتے ہیں) اور بغیر دباغت کھال لٹکی ہوئی تھی۔ میری آنکھوں میں آنسو آگئے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "ابن خطاب! آپ کیوں روتے ہیں؟"

میں نے کہا: اللہ کے نبی! میں کیوں نہ روؤں؟ اس چٹائی سے آپ کے پہلو میں نشان پڑ گئے ہیں (کوئی نرم بستر بھی نہیں۔) اور آپ کے سامان رکھنے کی جگہ میں کچھ نظر نہیں آتا، سوائے اس (ایک صاع جو) کے جو میں دیکھ رہا ہوں۔ ادھر کسریٰ اور قیصر باغوں اور میووں میں (عیش کر رہے) ہیں۔ آپ اللہ کے نبی اور اس کے برگزیدہ ہیں اور یہ آپ کا توشہ خانہ ہے (جو خالی پڑا ہے۔)
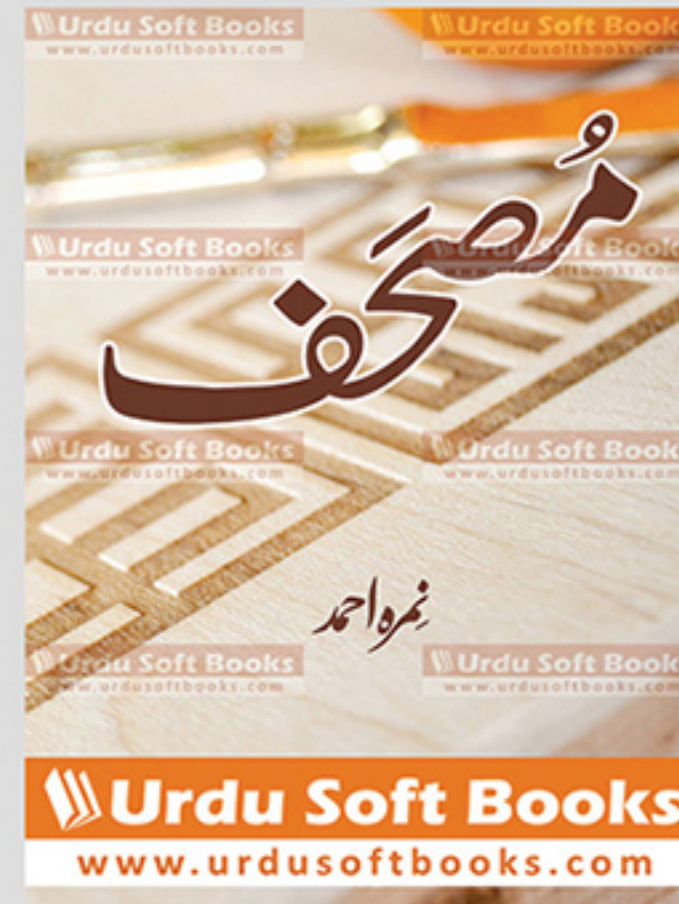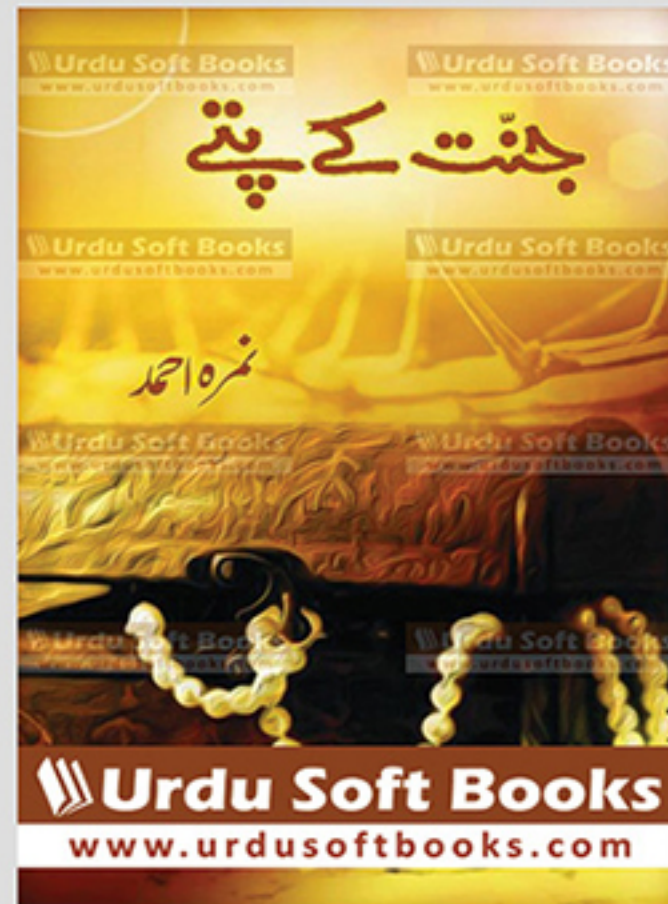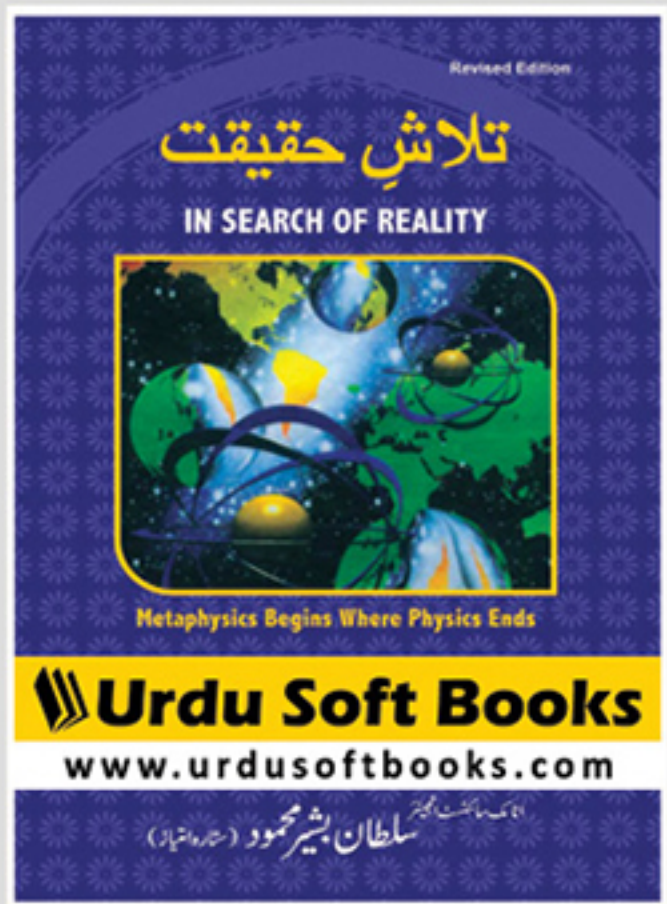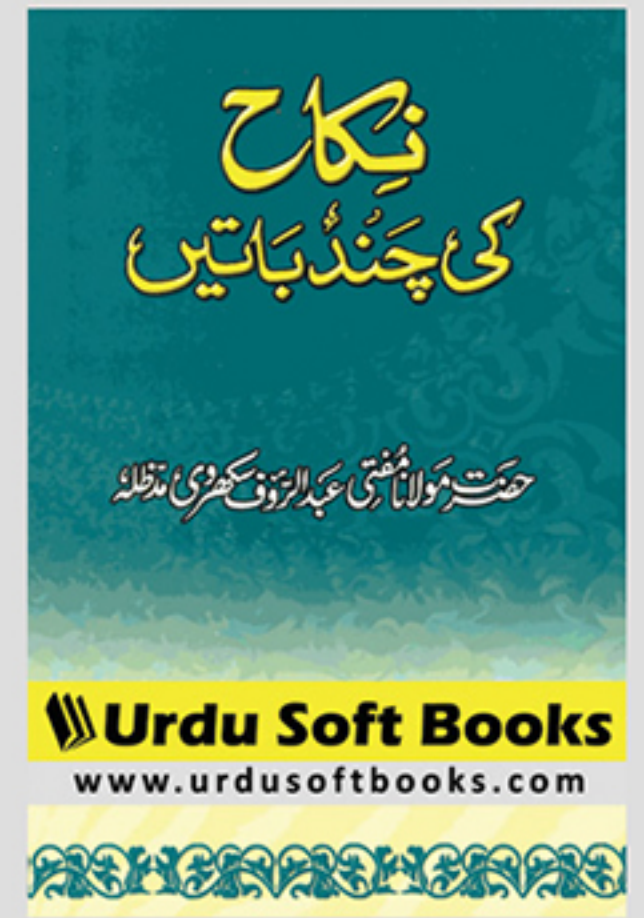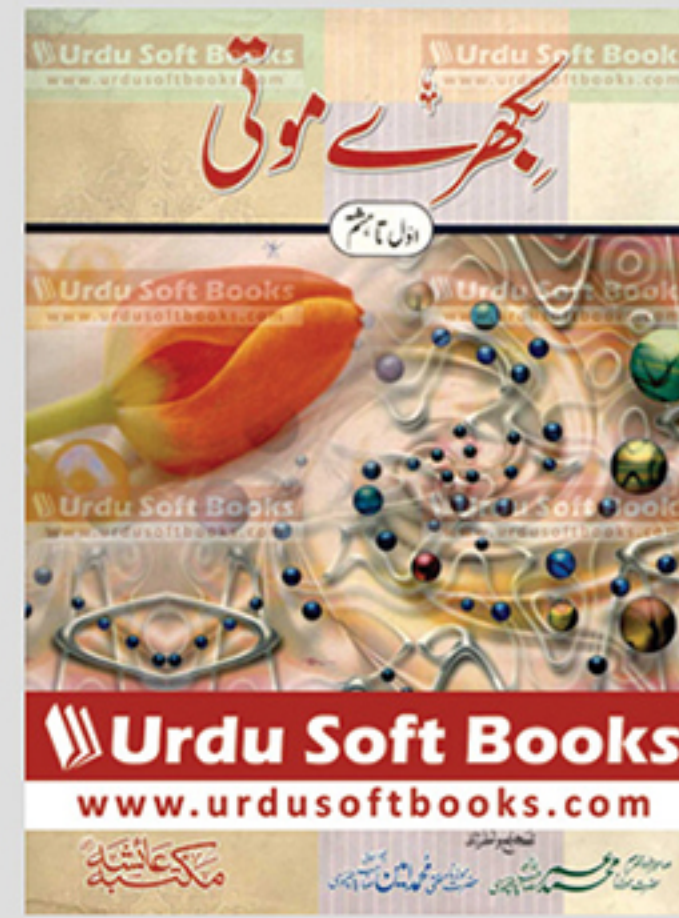
رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "خطاب کے بیٹے! کیا تو اس بات سے خوش نہیں کہ ہمیں آخرت مل جائے اور ان (قیصر و کسریٰ) کو دنیا؟"

میں نے کہا: "کیوں نہیں! (میں خوش ہوں۔)"

فوائد و مسائل:

1۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے دنیا کا مال جمع نہیں کیا بلکہ زہد اختیار فرمایا۔

2۔ گھر میں ایک دو وقت کی خوراک موجود ہونا زہد کے منافی نہیں۔

3۔ بے تکلف ساتھیوں میں صرف تہ بند پہن کر، یعنی قمیص پہنے بغیر بیٹھنا جائز ہے۔

4۔ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے شدید محبت رکھتے تھے۔

5۔ کافروں کو ان کی نیکیوں کا معاوضہ، دنیا ہی میں دنیوی سامان یا عیش و عشرت کی صورت میں مل جاتا ہے۔

6۔ مسلمان پر دنیوی تنگ دستی آخرت میں درجات کی بلندی کا باعث ہے۔

حجلۂ عروسی

حضرت علی رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، انہوں نے فرمایا:

"جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بیٹی (حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا) رخصت ہو کر میرے گھر آئیں، اس رات ہمارا بستر صرف ایک مینڈھے کی کھال پر مشتمل تھا۔"

کدو کا بیان

حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، انہوں نے فرمایا: نبی صلی اللہ علیہ وسلم کدو پسند فرماتے تھے۔ (احمد)

حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، انہوں نے فرمایا۔

میری والدہ ام سلیم رضی اللہ عنہا نے میرے ہاتھ کھجوروں کا ایک ٹوکرا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں بھیجا۔ آپ مجھے (گھر میں) نہ ملے۔ آپ قریب ہی اپنے ایک آزاد کردہ غلام کے ہاں تشریف لے گئے تھے۔ اس نے آپ کو دعوت دی تھی اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے کھانا تیار کیا تھا۔ میں حاضر خدمت ہوا تو آپ کھانا تناول فرما رہے تھے۔ آپ نے مجھے بھی اپنے ساتھ کھانا کھانے کی دعوت دی۔ ان صاحب نے کدو اور گوشت ڈال کر ثرید بنا رکھا تھا۔ میں نے دیکھا کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو کدو اچھا لگتا ہے تو میں اس (کدو) کے ٹکڑے (برتن کے اطراف میں سے) جمع کر کے آپ کے قریب کرنے لگا۔ جب ہم لوگوں نے کھانا کھا لیا تو آپ واپس گھر تشریف لے گئے۔ میں نے (کھجوروں کا) ٹوکرا آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے رکھ دیا۔ آپ نے کھجوریں کھانا اور تقسیم کرنا شروع کر دیں حتیٰ کہ ختم کر کے فارغ ہو گئے۔ (احمد)

جب تجھ سے ناتا جوڑا ہے

فاطمہ صغریٰ قادر

عنوان دلچسپ تھا سوچا، چلو قلم اٹھاتے ہیں

س : خواتین اور شعاع کب پڑھنا شروع کیا؟

ج : شادی کے بعد اس وقت جب میری بڑی بیٹی نے میٹرک کیا۔ دوسری ساتویں جماعت میں تھی ہمیں کراچی کے مشہور ترین سینٹ جوزف کالج میں پڑھایا کرتی تھی کہ بے انتہا چاہنے والے شوہر کا اچانک انتقال ہو گیا... تب سے یہ دونوں رسالے میرے رفیق ہیں۔

س : شادی سے پہلے کیا مشاغل تھے؟

ج : شادی سے پہلے صرف حصولِ علم کا جنون تھا چنانچہ بی۔ اے میں فرسٹ ڈویژن لی اور ایم۔ اے میں فرسٹ پوزیشن لی تھی۔ اس کے علاوہ ڈرائنگ، آئل پینٹنگ، تکیوں کے غلاف، کشن کورز اور ٹیبل میٹس پر امبر ائڈری کرنے کا شوق تھا، اردو اور انگریزی کے مشہور ناولز کے مطالعے کا شوق تھا۔

س : اس رشتے میں آپ کی مرضی تھی یا گھر والوں کی مرضی تھی جس پر آپ نے سر جھکا دیا تھا؟

ج : ایک انوکھی بات بتاؤں کہ میری شادی حضرت امیر خسرو کے شعر کے صرف ایک مصرعے پر طے ہو گئی تھی، کیسے؟ اس کا جواب ذرا تفصیل طلب ہے لیکن ہے بہت دلچسپ!

دراصل جب میں ساڑھے تین سال کی اور بھائی سال بھر کا تھا تب ہی ہماری امی کا انتقال ہو گیا تھا۔ اس وقت سے ہی ہم لوگ تایا ابا کے اصرار پر ان لوگوں کے ساتھ رہنے لگے۔ ان کا گھر بہت ہی کشادہ اور ہوادار تھا۔ جہاں میری بڑی تایا زاد بہن، بہنوئی اور ان کے بچے تھے، پھر ہم چلے گئے تو سب سگے بھائی بہن کی طرح رہنے لگے۔

میرے سسر کی تایا ابا کے ساتھ کالج لائف کے زمانے سے بہت پکی دوستی تھی۔ بہادر آباد سوسائٹی میں ہمارے گھر پر ہر چاند کی پندرہویں شب مشہور قوال منظور احمد نیازی کی قوالی ہوا کرتی تھی۔ کلام اردو کے علاوہ زیادہ تر فارسی کے مشہور شعرا... مثلاً" فردوسی، طوسی، عمر خیام، حضرت خواجہ معین الدین چشتی، نظام الدین اولیاء، سعدی شیرازی اور طوطیٔ ہند حضرت امیر خسرو وغیرہ محفل کا ایسا رنگ جماکہ سبحان اللہ! کیونکہ صوفیانہ شاعری کا فارسی کلام، اردو سے کہیں زیادہ خوب صورت ہے، من موہ لیتا ہے۔ اس تقریب کے لیے خاندان کے لڑکے لڑکیوں کو شروع ہی سے ایسی محفلوں میں نشست و برخاست آداب و اطوار کی تربیت دی جاتی تھی اور یوں ہمیں فارسی کے کلام سے بھی شناسائی اور دلچسپی ہو جاتی۔

ایک دن دوپہر کا وقت تھا۔ تایا ابا کے عزیز ترین دوست جناب سید غوث محی الدین کے داماد سید بشیر الدین صاحب تشریف لائے۔ انہوں نے ایک گلابی رنگ کا لفافہ تایا ابا کی خدمت میں پیش کیا کہ یہ غوث پاشا کی طرف سے ہے۔ تایا ابا نے بڑے شوق سے لیا۔ اس میں ایک گلابی ہی رنگ کے کاغذ پر حضرت امیر خسرو کے شعر کا ایک مصرعہ لکھا تھا۔

"کہ دارد جز تو دست آنکہ باشد" نیچے بریکٹ میں لکھا تھا

(آپ کی بھتیجی کا ہاتھ اپنے بیٹے کے لیے چاہتا ہوں۔)

جواب میں تایا ابا نے اسی لفافے میں "بہ سرو چشم قبول کردم" لکھ کر بھیج دیا۔

شام کو ابا جان آفس سے لوٹے تو بھائی بھاوج کو منتظر پایا۔

"مبارک ہو۔ آپ کی صاحبزادی کی شادی کی بات طے پا گئی۔" تائی اماں نے ہنس کر کہا۔

ابا جان کہاں تو جناح کیپ اتار کر بیٹھنے لگے تھے، تھام گئے رک گئے' لمحہ بھر کو ہکا بکا سے رہ گئے' پھر جب بھائی بھاوج کے مسکراتے چہرے دیکھے تو جا کر بھاوج کا ہاتھ مودبانہ اس کی پشت پر بوسہ دیا' فرمایا۔

"خیر مبارک"

"غوث پاشا نے اپنے داماد کے ہاتھ حضرت امیر خسرو کا ایک مصرعہ لکھ کر آپ کی بیٹی کا ہاتھ مانگا' تو ہم نے بھی اپنی رضامندی میں سعدی شیرازی کا شعر لکھا اور نیچے بریکٹ میں لکھ دیا 'بسرو چشم قبول کردم'"

ابا جان مسکرانے لگے۔

مارے حیا کے ہم کو جو منظر سے غائب ہونے کا موقعہ ملا' کمرے کی طرف لپکے۔ گھر والوں کی خوشی سے بھرپور آوازوں نے پیچھا کیا۔ کمرے میں تایا زاد بہن اختر آپا کی بیٹیاں تھیں۔ سب نے زندہ باد کے نعرے لگائے۔ رات تک میکے کے سب لوگوں کو اطلاع پہنچ چکی تھی فون پر۔۔۔ چنانچہ سب خالہ زاد بہنیں پہنچ گئیں' والداؤں کے سنگ ڈھول لے کر۔

ہمارے آباؤ اجداد حیدر آباد دکن سے ہجرت کر کے آئے تھے۔ اب بھی ہمارے گھر کے طور طریقے وہی تھے۔ خانساماں نے فوراً" حیدر آبادی ہرے مسالے والی بریانی' بگھارے بیگن' شکر قندی کی کھیر بنائی تھی۔ دسترخوان بچھ گیا۔ ہنسی خوشی کی رونق تھی۔ چنانچہ رات ڈھولک کے ساتھ محفل جمی' بیاہ والے چند گیت یہ تھے۔

اری بنو بولت کیوں ناہی بنرے سے
اری لاڈو۔۔۔۔۔۔
اری بنو جھومر جو اٹکا ہے گھونگھٹ میں (دوبارہ)
وہ ہریالہ' وہ میا پیارا۔۔۔ چھڑائے گا چاہت سے
بڑے ارمانوں سے۔ اری بنو۔۔۔

اری بنو کنگنا جو اٹکا ہے آنچل میں
وہ ہریالہ' وہ میا پیارا۔۔۔ چھڑائے گا چاہت سے
بڑے ارمانوں سے۔۔۔ اری بنو۔۔۔

شہزادہ دولہا آئیوری چلو دیکھ لو
بھائیوں کا پیارا۔۔۔
پھولوں کی لڑیوں کا سہرا سجائے
بہنوں کا پیارا آئیوری چلو دیکھ لو
بینڈ اور باجے سے دھوم مچائے
گھوڑے پر بیٹھا آئیوری۔ چلو دیکھ لو

✻ ✻ ✻

آیا بنا آیا ہریالہ بنا آیا۔ راج دلارا بنا آیا
حور و ملک نے گایا' ہریالہ بنا آیا' راج دلارا بنا آیا

میں تو نظر کے ڈر سے دیکھی نہ آنکھ بھرے' جی دیکھی نہ آنکھ بھر کے موہن مکھ پایا۔۔۔ ہریالہ بنا آیا' راج دلارا بنا آیا
تن من میں وار ڈالوں تیری بلا کو ٹالوں رے' تیری بلا کو ٹالوں جگ سارا جگمگایا۔۔۔ ہریالہ بنا آیا' راج دلارا بنا آیا

س: ذہن میں جیون ساتھی کے حوالے سے کوئی تصور تھا؟ وہ کیا خوبیاں تھیں جو آپ ان میں دیکھنا چاہتی تھیں؟

ج: ذہن میں صرف یہ تصور تھا کہ جیون ساتھی اعلا اخلاق و کردار کے حامل ہوں۔ اعلا تعلیم یافتہ اور بہت بہت چاہنے والے ہوں۔ اللہ کا کرم ہے کہ وہ بالکل اس کا نمونہ تھے۔ مزاج میں شگفتگی اتنی تھی کہ میکے میں سب سے زیادہ مقبول داماد وہی تھے۔

س: منگنی کتنا عرصہ رہی' شادی سے پہلے کوئی بات ہوئی یا ملاقات؟

ج: بس چٹ منگنی پٹ بیاہ والی بات تھی۔ فون بھی کبھی نہ کیا کہ بڑوں کے فیصلے ان کے تجربے مشاہدے پر مبنی ہوتے ہیں اور فون پر کیوں بات کروں کہ ہونے

والی سسرال میں میرا ہی امیج خراب ہو جائے۔
س: شادی سے پہلے آپ کے سسرال والوں کے بارے میں کیا خیالات تھے؟ کیا وہ ان پر پورے اترے؟
ج: قوالیوں کے موقعوں پر زنانے کے لیے ہال کے درمیان میں عرضاً جارجٹ کا پردہ ہوتا تھا اور ہمراہ ہونے والی سسرال کی خواتین آتیں' سب پڑھی لکھی شائستہ اطوار تھیں۔ دکنی اعلیٰ تہذیب کا نمونہ۔ نیک امیدیں تھیں سب پوری ہوئیں۔
س: شادی کے لیے کوئی قربانی دینی پڑی؟ یا کوئی اور؟
ج: میں نے ایم اے کیا تھا کہ شادی ہو گئی۔ سسرال میں تین نندیں تھیں۔ ان کا ایک اکلوتا بھائی تھا تو میرا استقبال انتہائی محبت سے کیا گیا تھا۔ دوسرے دن تیار ہو کر کمرے سے باہر آئی۔ سسر صاحب آرام کرسی پر بیٹھے کتاب پڑھ رہے تھے' اٹھ کھڑے ہوئے۔ بڑھ کر سر پر ہاتھ رکھا اور پکار کر کہا "بی بی" آئیں یہ دیکھیں۔ آپ کی بہو آپ کو سلام کرنے آئی ہے۔" میں نے سسر صاحب کے ہاتھ کی پشت پر بوسہ دیا' پلٹی تو ساس صاحبہ نے سر پر ہاتھ رکھ کر دعا دی۔
ان ہی دعاؤں کے سائے میں اللہ نے ہر مقام پر خوشیاں اور رحمتیں عطا کیں۔ ایسا کوئی مسئلہ نہ تھا۔
س: شادی کی رسموں کے دوران یعنی لین دین کے معاملے پر کوئی بدمزگی ہوئی؟
ج: بالکل بھی نہیں بلکہ خلد آشیاں ساس صاحبہ نے کہلوا دیا تھا کہ ہمیں صرف پڑھی لکھی اچھے خاندان کی بہو چاہیے تھی۔ نہ آپ لوگ فرنیچر دیں نہ جہیز' نہ ہی دولہا کے لیے کپڑوں وغیرہ کا اہتمام کریں۔ لیکن تایا جان' تائی جان نے کہہ دیا کہ یہ تو ہمارے گھر کی پہلی شادی ہے' پہلی خوشی ہے۔ آپ شادی کے دن کے لیے شیروانی کا اور ولیمہ کے کوٹ پینٹ سوٹ کا ناپ بھجوا دیں۔ چنانچہ خوش دلی اور باہمی رضامندی سے سارے معاملات ہو گئے۔
س: شادی کے بعد شوہر نے آپ کو دیکھ کر کیا کہا؟
ج: یہ بہت ہی پرسنل سوال ہے۔

س: شادی کے بعد آپ میں کیا تبدیلیاں آئیں؟
ج: جہاں جوائنٹ فیملی سسٹم ہو' وہاں یقیناً مسائل پیدا ہوتے ہیں۔ لیکن خوش دلی اور افہام و تفہیم سے کام لیا جائے۔ اگر آپ اچھی تعلیم یافتہ ہوں تو یہ بنیادی جوہر ہوتا ہے۔ خود اعتمادی' تحمل' درگزر اور صبر سے کام لے کر خود مسائل کا حل فراخدلی سے نکالیں تو اللہ رب العزت کی مدد شامل ہو جاتی ہے۔
س: سسرال میں کن باتوں پر تنقید ہوئی؟
ج: اس ناچیز نے موقع ہی نہیں دیا کہ تنقید کی جائے۔ بڑی نند اپنے بھائی کی عاشق زار تھیں۔ انہوں نے مجھے آنکھوں کا تارہ بنا کر رکھا۔ ساس سسر اتنے قدردان تھے کہ حد نہیں۔ سسر محترم کے شکاریات کے قصے سننا میرا شوق تھا۔ انہوں نے مجھے بتایا تھا کہ آپ کو پتا ہے' آپ کے شوہر نے اٹھارہ سال کی عمر میں پہلا شیر مارا تھا۔" پھر اٹھ کر گئے اور چاندی کی ایک ڈبیہ میں روئی میں رکھے شیر کے ناخن دیے کہ سنبھال کے رکھیں۔ کبھی اس کا نیکلس بنوایا جا سکتا ہے کسی اچھے جوہری سے!"
س: شادی کے کتنے عرصے بعد کام کاج سنبھالا؟
ج: برسوں بعد' جب ہم نے بیٹیاں ہونے کے بعد الگ گھر میں رہائش شروع کی۔
س: سوال نمبر ۱۳ سے نمبر ۱۷ کے جوابات کا گزشتہ جوابات سے اندازہ کیا جا سکتا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ میکہ اور سسرال کبھی ایک جیسے تو ہو ہی نہیں سکتے۔ کامیابیاں اور محبتیں جہد مسلسل سے حاصل ہوتی ہیں۔ اور خواتین اور شعاع جیسے رسالوں کی رہبری سے' ورنہ زندگی پھولوں کی سیج تو ہوتی ہی نہیں! اس کی گواہ پیاری امت الصبور اور عزیز سائرہ غلام نبی ہیں۔ جن کو میں نے کالج کے آخری تدریسی دور میں طالبات کے درمیان ہونے والے "مقابلہ سیزی" میں بحیثیت مہمانان گرامی بلایا تھا اور جس کے مہمان خصوصی "مصور پاکستان" کے خطاب یافتہ عظیم مصور تھے۔

جب تجھ سے ناتا جوڑا ہے

ن۔ق

ن۔ق۔راولپنڈی

میں زیادہ پڑھی لکھی نہیں، صرف پانچ کلاس تک پڑھا ہے۔اس میں بہت غلطیاں ہوں گی مگر شائع ضرور کریں۔شعاع میری بہن منگواتی ہے، خواتین ڈائجسٹ میں یقین کریں صرف یہ ساٹھ روپے اپنے اوپر لگاتی ہوں۔

س : شادی کب ہوئی؟

ج : تاریخ یاد نہیں اتنا پتا ہے کہ 28 سال ہو گئے ہیں۔

س : شادی سے پہلے کے مشاغل؟

ج : مشاغل کیا تھے۔بے فکری کے دن تھے۔کسی کام کا کچھ پتا نہیں تھا۔سولہ سال کی عمر میں شادی ہوئی۔کسی کام کا کچھ پتا نہیں تھا نہ ماں نے سکھایا۔ایک آٹا گوندلیتی تھی۔وہ بھی ابو نے سکھایا تھا۔میرے ابو کی گھر کے ساتھ دکان تھی۔ابو بہت نرم دل تھے اور امی بہت سخت۔ہم دو بہنیں اور دو بھائی ہیں۔

س : رشتے میں مرضی؟

ج : بس ابو کے دوست کے بیٹے تھے۔مجھ سے عمر میں پندرہ، سولہ سال بڑے، باتوں ہی باتوں میں انہوں نے ابو سے میرا رشتہ مانگ لیا۔ابو نے کہا ابھی میری بیٹی بہت چھوٹی ہے لیکن انہوں نے بہت اصرار کیا اس لیے میرا نکاح ہوا پہلے اس وقت میری عمر چودہ سال تھی اور دو سال بعد میری شادی ہوئی ہم بہت غریب تھے اور سسرال والے تھوڑے امیر تھے یہ گیارہ بہن بھائی تھے۔بس گھر کے دوست ہونے کی وجہ سے رشتہ ہوا۔

س : منگنی کتنے عرصے رہی؟

ج : میں نے بتایا نا کہ میرا نکاح پہلے ہوا جو دو سال رہا پھر شادی ہوئی۔

س : شادی کے لیے قربانی؟

ج : قربانی کیا دینی تھی بس امی بہت غیرت والی تھیں۔چھوٹی چھوٹی باتوں پر ابو سے ہر وقت لڑائی کرتیں، مجھے ابو پر بہت ترس آتا اور اچھے کپڑے پہننے کا بہت شوق تھا۔غریب تھے۔اس لیے کبھی اتنے اچھے کپڑے نہیں پہنے، سوچا شادی ہو گی تو اچھے اچھے کپڑے پہنیں گے۔یہ نہیں پتا تھا کہ شادی نام کس چیز کا ہے۔

س : رسموں کے لین دین پر کوئی جھگڑا ہوا؟

ج : نہیں کوئی نہیں۔

س : شادی کے بعد شوہر نے دیکھ کر کیا کہا؟

ج : کچھ نہیں انہوں نے بچپن میں مجھے دیکھا ہوا تھا۔

س : شادی کے بعد زندگی میں کیا تبدیلیاں آئیں؟

ج : یہ نہ پوچھیں کہ کیا تبدیلی آئی۔سولہ سال کی عمر میں آنکھیں کھل گئیں کہ شادی کے بعد کی زندگی کتنی مشکل ہے۔ساس، سسر، نندیں، دیور، جیٹھ، جیٹھانیاں ان کے بچے شکر کہ وہ الگ تھے۔اف کیا لکھوں بہت ہی مشکل وقت گزارا اور اب تک گزار رہی ہوں۔

س : کتنے عرصے بعد کام کاج سنبھالا؟

ج : سات، آٹھ دن بعد اور 28 سالوں سے کام اور بس کام۔اب تو ہر وقت کمر میں درد رہتا ہے۔کام ہے کہ ختم ہی نہیں ہوتا۔دو نندوں کی شادی مجھ سے پہلے ہوئی تھی۔تین ابھی تک کنواری ہیں۔بہت عمر کی ہیں۔

وہ کہتی ہیں کہ ہم پر کالا علم ہوا ہے۔ جس سے ہمارا رشتہ نہیں ہوتا جبکہ فارغ بیٹھ بیٹھ کر وہ بہت موٹی ہو گئی ہیں اور ہر رشتے پر شرط رکھتی ہیں فیملی کم ہو اور امیر ہو بس اللہ کو لگتا ہے ان کی بات پسند نہیں۔ اس لیے اب رشتے نہیں آتے۔

س : میکے اور سسرال کے کھانوں کے ذائقے میں فرق؟

ج : جی بہت زیادہ ہم غریب ضرور تھے مگر ابو بہت لذیذ کھانا بناتے تھے اور سسرال میں ایک لہسن سے تین ہانڈیاں بنتیں۔ ساس کے مرنے کے بعد تو نندوں نے حد ہی کر دی کنجوسی کی بس سر پر کھڑے ہو کر کھانا بنوانا۔ مجھے تو شادی سے پہلے کچھ بھی نہیں آتا تھا بس دیکھ دیکھ کر سیکھا۔ ہر بات پہ طعنہ کہ ماں نے تمہیں کیا سکھایا حالانکہ یہی پہلے کہتی تھیں کہ نہیں آتا تو نہ سہی ہم شادی کے بعد اسے سب کچھ سکھا دیں گے۔ نہ مجھے کھانا بنانا آتا تھا نہ ہی سلائی نہ ہی کچھ اور کام۔ بس اگر میں نے کچھ سیکھا تو ان کے طعنوں سے۔ یہ غیر تھے۔ اب میں نے اپنی بھابھی سے بہت کچھ سیکھا اور بہت اچھا بنا لیتی ہوں۔

س : سسرال میں کن باتوں پر تعریف / تنقید ہوئی؟

ج : تعریف تو اٹھائیس سال کے بعد بھی کسی نے نہیں کی اس لیے کہ مجھے گھر کے کسی کام کا پتا تھا نہ چالاکی تھی۔ کاش میرے امی ابو میری شادی جلدی نہ کرتے۔ پہلے گھر کے کام سکھاتے ' سالن بنانا ' روٹی ' چاول سب کچھ تاکہ سسرال میں میری عزت ہوتی۔ میری ہر ماں سے گزارش ہے کہ شادی سے پہلے اپنی بیٹی کو کچن کے کام ضرور سکھائے پڑھائی بھی میری بہت کم ہے۔ صرف پانچ تک پڑھا اپنی بیٹیوں کو اعلا تعلیم دلوائی میری دو بیٹیاں کالج میں پڑھتی ہیں اور دو بیٹے بھی پڑھ رہے ہیں۔ بیٹیوں کو کہتی ہوں کہ ساتھ کچن کا بھی کیا کریں۔

س : سسرال سے وابستہ توقعات کس حد تک پوری ہوئیں؟

ج : کیا توقعات کرتی بس اگر وہ مجھے طعنے نہ دیتے ' اگر آرام سے ہر کام سمجھاتے کیونکہ میں بہت ہی چھوٹی فیملی سے بڑی فیملی میں آ گئی تھی۔ دوسرا میری عمر صرف سولہ سال تھی۔ میں آج تک نندوں کے ساتھ ہوں میں نے اپنی ہم دردی بہن کو بنایا یعنی دیورانی ' وہ دیور میرا ٹھیک تھا اور سسرال والوں نے دیکھا کہ بڑی بہن نے آج تک ہمارے آگے نہ نہیں کی چلو ایک اور نوکرانی لے آتے ہیں۔ میں بھی نہیں بولی۔ کہا ' ٹھیک ہے۔ بہن آئے گی تو میرا بوجھ ہلکا ہو گا۔ میری بہن نے میرا سارا کام اپنے سر لے لیا پھر اس سے چھوٹی دیورانی آئی۔ وہ میرے دیور کی پسند سے تھی اور امیر گھر سے تھی۔ آتے ہی اس نے پہلے نندوں کو قابو کیا۔ نندیں اس کے آگے جی جی کرتی ہیں۔ اس سے اتنا ڈرتی ہیں۔ پہلے ہم نندوں کی نوکرانیاں تھیں۔ اب دیورانی کی بھی ہیں۔ مجھ سے اب اتنا کام نہیں ہوتا ' کمر میں درد رہتا ہے۔ سارا کام بہن کرتی ہے۔ اب اس پر بہت ترس آتا ہے کہ کاش اس کی شادی ادھر نہ ہوتی۔ میں تین ٹائم کچن کا کام کرتی ہوں اور باقی سارا کام بہن کرتی ہے۔ میرے خاوند بھی بہت سخت ہیں۔ ان سے کہتی ہوں کہ اب الگ ہو جائیں مگر وہ نہیں مانتے۔

س : پہلے بچے کی پیدائش؟

ج : پہلے بیٹا ہوا ' سنبھالنا بہت مشکل تھا۔ بس اللہ نے ہمت دی اور سنبھال لیا۔

س : سسرال میں مقام؟

ج : اتنے سال گزر جانے کے بعد بھی نہیں ملا۔ بہت قربانی دی مگر غربت سے آئی تھی ' آج تک وہی یاد کرتے ہیں۔ بہت دل دکھایا سسرال والوں نے مگر باپ اور بھائیوں کی عزت کا خیال کیا اور آج تک کر رہی ہوں۔

س : میکے اور سسرال میں فرق؟

ج : امی بہت سخت تھیں۔ بچپن میں بہت مار بھی کھائی۔ مگر اب سوچتی ہوں کہ میکہ ہی اچھا لگتا ہے۔

امی ابو، ساس سسر وفات پا گئے ہیں مگر سسرال کی زندگی بہت بہت کٹھن ہے۔ خدا ہر لڑکی کو اچھا سسرال دے۔

س : جوائنٹ فیملی سسٹم پسند ہے یا علیحدہ؟

ج : میں اب تک جوائنٹ فیملی میں ہی ہوں لیکن اب مجھے پسند نہیں۔ ساری زندگی میں نندوں کی محتاج رہی۔ پکایا ان کی مرضی سے۔ آج تک کبھی اپنی مرضی سے نہیں پکایا۔ کیا میرا دل نہیں؟ شوہر جس دن نہ اچھا بنا ہوا اپنے لیے اور بچوں کے لیے باہر سے لے آتے ہیں۔

س : شوہر سے تعلقات؟

ج : میرا تو شوہر نے بہت دل دکھایا۔ کبھی ان کو میرا خیال نہیں آیا نہ کبھی میری پسند کا پوچھا۔ بات بات پہ گالی دینا، نہ کبھی اپنے دل کی بات مجھ سے کی نہ کبھی میری سنی۔ لیکن میرے منہ سے ان کے لیے دعا ہی نکلی کہ اللہ ان کو صحت دے۔ میں پانچ وقت کی نماز پڑھتی ہوں اور ان کی صحت کے لیے دعا کرتی ہوں۔ اب بہت بیمار رہتے ہیں لیکن مزاج میں نرمی بالکل نہیں۔ پڑھنے والی سب بہنیں دعا کریں۔ اللہ ان کا دل میرے لیے نرم کرے۔ آمین۔ پتا نہیں میرے شوہر اتنے سخت کیوں ہیں۔ بہت خدمت کرتی ہوں مگر ان کے دل میں میرے لیے نرمی نہیں ہے۔ ساری زندگی میں نے اپنے سسرال والوں کے لیے وقف کر دی مگر ذرا بھی عزت نہیں ملی۔ اب تو ذرا سی بات پر رونے لگ جاتی ہوں۔ بس ایک بہن ہے جس سے بات کر کے دل کا بوجھ ہلکا کرتی ہوں اور وہ مجھ سے۔

آج کے دور میں کون سی لڑکی کسی کی بات برداشت کرتی ہے۔ محلے والیاں بھی اپنے گھر میں ہم دونوں بہنوں کی باتیں کرتی ہیں اور ہماری مثالیں دیتی ہیں کہ اگر کسی نے سسرال میں وقت گزارا ہے تو ان بہنوں نے بس ہمیں کچھ نہیں چاہیے۔ بس اتنی اپنے اللہ سے دعا ہے کہ شوہر کے دل میں نرمی ہو وہ مجھے پیر کی جوتی نہ سمجھیں بلکہ اپنا لباس سمجھیں۔ میں نے آج تک اپنے لیے کچھ نہیں مانگا، جو مانگا بچوں کے لیے مانگا۔ اب تو بچے بھی تنگ آ گئے ہیں۔ ماں باپ کے رویے سے۔ بس اللہ ان پر رحم کرے۔ بس میری ساری زندگی دکھوں میں گزری۔ پتا نہیں میری زندگی میں کبھی سکون ہے بھی کہ نہیں۔ اللہ کا شکر ہے کہ بچے بہت نیک ہیں اور میرا خیال رکھتے ہیں۔ میں اب نماز پڑھتی ہوں اللہ سے دعا کرتی ہوں۔ اللہ ہی مشکلیں آسان کرنے والا ہے۔ بس ایک بار پھر میری تمام ماؤں سے گزارش ہے کہ اپنی بیٹیوں کو ہر کام سکھا کر شادی کریں کیونکہ ہر لڑکی کی اصل زندگی ہی شادی کے بعد شروع ہوتی ہے۔
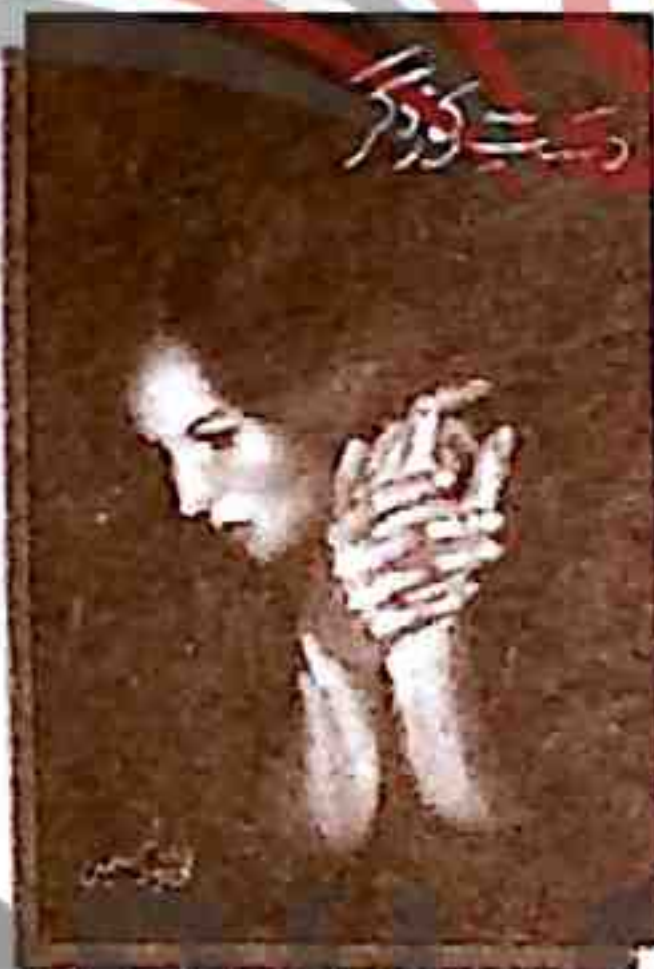
*

بندھن

عاصمہ شیرازی ہمراہ مدثر

شاہین رشید

میڈیا سے وابستہ لوگوں کے لیے ' لوگوں کی یہی سوچ ہے کہ ان کی شادیاں کامیاب نہیں ہوتیں۔۔۔ مگر ایسا نہیں ہے۔ میڈیا سے وابستہ لوگ بھی ہماری اور آپ کی طرح انسان ہی ہوتے ہیں' جو ایک پر سکون اور خوش گوار زندگی گزارنے کے خواہاں ہوتے ہیں۔۔۔ اور پھر پڑھے لکھے لوگ اپنی زندگی کا جو بھی فیصلہ کرتے ہیں بہت سوچ سمجھ کر کرتے ہیں۔ شوبز کی دنیا میں ضرور "اٹھا پٹخ" ہوتی رہتی ہے' مگر صحافت سے وابستہ لوگوں میں ایسا کچھ نہیں ہوتا۔ ہماری نالج میں بہت سے ایسے جوڑے ہیں جو ماشاء اللہ کئی سال بیت جانے کے باوجود بہت ہی خوش گوار زندگی گزار رہے ہیں۔ باقی یہ آسمانوں پہ لکھے گئے فیصلے ہوتے ہیں اور انسان ان فیصلوں کے آگے بے بس ہوتا ہے۔

عاصمہ شیرازی صحافت کی دنیا کا ایک بڑا نام' معروف اینکر' جن کی اپنی ایک خاص پہچان ہے۔ اس بار "بندھن" کے سلسلے میں ہمارے ساتھ ہیں۔

"کیسی ہیں عاصمہ؟"

"الحمدللہ۔۔۔"

"آج کل آپ کو "آج" چینل پہ دیکھ رہے ہیں۔ گزشتہ دو تین سالوں میں آپ نے تین' چار چینلز بدلے۔۔۔ وجہ؟"

"جی' میں آج کل "آج" ٹی وی چینل سے وابستہ ہوں۔ اس سے پہلے چینل "92" میں تھی جہاں میں نے ایک سال کام کیا۔ اس سے بھی پہلے "دنیا"
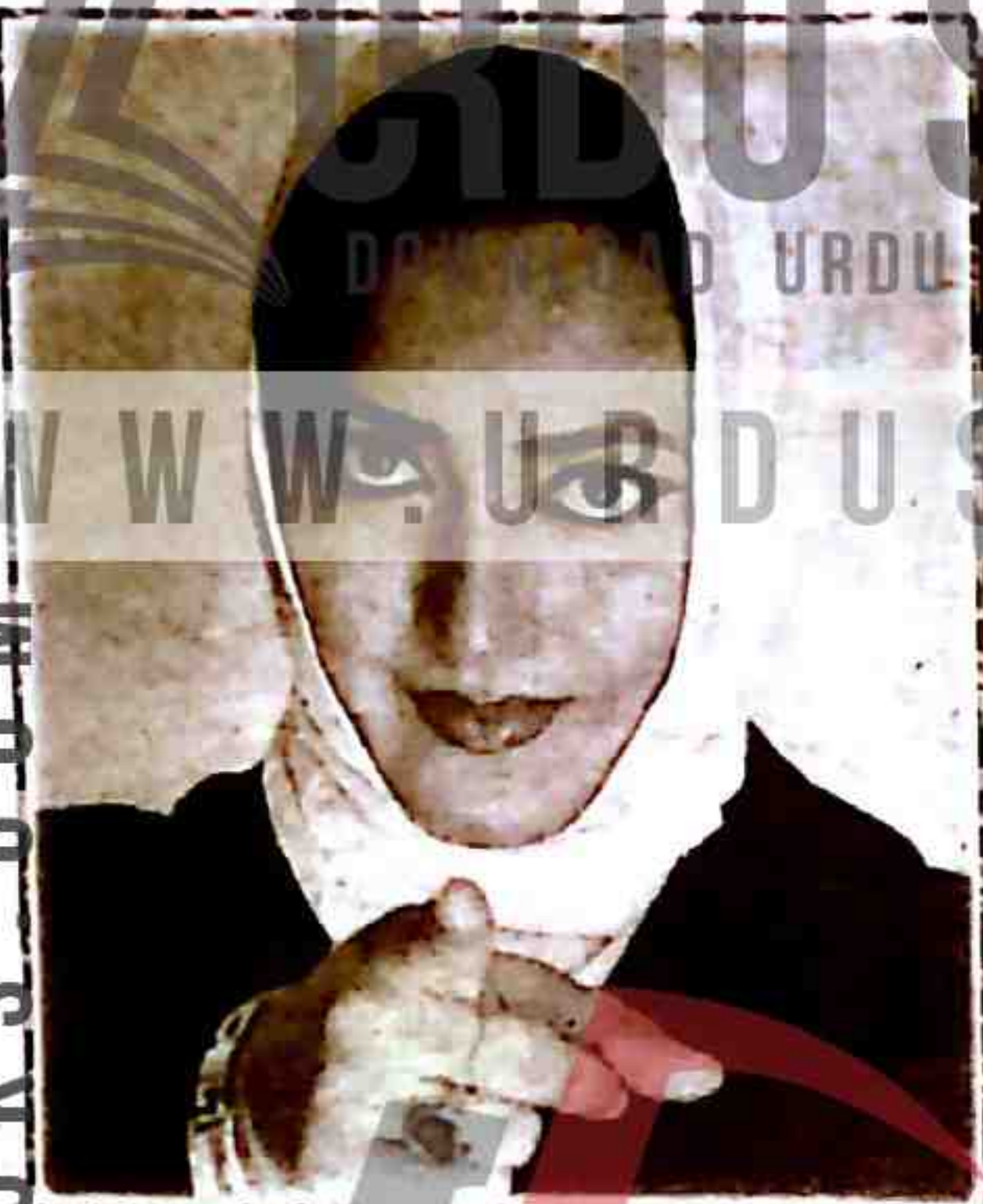
میں تھی اور "بول" کے نہ آنے کی وجہ سے ہماری پروفیشنل لائف پہ کافی اثر پڑا لیکن اب میں آج میں ہوں اور الحمدللہ یہاں کام کرکے بہت مطمئن ہوں اور سچ تو یہ ہے کہ "صحافت" کرنے کا موقع مل رہا ہے۔ جیسا کہ پروفیشنل آرگنائزیشن میں ہوتا ہے۔"

"شادی کو کتنا عرصہ گزر گیا اور بچوں کے بارے میں بھی بتایئے گا۔"

"ہماری شادی کو ماشاء اللہ آٹھ سال سے زیادہ کا عرصہ ہوگیا ہے اور ماشاء اللہ سے ہمارے دو بیٹے ہیں' میرا بڑا بیٹا علی آیان عباس اور علی حسین عباس۔۔۔ بڑا بیٹا سات سال کا ہے اور چھوٹا تقریباً" دو سال کا ہے۔۔۔ اور اللہ کا جتنا بھی شکر ادا کروں کم ہے کہ میں ایک بہت ہی اچھی اور خوش حال زندگی گزار رہی ہوں۔"

"ارینج میرج ہے یا لو اور آپ مدثر صاحب کو کیسے جانتی تھیں؟"

"ہم دونوں بہت اچھے دوست بھی تھے اور بہت اچھے کولیگ بھی اور ہماری شادی کی وجہ ہماری دوستی ہی ہے۔ نہ ہمارا افیئر چلا اور نہ ہی کوئی محبت والا سین تھا۔ ہاں مدثر یہ چاہتے تھے کہ ہماری شادی ہوجائے۔ چنانچہ میرے گھر والوں کو بھی یہ بہت اچھے لگے اور ہماری شادی ہوگئی تو میں اپنی شادی کو مکمل طور پر ارینج میرج کہوں گی۔ ہماری تو سہیلیوں جیسی دوستی تھی اور شادی کی کامیابی کی وجہ بھی محبت سے زیادہ دوستی ہوتی ہے اور پھر محبت تو ہو ہی جاتی ہے۔"

"شادی کے بعد مدثر میں کوئی تبدیلی آئی۔ عموماً" لڑکے شادی کے بعد بدل جاتے ہیں۔"

"مدثر میں کوئی خاص تبدیلی تو نہیں آئی۔ ہماری منگنی دو ماہ رہی تھی اور منگنی کے فوراً" بعد شادی کی تیاریاں بھی شروع ہوگئی تھیں اور میں ساتھ ساتھ کام بھی کررہی تھی تو کافی مصروف رہتی تھی میں۔"

"شادی کی شاپنگ سسرال والوں کے ساتھ کی تھی؟ اور یقیناً" آپ بہت حسین دلہن لگ رہی ہوں گی؟"

"شادی کی شاپنگ میں نے سسرال والوں کے ساتھ مل کر کی تھی اور بہت انجوائے کرکے شاپنگ کی تھی کیونکہ ادھر سے میرے میکے والے اور ادھر سے سسرال والے تو ہم سب نے بہت مزے کیے تھے۔۔۔ اور بالکل میں بہت حسین لگ رہی تھی۔ اللہ تعالیٰ نے مجھے ایک مکمل عورت بنایا ہے اور بڑے پیار سے بنایا ہے تو دلہن کے روپ میں' میں سب کو تو اچھی لگ ہی رہی تھی۔ مجھے بھی اپنا آپ بہت پیارا لگ رہا تھا اور یہ ایک یادگار اور نایاب لمحے ہوتے ہیں تو پھر سج دھج بھی ضروری ہوتی ہے۔"

"کیا نکاح پہلے ہوگیا تھا؟ اور نکاح نامہ آپ نے پڑھا تھا۔۔۔ اور یہ کہ شادی کی رسمیں دونوں نے مل کر انجوائے کی تھیں یا علیحدہ علیحدہ رسمیں ہوئی تھیں؟"

"نکاح ہمارا پہلے ہوگیا تھا' رخصتی سے تقریباً آٹھ دن پہلے اور چونکہ نکاح پہلے ہوگیا تھا تو ہم نے رسمیں بھی انجوائے کی تھیں۔ خاص طور پر "مہندی" کی رسم اور اس موقع پر ہم نے "قوالی" کا اہتمام بھی کیا تھا اور شادی دھوم دھام سے ہوئی تھی اور رشتے داروں کے علاوہ میڈیا کے لوگ بھی کافی تعداد میں آئے تھے اور ویڈنگ ریسپشن میں میڈیا کی بہت بڑی تعداد آئی تھی

اور کچھ سیاست دان بھی تشریف لائے تھے اور اتنی آرگنائزڈ طریقے سے ہماری شادی ہوئی کہ ہفتوں ہماری شادی ڈسکس ہوتی رہی اور اسلام آباد میں ہی ہوئی تھی۔ میں نے اور مدثر نے تو بہت چاہا کہ شادی سادگی سے ہو۔ مگر آپ کو پتا ہی ہے کہ ایسے موقعوں پر نہ لڑکی کی سنی جاتی ہے اور نہ ہی لڑکے کی تو دونوں فیملیز نے دل کھول کر پیسہ خرچ کیا۔

آپ کے سوال کا دوسرا حصہ... نکاح نامہ میں نے پڑھا تھا اور اس میں یہ شق پہلے سے موجود تھی کہ لڑکی کو طلاق کا حق حاصل ہے۔ اس لیے کچھ ترمیم کرانے کی ضرورت نہیں پڑی۔ نکاح نامہ ضرور پڑھنا چاہیے اور دستخط کرانے سے پہلے میری رضامندی بھی پوچھی گئی... اور میں سمجھتی ہوں کہ نکاح نامہ ایک بہت بڑا سوشل کنٹریکٹ ہوتا ہے اپنے لائف پارٹنر کے ساتھ اور صرف نکاح نامہ ہی نہیں ہر ڈاکومنٹ کو پڑھ کر ہی دستخط کرنے چاہئیں۔"

"منہ دکھائی میں کیا ملا تھا اور ہنی مون منایا تھا؟ اور کیا یہ ضروری ہے؟"

"منہ دکھائی میں بڑا ہی خوب صورت بریسلیٹ مجھے مدثر نے دیا تھا اور ہنی مون کے لیے ہم "ملائیشیا" اور "سری لنکا" گئے تھے اور یہ بالکل بھی ضروری نہیں ہے مگر اس کا مقصد یہ ہوتا ہے کہ جو نئے نئے لائف پارٹنر بنے ہوتے ہیں انہیں ایک دوسرے کے ساتھ زیادہ سے زیادہ وقت گزارنے کا موقع ملے اور ایک دوسرے کی پسند، ناپسند کو سمجھ سکیں، ایک دوسرے کو سمجھ سکیں اور ایسا اسی وقت ہو سکتا ہے، جب وہ کچھ ٹائم ایک دوسرے کے ساتھ فیملی کے بغیر گزار سکیں۔"

"جوائنٹ فیملی یا شروع سے ہی علیحدہ رہیں اور میکے اور سسرال میں کیا فرق پایا؟"

"میں اپنے میکے میں بھی بہت لاڈلی تھی۔ سسرال میں بہت زیادہ رہنے کا اتفاق اس لیے نہیں ہوا کہ وہ اسلام آباد میں نہیں رہتے لیکن مجھے کو آپریشن ہر جگہ سے ملا، محبت ہر جگہ سے ملی۔"

"شادی کے بعد لڑکیاں اپنے نام کے ساتھ اپنے شوہر کا نام لگاتی ہیں، مگر آپ نے...؟"

"اس لیے کہ میرے شوہر نے مجھے نہیں کہا کہ نام بدلو اور ویسے بھی میرے نام کی ایک پہچان تھی اور اس پہچان کی وجہ سے بھی نام نہیں بدلا۔ بہت سے ممالک ہیں جہاں نام نہیں بدلا جاتا اور نہ ہی بدلنا چاہیے۔ یہ کوئی ضروری نہیں ہے اور ہماری زندگی ماشاءاللہ بہت اچھی انڈراسٹینڈنگ کے ساتھ گزر رہی ہے۔"

"زندگی میں کبھی ایسا موڑ آیا جہاں آپ کو شادی کرکے پچھتاوا ہوا ہو؟ یا سسرال میں کسی نے کہا ہو کہ جاب چھوڑ دو؟"

"الحمدللہ... ایسی نوبت کبھی نہیں آئی۔ اللہ نے بہت پیاری اولاد دی ہے۔ بہت اچھا لائف پارٹنر ملا ہے۔ زندگی بھرپور ہو گئی ہے، زندگی میں کوئی کمی نہیں ہے۔ اس لیے راستہ جدا کرنے کا نہیں سوچا اور کسی نے جاب چھوڑنے کو نہیں کہا۔ کیونکہ سب کو معلوم ہے کہ میں کیریئر اورینٹڈ ہوں، تھی اور رہوں گی۔ مجھے کبھی نہ سسرال نے اور نہ مدثر نے فورس کیا، جاب چھوڑنے کے لیے... تو اس طرح کی ڈسکشن ہمارے درمیان کبھی نہیں ہوئی۔"

"ایک خطرناک سوال سب سے کرتی ہوں کہ اگر آپ کے میاں صاحب کو کوئی اور لڑکی پسند آ گئی تو؟ اور ہمارے مذہب میں اس کی اجازت بھی ہے...."

"دوسری شادی کے لیے موثر کو اجازت ہے، مگر اس کے بعد مجھ سے ملنے کی اجازت نہیں ہوگی۔ اس معاملے میں، میں بھی ایک روایتی بیوی ہوں۔ شراکت تو برداشت ہی نہیں ہے۔"

"لڑائیاں ہوتی ہیں آپ دونوں میں؟ اور گھر کا نظام کس کے ہاتھ میں ہے، آپ کے یا مدثر صاحب کے؟"

"جی لڑائیاں ہوتی ہیں، مگر مجھے یاد نہیں آرہا کہ کوئی بہت بڑی لڑائی ہوئی ہو۔ چھوٹی موٹی ہوتی ہیں اور پھر ہم دس پندرہ منٹ میں ٹھیک بھی ہو جاتے ہیں، زیادہ دیر

خواتین اور دوشیزاؤں کیلئے پی طرز کا پہلا ماہنامہ

خواتین ڈائجسٹ

نومبر 2016ء
کے شمارے کی ایک جھلک
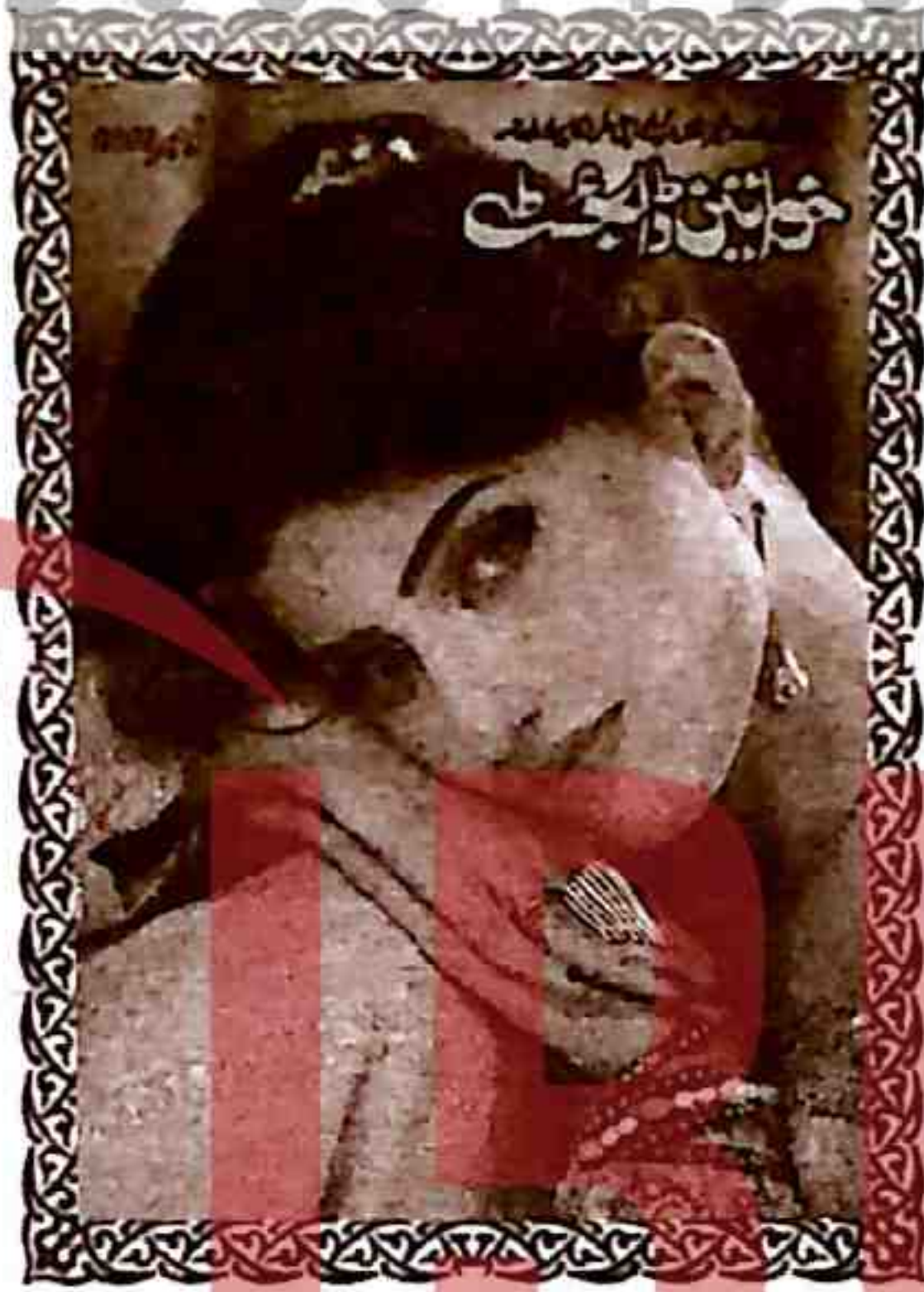
- "آبِ حیات" عمیرہ احمد کا ناول تکمیل کے مراحل میں،
- "نمل" نمرہ احمد کا مکمل ناول،
- "وحشت جنوں" آمنہ ریاض کا ناول،
- "محبت، خواب، جزیرہ" عنیزہ سید کا مکمل ناول،
- "تھینک یو سلجوق" راشدہ رفعت کا مکمل ناول،
- "اچھی بہو" سمیرا عثمان گل کا ناولٹ،
- سائرہ رضا، سمیرا حمید، میمونہ صدف، عاصمہ فرحین، قرۃ العین سکندر اور ہاجرہ ریحان کے افسانے،
- ٹی وی اور فلم کے اداکار "جاوید شیخ" سے ملاقات،
- "علیزے" سے باتیں،
- "حرف سادہ کو عنایت ہوا اعجاز کا رنگ" مصنفین سے سروے،
- "کرن کرن روشنی" احادیث نبوی ﷺ کا سلسلہ،
- نفسیاتی ازدواجی الجھنیں عدنان کے مشورے اور دیگر مستقل سلسلے شامل ہیں،

خواتین ڈائجسٹ کا نومبر 2016 کا شمارہ آج ہی خرید لیں۔

تک ہم ایک دوسرے سے ناراض نہیں رہ سکتے اور اس کی وجہ یہ ہے کہ ہم دونوں میں انڈر اسٹینڈنگ بہت ہے۔ اور میں تھوڑی غصے کی تیز ہوں تو جب مجھے غصہ آرہا ہوتا ہے تو مدثر خاموش ہوجاتا ہے اور جب مدثر کو غصہ آتا ہے تو میں خاموش ہوجاتی ہوں۔ اس طرح بات جلدی ختم ہوجاتی ہے اور گھر کا نظام میرے ہاتھ میں ہے۔ ظاہر ہے کہ میں خاتون خانہ ہوں۔ مجھے پتا ہے کہ کیا چیز ختم ہوگئی ہے۔ کیا چیز لانی ہے۔ البتہ شاپنگ (گھر کی چیزوں کی) ہم دونوں مل کر ہی کرتے ہیں۔ حساب کتاب میرے پاس ہی ہوتا ہے۔ نوکروں سے ڈیلنگ بھی میری ہی ہوتی ہے۔ مگر مدثر کی نالج میں سب باتیں ہوتی ہیں۔ میرے بینک اکاؤنٹ کے بارے میں مدثر کو پتا ہے۔ میرے پاسپورٹ بھی ان ہی کے پاس ہوتے ہیں۔ اللہ کا کرم ہے کہ محبت اور دوستی سے بہت اچھی زندگی گزار رہی ہے۔"

"شادی کے اتنے عرصے کے بعد محبت میں کمی ہوئی ہے یا اضافہ ہوا ہے آپ دونوں میں"

"نہ کمی ہوتی ہے' نہ اضافہ ہوا ہے۔ جس طرح پہلے تھے' اسی طرح اب بھی ہیں۔ ہر چیز میں ہم زیادہ تر ایک دوسرے کے ساتھ ہی ہوتے ہیں۔ شکر ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اس آزمائش میں نہیں ڈالا کہ ہم ایک دوسرے سے وقتی طور پر الگ ہوں تو پتا چلے کہ ہم ایک دوسرے سے محبت کرتے ہیں یا نہیں۔ تو اللہ تعالیٰ ہمیں نظر بد سے بچائے۔ ہم بالکل دوستوں کی طرح بات کرتے ہیں تو میرا بڑا بیٹا بھی بہت حیران ہوتا ہے کہ آپ دونوں ایک ساتھ جاتے ہیں اور ایک ساتھ آتے ہیں اور دوستوں کی طرح رہتے ہیں اور دوستوں کی طرح انجوائے کررہے ہوتے ہیں۔"

"جوائنٹ فیملی بہتر ہوتی ہے یا علیحدہ گھر؟"

"اگر وہ افورڈ کرسکتے ہیں علیحدہ رہنا تو الگ ہی رہنا چاہیے۔ اس میں کوئی حرج نہیں ہے۔ کیونکہ ہر عورت' مرد کا دل چاہتا ہے کہ اس کا اپنا گھر ہو جسے وہ اپنی مرضی سے چلائے۔"

"طلاقیں اور علیحدگی کیوں ہوتی ہیں؟"

"اس کی وجہ شاید یہ ہے کہ جب توقعات بڑھ جاتی ہیں ایک دوسرے سے' تب مسائل جنم لینا شروع ہوجاتے ہیں۔ جب آپ شادی کرتے ہیں تو آپ کو خوبیوں' خامیوں سمیت شادی کرنی پڑتی ہے۔ یا خوبیوں' خامیوں سمیت کرتے ہیں تو پھر اس پر آپ کو کمپرومائز بھی کرنا چاہیے اور لو میرج میں ایسا ہوتا ہے

کہ پہلے کی صورت بعد کی صورت حال سے بہت مختلف ہوتی ہے' تو میں تو یہی کہوں گی کہ توقعات کم کرنی چاہیے اور شادی کو خوابوں کی دنیا نہ سمجھیں' بلکہ پریکٹیکلی سوچیں کہ زندگی کیا ہے اور میاں' بیوی دوست بن کر رہیں تو مسائل کم جنم لیں گے۔"

"بچوں کی تربیت میں کس کا ہاتھ ہے اور ٹائم زیادہ کون دیتا ہے آپ یا مدثر صاحب؟"

"میرے پاس ہفتے میں تین دن ایسے ہوتے ہیں جن میں' میں ریلیکس ہوتی ہوں' تو ان تین دنوں میں' میں بچوں کو بھرپور ٹائم دیتی ہوں۔ مدثر کی ذمہ داریاں آفس میں بہت بڑھ گئی ہیں تو میں زیادہ ان ٹچ رہتی ہوں بچوں کے ساتھ بھی اور دیگر باتوں کے ساتھ بھی.... لیکن جہاں کہیں میں پھنس جاتی ہوں' جیسے میٹنگ میں یا آفس کے کسی اور کام میں تو میں مدثر کو کہتی ہوں کہ آپ کچھ کرلیں یعنی بچوں کو دیکھ لیں۔ ہم بچوں کے ساتھ بہت زیادہ ان ٹچ رہتے ہیں اور میرے بیٹے کی جو ٹیچرز ہیں' وہ کہتی ہیں کہ میں نے ایسے ماں' باپ کہیں نہیں دیکھے جو اتنے مصروف رہنے کے باوجود بچوں کو بھرپور ٹائم بھی دیتے ہیں۔ ہماری زندگی کا محور ہمارے بچے ہی ہیں۔ اس لیے بچوں کی ہر جائز فرمائش کو پورا کرتے ہیں۔ ان کو مووی دکھانے بھی لے جاتے ہیں' انہیں پارک بھی لے جاتے ہیں اور ہفتے میں ایک دوبار بچوں کو باہر مختلف جگہوں پر ضرور لے جاتے ہیں اور الحمدللہ ہم بہت انجوائے کرتے ہیں اور بہ حیثیت ایک ماں کے مجھے زیادہ توجہ دینی پڑتی ہے اور ہر چیز کو دیکھنا پڑتا ہے۔"

"کھانا پکانے اور کھانے کا کتنا شوق ہے؟"

"مجھے کھانا کھانے کا بھی شوق ہے اور پکانے کا بھی.... لیکن اپنی مصروفیات کی وجہ سے کچن کو ٹائم نہیں دے پاتی۔ اس لیے گھر میں کک ہے لیکن جب مجھے وقت ملتا ہے تو میں ضرور کچھ بناتی ہوں اور بہت اچھا بناتی ہوں اور میرے ہاتھ کا پکا ہوا مدثر کو پسند بھی ہے۔"

"کبھی گھر کے کاموں میں ہاتھ بٹایا مدثر صاحب نے؟"

"مدثر بالکل بھی کچن میں نہیں جاتے' انہیں کچن میں جانا پسند ہی نہیں ہے اور نہ ہی انہیں کوئی کام کرنا آتا ہے۔ اس لیے جب کک چلا جاتا ہے یا کوئی مجبوری ہوتی ہے تو پھر میں مدثر سے کہتی ہوں کہ آپ ذرا بچوں پر توجہ دیں' میں ذرا گھر کی نوک پلک سنوار لوں۔"

"اور کچھ کہنا چاہیں گی؟"

"نہیں.... بس سب کچھ تو آپ نے پوچھ لیا۔"

"او کے جی بہت شکریہ آپ نے ٹائم دیا۔"

اس کے ساتھ ہی ہم نے عاصمہ شیرازی صاحبہ سے اجازت چاہی۔

سرورق کی شخصیت

ماڈل ---------- علینہ

میک اپ ---------- روز بیوٹی پارلر

فوٹوگرافی ---------- موسیٰ رضا

دستک دستک دستک

ہمایوں رشید

سائرہ پیٹر (پاکستانی نژاد برطانوی گلوکارہ)

"کیسی ہیں سائرہ....."

"جی اللہ کا شکر ہے۔"

"بہت نام سنا ہے آپ کا.... ہمارے قارئین کو اپنے بارے میں کچھ بتائیں؟"

"جی.... پاکستان میں جنم لیا.... پاکستان کی ہی جامعہ کراچی سے کیمسٹری میں ایم ایس سی کی ڈگری حاصل کی اور ایم اے تاریخ "کوئین میری یونی ورسٹی آف لندن" سے کیا اور میں پاکستان کی واحد "اوپیرا" سنگر ہوں اور میں نے ایشیا کے نامور اساتذہ سے میوزک کی تعلیم حاصل کی۔ میں این جے آرٹس لندن کی ڈائریکٹر بھی ہوں۔ ایسٹرن اور ویسٹرن دونوں طرح کے گانے گاتی ہوں۔ مگر کلاسیکل انداز میری پہچان ہے۔"

"اچھا.... گڈ.... کہاں کہاں اپنے فن کا مظاہرہ کرچکی ہیں اور کن کن زبانوں میں....؟"

"جی میں.... ورلڈوائیڈ نیشنل اور انٹرنیشنل نشریاتی اداروں میں اپنے فن کا مظاہرہ کرچکی ہوں اور جناب! انگریزی' اردو' پنجابی' سرائیکی اور سندھی زبانوں میں گانے کا اعزاز حاصل کرچکی ہوں اور آپ کو بتاؤں کہ سندھ کے سب سے بڑے اور واحد ریئلٹی شو وائس آف سندھ کی چیف جج ہونے کا اعزاز بھی حاصل ہے اور نہ صرف پاکستان میں بلکہ.... امریکہ' برطانیہ' انڈیا اور یورپ کے دیگر ممالک میں بھی اپنے فن کا مظاہرہ کرچکی ہوں۔"

"آپ صوفیانہ کلام گاتی ہیں تو کیا آپ کو بچپن سے ہی شوق تھا صوفیانہ کلام گانے کا؟"

"بچپن سے گانے کا شوق تو تھا' مگر صوفیانہ کلام کا نہیں۔ کیونکہ چھوٹی عمر میں صوفیانہ شاعری کو سمجھنا بہت مشکل ہوتا ہے۔ بس گانے کے شوق میں' میں نے میوزک کی باقاعدہ تعلیم حاصل کی.... صوفیانہ کلام کی طرف تب راغب ہوئی جب میں نے صوفیا اکرام کو باقاعدہ پڑھا.... پھر میں نے دیکھا کہ دوسرے ممالک میں پاکستان کے خلاف منفی پروپیگنڈہ ہورہا ہے۔

پاکستان کو بدنام کرنے کی کوشش کی جارہی ہے۔ تب مجھے خیال آیا کہ ہمارے صوفیا کرام نے بھائی چارے اور محبت کا جو درس لوگوں کو دیا ہے کیوں نہ میوزک کے ذریعے اسے عام کیا جائے.... تاکہ لوگوں کے دلوں سے پاکستان کے لیے جو غلط فہمیاں ہیں دور ہوسکیں۔ چنانچہ میں نے صوفیا کرام کی شاعری کو انگریزی میں گاکر بھائی چارے' محبت اور حق و صداقت کا درس دیا اور میں یہ درس ہمیشہ دیتی رہوں گی اور یہ ثابت کرکے

رہوں گی کہ ہم پاکستانی ایک پرامن قوم ہیں۔"

"واہ۔۔۔ آپ کے ارادے تو بہت نیک ہیں۔ اللہ تعالیٰ آپ کو کامیاب کرے۔ جو کلام آپ نے گایا اسے "البم" کی شکل بھی دی؟"

"جی میرا پہلا البم جو کہ تیاری کے آخری مراحل میں ہے اس میں شاہ عبداللطیف کی خوب صورت شاعری شامل ہے اور اس البم کا نام "مورے من میں شاہ" ہوگا۔ میں نے "شاہ" کا کلام "سندھی" "اردو" اور "انگریزی" میں گایا ہے اور اس البم کی تمام تر تیاری "لندن" میں کی گئی ہے اور میوزک کی تمام تر تیاری "توفیق احمد" نے کی ہے جن کا تعلق معروف طبلہ نواز استاد ذاکر کے گھرانے سے ہے۔ میرا دوسرا البم "ملھے شاہ" کی شاعری پر مشتمل ہے اور تیسرا البم "سائرہ" کے نام سے ہے اور یہ تینوں ورلڈ وائیڈ ریلیز ہوں گی۔"

"کیا موسیقی کا سیکھنا بہت ضروری ہوتا ہے؟"

"جی۔۔۔ بہت ضروری ہے۔۔۔ سنگیت کا علم سیکھنا اور پڑھنا بہت ضروری ہے۔ ہر شعبے کا شارٹ کٹ ہو سکتا ہے، مگر میوزک کا کوئی شارٹ کٹ نہیں ہے۔ موسیقی کے ذریعے معاشرے کی اصلاح اور خدمت کی جاسکتی ہے اور اس کے لیے جذبہ اور جنون کا ہونا بہت ضروری ہے اور میں صوفیا کرام کا کلام لے کر پوری دنیا میں ان کا پیغام پہنچانا چاہتی ہوں۔۔۔ میں اوپیرا سنگر ہوں اور مجھے یاد ہے کہ جب میں نے شاہ کا کلام اوپیرا (انگریزی) میں گایا تو لوگوں نے بہت پسند کیا۔ خاص طور پر لندن کے سٹی ہال میں برطانیہ کے مایہ ناز سنگر "بائیکل راوز" کے ساتھ پرفارم کیا تو لوگوں کی تالیوں نے ثابت کردیا کہ صوفیانہ کلام میں سکون بھی ہے اور طاقت بھی ہے۔۔۔ صوفی سنگیت کو عام کرنا میرا خواب ہے۔"

"اپنے ملک پاکستان کی موسیقی کے بارے میں کیا کہیں گی آپ؟"

"پاکستانی میوزک بہت اچھا ہے اور اسے مزید اچھا کیا جاسکتا ہے۔ پاکستان کا ماضی کا میوزک بے مثال تھا۔ مگر اب میں سمجھتی ہوں کہ میوزک کا برا حال ہے اور میوزک کو اچھا کرنے کے لیے اس میں تعلیم و تربیت حاصل کرنا بہت ضروری ہے۔ میوزک کو سننا اور سمجھنا ایک فن ہے۔"

"ایوارڈ بھی ملے آپ کو۔۔۔"

"جی۔۔۔ سندھ ایکسیلنس ایوارڈ حاصل کیا 2013ء میں بہترین سنگر کا، ینگ رائٹرز ایسوسی ایشن کی طرف سے میوزک کا خصوصی ایوارڈ بھی حاصل کیا اور دیگر اعزازات سے بھی نوازی جاچکی ہوں۔"

✡ ✡ ✡

عائشہ خان (جونیئر)

"کیا حال ہے؟"

"اللہ کا شکر ہے۔"

"جیناں کے حصار سے نکلیں کہ نہیں؟"

"میں نے کیا نکلنا ہے۔ لوگ ہی نہیں نکل رہے۔ بس کوئی کردار مقبول ہوجائے، لوگ اس کو لے کر بیٹھے رہتے ہیں۔"

"یہی تو فنکار کی مقبولیت ہے۔"

"ہاں ہے مگر اس کردار سے سب کو نفرت تھی اور لوگ اس کردار کے حوالے سے بات بھی کرتے ہیں۔"

"آپ . نے صلاح الدین کے ساتھ برا بھی تو بہت کیا!"

قہقہہ... "آپ بھی..."

"ویسے بات کر رہی ہوں... ہمارے لوگ... ڈراموں کا بہت اثر لیتے ہیں۔ ڈرامے میں کوئی مظلوم رو رہا ہے تو ہمارے دیکھنے والے بھی روئیں گے۔ کوئی نگیٹیو رول کر رہا ہے تو لوگ اس سے نفرت کریں گے۔"

"بالکل ٹھیک کہہ رہی ہیں آپ... آج کل لوگ بڑی نفرت کا اظہار کرتے ہیں۔ سوشل میڈیا پر لوگ کچھ نہ کچھ لکھ دیتے ہیں... لیکن خیر میں کوئی اصل والی "جینا" تو ہوں نہیں... کچھ عرصے میں لوگ اس کردار کو بھول جائیں گے۔"

"پہلی بار شاید آپ نے نیگٹیو کردار کیا ہے... اس کی کیا وجہ ہے؟"

"میں نے یہ کردار اپنی دوست ثناء شاہ نواز کے اصرار پر قبول کیا' جو مومنہ درید کے ساتھ اس سیریل کی پروڈیوسر ہیں۔ میں نے یہ کردار اپنے شوق سے کیا' کیونکہ میں رونے دھونے والے کافی کردار کر چکی تھی... اور اس کردار میں مجھے کافی جان نظر آئی... سو میں نے کرلیا۔ ویسے مجھے خوشی ہے کہ میرا یہ کردار پاپولر ہوا اور ایک نئے انداز میں ناظرین نے مجھے دیکھا۔"

"اور کیا ہو رہا ہے آج کل؟"

"بس کچھ خاص نہیں' جو اپنا کام ہے کر رہی ہوں۔ ان شاء اللہ بہت جلد آپ مجھے نئے پروجیکٹ میں دیکھیں گی۔"

"اب زیادہ تر کردار کس نوعیت کے ہوں گے۔ نیگٹیو یا پوزیٹو..."

"پوزیٹو ہی ہوں گے' مگر اچھا نیگٹیو رول ملا' تب بھی انکار نہیں کروں گی... کیونکہ میں نے نیگٹیو

رول کر کے دیکھا ہے کہ پوزیٹو سے زیادہ نیگیٹو رول زیادہ مقبول ہوتے ہیں۔"

"ہاں۔۔۔ یہ تو ہے۔۔۔ ویسے ہمارے پوزیٹو رول اب کچھ زیادہ ہی رونے دھونے والے نہیں ہو گئے؟"

"جی۔۔۔ میں بھی یہی کہنا چاہ رہی ہوں کہ اب رونے دھونے والے کردار بہت ہو گئے۔ میں اب ان کرداروں سے باہر آنا چاہتی ہوں اور یہی وجہ ہے کہ میں نے نیگیٹو رول کو قبول کر لیا۔"

"فلموں کی طرف کیا پیش رفت ہے؟"

"بات چیت چل رہی ہے۔ دیکھیں کیا ہوتا ہے۔ "وار" اور "میں ہوں شاہد آفریدی" کی کامیابی کے بعد پرامید ہوں کہ اچھے ہی رول ملیں گے مجھے۔"

"اوکے عائشہ! ان شاءاللہ پھر بات کریں گے۔"

✡ ✡ ✡

نوین وقار

"کیسی ہیں؟ اور "سایہ دیوار بھی نہیں" کا کیا رسپانس مل رہا ہے؟"

"جی۔۔۔ بہت اچھا۔۔۔ لوگ بہت پسند کر رہے ہیں۔"

"اور آپ۔۔۔؟"

"اور میں بھی۔۔۔ کیونکہ مجھے اس سیریل میں کافی نامور لوگوں کے ساتھ کام کرنے کا موقع مل رہا ہے اور بہت کچھ سیکھنے کو بھی ملا۔ کہانی بہت اچھی تھی۔ ہر لحاظ سے سیریل اچھا رہا۔"

"وہی مظلوم عورت، ظلم سہتی عورت۔۔۔ کچھ چینج ہونا چاہیے؟"

"بالکل ہونا چاہیے۔۔۔ کیونکہ عورت جتنی "مظلوم" اور "بے چاری" دکھائی جا رہی ہے، اتنی ہے نہیں۔۔۔ آج کی عورت بہت اسٹرونگ ہے۔ وہ اکیلی گھر سے نکلتی ہے۔ جاب کرتی ہے، کماتی ہے۔۔۔ بچے پالتی ہے اور کفالت بھی کرتی ہے۔۔۔ تو ایسی عورت کے بارے میں ڈرامے ہونے چاہئیں۔ تاکہ وہ خواتین جو

برے حالات میں مایوس ہو جاتی ہیں ان میں کچھ ہمت آجائے۔"

"اب ڈائریکٹرز اور پروڈیوسر کو یکسانیت سے نکلنا ہوگا۔"

"بالکل جی۔۔۔ زندگی صرف چند واقعات کے گرد ہی نہیں گھومتی' زندگی کا کینوس بہت وسیع ہے۔ بس نظر دوڑانے کی ضرورت ہے۔"

"اور انڈر پروڈکشن کیا ہے؟"

"انڈر پروڈکشن "کچھ نہ کہو" اور یہ بھی بہت اچھا سیریل ثابت ہوگا۔ اس میں بھی میرے ساتھ عماد عرفانی' عابد علی صاحب' ہما نواب صاحبہ اور علی سفینہ ہوں گے۔ "سایہ دیوار بھی نہیں" میں بھی عماد عرفانی تھے اور ان کے اور احسن خان کے ساتھ اچھی کیمسٹری رہی میری۔"

"آپ نے کامیڈی پلے بھی کیے ہیں۔۔۔ یہ تجربہ کیسا رہا؟"

"بہت اچھا تجربہ رہا۔۔۔ بہت مزا آتا ہے کامیڈی کرنے کو اور ہماری وجہ سے لوگوں کے لبوں پر مسکراہٹ آجاتی ہے تو اور بھی زیادہ خوشی ہوتی ہے۔ ویسے کامیڈی کرنا تھوڑا مشکل کام ہے۔ بہ نسبت سنجیدہ اور نگیٹیو رول کے۔"

"ہر وقت اسکرین پہ نہ رہنے کی کیا وجہ ہے؟"

"میں ہر وقت اسکرین پہ رہ کر اپنے آپ کو فارغ اداکارہ نہیں کہلوانا چاہتی۔ ویسے بھی میں کردار بہت سوچ سمجھ کر لیتی ہوں۔ بہت سلیکٹیو قسم کی فن کارہ ہوں۔ میں نہیں چاہتی کہ بیک وقت میرے کئی ڈرامے آن ایئر آرہے ہوں۔۔۔ میں نے اب تک جتنا کام کیا لوگوں کو یاد ہے' اس لیے میں اتنا ہی کام کرتی ہوں کہ لوگوں کو یاد رہ جائے۔۔۔ آپ یقین کریں۔۔۔ بہت آفرز آتی ہیں۔۔۔ مگر سب کردار کرنے کے قابل نہیں ہوتے۔۔۔ کیونکہ عموماً" کردار ایک جیسے ہوتے ہیں۔"

"تو پھر۔۔۔ ان شاء اللہ اب آپ کا جب نیا سیریل آئے گا تو پھر بات کریں گے۔"

"جی۔۔۔ ضرور۔۔۔"

عفت سحر طاہر

خواب عشق سلگتا

تیز برستی بارش اور سماعتوں میں کسی کے تیز چبھتے جملے یہ خواب اس کی زندگی کا سب سے ڈراؤنا خواب تھا جو اسے یہ یاد دلاتا تھا کہ اس نے کبھی سے ان سب کی بربادی کا وعدہ کیا تھا۔

آفندی ہاؤس میں اصول پسند آغاجان اپنے دو بیٹوں مبین آفندی اور سہیل آفندی ان کی بیویوں اور بیٹیوں کے ساتھ رہتے ہیں۔ انہیں اپنا پوتا نہ ہونے کا بہت دکھ ہے پوتیاں ان کی اس بات سے بہت چڑتی ہیں۔

وقار آفندی کو ایک گانے والی زرنگار سے محبت ہوجاتی ہے۔ وقار آفندی زرنگار کو نکاح کی آفر دیتا ہے تو وہ غائب ہوجاتی ہے۔

طلال اور مہرماہ یونی ورسٹی میں ایک ساتھ پڑھتے ہیں اور ایک دوسرے سے محبت کرتے ہیں۔ طلال کے گھر والے مہرماہ کا رشتہ لے کر آتے ہیں جو قبول کرلیا جاتا ہے۔

مبین آفندی، آغاجان سے بات کرتے ہیں کہ فاران آفندی کو معاف کردیا جائے اور اسے اس کے بیٹے اور بیوی کے ساتھ آفندی ہاؤس بلالیا جائے۔ فاران آفندی کو چھوٹے بھائی وقار آفندی کی حمایت اور آغاجان کی مخالفت کی وجہ سے گھر بدر کردیا گیا تھا۔ پوتے کی خاطر آغاجان مان جاتے ہیں، تائی جان، مبین آفندی کی بیوی اس بات پر بہت ناراض ہوتی ہیں۔ فاران آفندی پاکستان جانے کا فیصلہ کرلیتے ہیں، ان کی بیوی ثمرہ اور بیٹا موحد بہت ناراض ہوتے ہیں۔

وقار آفندی آخر کار زرنگار کو تلاش کرلیتا ہے۔ اور اسے یقین دلاتا ہے کہ وہ اسے باعزت طریقے سے اپنے نکاح میں لینا چاہتا ہے اور اپنے خاندان میں متعارف کرائے گا۔

آٹھویں قسط
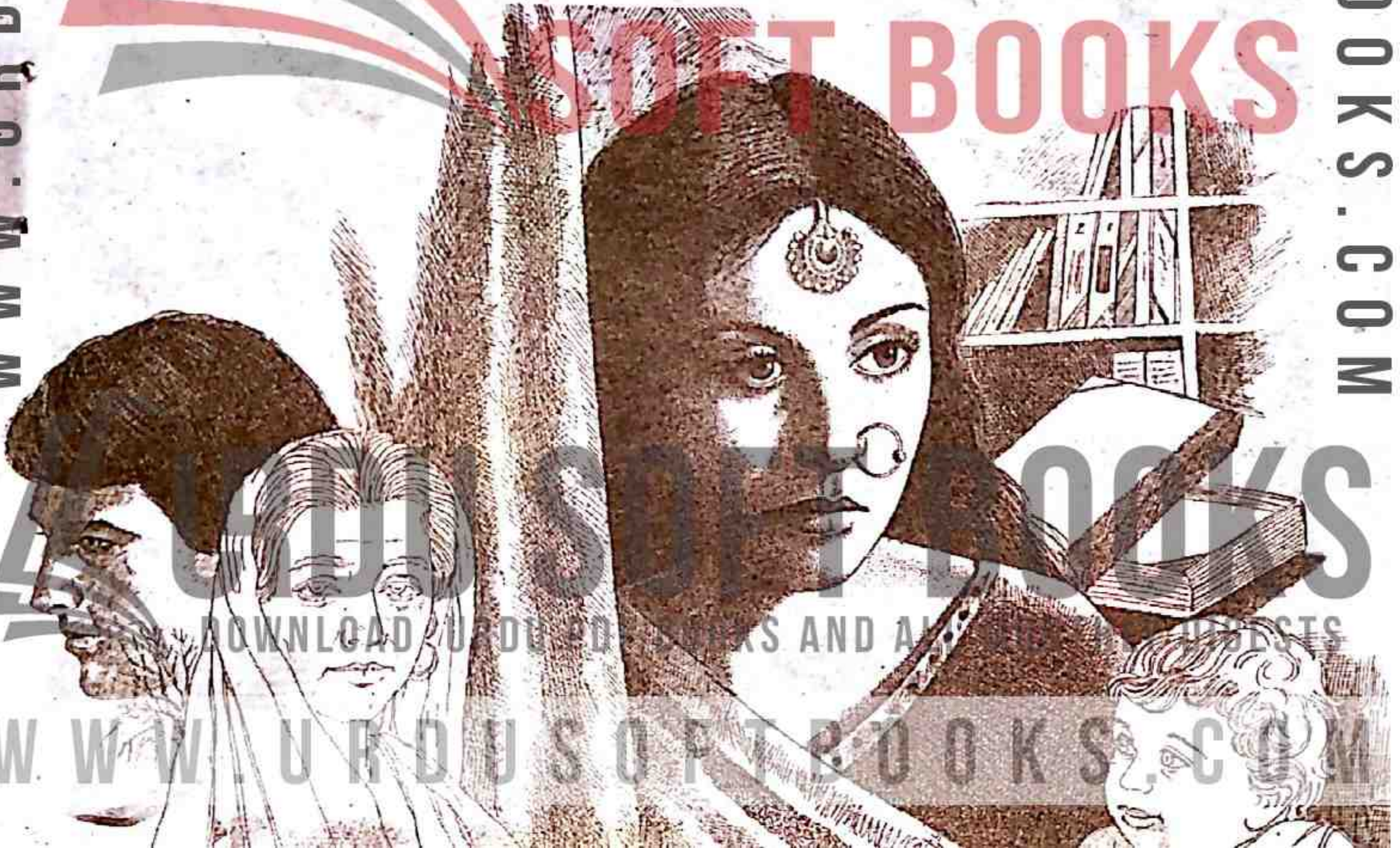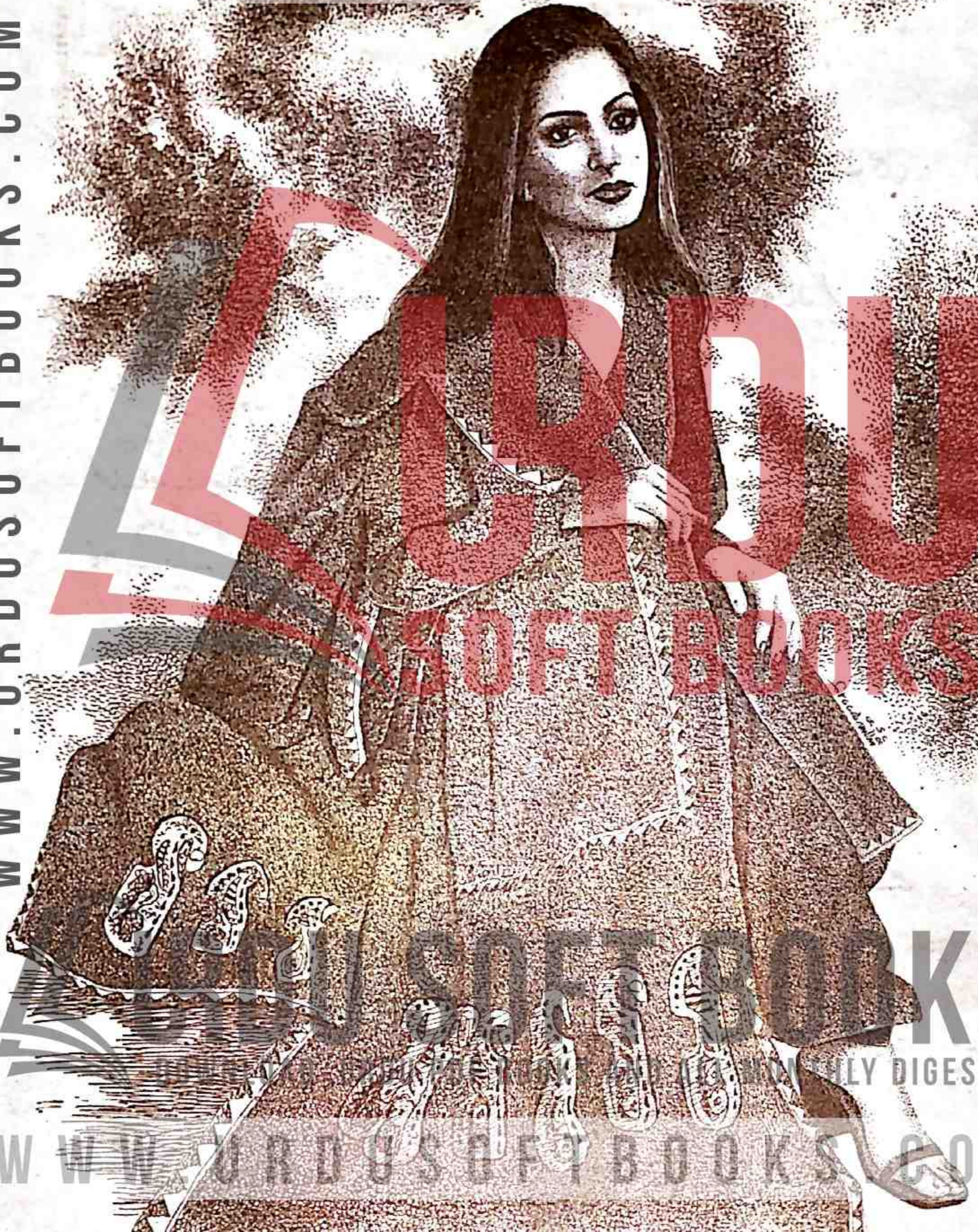
جہاں مہرماہ کا رویہ طلال کے لیے امتحان بن گیا تھا وہیں مہماہ کو بھی طلال کی تنگ نظر نیت نے آزردہ کیا۔
"یا شاید میں ہی غلط ہوں۔۔۔" وہ نروس سی داہنے ہاتھ کی چھنگلی کا ناخن دانتوں سے چباتی، بے ساختہ تکیے کے پاس پڑے آئی فون کو دیکھنے لگی۔
"مجھے موحد کو انکار کر دینا چاہیے تھا یہ فون لینے سے۔ کیا کرتا زیادہ سے زیادہ ناراض ہی ہو جاتا۔۔۔ تو پہلے کون سا بڑی دوستی نبھا رہے ہیں ہم دونوں۔" وہ مضطرب تھی۔
موحد سے گھریلو سطح پر تعلقات صحیح کرتے کرتے وہ اپنا مستقبل کا رشتہ خراب کر رہی تھی اور اس کی چھٹی حس اسے خبردار کر رہی تھی کہ اسے موحد سے دور ہی رہنا چاہیے۔

☆ ☆ ☆

کبیر اسٹڈی روم میں داخل ہوا تو آغا جان نے کتاب بند کر کے رکھ دی۔ ان کے لبوں پر ہلکی سی مسکراہٹ پھیل گئی۔ کبیر نے آگے بڑھ کر احتراماً ان کے گھٹنوں کو چھوا۔
"السلام علیکم آغا جان۔۔۔ کیسے ہیں آپ؟"
"ہم۔۔۔ ہم تو ٹھیک ہیں۔۔۔ بیٹھو۔" مسکراتے ہوئے کھنکھار کر انہوں نے سامنے رکھی کرسی کی طرف اشارہ کیا۔
"تم سناؤ۔۔۔ کیا حال چال ہے؟" اس کے بیٹھنے کے بعد وہ پوچھ رہے تھے۔
"گاؤں میں سب لوگ کیسے ہیں۔ پشاور کیسا ہے؟"
کبیر کی سنجیدگی اور بڑھی۔ تھوڑا سا آگے جھک کر کہنیاں گھٹنوں پر ٹکائے وہ دونوں ہاتھوں کی انگلیوں کو باہم الجھائے ہوئے بیٹھا تھا۔
"پشاور بھی وہی ہے آغا جان اور گاؤں کے لوگ بھی ویسے ہی ہیں۔ اگر کچھ بدلا ہے تو وہ کبیر ہے آغا جان۔ گاؤں کے سارے گھر ہنسی سے گونجتے ہیں، مگر میرے گھر میں میری بہنوں کے آنسو ہیں اور مرنے والی ماں کے لیے کراہٹیں۔" اس کا لب و لہجہ بے حد آزردہ اور دکھ سے بوجھل تھا۔
آغا جان کے چہرے پر بھی سنجیدگی در آئی۔
"مشیت ایزدی کو سمجھو کبیر۔ جلدی صبر آئے گا۔"
"میں تو صبر کر گیا ہوں آغا جان، مگر سونا آنگن دیکھنے کی تاب نہیں ہے مجھ میں اور نہ بہنوں کے آنسو دیکھنے کی۔" اس کی آنکھیں شدت ضبط سے لال ہو رہی تھیں۔
وہ ماں کا اکلوتا لاڈلا، نازوں پلا بیٹا تھا۔ آغا جان نے آگے بڑھ کر اس کے شانے کو تسلی آمیز انداز میں تھپکا تو وہ سیدھا ہو بیٹھا۔
"فاران صاحب کا بہت افسوس ہوا آغا جان۔۔۔ مگر میں آ نہیں سکا۔ بہت شرمندگی ہے مجھے۔" اس کے کندھے پر دھرا آغا جان کا ہاتھ لرزا۔
"میں جانتا ہوں۔ تم خود غم میں گھرے ہوئے تھے۔" انہوں نے اسے اس تاسف سے نکالنا چاہا۔
سہیل آفندی نے کبیر کو اطلاع تو کر دی تھی، مگر وہ خود اپنی ماں کے مرنے کی خبر سن کر پشاور گیا تھا۔ کیسے آتا۔
"مگر ایک خوشی کی خبر بھی ہے کبیر۔" وہ اس کے مقابل اپنی آرم چیئر پر بیٹھتے ہوئے خود کو گویا آزردگی سے نکالنے کی خاطر ذرا سا مسکرائے۔
"جی آغا جان۔۔۔" وہ مؤدب سا ہمہ تن گوش ہوا۔

"فاران کا بیٹا۔ میری اس ساری جاگیر کا وارث۔۔۔ میرا پوتا آگیا ہے میرے پاس۔" وہ خوش تھے۔ بے حد خوش۔ کبیر کو ان کی آواز اور ان کے تاثرات ہی سے اندازہ ہو گیا۔
"موحد۔۔۔ تم ملو گے اس سے تو دل خوش ہو جائے گا تمہارا۔" وہ مزید بولے۔
کبیر مسکرایا تھا۔ "بالکل آغا جان۔۔۔" (مل لیں گے موحد آفندی سے بھی۔)
آغا جان اس سے پشاور میں موجود اپنی زمینوں کا حساب کتاب معلوم کرنے لگے۔

☼ ☼ ☼

وہ دروازہ کھٹکھٹا کر موحد کے کمرے میں داخل ہوئی۔
اپنی "کم ان" کے جواب میں وہ مہراہ کی توقع نہیں رکھتا تھا۔ تب ہی الماری کا دروازہ بند کرتا اس کی طرف آیا تو چہرے پر گرم جوشی کا سا تاثر تھا۔
"ویلکم۔۔۔ ویلکم۔۔۔" اسے موحد کی طرف سے ایسے استقبال کی توقع نہیں تھی۔ وہ ذرا سا گڑبڑائی۔
"وہ۔۔۔ میں یہ واپس کرنے آئی تھی۔" وہ دروازہ بند کر کے چند قدم ہی آگے آئی تھی بس۔ ہاتھ میں تھاما موبائل آگے کر دیا۔
"اوہ۔۔۔ ناٹ اگین۔" گہری سانس بھرتا ہوا ایڑیوں پر گھوم کر پلٹ گیا۔
"موحد پلیز۔ یہ بلاوجہ کا گفٹ میرے گلے پڑ رہا ہے۔" مہراہ نے قطعی انداز میں کہا تو وہ حیرت زدہ سا دوبارہ اس کی طرف مڑا۔
"کیا مطلب۔۔۔؟ میں نے کوئی چوری یا ڈاکے کا موبائل تو گفٹ نہیں کیا محترمہ۔" بھنویں اچکا کر تیکھے لہجے میں کہا تو مہراہ کلسی۔
"یہ میں نے کب کہا؟"
"تو پھر صاف اور سیدھی بات بتاؤ۔ ایک ہفتے کے بعد کیسے تمہارے گلے پڑنے لگا یہ موبائل۔" موحد کا انداز چبھتا ہوا تھا۔ نرمی تو محض دوستی میں جھلکتی تھی اس کی۔ ورنہ تو نرا سڑا ہوا تربوز تھا (مہراہ نے دل میں لقب دیا)۔
"صاف اور سیدھی بات یہ ہے کہ" وہ کہتے ہوئے ذرا رکی زبان لڑکھڑا سی گئی۔
"طلال کو یہ بات پسند نہیں کہ میں تم سے گفٹ لوں۔" موحد نے جبڑے بھینچے پھر اسے گھورتے ہوئے بولا۔
"اور تمہیں۔۔۔؟ تم نے تو رکھ لیا تھا نا۔"
"ہاں۔۔۔ مگر تم نے زبردستی دیا تھا، تم اسے پھینکنے والے تھے۔" مہراہ نے اپنی صفائی پیش کی۔
"اب اگر تم واپس کرو گی تو میں پھر پھینکوں گا اسے۔۔۔ پھر تم لے لو گی نا؟" وہ بے ساختہ مسکرا دیا۔
"جی نہیں۔۔۔" وہ نروٹھے انداز میں بولی۔ (مذاق اڑا رہا ہے بد تمیز)
"اب تم اسے پھینکو یا توڑ کر اچار ڈال لو۔ مجھے کوئی انٹرسٹ نہیں۔ اس کی وجہ سے طلال اور میرے بیچ مس انڈر اسٹینڈنگ ہو رہی ہے۔" مہراہ نے قطعیت سے کہتے ہوئے موبائل اس کے بستر پر تقریباً "اچھال دیا۔
"اور تم۔۔۔ تمہاری اپنی کوئی چوائس نہیں اپنی زندگی کے بارے میں؟" موحد نے حیرت سے پوچھا۔
"طلال میری اپنی چوائس ہے۔" وہ فخر سے بولی۔
"استغفار۔۔۔" وہ بڑبڑایا مگر مہراہ کے کان تیز تھے۔ سن لیا۔ ناگواری سے موحد کو دیکھا تو وہ جلدی سے بولا۔
"تو کیا غلط کہہ رہا ہوں۔ اسے حق نہیں پہنچتا کہ اس گھر میں تمہارے معاملات میں دخل اندازی کرے۔ ہاں، شادی کے بعد تم پابند ہو اس کی بات ماننے کی۔"

"وہ فیانسی ہے میرا۔" مہراہ نے جتایا۔
"تو کہاں لکھا ہے کہ فیانسی کی بات ماننا فرض ہے؟ یا فیانسی کے حقوق پر کوئی کتاب طلال صاحب کی اپنی ہی لکھی ہوئی ہے؟" وہ تیکھے لہجے میں پوچھ رہا تھا۔
"وہ تمہارا دردِ سر نہیں ہے موحد، مگر بہرحال... تھینکس فار دی گفٹ، لیکن میں اسے نہیں رکھ سکتی۔" وہ اب کی بار قدرے رکھائی سے کہہ کر رکی نہیں۔ پلٹ کر دروازہ کھولا اور باہر نکل گئی۔
"الو کا..."
موحد نے دانت پیستے ہوئے طلال کو شاندار خراجِ تحسین پیش کیا اور بے زار نظروں سے بستر پر پڑے منہ چڑاتے آئی فون سکس کو دیکھنے لگا۔

☆ ☆ ☆

وہ آغا جان سے ملاقات کے بعد باہر نکلا تو کوریڈور خالی تھا۔ وہ ناک کی سیدھ میں نکلتا چلا گیا۔
"ہم... شش..." وہ داخلی دروازہ کھول کر باہر نکلا ہی تھا جب سرگوشی کی تیز آواز نے اسے بے ساختہ رکنے بلکہ مڑ کے دیکھنے پر مجبور کردیا۔
گلابی آنچل کو سر پر ٹکاتی... سانسیں ہموار کرتی وہ بھاگتے قدموں سے دروازے تک آئی تھی۔ کبیر نے احتراماً نظر جھکالی۔
"تم آگئے...؟" (بے وقوفانہ سوال...) پتا نہیں اشتیاق زیادہ تھا سوال میں یا جوش۔ کبیر نے ادب سے جواب دیا۔
"جی بی بی..."
"کیسے ہو...؟" ادھ کھلے دروازے سے وہ اس کا پژمردہ چہرہ دیکھ سکتی تھی۔ مسکراتا تو وہ پہلے بھی کم ہی تھا، مگر ماں کے غم نے اسے کمزور کردیا تھا۔ یہ ملاحہ کا خیال تھا۔
"ٹھیک ہوں۔"
"اور... تمہاری بہنیں؟"
"وہ بھی ٹھیک ہیں۔"
"اور..." اگلا سوال نہ سوجھنے پر وہ گڑبڑا سی گئی۔
"اور... گاؤں میں خیریت تھی نا؟"
"پورا پشاور ٹھیک ہے بی بی... اب میں جاؤں؟" بڑا ہی مؤدب اور نرم لہجہ... انتہا پر تحمل طنز، ملاحہ نے اسے گھور کے دیکھا۔ پھر دانت پیس کر بولی۔
"جاؤ... اور جو ملیں تمہاری غیر موجودگی میں بند ہو گئی تھیں، انہیں چلاؤ جا کر۔" وہ زور سے دروازہ بند کرتی چلی گئی۔
کبیر سر جھٹک کر سیڑھیاں اترتا پورچ کی طرف بڑھ گیا۔

☆ ☆ ☆

ثمرہ گہری سوچ کا شکار تھیں۔ موحد کا ایک دم سے بدلتا رویہ اور خصوصاً مہراہ کی طرف جھکاؤ... وہ عدم تحفظ کا شکار ہونے لگیں۔
(تو کیا آفندی ہاؤس والے ایک بار پھر مجھ سے میرا بیٹا...!!) انہوں نے اپنی بے ساختہ سوچ پر جھرجھری سی لے کر

نفی میں سر ہلایا۔

نہیں۔۔۔ وہ میرا بیٹا ہے۔ میرا موحد فاران آفندی۔ وہ مہرماہ کی ماں کی اصلیت اچھی طرح جانتا ہے۔ کس طرح اس بدزبان اور کینہ پرور عورت نے وقار کے ساتھ ہمیں بھی دربدر کرلیا تھا۔ اچھا ہوا میں نے وقت پر ہی سومیہ کا نام اس کے سامنے رکھ دیا۔

انہیں سومیہ کے بارے میں سوچ کر کچھ تسلی ہوئی۔ آخر کو وہ بھی موحد کے بچپن کی دوست تھی۔ میں بار بار اس کے سامنے سومیہ کا تذکرہ کروں گی تو وہ بھی مان ہی جائے گا۔ اب کی بار یہ سوچ انہیں اطمینان دے گئی تھی۔

✡ ✡ ✡

"طلال! میں تم سے ملنا چاہتی ہوں۔" اس نے طلال کے خشک سلام و دعا کے بعد سیدھے سبھاؤ کہا۔ تو وہ طنزیہ گویا ہوا۔

"اجازت دے دی تمہارے عزت مآب آغا جان نے۔۔۔؟"

"طلال پلیز۔!" وہ ضبط کرتے ہوئے اسے ٹوک گئی۔

"میں بات کو سلجھانا چاہتی ہوں اور الجھنیں تب ہی ختم ہوں گی جب تم ملو گے۔"

"ہم۔۔۔" اس نے ہنکارا بھرا۔ "سی 'باڈی گارڈ' کزن کے ساتھ آؤ گی یقیناً۔" پھر تلخی۔۔۔ مہرماہ کراہ کر رہ گئی۔

"کبیر آگیا ہے گاؤں سے۔ اسے کہوں گی وہ ڈراپ کردے گا پبلک لائبریری تک۔ تم پانچ بجے تک پہنچ جانا۔" اس نے بڑے تحمل سے کہا۔ جواباً وہ گہری سانس بھرتے ہوئے قدرے روکھے انداز میں بولا۔

"اوکے۔۔۔" اور یہ ان دونوں کے مابین ہونے والی دوسری ٹیلیفونک گفتگو تھی جو اس قدر تلخ اور سرد تھی۔ مہرماہ کا دل وحشت کا شکار ہونے لگا۔

✡ ✡ ✡

آغا جان نے موحد کا تعارف کبیر سے کرایا تو اس نے گہری نگاہ اس ڈیسنٹ سے بندے پر ڈالتے ہوئے ہاتھ اس کی طرف بڑھا دیا۔ ہلکی سی مسکراہٹ کے ساتھ اس کا ہاتھ تھامنے والے کبیر کے ہاتھ میں بھی جوشیلی سی گرماہٹ تھی۔

"اور یہ کبیر ہے، موحد۔ میرے بہت اچھے دوست کا پوتا۔ دوست تو نہیں رہا، مگر اس کا پوتا ہمارا دست راست بن گیا۔"

آغا جان نے اب کی بار اپنے مخصوص انداز میں کبیر کا تعارف کرانا شروع کیا۔ تو وہ ہمیشہ کی طرح بے چینی سی محسوس کرنے لگا۔ بہ مشکل ہونٹوں پر مسکراہٹ لاکر آغا جان کو دیکھا۔

موحد کی زیرک نگاہ نے اس کی مسکراہٹ کے مصنوعی پن کو سرعت سے محسوس کیا تھا۔

"حالات اور گردش زمانہ نے میرے دوست کو بہت برے دن دکھائے تو میں نے اس کا ہاتھ تھاما۔ اسے اپنی زمینوں کی نگرانی سونپی اور اسے اس کے قدموں پر کھڑا ہونے کا موقع دیا۔" وہ اپنی مونچھوں کو تاؤ دیتے تفاخر سے بتا رہے تھے۔

کبیر مؤدبانہ کھڑا تھا۔ نظر جیسے زمین میں گڑی جاتی تھی۔

"پھر اس کا باپ بھی ہماری زمینوں پر کھیتی باڑی کرتا رہا اور اب یہ تیسری نسل چل رہی ہے ہمارے وفاداروں کی۔" دوستی سے وہ ایک دم کہانی کو غلامی تک لے آئے تھے۔ موحد کو عجیب سا احساس ہوا۔

"بہت خوشی ہوئی تم سے مل کر کبیر خان زادہ۔ سب سے بڑی تعریف سنی تھی تمہاری اور مجھے خوشی ہے کہ تم ہمارے خاندانی دوستوں میں سے ہو۔"
اس نے ایک بار پھر گرم جوشی سے کبیر سے ہاتھ ملایا تو اس کے لبوں پر ـــــ ہلکی سی مسکراہٹ پھیل گئی۔
آغا جان مسکراتے ہوئے اندر چلے گئے تھے۔
"مجھے بھی آپ سے مل کر بہت خوشی ہوئی۔ اگر میں بچپن میں یہاں آتا تو آپ سے اچھی دوستی ہوتی۔"
"اچھا۔ ہاں۔ کتنے سال ہوگئے تمہیں یہاں آئے؟" موحد نے دلچسپی سے پوچھا۔
"میٹرک کے بعد آیا تھا۔ دس سال ہونے کو ہیں۔"
"ہم ـــ آغا جان نے تمہاری مدر کی ڈیتھ کا بتایا تھا۔ بہت افسوس ہوا سن کر۔" موحد کو دھیان آیا۔
کبیر کی آنکھوں میں آزردگی کی دھند چھانے لگی۔
"ہنہ ـــ" وہ جیسے خود پر ہنسا۔ "لڑکوں کا ڈائیلاگ ہوتا ہے ماؤں کے مرنے پر ـــ مگر میں بھی یہی کہتا ہوں موحد! میرا بھی میکہ ختم ہوگیا۔ ماں کیا مری۔ گھر سنسان بیابان لگنے لگا۔"
"اور تمہارے بہن بھائی ـــ؟"
"تین بہنیں بڑی ہیں۔ شادی شدہ اپنے گھر بار والی۔" وہ بتا رہا تھا۔
"اوہ ـــ" موحد کو افسوس ہوا۔ اب تو وہ صحیح معنوں میں یہاں غلامی میں آ گیا تھا۔
"کبیر ـــ" مترنم نسوانی آواز نے پکارا تو کبیر ہی نہیں پورے کا پورا موحد آفندی بھی گھوم گیا۔
"جی بی بی ـــ" مؤدب لہجہ ـــ جھکی نظریں ـــ یہ کبیر خانزادہ کا اس گھر کی عورتوں کے لیے انداز تھا۔
"مجھے ذرا پبلک لائبریری تک جانا ہے۔ گاڑی نکالو۔" وہ تحکمانہ انداز میں کہتی قصداً موحد کو نظر انداز کر رہی تھی۔ موحد نے دلچسپی سے اسے دیکھا۔ کبیر گاڑی نکالنے چلا گیا۔
"آہاں ـــ یہاں کوئی لائبریری بھی ہے کیا؟" چہک کر پوچھا۔
"تو ہم کون سا چاند پر رہتے ہیں۔" وہ ذرا سا چڑی۔
"میں کئی روز سے سوچ رہا تھا کہ کسی لائبریری کا چکر لگاؤں۔ ذرا ذہن کو ہوا لگے۔ تمہاری بات سن کر تو میرا شوقِ مطالعہ بھی جاگنے لگا ہے۔" وہ خوشی سے مسکرا کر اسے بتا رہا تھا۔
"خدا کے لیے۔ اپنے اس ذوق کو کچھ دنوں کے لیے مزید سویا رہنے دو۔ میں اپنے ضروری کام سے جا رہی ہوں۔" وہ روکھی سی ہو کر بولی۔ بس ہاتھ جوڑنے کی کسر باقی رہ گئی تھی گویا۔
موحد نے اچٹتی مگر گہری نگاہ اس کے "یکلخت" بدلتے انداز پر ڈالی۔ پچھلے دنوں والی بے تکلفی اس کے انداز سے غائب تھی۔ وہ گاڑی کا پچھلا دروازہ کھول کر اندر بیٹھ گئی۔ موحد نے گردن موڑ کر گاڑی کو گیٹ سے باہر جاتے ہوئے دیکھا۔ اس کے ہونٹوں پر تلخ سی مسکراہٹ پھیل گئی۔
اور مہرماہ نہیں جانتی تھی کہ ان کی گاڑی سے کچھ فاصلے پر ان کا تعاقب کرنے والی ایک دوسری گاڑی بھی اسی سڑک پر تھی اور اس میں بیٹھا اونچا لمبا بندہ بہت جانا پہچانا سا تھا۔ جیسے کچھ دن پہلے اس سے ٹکراؤ ہوا ہو ـــ

☼ ☼ ☼

گیٹ سے گاڑی باہر نکلنے تک اسے موحد سے یوں رکھائی برتنے کا افسوس رہا مگر یہ افسوس مین روڈ پر آتے ہی طلال کی ناراضی کی فکر میں جتلا ہو گیا۔
"میں یہیں پہ رکوں مہر بی بی ـــ؟" وہ اپنا شولڈر بیگ سنبھالتی گاڑی سے اتر رہی تھی جب کبیر نے مؤدبانہ

پوچھا۔

"نہیں۔ تم جاؤ۔ مجھے تھوڑا ٹائم لگے گا۔ تمہارا نمبر ہے میرے پاس' میں کال کرلوں گی تمہیں۔" وہ بے نیازی سے بولی۔

موبائل میں موجود سم میں وہ دوبارہ سے تمام کانٹیکٹس کو محفوظ کرچکی تھی۔ کبیر سرہلا کر گاڑی اسٹارٹ کرنے لگا۔

وہ دھڑکتے دل کے ساتھ لائبریری کی سیڑھیاں چڑھنے لگی۔ پانچ بجنے میں محض دس منٹ باقی تھے' مگر اسے پوری توقع تھی کہ طلال وہاں آچکا ہوگا۔

اس نے داخلی دروازے سے اندر آکر لائبریری ہال میں طائرانہ نگاہ دوڑائی۔ طلال تیز قدموں سے چلتا اس کی طرف آیا۔ مہراہ نے ہونٹوں پر خیر مقدمی مسکراہٹ پھیلائی۔

"کیسی ہو.....؟" وہ پاس آکر رکا۔

"ٹھیک....." مہراہ کے دل کو اطمینان ہوا۔ وہ سکون سے اس کی بات سننے کے موڈ میں تھا۔

"ساتھ ہی کافی شاپ ہے۔ وہاں چلتے ہیں۔ لائبریری میں بات نہیں ہوسکتی۔" طلال نے لائبریری میں چھائی خاموشی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا تو وہ سرہلا کر اس کی تقلید میں باہر نکل آئی۔

"کس کے ساتھ آئی ہو؟" کافی شاپ میں کارنر کی ٹیبل سنبھالتے ہی طلال نے تیکھا سا سوال کیا تھا۔

"بتایا تھا نا۔ کبیر آگیا ہے گاؤں سے۔ وہی ڈراپ کرکے گیا ہے۔" وہ اس کے تیکھے پن کو نظرانداز کرتے ہوئے بولی۔

"اب بتاؤ مہو..... یہ موحد آفندی کہاں سے ہمارے رشتے اور اعتماد کے بیچ آگیا ہے؟" وہ اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے جذباتی انداز میں پوچھنے لگا۔ مہراہ کو اس کے الفاظ نے شاک پہنچایا۔

"یہ تم نے محسوس کیا ہے طلال..... اس کا مطلب ہے کہ تم لا رہے ہو اسے ہم دونوں کے درمیان۔"

"جو مجھے نظر آرہا ہے اس کی نفی نہیں کرسکتا میں۔" وہ تلخی سے بولا۔

"تم مجھ پر شک کررہے ہو طلال؟" مہراہ بے یقینی سے اسے دیکھتے ہوئے بولی۔

"ایک بندہ مجھ سے روڈلی بیہو کرتا ہے اور مسلسل کرتا ہی جاتا ہے..... مہو' تم پر اس بات کا کوئی اثر نہیں ہوتا؟" وہ تیز لہجے میں بولا تو مہراہ خائف سی ہوگئی۔

"اس کے ساتھ میرا فیملی ریلیشن ہے' طلال۔" وہ بمشکل بولی۔

"اور میں..... اس سارے فیملی فریم میں' میں کہاں فٹ ہوتا ہوں' وہ بھی بتادو آج۔" اس کے انداز سے کڑواہٹ چھلکتی تھی۔

"کہاں گئی وہ' موحد آفندی سے نفرت.....؟ فیملی ممبر تو وہ پہلے بھی تھا۔"

"فار گاڈ سیک طلال۔" مہراہ کی آنکھوں میں بے اختیار نمی اتر آئی۔ وہ رک کر اسے دیکھنے لگا۔ پھر سلگ کر بولا۔

"تو کیا نہیں ہے ایسا؟ کہو کہ میں جھوٹ بول رہا ہوں۔ تمہیں تو چاہیے تھا ساری زندگی اس شخص کو منہ ہی نہ لگاتیں۔ جس نے میرے ساتھ بدتمیزی کی اور یہاں تم اس سے گفت و صول کررہی ہو۔ اب اسے میں کیا سمجھوں؟"

"او کے..... میرا موبائل چھن گیا۔ گھر میں' میں نے اس حادثے کا کسی سے ذکر نہیں کیا۔ مجھے ڈر تھا کہ آغا جان مجھے اگلے دن شادی میں شریک ہونے نہیں دیں گے۔ اس لیے اس نے مجھے موبائل دیا اور کچھ نہیں تھا طلال۔" صفائی پیش کرتے کرتے اس کی آنکھیں چھلک گئیں تو اس نے چہرہ جھکا کر آنکھوں پر ٹشو رکھ لیا۔

طلال نے لب بھینچے اور چند لمحے اس کے جھکے ہوئے سر کو گھورا۔ پھر دانت پیس کر بولا۔
"ایک تو تم لڑکیوں کے پاس یہ بہت بڑا ہتھیار ہے۔ ذرا سی بات ہوتی نہیں اور آنکھوں میں آنسو لے آتی ہو۔"
"تم بات بے بات ڈانٹو گے تو آنسو تو آئیں گے نا۔" وہ اسے نم گلابی آنکھوں سے دیکھ کر منہ بسور کر بولی تو طلال کا دل پہلو میں لوٹ کر رہ گیا۔
"ہم کیا اور ہماری ڈانٹ کیا... تمہارے دو آنسوؤں کی مار ہے بس۔" وہ اب کی بار مسکرا دیا تھا تو مہرماہ کی جان میں جان آئی۔
"اچھا سوری نا۔ غلطی ہو گئی۔ آئندہ سے میں محتاط رہوں گی۔" وہ معصومیت سے بولی تو طلال نے گہری سانس لے کر کرسی سے پشت لگائی اور بے بسی سے بولا۔
"اب کیا ہو سکتا ہے۔ قتل کرنے کے سارے داؤ پیچ آزما رہی ہو تم۔"
"طلال..." وہ ہلکے سے چلائی۔ "یہ شوگر پاٹ اٹھا کے تمہارے سر پہ دے ماروں گی میں۔" وہ ہنسنے لگا۔
"یہی دھمکی اپنے اس اسٹوپڈ کزن کو بھی دیتیں نا۔"
"اونہوں۔ دیکھا! اب تم اسے لائے ہماری بات کے درمیان۔" مہرماہ نے فوراً" کہا۔
"میں اپنے سے منسلک چیزوں کے بارے میں بہت پوزیسو بندہ ہوں مہو۔ بلکہ شاید ہر کوئی ہوتا ہے، لیکن میں کچھ زیادہ ہی ہوں۔ وہ بندہ تم سے دس فٹ دور بھی نظر آئے! مجھے گوارہ نہیں ہے۔ جو ہو چکا وہ میں بھولنے کی کوشش کروں گا مگر یہ طے ہے کہ ہماری شادی کے بعد... تمہارا یہ کزن ہمارے گھر کبھی نہیں گھسے گا۔" وہ خطرناک حد تک سنجیدہ تھا۔
"اوکے ڈن۔"
مہرماہ نے فوراً" اس کے فیصلے پر اپنے اثبات کی مہر ثبت کر دی۔ اس کے کون سا موحد آفندی کے ساتھ اتنے گہرے روابط تھے کہ وہ اس کی شادی کے بعد بھی اس سے ملنے آتا رہتا۔ بہ مشکل ہی سہی طلال کا موڈ ٹھیک ہو ہی گیا اور کافی آنے تک وہ پہلے والا طلال تھا۔ خوش مزاج اور اس کا خیال رکھنے والا۔
اور ادھر مہرماہ سوچ چکی تھی کہ موحد آفندی سے کنارہ کیسے کرنا ہے۔
مگر اے بندے! تقدیر۔ صحرا میں بھٹکے کو اکثر ہریالی اور سمندر میں بھٹکے کو کنارا دکھائی دیتا ہے، مگر وہ محض نظر کا دھوکا ہوتا ہے۔ ہوتا وہی ہے جو منظور خدا ہوتا ہے۔ مہرماہ آفندی کی تقدیر بھی بڑی انوکھی لکھی گئی تھی۔
طلال، نمیر اور موحد آفندی... ان کا چوتھا کونا تھی مہرماہ... اور بے شک اللہ ہی بہترین علم رکھنے والا ہے۔

☆ ☆ ☆

زرنگار نے چار سال بڑے حوصلے اور صبر سے گزارے۔ نمیر اسکول جا رہا تھا اور گھر کا خرچا پانی فاران آفندی ہر ماہ بھجوا رہے تھے۔
زرگل بائی کا چھ ماہ پہلے ہی ہارٹ اٹیک سے انتقال ہوا تو زرنگار کو دکھ کے ساتھ ساتھ ایک اور لیبل کے اپنے وجود پر سے اترنے کا اطمینان بھی ملا۔ وہ نہ صرف اسے کوٹھے پر واپسی کے لیے اکسایا کرتی تھی بلکہ ایک آدھ بار تو زرگل بائی نے اتنی سنجیدگی سے فاران آفندی کے ساتھ عقد ثانی کا مشورہ دیا کہ وہ چیخ اٹھی۔
"اماں... اللہ کا واسطہ ہے اب بس بھی کر دو۔"
"اے لو... میں نے کیا غلط بات کہہ دی۔ بھاگ بھاگ کے آتا ہے یہاں اور کچھ نہیں تیرا اور تیرے بچے کا حق ہی

دلوادے گا۔" وہ برا مان کر بولی۔

"بھائیوں کی طرح ہیں وہ میرے۔ اماں کچھ تو سوچ سمجھ کے بولا کرو۔" زرنگار نے تاؤ بھرے لہجے میں کہا تو اس نے ہاتھ ہلا کر گویا مکھی اڑائی۔

"ارری ہٹ۔ طوائفوں کے بھی بھلا بھائی ہوا کرتے ہیں۔ مرد اور طوائف کا ایک ہی رشتہ ہوا کرتا ہے۔ عورت اور تماش بین کا۔" زرگل بائی پان کلے میں دباتے ہوئے مدبرانہ انداز میں بولی تو زرنگار کو اس کی سوچ سے کراہت محسوس ہوئی۔

اور اس بحث کے تین روز بعد ہی زرگل بائی کے مرنے کا فون آگیا۔ زرنگار کو دکھ بھی ہوا۔ وہ روئی بھی تھی، مگر اس نے ماں کے جنازے میں شریک ہونے کے لیے بازار حسن کی ان گلیوں میں جانے کے متعلق بھول کر بھی نہ سوچا اور گھر ہی میں ماں کے ایصال ثواب کے لیے فاتحہ خوانی کرلی۔

"اور اگر میں بھی ایسے ہی کسی روز مر گئی تو..... نمیر کا کیا ہوگا؟"

یہ سوچ ان دنوں زرنگار کے دل و دماغ میں گڑ کے رہ گئی تھی اور اس نے اچھی طرح سوچ بچار کرنے کے بعد فیصلہ کرلیا تھا کہ وہ ایک بار نمیر کو لے کر آفندی ہاؤس ضرور جائے گی۔

"ہوسکتا ہے پوتے کو دیکھ کر ہی دادا کا دل پگھل جائے۔" اس نے پاس سوئے چودہ سالہ نمیر کے بالوں میں ہاتھ پھیرا۔

اچھی خوراک اور بے فکری نے دنوں میں اس کی صحت کو بہترین کردیا تھا۔ وہ اچھی اٹھان اور خوب صورت نقوش والا لڑکا تھا۔

فاران تو پھر بھی کبھار چکر لگا لیتے، مگر ثمرہ ایک آدھ بار ہی زرنگار کے پاس آئی۔ زرنگار کو کوئی بندہ نہ ملتا تھا جس کے ساتھ وہ اپنے ان خیالات اور توہم پرستی کی حد تک آلودہ سوچیں بانٹ لیتی۔ ان دنوں اپنی اچانک موت کا خوف اس کے دل و دماغ پر بری طرح حاوی تھا۔

فاران آفندی ماہانہ خرچ باقاعدگی سے بھجوا رہے تھے، مگر زرنگار کو مسلسل پیٹ کے درد اور بخار کے ساتھ الٹیوں نے نڈھال کردیا۔

چودہ سالہ بچے کا ساتھ بھی کوئی ساتھ تھا کیا..... یہ زرنگار کو ان دنوں صحیح معنوں میں محسوس ہوا۔
نمیر کا بھی کوئی ہونا چاہیے..... اگر میں مر گئی تو؟

دن کو پڑوسن منت سماجت اور سو نخروں کے بعد آکر ہانڈی روٹی کردیتی، مگر بخار اور الٹیوں سے نڈھال پڑی زرنگار کو کھانا کون کھلاتا اور دوا کون وقت پر دیتا کہ خود میں تو اتنی ہمت ہی نہ رہی تھی۔

اور وہ ہفتہ جیسے تیسے گزارنے کے بعد وہ اپنی کمزوری اور موسم کی پروا کیے بغیر نمیر کا ہاتھ تھامے بس میں بیٹھ گئی۔

"امی کہاں جا رہے ہیں ہم.....؟" نمیر ماں کی بیماری اور اب اس قدر متوحش انداز سے پریشان تھا۔

"تمہارے دادا کے پاس نمیر۔ دعا کرو وہ تمہیں اپنا لیں۔" زرنگار کے اپنے دل کو قرار نہیں آرہا تھا۔

جس شخص نے اپنے بیٹے کو قبول نہ کیا وہ پوتے کو.....

"ابو نے منع کیا تھا ان کے پاس جانے سے امی..... وہ ابو سے ناراض تھے۔" وہ بے چین ہو اٹھا۔ کھڑکی والی سیٹ کی طرف بیٹھ کر بس سے باہر جھانکنے کی ساری خوشی ماند پڑ گئی۔

"وہ بہت اچھے ہیں نمیر۔ تم بس یہ سوچو۔ وہ تمہیں دیکھ کر بہت خوش ہوں گے۔" اس نے خود کو تسلی دی یا نمیر کو..... وہ بے یقینی سے ماں کو دیکھنے لگا۔

"تو پھر ابو کیوں نہیں لے کر گئے، ہمیں وہاں؟"

ماں باپ کے آنسوؤں، ان کی بے بسی... اور پھر باپ کی بے بسی بھری موت کا گواہ تھا وہ مگر نرم دل اتنا کہ ماں کو بھی جھٹلا نہیں پا رہا تھا۔

"مگر تم دیکھنا نمیر۔ تمہیں دیکھتے ہی ان کا دل پگھل جائے گا۔"

وہ چند لمحوں تک ماں کا کمزور پڑتا چہرہ دیکھتا رہا... وہاں آس و نراس بھری حسرتوں کی اتنی گہری داستان رقم تھی کہ وہ چودہ سالہ بچہ بھی اچھی طرح پڑھ سکتا تھا۔ وہ پچھلے چار سالوں سے تمام باتوں اور والدین کے جذبات و احساسات کو لب و لہجے کے اتار چڑھاؤ کے ساتھ سمجھنے لگا تھا۔

"تم بس اللہ سے دعا کرو۔ وہ ہمارے گناہ معاف فرما دے تو یہ لوگ بھی ہمیں معاف کر دیں گے۔"

زرنگار نے تھک کر سیٹ سے پشت ٹکالی۔ نمیر کچھ بولے بنا سر گھما کر کھڑکی سے باہر بے فکرے ہجوم اور عجلت بھری زندگی کو دیکھنے لگا۔ ہر کوئی جلدی میں نظر آتا تھا۔ جیسے وقت کم ہو... مگر اس کا دل آنے والے وقت کے قدموں کی ان سنی دھمک سے سہما جاتا تھا۔ اللہ تو معاف کر ہی دیتا ہے مگر اس کے بندے معاف نہیں کرتے۔

☼ ☼ ☼

تند و تیز ہوائیں کالی گھٹاؤں کو جانے کس دیس سے اڑا لائی تھیں، جب نومبر کے ابتدائی دنوں میں بادل زور سے گرجے اور بارش کا تیز چھینٹا پڑا تو موسم آپوں آپ سرد ہو گیا۔ اندر بستر پر موحد بخار میں تپ رہا تھا۔

"یا اللہ خیر... "بادلوں کی گرج سن کر ثمرہ نے بے اختیار کہتے ہوئے جھک کر موحد کی پیشانی چومی۔ وہ تیز بخار کی وجہ سے بے سدھ پڑا تھا۔

"دوائی سے کوئی خاص فرق نہیں پڑا بخار میں فاران۔" وہ تشویش سے بولی۔

"فکر مت کرو۔ اللہ بہتر کرے گا۔ ابھی دوائی دیے آدھا گھنٹہ ہی تو ہوا ہے۔ فوراً" بخار اترنا بھی ٹھیک نہیں ہوتا۔ آہستہ آہستہ صحیح ہو جائے گا۔" انہوں نے تسلی دی تھی۔

"مجھے بہت ڈر لگ رہا ہے فاران۔ موسم بھی اتنا خراب ہے۔ دوبارہ ڈاکٹر کے پاس جانا بھی محال ہے۔" ثمرہ نے متوحش انداز میں کہا تو انہوں نے نادیدہ نظروں سے بیوی کو دیکھا۔

"اللہ سے بہتری کی امید رکھو اور آسانی کی دعا مانگو بس۔"

وہ نم آنکھوں سے بے سدھ پڑے موحد کو دیکھنے لگی۔ اللہ نے ایک ہی اولاد دی تھی ہر وقت جان اسی میں اٹکی رہتی۔ اور کچھ صدیقہ بھابھی کی طرف سے اس کے دل کو دھڑکا لگا رہتا جو تین بیٹیوں کی ماں بننے کے بعد بھی اولاد نرینہ کے لیے ترس رہی تھیں اور موحد کو عجیب ترسے ہوئے انداز میں دیکھتیں۔ البتہ جب آغا جان اپنے اکلوتے لاڈلے پوتے پر پیار نچھاور کرتے تب کبھی کبھار ثمرہ کو ان کی آنکھوں سے جھلکتا حسد صاف دکھائی دیتا تھا۔ وہ دل ہی دل میں قرآنی آیات پڑھ کر موحد پر پھونکتی رہتی۔

اگلے آدھے گھنٹے میں موحد کے بخار میں کافی کمی آئی تھی۔ ثمرہ مطمئن ہو کر اس کے پاس ہی بستر پر دراز ہو گئی۔ باہر ابھی بھی بادلوں کی ہلکی ہلکی گرج سنائی دیتی تھی۔ فجر کے ٹائم سے موحد کی پریشانی میں جاگتی ثمرہ اونگھنے لگی۔

اور اب جب سب موسم کی یکایک تبدیلی کے باعث اپنے کمروں میں دبکے ہوئے تھے، ڈور بیل کا بجنا سب ہی کو متوجہ کر گیا۔

"اس وقت کون آ گیا... برستی بارش میں۔" فاران کتاب رکھ کر اٹھے۔ ایک نظر نیند میں ڈوبی ثمرہ پر ڈالی اور

کمرے سے باہر نکل آئے۔
اسی وقت لاؤنج میں سے آغا جان کے تیز لہجے میں بولنے کی آواز آئی تو وہ جلدی سے اس طرف بڑھے مگر لاؤنج میں قدم رکھتے ہی جیسے چھت ان کے سر پر آن پڑی تھی۔

☆ ☆ ☆

"کبیر۔۔۔" بڑی عجلت میں پکارا گیا تھا۔ وہ دل ہی دل میں کراہ کر رہ گیا۔ پلٹا تو نگاہ جھکی ہوئی تھی۔
"جی۔۔۔"
"مجھے کچھ بکس لینی ہیں بازار سے۔" ملاحہ نے اسے بتایا۔
"جی ضرور لیں۔۔۔ میں آغا جان کو لے کر بینک جا رہا ہوں۔" اس نے مؤدبانہ انداز میں کہا تو ملاحہ کو غصہ آیا۔
"تم سے اجازت لینے نہیں آئی ہوں میں کہ جاؤں یا نہ جاؤں۔ گاڑی ریڈی کرو۔" غصہ دبا کر وہ بڑے مالکانہ تحکم سے بولتی تھی۔
"آدھا گھنٹہ باقی ہے صرف بی بی۔ آغا جان نے بینک جانا ہے پھر۔"
"سن لیا ہے کبیر خان۔ بہری نہیں ہوں میں۔ اب چلیں؟" تنک کر کہتے ہوئے اس نے دونوں بازو سینے پر لپیٹے۔ ماں سے اجازت لے کر آئی تھی، ڈر جھجک کس بات کا ہوتا بھلا۔
کبیر نے بے بسی سے اس کو دیکھا۔ وہ اسی کو گھور رہی تھی۔ بھوری آنکھوں کا کانچ شربتی رنگ سے بھرا پڑا تھا جیسے۔۔۔ ملاحہ کا دل بے ترتیبی سے دھڑکا۔
(کم بخت کی آنکھوں کا رنگ دیکھو ذرا۔۔۔ اف)
"میں یہاں سے ہل بھی نہیں سکتا ملاحہ بی بی۔ آغا جان کے غصے سے واقف ہیں آپ۔"
"اور تم میرے غصے سے بھی اچھی طرح واقف ہو۔ بکس نہیں ہوں گی تو میں پڑھوں گی کیسے۔ میرا فیل ہونا تمہارے سر ہوگا۔"
ملاحہ نے دانت پیسے (گویا فیل ہونا نہ ہوا قتل ہونا ہو گیا)
"وہ منظور ہے مجھے، لیکن اگر آغا جان کو ٹھیک تین بجے گاڑی یہاں نہ ملی تو۔۔۔" وہ جلدی سے بولا، مگر بات ادھوری چھوڑ کر لب بھینچ گیا۔ (آگے صرف سوچ ہی ہے آپ کی)
"تم چاہتے ہو کہ میں باہر جاؤں اور رکشہ کر لوں؟" ملاحہ نے دھمکایا۔
"آپ اپنا ٹائم آگے کیوں نہیں کر لیتیں۔" وہ زچ آ گیا تھا۔
"تو ابھی پورا آدھا گھنٹہ تھا۔ پانچ منٹ تم نے خواہ مخواہ کی بحث میں ضائع کر دیے۔ چلو اب۔" وہ جلدی جلدی کا شور مچاتی فٹافٹ آغا جان کی سیاہ کرولا میں بیٹھ گئی۔
"افففف۔۔۔" کبیر نے دو انگلیوں سے ماتھے کو چھوا۔ سمجھ میں نہ آتا تھا کہ سر کہاں پٹختے۔ وہ پچھلی نشست پر براجمان اس کی بے بسی دیکھ رہی تھی۔ اسے وہیں کھڑا دیکھ کر ہاتھ بڑھا کر ہارن بجایا تو وہ ہڑبڑا کر آگے بڑھا اور تیزی سے دروازہ کھول کر ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھتے ہوئے خفگی سے بولا۔
"یہ کیا کر رہی ہیں آپ۔ آغا جان اپنی گاڑی کا ہارن پہچانتے ہیں۔"
"پتا ہے خان! تم مجھے مجبور کرتے ہو ان ظالمانہ کارروائیوں کے لیے۔" وہ اطمینان سے بولی تو مارے باندھے وہ گاڑی اسٹارٹ کرنے لگا۔
"اللہ جانے کیا دشمنی پال لی ہے آپ نے مجھ سے۔" وہ سخت کبیدہ خاطر ہو رہا تھا۔ ملاحہ نے بے ساختہ اسے

دیکھا۔

پٹھانوں کی مخصوص رنگت بھوری آنکھیں اور شیو نہ کرنے کے باعث ہلکی شیو بڑھی ہوئی تھی۔

(دشمنی۔۔۔؟) وہ مسکراہٹ دباتے ہوئے ونڈ اسکرین کے پار دیکھنے لگی۔ پھر اطمینان سے کہا۔

"تم کام ہی دشمنوں والے کرتے ہو۔"

"جلدی سے بتائیں کس مارکیٹ جانا ہے۔۔۔ مجھے پورے تین بجے گھر ہونا چاہیے۔"

"افففف۔۔۔" وہ ایک دم چیخی۔ کبیر کا پاؤں بے اختیار بریک پر پڑا۔ وہ پرجوش سی باہر اشارہ کر رہی تھی۔

"کیا ہوا۔۔۔ کون ہے؟" وہ ایک دم سے الرٹ ہوا تھا۔

"وہ۔۔۔ اوفوہ۔ اس دوسری لین میں۔ ہمارے کالج کے باہر جو گول گپے والا ہوتا ہے اس کی ریڑھی دیکھی میں نے۔" چمکتی آنکھوں کے ساتھ منہ میں گویا پانی بھرے وہ اسے بتا رہی تھی۔ کبیر نے مشکوک نظروں سے اسے دیکھا۔

"تو۔۔۔؟"

"تو یہ کہ گول گپے کھانے ہیں بھئی اور کیا۔۔۔" کہتے ہوئے وہ مزے سے دروازہ کھول کر گاڑی سے اتر گئی تھی۔

"یا اللہ۔۔۔" خود کو بے بس محسوس کرتا کبیر گاڑی کا انجن بند کرتا مجبوراً نیچے اترا اور اس کی طرف آیا۔ جو اڑ کر سڑک کے اس پار جانے کو تیار تھی۔

"آپ گاڑی میں بیٹھیں۔ میں یہیں لا دیتا ہوں پیک کروا کر۔ گھر جا کے تسلی سے کھا لیجیے گا۔" ادب سے مسئلے کا حل پیش کیا۔

"ہنہ۔۔۔ جو مزہ اس تھڑل میں ہے وہ اس تسلی میں نہیں ہوگا۔" اس کی رنگت تمتما رہی تھی۔ کبیر نگاہ پھیر گیا۔

"اچھا پھر آپ بیٹھیں گاڑی میں، آگے جا کر ٹرن لیتا ہوں۔ یہاں بہت ٹریفک ہے روڈ کراس کرنا بہت مشکل ہے۔" ہار کر اس نے مشورہ دیا۔ ملاحہ نے مشکوک بھری نظروں سے اسے دیکھا۔

"جھوٹ تو نہیں بول رہے؟"

"مرنا ہے مجھے آپ کے ہاتھوں۔" وہ بڑے ضبط سے بولا پھر ہاتھ کے اشارے سے اسے گاڑی میں بیٹھنے کو کہا۔

"اگر تم مجھے یہاں سے دھوکے سے لے کر گئے تو شور مچا دوں گی میں۔" اس کے گاڑی اسٹارٹ کرتے ہی ملاحہ نے اسے دھمکایا تھا۔

"جانتا ہوں میں۔ کافی عرصے سے آپ کی ایٹیٹیوڈ چیک کر رہا ہوں۔" وہ گہری سانس بھرتے ہوئے بولا تو ملاحہ نے اسے گھور کے دیکھا۔

"اچھا اب باہر کھڑے ہو کر نہیں کھائیں گی آپ۔ یہیں گاڑی میں ٹرے لا دیتا ہوں۔۔۔ آں۔ ضد کریں گی تو سیدھا گھر لے جاؤں گا۔ بے شک چلاتی ہوئی جائیے گا۔"

وہ ریڑھی سے کچھ فاصلے پر گاڑی کھڑی کرتے ہوئے تنبیہی انداز میں بولا اسے منہ کھولتے دیکھا تو ساتھ ہی اٹل لہجے میں دھمکا بھی ڈالا۔

"ہنہ۔۔۔" سر جھٹک کر سینے پہ بازو لپیٹتے ملاحہ نے خفگی سے منہ پھیر لیا تھا۔ مگر کبیر مطمئن ہو کر گاڑی سے اتر گیا اسے پتا تھا کہ اب وہ اندر ہی بیٹھی رہے گی۔

"ہم۔۔۔" وہ اس قدر مزے اور انہماک کے ساتھ گول گپے کھا رہی تھی کہ حد نہیں۔ مگر کبیر کی نگاہ گھڑی پر تھی۔

"جلدی کریں۔ آدھا گھنٹہ تو یوں ہی نکل گیا۔ ابھی بکس لینی ہیں آپ نے۔" وہ زچ آ گیا۔

"ہر چیز جلدی جلدی کھانے والی نہیں ہوتی۔ مگر تمہیں کیا معلوم تم کوئی انسان تھوڑی ہو۔ باڈی گارڈ ہو باڈی گارڈ۔ گارڈز سے ہی بنے ہوئے۔" وہ اس پر طنز کرتے ہوئے اب گھونٹا پانی پی رہی تھی۔ کبیر اس کا مذاق اڑانا انداز سمجھ گیا۔

"اچھی بات ہے کہ آپ سمجھتی ہیں۔ میں نوکر ہوں اس گھر کا۔" وہ سامنے دیکھتے ہوئے سنجیدگی سے پرسادہ انداز میں بولا مگر ملاحہ کا تو دل ہی مٹھی میں بھینچ گیا ہو۔

"بس..." اس نے ٹرے اٹھا کر کبیر کو تھمائی۔ ابھی پلیٹ میں چاٹ سے بھرے گول گپے باقی تھے۔

"ختم تو کرلیں۔"

"تم جو ہو... ہر بات ختم کرنے کے لیے۔" وہ اسے گھورتے ہوئے بولی تو وہ خاموشی سے ٹرے لے کر پلٹ گیا۔
ملاحہ کی آنکھیں نم سی ہو گئیں۔

دل کو اس راہ پہ چلنا ہی نہیں
جو مجھے تجھ سے جدا کرتی ہے

"اب کہاں...؟" وہ گاڑی اسٹارٹ کرتا بعجلت پوچھ رہا تھا۔

"گھر چلو بس..." وہ بجھے ہوئے انداز میں بولی۔ تو کبیر کا دل چاہا اپنا سر پیٹ لے۔ بے یقینی سے پوچھا۔

"آپ صرف یہ گول گپے کھانے آئی تھیں؟"

"نہیں... تمہارا سر اب گھر چلو سیدھے۔ کتنا بولتے ہو تم۔ سر میں درد کر دیا۔"

وہ تنک کر کہتی چہرہ موڑ گئی اور سر سیٹ سے ٹکا دیا۔ گہری سانس بھرتا کبیر خان خود کو اپنی برداشت پر داد دے کر رہ گیا۔

☆ ☆ ☆

"مہر... تمہارا ایک فیور چاہیے تھا۔" وہ بے تکلفی سے اس کے کمرے میں چلا آیا تھا۔ مہپاہ کو اندازہ نہیں تھا کہ دستک کے جواب میں یہ شکل دکھائی دے گی۔

"کیا...؟" اسے گھور کر دیکھا۔

"یہاں کی جو مشہور جگہیں ہیں۔ تم مجھے وہاں لے جاؤ گی؟" وہ پوچھ نہیں رہا تھا۔ اسے بتا رہا تھا کہ تم ہی ہو جو مجھے وہاں لے جاؤ گی۔ مگر مہپاہ کا مزید مروت نبھانے کا کوئی ارادہ نہ تھا۔

"آئم سوری موحد۔ میں بہت بزی ہوں۔" اس نے فوری انکار کیا۔ پھر جتایا۔

"کبیر آچکا ہے۔ وہ ساتھ جا سکتا ہے تمہارے۔ اسے پتا ہے ہر جگہ کا..." اس کا لہجہ روکھا سا تھا۔

موحد نے جانچتی نظروں سے اسے دیکھا۔ وہ پچھلے دنوں سے الگ وہی پرانی والی مہپاہ بن گئی تھی۔ اکھڑ اور بدتمیز...

"تمہیں طلال نے منع کیا ہے میرے ساتھ کہیں جانے سے؟" اس کا سوال غیر متوقع تھا، مہپاہ کو امید نہیں تھی کہ وہ صاف گوئی سے پوچھ لے گا۔ وہ پہلے گڑبڑائی۔

"نہیں تو... وہ کیوں منع کرے گا بھلا۔" خود کو سنبھالتے ہوئے اس نے تیوری پر بل ڈالے۔

"وہ اتنا تنگ نظر نہیں ہے۔"

"اس کا مطلب ہے کہ تم خود میرے ساتھ کہیں جانا نہیں چاہتیں۔" موحد کی پیشانی پر شکن ہو گئی۔

"یہی سمجھ لو۔ جو تمہارا نقصان کیا تھا اس کے لیے تم مجھ سے معافی منگوا چکے ہو۔ بلکہ پنالٹی کے طور پر تمہیں

شاپنگ پر لے جانے کی کرلسی بھی نبھادی میں نے۔ معاملہ ختم۔" اس نے اطمینان سے کہتے ہوئے ہاتھ جھاڑے۔

"ویری روڈ۔" موحد نے تبصرہ کیا تھا۔ مہواہ نے شانے اچکائے۔

"تم جو بھی کہو۔ کزن شپ اپنی جگہ۔ مگر میں پبلک اسپاٹس پر تمہارے ساتھ گھوم پھر نہیں سکتی۔ سوری۔"

اس کا جواب صاف صاف تھا۔

"ہمم۔" وہ مبہم سا بولا۔ پھر ہلکے سے مسکرایا۔ وہی۔ خوب صورت سی مسکراہٹ جو کبھی کبھی جھلک دکھاتی تھی اور اس کا چہرہ تروتازہ لگنے لگتا تھا۔

"یعنی کہ آج سے ہم دونوں کا ایک دوسرے کو فیور دینا ختم۔" مہواہ بازو لپیٹے خاموش کھڑی رہی۔ اس شخص کی خاطر وہ طلال کو خفا نہیں کر سکتی تھی۔

"اوکے۔"

وہ بنا کچھ کہے واپس مڑ گیا تھا۔ پل بھر کو مہواہ کو افسوس ہوا مگر وہ مجبور تھی۔ سو خاموشی سے اسے جاتا دیکھتی رہی۔ پھر گہری سانس بھرتے ہوئے موبائل اٹھایا۔ جو اس نے ماں کے ساتھ جا کر خریدا تھا اور پہلے والا موبائل گم کرنے پر خوب ڈانٹ بھی کھائی تھی۔

"اوفوہ۔ اپنی منگنی کی سلامیوں کے پیسوں میں سے خود لے لوں گی۔ آپ بس ساتھ چلیں۔"

اس نے انہیں مناتے ہوئے کہا تو وہ سر جھٹک کر رہ گئیں۔ مگر بہر حال وہ نیا موبائل لے ہی آئی تھی اور سارے نمبر دوبارہ محفوظ کر لیے۔ اس نے طلال کا نمبر نکالا۔ اس کے لبوں پر ہلکی سی مسکراہٹ کھیلنے لگی۔

"کیا ہوا۔ مل گئی اجازت جانے کی؟" طلال نے چھوٹتے ہی پوچھا تھا۔

"ہاں۔ مل گئی۔ اب یہ ہینٹنگز وغیرہ مجھے کچھ خاص سمجھ میں نہیں آتیں۔ مگر صرف تمہارے لیے آغا جان سے اجازت لی ہے۔" وہ مسکرا رہی تھی۔

"آہاں۔" طلال کے دل و دماغ پر ہلکی پھلکی سی کیفیت طاری ہونے لگی۔ "ہم بھی بہت کچھ آپ کے لیے ہی کیا کریں گے۔ جناب۔ آپ میسر تو ہو جائیں بس۔"

"اوہو۔ زیادہ فری مت ہو۔ ٹائم بتاؤ۔ کب تک الحمرا پہنچو گے؟" گلابی پڑتے چہرے کے ساتھ وہ فوراً" بات کا رخ بدل گئی۔ تو وہ محظوظ ہوتے ہوئے اسے وقت بتانے لگا۔ پھر جیسے اسے خوش خبری سنائی۔

"ماما سے کہا ہے میں نے شادی کی ڈیٹ فکس کرنے کا مہو۔" مہواہ کا دل بے ترتیبی سے دھڑکا۔

"اچھا۔ پھر۔؟"

"بس پاپا کا کہنا تھا کہ آفس جانا شروع کر دوں۔ میں نے یونی ورسٹی کے فوراً" بعد جانا شروع کر دیا۔ تو اب وہ سمجھ جائیں گے کہ بیٹا اپنی فیملی بنانے کے قابل ہو گیا ہے۔" وہ ہنسا تھا۔

"بے وقوف۔" مہواہ کے کان تپے۔

"کاش میں تمہارے سامنے ہوتا اور دیکھتا کہ کنکھنی بلی شرماتی ہوئی کیسی لگتی ہے۔" وہ بڑی حسرت سے شرارت میں کہہ رہا تھا۔ مہواہ نے ہنستے ہوئے خدا حافظ کہا۔

آج دل کا موسم بہت خوب صورت ہو رہا تھا۔ وہ مسکرا دی۔

☼ ☼ ☼

فاران آفندی سوچ بھی نہیں سکتے تھے کہ وہ اس قدر غیر متوقع منظر اپنی آنکھوں سے دیکھیں گے۔

لاؤنج میں اس وقت زرنگار وقار آفندی اپنے بیٹے نمیر کے ساتھ موجود تھی اور دوسری طرف غیض و غضب کا شکار بنے آغا ذوالفقار علی اور صدیقہ بھابھی۔

"فاران! یہ... یہ دیکھ رہے ہو جرات۔ اس دو ٹکے کی عورت کی کہاں ہے چوکیدار؟ آج ابھی اسے فارغ کرتا ہوں۔ کیسے اندر آنے دیا اس کو۔" آغا جان نے لاؤنج میں داخل ہوتے فاران کو دیکھا۔ اب وہ گرج رہے تھے۔

"آغا جان! ذرا برداشت سے کام لیں۔" فاران نے فوراً آگے بڑھ کر آغا جان کے شانے پر ہاتھ رکھ کر نرمی سے دبایا۔

"آپ کا پوتا پہلی بار گھر آیا ہے۔" ان کا ذہن بدلنے کی سعی کی۔

"خبردار! خبردار جو اس رذیل عورت کے خون کو کسی نے میرا پوتا کہا تو..." وہ مارے طیش کے لرزنے لگے۔

زرنگار تڑپی۔

"میں تو صرف اس کی ماں ہونے کی گناہ گار ہوں آغا جان۔ خون تو آپ کے بیٹے کا ہے یہ۔ آپ کی نسل ہے۔"

صدیقہ بھابھی تو جلتے کوئلوں پر لوٹ گئیں۔ پہلے ثمو نے بیٹا پیدا کر کے ان کی پوزیشن ڈاؤن کی اور اب یہ طوائف زادی اپنا سیمپل لے کر آگئی تھی۔

"اری ہٹ... اب ہر کوئی دعوے دار بن کر آجائے وراثت کا تو کیا ہم آنکھیں بند کر کے مان لیں گے۔"

"یہ وقار آفندی کا بیٹا ہے آغا جان۔ کیا آپ کو اس میں اپنا بیٹا دکھائی نہیں دے رہا۔" زرنگار کرلائی۔ چودہ سالہ نمیر کی طرف اشارہ کیا۔

"اے... بات کو سمجھتی نہیں ہو تم۔" صدیقہ بھابھی کو خوب ہی غصہ آیا اور غصے میں وہ سوچتی کم اور بولتی زیادہ تھیں۔

"خبردار جو وقار کا نام بھی لیا ہو تم نے۔ غلطی کر بیٹھا تھا وہ جو گند میں منہ مار لیا اور تم پتا نہیں کس کا گناہ اس کے سر منڈھنے چلی ہو۔"

"بھابھی!" فاران ناگواری سے اونچی آواز میں انہیں ٹوک گئے۔ سہیل نے بھی تنبیہی نظروں سے بیوی کو دیکھا۔ خوف زدہ سا نمیر ماں کے بالکل ساتھ چپکا کھڑا تھا۔

یہ سب لوگ اسے ظالم درندے لگ رہے تھے۔ وہ جانتا تھا کہ کیسے اس کا باپ کسمپرسی کی حالت میں مرا۔ اتنے بڑے گھر میں رہنے والے لوگوں کا بیٹا... افلاس کے ہاتھوں مار کھا گیا۔

"فاران... اگر تمہیں اس عورت سے زیادہ ہمدردی ہے تو اس سے کہو چپ کر کے یہاں سے نکل جائے۔ میں اس سے کوئی بحث نہیں کرنا چاہتا۔" آغا جان ان پر گرجے تھے۔

"یہ جذباتیت سے نہیں، ہوش و حواس سے حل کرنے والا مسئلہ ہے آغا جان۔"

"اب تمہارا بھائی مر چکا فاران، مت حمایت کرو اس ناپاک عورت کی یا پھر اب تمہاری باری ہے اس کے چنگل میں پھنسنے کی۔" آغا جان کا تنفر، کروفر اور لفظی بے احتیاطی عروج پر تھی۔ غصے میں وہ زبان و بیان پہ قابو کھو بیٹھتے تھے۔

فاران کا چہرہ مارے اہانت کے سرخ پڑ گیا۔

"آغا جان پلیز۔" وہ زرنگار سے نظر نہ ملا سکے۔

وہ چپ چاپ آنسو بہا رہی تھی۔ آج تو وہ جگر والا مرد بھی ساتھ نہ تھا۔ جو اس کے آگے کھڑا ہو کر ان طعنوں تشنوں سے اسے بچایا کرتا تھا۔ ہاں نمیر آفندی تھا ساتھ "ازحد حساس اور عمر سے پہلے ہی ذہنی بلوغت حاصل کرنے والا بچہ۔ اب بھی یہ ماحول اور باتیں اس کے ذہن پر انمٹ نقوش چھوڑ رہی تھیں۔

"تم کیا جانو فاران۔۔۔ کس کی ناجائز اولاد اٹھا کر لے آئی ہے یہ ہمارے گھر۔ جائیداد کا وارث بنانے کے چکر میں۔" صدیقہ بھابھی نے حقارت سے' زرنگار کو دیکھتے ہوئے کہا بس تھوکنے کی کسر باقی رہ گئی تھی۔

"ہوش سے بات کریں آپ۔۔۔ خبردار جو کسی نے وقار آفندی کے خون' اس کی جائز اولاد پر انگلی اٹھائی تو۔" زرنگار شیرنی کی طرح غرائی تھی۔ سرخ و سپید رنگت اور مارے غم و غصے کے سپید پڑتے ہونٹ۔ وہ لرز رہی تھی۔ بیماری اسے اندر ہی اندر کھوکھلا کر چکی تھی۔ مگر ہمت تو لوگوں کے رویے توڑتے ہیں۔ بیماری تو صرف موت کا بہانہ بنا کرتی ہے۔

"بھابھی! آپ اتنی گری ہوئی بات کریں گی' یہ میں سوچ بھی نہیں سکتا تھا۔" فاران کو بھی غصہ آیا تھا۔

"سب جانتے ہیں کہ وقار نے اس عورت سے شادی کی ہے اور آغا جان یہ۔۔۔ یہ دیکھیں۔ کوئی فرق نظر آتا ہے آپ کو اس بچے اور وقار میں؟"

وہ نمیر کو شانوں سے تھام کر آگے کیے' آغا جان سے جذباتی ہو کر پوچھ رہے تھے۔

"دور کرو ان دونوں کو یہاں سے فاران' ورنہ میں دھکے دے کر نکلواؤں گا۔" وہ ایک نظر بھی دہشت سے کپکپاتے نمیر پر ڈالے بنا سفاکی سے بولے تھے۔

"اللہ سے ڈریں آغا جان! یہ آپ کا پوتا ہے۔ آپ کا وارث۔" زرنگار بے بسی کے مارے رو پڑی۔

"اللہ نے دے رکھا ہے پوتا مجھے۔ تم اس گندگی سمیت یہاں سے دفع ہو جاؤ۔ بہت کھا چکی ہو تم وقار کے ذریعے اس کا سارا بینک بیلنس' اس کا پلاٹ۔ اب یہاں کوئی حق نہیں تمہارا اور نہ اس غلیظ کا۔ جسے تم میرا پوتا بنا کر لائی ہو۔" وہ بڑی حقارت سے کہہ رہے تھے۔

"میں آپ کے سامنے ہاتھ جوڑتی ہوں آغا جان۔ وقار مر گیا۔ میں بھی مر گئی تو آپ کا خون گلیوں میں رل جائے گا۔" رو رو کر اس نے تھک کر ان کے آگے ہاتھ جوڑ دیے۔۔۔ بے بس سے نمیر کی آنکھوں سے سیل رواں تھا۔ مگر وہاں اس وقت انسان نہیں بستے تھے۔ پتھر کے بت تھے۔۔۔ نہ سنتے نہ دیکھتے۔

"فاران اسے تم باہر نکالو گے یا میں چوکیدار کو بلاؤں؟" آغا جان کا لہجہ سرد ترین تھا۔

بادلوں کی گڑگڑاہٹ نے زور پکڑا۔ آج بارش میں بھی کسی بیوہ اور کسی یتیم کے آنسوؤں کی سی روانی تھی۔

"آغا جان رحم کریں ان پر۔۔۔ یہ ظلم مت کریں۔"

ثمرو ابھی جاگیں تو فاران کو کمرے میں نہ پا کر باہر نکلیں۔ لاؤنج سے آغا جان کی۔۔۔ آنے والی آواز نے انہیں بعجلت ادھر آنے پر مجبور کر دیا اور زرنگار کے متعلق آغا جان کے ارشادات سن کر وہ گنگ سی کھڑی رہ گئی تھیں مگر اب جب بات حد سے بڑھتی دیکھی تو وہ احتجاجاً" اونچی آواز میں بول اٹھیں۔

مگر یہ وہ گھر تھا جہاں بہوؤں کو "اختلاف" کرنے کی اجازت نہیں تھی۔ آغا جان کے سامنے ثمرو اور فاران کے بولنے کی جرأت نے انہیں سیخ پا کر دیا تھا۔

انہوں نے اسی وقت زرنگار اور نمیر کو وہاں سے نکال دیا۔ صدیقہ بھابی کے دل میں ٹھنڈک اتر گئی۔ ثمرو آغا جان کے ہاتھ کے محض ایک اشارے پر ہی اندر چلی گئی تھیں۔ فاران بے بس کھڑے تھے۔ سہیل آفندی میں ہمت ہی نہ تھی کہ وہ آغا جان کے سامنے کسی بھی قسم کی آواز اٹھاتے۔

لاؤنج میں خاموشی چھائی ہوئی تھی۔ جیسے ابھی کسی کی موت کی خبر سن کر سب گنگ رہ گئے ہوں۔

☆☆☆

تیز موسلا دھار بارش تھم چکی تھی مگر موسم کے تیور نہیں بدلے تھے۔ وہ روتی ہوئی ماں کا ہاتھ تھامے اس

عفریت خانے سے نکل آیا۔
اس کا وجود ابھی بھی خوف و وحشت سے لرز رہا تھا۔ رات کے اس پہر سڑک پر اونچی آواز میں روتی۔ اس کی ماں اور ماں کے دکھ میں کلستا دل لیے بے آواز آنسو بہاتا چودہ سالہ معصوم کبیر آفندی۔
"آہ۔" زرنگار کو ٹھوکر لگی اور وہ اوندھے منہ سڑک پر جا گری۔
"امی۔" وہ تڑپ اٹھا۔ گھبرا کر برافروختہ ہو کر انہیں سیدھا کرنے کی سعی کی تو ان کی پیشانی خون سے تر بتر تھی۔
"امی۔۔۔ امی۔" وہ وہیں اونچی آواز میں رونے لگا۔

☼ ☼ ☼

وہ کبیر کے ساتھ وقت سے کچھ دیر پہلے ہی الحمرا ہال پہنچ گئی۔
"ایک گھنٹے تک آجانا کبیر۔ میں باہر ہی ملوں گی۔" اس نے کبیر کو یاددہانی کرائی تھی۔
اور اب۔۔۔ اس نے گردن اچکا اچکا کر پنجوں کے بل کھڑے ہو کر بھانت بھانت کے لوگوں میں طلال کو ڈھونڈنے کی کوشش کی۔ مگر بے سود۔
اس نے موبائل نکال کر اسے کال کی۔
"بس ابھی پانچ منٹ میں نکل رہا ہوں۔ تم پہنچی تو نہیں؟" وہ آفس میں ہی تھا۔ بعجلت بولا تو وہ جل کر رہ گئی۔
"نہیں۔ ابھی راستے میں ہوں۔"
اس نے منہ پھلا کر کہتے ہوئے موبائل بند کر کے بیگ میں ڈال لیا۔ اب کچھ بھی ہو۔ وقت گزاری کے لیے پینٹنگز ہی دیکھنا پڑیں گی۔ اوکھلی میں سر دے لیا تو بھلا موسلوں سے ڈر کے کیا حاصل۔
وہ آگے بڑھی اور جا کر ایک تصویر کے سامنے کھڑی ہو گئی۔ انہماک کا مظاہرہ کرتے ہوئے اس نے تصویر کا دو منٹ تک جائزہ لیا اور پھر اثبات میں سر ہلایا (جیسے کہ سارا آرٹ سمجھ لیا ہو محترمہ نے) اور جا کر اگلی تصویر کے سامنے کھڑی ہو گئی۔
مگر تین تصویروں کے بعد نیلے پیلے رنگوں سے اسے گویا یرقان ہو جانے کا اندیشہ ہوا تو وہ پلٹ گئی۔
"توبہ۔۔۔ بنانا تو دور کی بات۔ انہیں تو دیکھنے کے لیے بھی اسٹیمنا چاہیے۔ نہ آنکھ نہ کان نہ ہاتھ نہ پیر۔"
وہ سخت بے زار ہوئی۔ مگر پلٹتے ہی زمین آسمان نظروں کے سامنے یوں گھومیں گے اس نے کبھی سوچا بھی نہیں تھا۔
"آہاہ تم یہاں؟" وہ موحد آفندی تھا۔ مہراہ چکرائی۔
"تم یہاں کیا کر رہی ہو؟" وہ بے یقینی سے اسے دیکھ رہا تھا۔ مہراہ نے تو یہی سوچا کہ وہ محض اسے ساتھ لے جانے کے لیے گھومنے پھرنے کی آفر کر رہا ہے۔ یہ نہیں پتا تھا کہ وہ سب سے پہلے "اس" مشہور جگہ کو دیکھنے آجائے گا۔
"وہ۔۔۔ میں پینٹنگز دیکھنے آئی ہوں۔" وہ گڑبڑائی۔
"اچھا۔۔۔ تو بزی لائف میں سے "اپنے" لیے وقت نکال ہی لیا۔ بہت اچھا کیا۔" وہ محظوظ ہوتے ہوئے مسکرایا۔
مہراہ نے نگاہ پھیری۔ کمبخت ہیرو لگتا تھا۔ مگر اس کے ساتھ ستارے نہیں ملتے تھے کہ دوستی ہی کر لیتی۔ کسی بھی پل طلال پہنچنے والا تھا۔

"ہوں۔۔۔" مبہم انداز میں کہہ کر یونہی ادھر ادھر دیکھنے لگی۔ جیسے اس سے بات نہ کرنا چاہتی ہو۔
"اکیلی کیوں آئی ہو؟ تزئین یا ملاحہ کے ساتھ آجاتیں۔" وہ سنجیدگی سے بولا۔
"کبیر ڈراپ کر کے گیا ہے (داوا ابا نہ ہوتو)۔" وہ چڑ کر بولی۔
"اور یہ تم نمائش دیکھنے آئے ہو یا میری کلاس لینے؟ جاؤ اور جا کر پینٹنگز دیکھو۔"
"تم بھی چلو۔ ہر قسم کے لوگ موجود ہیں یہاں۔ اکیلی کھڑی رہو گی کیا؟" وہ قطعیت سے بولا۔
"اوفوہ۔ ٹھیک ہوں میں یہاں۔ سارا بھائی ہے کسی نے مجھے کچھ کہہ کر۔" وہ جھلائی۔ موحد نے اسے گھورا۔
"آغا جان کو فون کروں؟" اس کی دھمکی نے مہواہ کو اندر تک سلگا دیا۔ تنک کر بولی۔
"جی نہیں۔ بہت شکریہ۔ ان کا نمبر ہے میرے پاس۔ میں خود کال کرلوں گی۔"
اب جو لوگ وہاں موجود تھے وہ ایک نظر تو ضرور ہی اس خوب صورت کپل پر ڈالتے تھے۔ جھنجلائی ہوئی گلابی رنگت اور سیاہ بالوں والی لڑکی اور خوب صورت نقوش والا پیاری سی مسکراہٹ والا لڑکا۔ وہ اس کی بات پر بے ساختہ ہنس دیا۔
"ہیلو مہر۔"
طلال کی سرد سی آواز نے اسے ٹھٹھرا سا دیا۔ وہ بمشکل مسکرائی۔
"ہیلو۔۔۔ اتنی دیر کردی۔ کب سے اکیلی کھڑی تھی میں۔" اسے باور کرایا کہ موحد کے ساتھ نہیں تھی۔
طلال نے ایک نظر ٹراؤزر کی جیبوں میں انگلیاں پھنسائے کھڑے موحد پر ڈالی۔ پھر مہواہ کو چلنے کا اشارہ کیا۔
"اففف۔۔۔" مہواہ کی ٹانگیں من من بھر کی ہوگئیں۔ (کیا سوچتا ہوگا۔۔۔ موحد)
"او کے موحد۔ انجوائے یور سیلف۔" وہ بدقت مسکرا کر کہتی طلال کے ساتھ آگے بڑھ گئی۔
"پھر یہ شخص تمہارے ساتھ تھا مہر۔ میں نے کہا بھی تھا تم سے کہ اب یہ بندہ تمہارے آس پاس بھی نظر نہ آئے۔"
موحد کے کانوں میں دور جاتے طلال کی پر تپش آواز آئی تو وہ لب بھینچے پینٹنگز کی طرف بڑھ گیا۔
"اوفوہ۔۔۔ میرے کون سا دادا کا ہے الحمرا ہال۔ جس کی مرضی ہو وہ آسکتا ہے یہاں۔" مہواہ چڑ کر بولی۔ "میں کبیر کے ساتھ آئی تھی۔ اب موحد کب آیا مجھے نہیں پتا۔"
"سارا مزہ خراب کردیا اس بندے کے دیدار نے۔" وہ تصویریں دیکھتے ہوئے بھی بڑبڑاتا رہا تھا۔ مہواہ الگ ٹینشن کا شکار تھی۔
"میں یہاں ہر بات ختم کرنے آئی تھی طلال اور تم نئی ٹینشن لے کر بیٹھ گئے ہو۔" وہ خفا ہونے لگی۔
"میں نے بھی سوچا تھا یہاں سے سیدھا پزا ہٹ اور پھر لانگ ڈرائیو۔ مجھے کیا پتا تھا تمہارا "خاندانی" باڈی گارڈ بھی منہ اٹھا کر چلا آئے گا۔" وہ تپا ہوا تھا۔
منگنی کا پیریڈ "اس قدر" یادگار ہوگا یہ طلال نے سوچا بھی نہیں تھا۔۔۔ "سالا۔" وہ دانت کچکچا کر رہ گیا۔
"وہ دوبارہ کہیں نظر نہیں آیا طلال۔ چلا گیا ہوگا۔" مہواہ نے اسے تسلی دی۔ "آئس کریم تو کھا ہی سکتے ہیں۔ موسم بھی بہت اچھا ہوگیا ہے اب تو۔" وہ مسکرائی۔
طلال کے تنے ہوئے اعصاب بھی کچھ ڈھیلے پڑے۔
"ویسے طلال، مجھے پتا نہیں تھا کہ تم اتنے غصیلے اور پوزیسو ہو۔" آئس کریم پارلر میں آئس کریم سے لطف اندوز ہوتے ہوئے مہواہ کا انداز اسے چھیڑنے والا تھا۔
"شادی کے بعد تو میں باقاعدہ ایک گن رکھوں گا اپنے ساتھ۔ جو بھی تمہیں دیکھے گا وہ فائر۔۔۔" وہ کہہ رہا تھا۔

مہماہ نے اسے گھور کر دیکھا اور جتایا۔

"کوئی اور بھی یہی سوچ لے تو؟ کسی کی بیوی پر تمہاری بھی نظر پڑ سکتی ہے۔"

"میری نظر تم پر سے ہٹے گی تو نا۔" وہ گہری نظروں سے اسے دیکھتے ہوئے بولا تو وہ جھینپ گئی۔

"آئس کریم کھاؤ آئس کریم۔ میرے اتنے ہینڈسم کزن سے ہر وقت جیلس ہوتے رہتے ہو۔" مہماہ نے اسے چھیڑا تھا۔

"ہنہ۔" طلال نے ناپسندیدگی سے سر جھٹکا اور اسے گھورا۔

"مجھ سے زیادہ ہینڈسم لگتا ہے وہ تمہیں؟" مہماہ نے مسکراہٹ دبائی۔

"تم سے تھوڑا سا کم۔" وہ لمبا کھینچ کر بولی۔ ساتھ ہی چٹکی سے اشارہ بھی کیا۔

"بہت ماروں گا مہماہ!" اسے کچا چبانے والے انداز میں دیکھتے ہوئے بولا تو وہ ہنستے ہوئے کہنے لگی۔

"جلدی کرو۔ کبیر آنے والا ہو گا۔ مجھے الحمرا ڈراپ کرو۔ فٹافٹ۔"

"اف۔۔۔ ایک تو یہ خوامخواہ کی پابندیاں اور باڈی گارڈز۔" وہ سخت کوفت سے پیالے میں چمچہ پھینکتے ہوئے بولا۔

"شادی کے بعد دیکھنا' اتنی منتیں کروں گی تب لے کر جایا کرو کے لانگ ڈرائیو پر۔" مہماہ نے اپنا بیگ اٹھاتے ہوئے اسے چھیڑا۔

"وہ دن آنے تو دو مہو۔ دیکھنا کیسی زمانے بھر کی خوشیاں تمہارے قدموں میں ڈھیر کر دوں گا۔"

وہ گہرے لہجے میں بولا تو مہماہ کے چہرے پر خوب صورت سی مسکان پھیل گئی۔ پلکیں اٹھا کر ایک نظر اسے دیکھا۔ وہ اسی کی طرف متوجہ تھا۔

"مجھے پتا ہے۔۔۔"

"اعتراف محبت؟" وہ فوراً "اٹھ گئی تھی۔ طلال خوش دلی سے مسکرایا۔

✡ ✡ ✡

طلال کی ضد پر اسے نہ چاہتے ہوئے بھی لانگ ڈرائیو پر جانا ہی پڑا مگر سارے راستے وہ ٹائم دیکھتی رہی۔

"کال کر دو اسے' ٹھہر کے آجائے یا میں ڈراپ کر دوں گا۔" طلال نے مزے سے حل پیش کیا۔

"شام ہونے والی ہے طلال۔ آفس سے ابو اور چچا جان کو پک کرنے کی ذمہ داری بھی اب اسی کی ہے۔ آغا جان کو پتا چلا تو۔۔۔" وہ سخت پریشان تھی۔

"وہ آیا ہوتا تو کال کر لیتا نا۔ اسے بھی کوئی کام پڑ گیا ہو گا۔" طلال نے اسے تسلی دی۔

"ہاں۔۔۔ یہ بھی ہے۔" اسے خیال آیا۔ کبیر نے مس کال نہیں کی تھی۔ مطلب ابھی وہ نہیں آیا تھا اور اگر محترمہ مہماہ صاحبہ اس وقت ذرا سی دانش مندی دکھاتے ہوئے ایک بار اپنا موبائل فون چیک کر لیتیں تو انہیں پتا چل جاتا کہ وہ لو بیٹری کی وجہ سے شٹ ڈاون ہو چکا ہے۔ جانے کبیر نے کتنی کالز کر ڈالی تھیں۔

"اب بس طلال' واپس چلو۔" مہماہ نے دیئے ہوئے ٹائم سے آدھا گھنٹہ اوپر ہوتے دیکھ کر طلال کو سختی سے کہا تھا۔

"بڑی ظالم بیوی بنو گی۔" وہ ہنسا تھا مگر بہرحال گاڑی واپس موڑ ہی لی۔ راستے میں سے زبردستی اسے ہاتھوں میں پہننے کے لیے گجرے لے کر دیے۔

"تم جان بوجھ کر دیر کر رہے ہو طلال۔" اسے اب سخت بے چینی اور پریشانی ہو رہی تھی۔

طلال نے اسے الحمرا ہال ڈراپ کیا۔ وہاں کبیر کا نام و نشان تک نہ تھا۔

"ہوں... وہ ابھی پہنچا بھی نہیں اور تمہیں جلدی کی پڑی ہوئی تھی۔" طلال خفا ہونے لگا۔ مہاہ نے اسے دھکیلا۔
"تم نکلو جلدی سے۔ ہو سکتا ہے وہ ابو اور چچا جان کو پک کرتے ہوئے مجھے لینے آئے۔ میں کال کر لیتی ہوں اسے۔"
"اوفوہ... تو سسر صاحب سے ملنے میں کیا قباحت ہے بھلا۔ میں بھی ویٹ کر لیتا ہوں۔" وہ شرارت سے بولا۔
"طلال..." مہاہ کو غصہ آگیا۔ طلال کو بمشکل وہاں سے دھکیل کر بھیجا اور موبائل نکالا تاکہ کبیر کو کال کر کے صورت حال معلوم کرے۔ مگر تاریک اسکرین پر نگاہ پڑتے ہی اس کے قدموں تلے سے صحیح معنوں میں زمین نکلی تھی۔
"شٹ..." موبائل آن کرنے کی کوشش میں ناکام ہو کر اسے احساس ہوا کہ بیٹری کی چارجنگ ختم تھی۔
اس نے پریشانی سے ماتھا سہلایا۔
(اب تک تو گھر میں طوفان مچ چکا ہوگا۔) وہ ٹیکسی کی تلاش میں نظر دوڑانے لگی۔ اس بات سے بالکل بے خبر کہ اس سے کچھ فاصلے پر گاڑی میں موجود شخص اسی پر نظریں جمائے ہوئے ہے۔

☆ ☆ ☆

مہاہ کا کافی دیر انتظار کرنے اور مسلسل اس کا فون بند ملنے کے بعد پریشان ہو کر کبیر واپس گھر پہنچا۔ سوچا شاید مہاہ گھر پہنچ گئی ہو۔ مگر چوکیدار ہی سے پتا چل گیا کہ وہ واپس نہیں آئی تھی۔ اسی لمحے موحد کی گاڑی آکر اس کی گاڑی کے سامنے رکی۔ کچھ سوچ کر کبیر گاڑی سے نکل کر اس کی طرف بڑھا۔
"خیریت...؟" کبیر نے پریشانی کے عالم میں ساری بات اسے بتادی۔
"اب بتائیں... وہ گھر بھی نہیں آئیں اور موبائل بھی آف جا رہا ہے۔"
"ڈونٹ وری... مجھے پتا ہے وہ کہاں ہے۔" موحد نے اطمینان سے کہتے اسے تسلی دی۔ اسے تسلی تو کیا ہوتی وہ بے یقینی سے اس کی شکل دیکھنے لگا۔
مگر وہاں مذاق کی کوئی رمق موجود نہ تھی۔
"سچ کہہ رہا ہوں یار، تم جاؤ، چچا جان اور تایا جان ویٹ کر رہے ہوں گے تمہارا۔ میں اسے لے کر آتا ہوں۔ اپنی دوست کے ساتھ چلی گئی تھی وہ۔ وہیں تھا میں بھی... الحمرا میں۔" موحد نے اسے تسلی دی تو الحمرا کا حوالہ سن کر کبیر نے گہری سانس بھری۔ اگر موحد کو یہ پتا تھا کہ وہ مہاہ کو الحمرا چھوڑ کر آیا تو پھر وہ جھوٹ نہیں بول رہا تھا۔
موحد نے وہیں سے گاڑی آگے نکال لی اور کبیر اطمینان کی سانس لیتا آفس کے راستے چل دیا۔
مگر اسے یہ خیال نہیں آیا کہ ابھی کچھ دیر پہلے گھر فون کر کے مہاہ کی واپسی کا جو پوچھا تھا اس کا کیا؟ تائی جان تو بھری بیٹھی تھیں۔ وہ رکشے میں گھر لوٹی تھی۔ جلدی سے پیسے پکڑا کر رکشے والے کو فارغ کرتی بیل بجانے لگی۔
جب وہ گیٹ سے اندر داخل ہوئی تو اسی وقت وہی گاڑی گیٹ کے سامنے آکر رکی تھی۔
وہ جل تو جلال کا ورد کرتی اندر آئی تو لاؤنج ہی میں تائی جان، چچی جان اور باقی سب کی پریشان شکلوں کے ساتھ آغا جان غیض و غضب سے لال ہوتا چہرہ لیے موجود تھے۔
"کہاں تھیں تم؟" تائی جان شدید غصے میں تھیں۔
اور مہاہ جو سارے راستے بہانے سوچتی آئی تھی۔ خالی الذہن کی سی کیفیت میں کھڑی رہ گئی۔ اسی وقت کسی نے لاؤنج میں قدم رکھا۔
"السلام علیکم... میرے ساتھ تھی یہ..."

سب نے بے یقینی سے اس کا چہرہ دیکھا۔ اور تو اور مہاہ کو بھی اس سفید جھوٹ پر کرنٹ سا لگا۔ جبکہ آنے والا مطمئن تھا۔

☆☆☆

"میں نے بھی سوچ رکھا تھا کہ میں نمیر کو ایک نہ ایک دن وہاں ضرور لے جاؤں گا۔ جو اس کا حق ہے' وہ اسے دلواؤں گا بھابھی۔ آپ نے اس قدر جلد بازی کر کے کام بگاڑ دیا۔" فاران ماہانہ خرچ دینے آئے تو ثمرہ کی زرنگار پر خفا ہونے لگے۔

"ہونہہ۔۔۔ ہمارے کام سنورے ہی کب تھے بھائی صاحب۔۔۔ جو اب بگڑیں گے۔" وہ استہزائیہ مسکرا کر بولی۔

"میں معذرت چاہتا ہوں آپ سے' بس دکھ کی کیفیت میں آغا جان کچھ زیادہ ہی بول گئے۔" فاران نے پردہ رکھنا چاہا۔

"دکھ نہیں۔۔۔ ان لوگوں کو انا پسندی لے بیٹھی ہے بھائی صاحب' دکھ ہوتا تو اس یتیم کے سر پر ایک بار تو ضرور ہاتھ رکھتے۔" وہ آنسو پیتے ہوئے صاف گوئی سے بولی۔

فاران آفندی نے پاس بیٹھے نمیر کے شانے پر بازو پھیلا کر اسے اپنے ساتھ لگا لیا۔ وقار آفندی کا بیٹا بھی انہیں اسی کی طرح پیارا تھا۔ ان کا بس نہیں چلتا تھا وہ شام سے پہلے اسے آفندی ہاؤس لے جاتے۔ مگر جانے آغا جان کا دل پتھر کیوں ہو گیا تھا۔ وہ کڑھ کر رہ گئے۔

☆☆☆

"آغا جان۔۔۔ ہم نے وقار کو کھو دیا۔ اس کے غم میں ماں جی چلی گئیں۔ اب بس کر دیں پلیز۔۔۔ وقار کی آخری نشانی ہے اس کا بیٹا۔ اسے اپنا لیں۔ آپ کا اپنا خون ہے وہ۔۔۔"

وہ شام کو آغا جان کے پاس آئے تو پکا ارادہ تھا کہ ان کے خیالات اور اصولوں میں دراڑ ڈال کر ہی رہیں گے۔ مگر آغا جان کس غضب میں گھرے ہوئے ہیں یہ انہیں پتا ہی نہیں تھا۔

وہ فاران کی بات کے جواب میں پہلے تو خاموش رہے۔ پھر سرد مہری سے بولے۔

"تم اس طوائف پر پیسے لٹا رہے ہو آج کل۔۔۔؟" فاران چکرا کر رہ گئے۔ خفگی سے پوچھا۔

"آغا جان۔۔۔ کیا کہہ رہے ہیں آپ؟"

"کہو کہ یہ جھوٹ ہے۔ جب سے وقار مرا ہے تم باقاعدگی سے وہاں جاتے بھی ہو اور روپیہ بھی لٹاتے ہو اس پر۔۔۔" تنفر کی حد تھی۔ فاران سناٹے میں آ گئے۔

"تم مجھے دھوکا دیتے رہے ہو فاران۔۔۔ مجھے۔۔۔ غلطی ہو گئی مجھ سے جو تمہیں وقار سے الگ سمجھا میں نے۔ تم بھی اسی غلاظت میں گر گئے جا کر۔۔۔" ان کی آنکھیں انگاروں کی طرح دہکنے لگیں۔

"خدا کے لیے آغا جان۔۔۔ بس کر دیں۔" فاران پھٹ پڑے تھے۔ "ان کا خرچ دے رہا ہوں بس۔۔۔ ان کا حق ہے یہ۔۔۔"

"بس تو تم لوگوں نے کر دی ہے میری فاران آفندی۔ اٹھاؤ اپنا بوریا بستر اور اسی خبیث عورت کے پاس شفٹ ہو جاؤ تم بھی۔۔۔" وہ قطعیت سے بولے تھے۔

وقار کے بعد فاران کی دھوکا دہی نے ان کا دماغ گھما دیا تھا۔ بعد میں شاید غصہ ٹھنڈا ہوتا تو وہ اپنی باتوں پر نظر ثانی کر لیتے مگر فاران کا دل اس قدر بری طرح ٹوٹا کہ وہ اسی شام بیمار موحد اور ثمرہ کو لیے وہاں سے نکل گئے۔

صدیقہ بھابھی نے بظاہر روکا۔ مگر دل میں اترتی ٹھنڈک تھی کہ بڑھتی ہی چلی جاتی تھی۔ سائرہ نے میاں کو فون کیا۔ مگر سہیل کے آنے تک وہ لوگ آفندی ہاؤس سے ہمیشہ کے لیے جا چکے تھے۔

آغا جان کو پتا چلا تو وہ ساکت سے رہ گئے۔ بلندیوں پر رہنے والے اکثر' تنہا ہوتے ہیں۔ مگر انہیں اس بات کا شعور بہت دیر سے آتا ہے۔ آغا ذوالفقار علی آفندی بھی ان ہی میں سے تھے۔

ان کے گھر کا شیرازہ بکھر گیا تھا۔ وہ شدید ٹوٹ پھوٹ کا شکار ہوئے مگر اسی تنہائی میں۔۔۔ اسٹڈی کا دروازہ بند کرکے۔

اللہ نے منتوں' مرادوں کا پوتا دیا تھا۔ ایک کو ناجائز کہہ کر مسترد کردیا۔ جو جائز تھا اسے ناجائز طریقے سے جدا کردیا۔

ہوگا کوئی آغا ذوالفقار علی آفندی جیسا بے مراد اور شقی القلب شخص۔۔۔

مگر اے بندے! اللہ کی لاٹھی بے آواز ہے۔ ہر زبردست کو ایک نہ ایک دن زیرِ دست آنا ہی ہے۔ حق اللہ۔ لاٹھی کھائے بغیر سمجھ میں کسی کسی کو ہی آتا ہے۔

✡ ✡ ✡

موحد آفندی نے اتنے آرام سے جھوٹ بول کر اسے آغا جان کے غضب سے بچالیا تھا کہ مہماہ چکرا کر ساری صورت حال دیکھتی رہ گئی۔ اب کسی کو یقین آیا ہو یا نہیں مگر بات ختم ضرور ہوگئی تھی۔ وہ اس کے پیچھے جانے کو تھی جب صدیقہ بھابھی اسے بازو سے پکڑ کر تقریباً گھسیٹتی ہوئی اپنے کمرے میں لے گئیں۔

"اب مجھے ٹھیک سے بتاؤ۔۔۔ کہاں تھیں تم اور کس کے ساتھ؟" انہوں نے غرا کر پوچھا۔

"اوفوہ۔۔۔ بتا کر تو گئی تھی امی۔۔۔" وہ جھنجلائی۔ اس ساری صورت حال نے ویسے ہی انجر پنجر ڈھیلے کردیے تھے' اوپر سے اب یہ پوچھ گچھ۔

"تو وہ کیوں کہہ رہا ہے کہ تم اس کے ساتھ تھیں؟"

"دیر ہوگئی تھی مجھے طلال کے ساتھ امی۔ موحد نے بس ذرا سی فیور دے دی مجھے۔" وہ نادم سی ہوکر بولی تو وہ اسے گھور کر رہ گئیں۔

✡ ✡ ✡

دروازے پر دستک ہوئی تھی۔

"یس۔۔۔ کم آن۔۔۔" وہ مصروف سا بولا۔ مہماہ اندر داخل ہوئی۔ موحد آفندی کا شکریہ ادا کرنا تو بنتا ہی تھا نا۔

"تم۔۔۔ تم کیا لینے آئی ہو یہاں؟ گیٹ لوسٹ۔" وہ سرد لہجے میں کہتا اس تک آیا۔ وہ جو موحد کے اس قدر حیران کن انداز پر ششدر سی کھڑی تھی۔ اس کا ہاتھ پکڑا اور اسے کمرے سے باہر کرکے دروازہ دھاڑ سے بند کردیا۔

باہر حق دق کھڑی مہماہ کی آنکھیں اس قدر بے عزتی پر بھر آئیں۔ اور اندر بستر پر بیٹھ کر جوتے اتارتے ہوئے موحد آفندی کے ہونٹوں پر محظوظ کن مسکراہٹ کھیل رہی تھی۔

باقی ان شاء اللہ آئندہ ماہ

تیری اک نظر

اسما طاہر

وہ لاؤنج میں چُپ چاپ بیٹھا اپنی شادی کا ہنگامہ دیکھ رہا تھا۔ زرق برق سوٹ پہنے میک اپ سے سجے چہرے، ہار پھول، کھانا، خوشیاں، سب ہی لوازمات تو تھے اگر نہیں تھا تو وہ یہاں نہیں تھا۔ اس کا ذہن دور کسی صدمے میں گم تھا۔ کار پہ سجے پھول اس کے سینے میں کانٹوں کی طرح چبھتے رہے تھے۔ دلہن کے پسماندہ دیہات کے ڈھولک کی آواز ابھی تک اس کے کانوں میں گونج رہی تھی۔ رہا اچھا مستقبل! تو وہ بھی اسی ڈھول میں گم کر آیا تھا۔

”بیٹا! رات بہت ہو گئی ہے اب تم بھی جا کر سو جاؤ۔“ امی کے احساس دلانے پر اسے اندازہ ہوا کہ سارا ہنگامہ کب کا ختم ہو چکا ہے۔

وہ اس کی خاموشی اور افسردگی دیکھ رہی تھیں مگر کچھ بولی نہیں۔ وہ تھکے قدموں سے چلتا ہوا اپنے کمرے میں آیا تھا۔

دلہن کے سُرخ زرتار دوپٹے کو دیکھتے ہی دن بھر کی افسردگی غصے کی آگ میں بدل گئی تھی۔ اس کے

خوابوں اور آرزوؤں کی بربادی کی وجہ وہی تو تھی۔

"خوش آمدید" وہ اس کے سامنے آبیٹھا تھا۔ "کیسا لگا آپ کو شہر؟" اس کے لہجے میں کچھ تو ایسا تھا' اس نے چونک کر سر اٹھایا۔

"بتیاں دیکھیں؟" الفاظ تھے کہ پتھر۔ اس اہانت پر اس کا چہرہ سرخ ہو رہا تھا' یہاں تک کہ دوپٹے اور اس کے چہرے کا رنگ ایک سا ہو گیا تھا۔ مگر وہ بولے جا رہا تھا۔

"اتنا بڑا اور خوب صورت گھر بھی پہلے کبھی نہیں دیکھا ہو گا' ہے نا؟" وہ اسی دھیمے مگر زہر خند لہجے میں بولا تھا۔ جیسے ایک ایک لفظ کا مزہ لے رہا ہو۔

"اس گھر میں بہت سارے لوگ بھی ہیں اور چیزیں بھی جو آپ نے زندگی میں نہیں دیکھی ہوں گی تو تعارف ضروری ہے۔ سب سے پہلے مجھ سے ملیں میں ہوں سلمان' اس گھر کا سب سے لائق اور قابل بیٹا اور اتنا ہی بدقسمت بھی' آپ سے شادی جو ہو گئی۔ اب آیئے کمرے کی چیزوں کی طرف۔ آج سے پہلے یہ سب کچھ خواب میں بھی نہیں دیکھا ہو گا آپ نے' ہے نا' میں صحیح کہہ رہا ہوں ناں؟" اس نے جیسے اپنے ہی لفظوں کی تصدیق چاہی۔ مگر وہ کچھ کہنے بتانے کی پوزیشن میں ہی کہاں تھی۔ سارے جملے اچانک اور اس کی توقع کے برعکس تھے۔

"یہ جو آپ کے سر کے اوپر ہے' اسے پنکھا کہتے ہیں۔ خودکشی کرنے کے کام بھی آتا ہے' آپ نہ کیجیے گا' ویسے اس کی نوبت نہیں آئے گی۔ یقیناً" سنا ہے دیہاتی بہت سخت جان' مطلب ڈھیٹ ہوتے ہیں۔

وہ خود ہی سوال جواب کر رہا تھا۔

"اور یہ جو دیوار کے ساتھ لگا ہے اسے اے سی کہتے ہیں۔ یہ کمرہ ٹھنڈا کرتا ہے۔ یہ ٹیوب لائٹ ہے۔ یہ سائیڈ ٹیبل ہے۔ یہ لیمپ ہے۔ یہ وہ ہے' یہ وہ ہے۔"

وہ بولے جا رہا تھا اور وہ آنکھیں پھاڑے حیرت سے اسے دیکھ رہی تھی۔ اچھے خاندان کا قابل انسان اندر سے اس قدر زہریلا ہو گا' اس نے سوچا بھی نہیں تھا۔ وہ لفظوں کی صورت زہر اس کی رگ رگ میں اتار رہا تھا۔ اس کے چہرے پر اس کے لیے نفرت' حقارت' غصہ کیا کچھ نہ تھا۔ پہلی ملاقات کا یہ نقشہ ہو گا اس کے وہم و گمان میں بھی نہیں تھا۔ نہ حسن کی تعریف نہ ساتھ نبھانے کا وعدہ' وہ اسے الیکٹرونکس پڑھا رہا تھا۔

☆ ☆ ☆

صبح ہوتے ہی اس نے یہاں سے جانے کا فیصلہ کیا تھا۔ وہ جس کے لیے یہاں لائی گئی تھی۔ جب اسے ہی اس کی ضرورت نہیں تھی' بلکہ وہ اس کے لیے شرمندگی کا باعث تھی شاید۔ تو پھر یہاں زبردستی رہنے کا کیا جواز تھا۔ پھر رات اس نے اسے جس ذلت اور شرمندگی سے دوچار کیا تھا۔ وہ یہ سب دوبارہ نہیں سہ سکتی تھی۔

نماز کے بعد اس نے معمول کی دعائیں مانگی خاص طور پر ابو کی صحت کی دعا اور اچانک جیسے اس کی یادداشت واپس آ گئی تھی اپنا گھر' گھر کے سب لوگ' ابو ان کی بیماری سب یاد آ گیا تھا۔ اس کے گھر میں سکون تھا' محبت تھی' احساس تھا۔ اس کے گھر میں خوشیوں اور امیدوں کے چراغ جل اٹھے تھے۔ اب ان چراغوں میں اس کا خون جلتا یا دل' اسے ہر حال میں انہیں روشن رکھنا تھا۔ واپسی کا فیصلہ رات کو جتنا آسان لگا تھا اب اتنا ہی ناممکن لگ رہا تھا۔ وہ واپس جا کر اپنے ماں باپ کو کیسے شرمندہ کر سکتی ہے' اس کی قسمت میں جو کچھ تھا اسے مل گیا تھا۔ اب زندگی چاہے کتنی ہی محروم گزرتی' اس نے ہر چیز پر عزت کو ترجیح دی تھی۔

وہ بھی جاگ چکا تھا۔ رات کی ایک ایک بات اسے یاد آ رہی تھی۔ ڈھیروں زہر اگلنے کے بعد اسے اپنے رویے پر تھوڑا سا پچھتاوا ہوا تھا۔ اس نے آئندہ ایسا نہ کرنے کا کمزور سا ارادہ بھی کیا تھا۔ مگر اسے دیکھتے ہی اس کا غصہ دوبارہ لوٹ آیا تھا۔ وہ ایک جھٹکے سے اٹھ کر باتھ روم میں گیا۔ آئینے کے سامنے کھڑے ہو کر اس نے خود کو غور سے دیکھا۔ کس چیز کی کمی تھی اس میں پھر اس کے ساتھ آخر ایسا کیوں ہوا تھا' اس کی قسمت

کھوئی نکلی تھی۔ اس کے اپنے ہی ماں باپ نے اس دیہاتن کو لاکر کس قدر آسانی سے اس کے خوابوں کا خون کردیا تھا اور اس نے یہ ہونے دیا تھا۔ وہ اس کے بارے میں وہی باتیں جانتا تھا۔ وہ دیہاتن تھی اور مڈل پاس تھی، اور ان ساری معلومات کا منبع اس کی بھابھیاں تھیں، جو اس کی معلومات میں اضافہ کرتی رہتی تھیں۔ جتاتی رہتی تھیں۔

"سنا ہے خالی ہاتھ جھلاتی آرہی ہے پینڈو، نہ تعلیم نہ شکل نہ پیسہ۔ جہیز وغیرہ بھی کچھ نہیں ہوگا۔ ہم کیا پاگل تھے ٹرک بھر بھر سامان لائے۔ حالانکہ ماں باپ پہلے ہی تعلیم پر کروڑوں خرچ کرچکے تھے۔"

یہ بڑی بھابھی تھیں شہر کی مشہور گائناکالوجسٹ، ان کا دن رات کلینک پر ہی گزرتا تھا۔ کافی بھاری فیس تھی ان کی اس کے ساتھ ساتھ ذاتی لیبارٹری اور میڈیکل اسٹور کا دھندہ بھی زوروں پر تھا۔ جس جگہ سے ہن برس رہا تھا ترجیح بھی اسی کو حاصل تھی۔ گھر، رشتے، ذمہ داریاں سب خاموشی سے ان کی زندگی میں کہیں دبکے پڑے تھے۔

"حیرت ہے ہم اس شادی پر راضی کیسے ہوئے۔ کہاں تمہارے اونچے خواب اور کہاں یہ دیہاتن۔ ڈیڈی نے اپنے گاؤں کے کسی دوست کی بیٹی پسند کرلی، تم نے بھی آؤ دیکھا نہ تاؤ، اسے بیاہنے چل دیے۔"

یہ آفرین بھابھی تھیں خیر سے انجینئر تھیں نائن ٹو فائیو والی نوکری، دفتر کی میٹنگز، پارٹیاں ٹورز ہی ان کی زندگی تھے۔ تنخواہ کے لاکھوں روپے ان کی ذاتی تزئین و آرائش پر ہی خرچ ہوتے لیکن عدیل بھائی سے بھی ہر ماہ ایک موٹی رقم وصول کرتی تھیں۔ اگر دیر ہوجاتی تو خوب ہنگامہ کرتیں۔ اس کے باوجود اس کے بھائی ان حسین، طرح دار کیریر وومن پر جتنا فخر کرتے کم تھا۔

بچے کسی کے بھی نہیں تھے، کیونکہ ابھی انسان نہیں کیریئر بنانے کا وقت تھا۔ یہ لڑکی مینا ان کے رویوں کے ردعمل کے طور پر لائی گئی تھی یہ بات وہ جانتی تھیں یہی وجہ تھی کہ وہ سلمان کے سامنے اپنا اور اس کی بیوی کا تقابلی جائزہ پیش کرتی رہتی تھیں۔ جو کسی طور بھی اس جیسے اعلا انسان کے لائق نہیں تھی۔

"ہم حیران ہیں تم جیسا انسان اس لڑکی کے ساتھ کیسے زندگی گزارے گا۔"

وہ خود بھی حیران تھا۔ اس لڑکی کے ساتھ کیسے زندگی گزارے گا؟ گزارے گا بھی یا نہیں؟ ممی ڈیڈی نے اسے ایسے گھیرا تھا جیسے یہ شادی نہ ہوئی تو خاندان پر نہ جانے کتنی بڑی قیامت ٹوٹ پڑے گی۔ اور کسی کمزور لمحے کی گرفت میں آکر وہ ہاں کر بیٹھا تھا اور یہی کمزور لمحہ زندگی کی سزا بن گیا تھا۔

جیسے جیسے وقت گزرتا جارہا تھا۔ اس کی جارحیت اور مینا کی خاموشی بڑھتی جارہی تھی۔ وہ اسے تکلیف دینے کا کوئی موقع ہاتھ سے جانے نہ دیتا۔ کبھی کبھی اسے لگتا وہ گونگی ہے۔ مگر جب بھی وہ اس کی آنکھیں سرخ دیکھتا اسے تھوڑا سا پچھتاوا ہوتا۔ وہ خود نہیں آئی تھی لائی گئی تھی۔ مگر اب ماں باپ پر تو وہ غصہ نکالنے سے رہا۔ لیکن وہ یہ سب کچھ کیوں سہ رہی تھی۔ وہ یہ سمجھنے سے قاصر تھا۔ آخر وہ چلی کیوں نہیں جاتی۔ یہاں آنا اس کے اختیار میں نہیں تھا مگر جانا تو تھا۔ لیکن اگر وہ پھر بھی یہاں تھی تو اسے اس کی پوری پوری قیمت چکانا ہوگی۔

اس نے خود کو بہت مصروف کرلیا تھا۔ گھر کے ہر حصے میں اس کی مداخلت اور کارروائی صاف نظر آتی۔ وہ سلمان کی بھی ہر ضرورت جیسے ٹیلی پیتھی کے ذریعے جان کر پوری کردیتی۔ اسے اپنی ہر چیز اپنی جگہ پر تیار ملتی، کھانے کی میز پر بھی لطف اور مزہ بڑھتا جارہا تھا۔ اسے گھر آتا ہی بڑا لان کے پھلوں اور پھولوں میں بھی اضافہ ہوا تھا۔ حتیٰ کہ کچن گارڈن میں سبزیاں تک اگائی جارہی تھیں۔

اسے یقین تھا کہ کچھ دنوں میں کچن کے پچھواڑے دو بھینسیں بھی بندھی ہوں گی اور اس کے کپڑوں کی الماری سے انڈے دیتی مرغیاں بھی برآمد ہوں گی مگر وہ اس کی اس ساری محنت سے ذرا بھی متاثر نہیں تھا۔ یہ سارے کام تو ملازم بھی کررہے تھے۔

مینا نے پہلے پہل تو یہاں رہنے کا فیصلہ ماں باپ کی

محبت میں کیا تھا۔ اس کے بعد باقی سب کچھ اس کی محبت میں۔ یہ ناراض شخص کب اس کے دل میں آبسا تھا اسے پتا ہی نہیں چلا تھا۔ اس کے آس پاس رہنا، اس کے کام کرنا‘ حتیٰ کہ اس کی ڈانٹ کھانا بھی اب اسے اچھا لگتا تھا۔

اس کی اس درجہ سعادت مندی پر وہ اور چڑ جاتا اسے یہ سلیقہ مشین نہیں چاہیے تھی۔ اسے ایک حسین 'تعلیم یافتہ' پر اعتماد بیوی کی ضرورت تھی۔ جو اس کے گھر کے اندر ہی نہیں باہر کی زندگی میں بھی پوری طرح سے شریک ہو۔ کچھ اختلافات کے باوجود وہ اپنی بھابھیوں کو بہت پسند کرتا تھا۔ وہ ذہین تھیں۔ اعلا تعلیم یافتہ اور اپنے اپنے شعبے میں بہت قابل‘ ان کی اپنی ایک الگ اور مضبوط شخصیت تھی۔ وہ کسی کی محتاج یا پابند نہیں تھیں۔ مگر اس کی بدقسمتی یہ تھی کہ اسے بیوی اپنی ترجیحات کے بالکل برعکس ملی تھی۔ جو صرف گھر چلا سکتی تھی۔ حالانکہ آج کی دنیا میں عورت کے لیے مخصوص سمجھے جانے والے کام اب مشینیں زیادہ بہتر کررہی تھیں۔ بچے ہاسٹلوں میں زیادہ اچھے طریقے سے پل رہے تھے ایسے میں عورت کی قابلیت کو گھر میں دفن کرنا اماں کی عقل مندی تھی۔ مگر اس کے ساتھ یہ سانحہ پیش آچکا تھا۔

اس کی بیوی میں اکیلے گھر سے باہر نکلنے کی قابلیت بھی نہیں تھی۔ اس کی ساری دلچسپیاں گھر اور شوہر تک محدود تھیں۔ وہ ذرا سا بھی بیمار پڑتا‘ وہ بے چین ہوجاتی‘ ایسی فکر اور بے چینی تو اس نے ممی کے چہرے پر بھی نہیں دیکھی تھی اپنے لیے اس کے باوجود وہ اسے کوئی اہمیت نہ دیتا۔ وہ ایک پریکٹیکل آدمی تھا۔ جذباتیات کے مضمون میں اسے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔

❊ ❊ ❊

وہ آفس کے لیے نکل ہی رہا تھا جب ڈیڈی نے اسے بٹھالیا۔

''ہم سب تمہارا رویہ دیکھ رہے ہیں۔'' وہ کہہ رہے تھے۔ ''لیکن بولتے اس لیے نہیں کہ میاں بیوی کا مسئلہ تم آپس میں ہی حل کرلو تو اچھا ہے۔''

''ڈیڈی! آپ نے اور ممی نے اپنا بڑھاپا آرام دہ بنانے کے لیے بیٹا قربان کردیا۔ ایک مڈل پاس دیہاتن میرے سر تھوپ دی۔ نباہ تو رہا ہوں اب اور کیا کروں۔'' وہ سخت ناراض تھا۔

''تو تم کو اس بات پر اعتراض ہے کہ اس کا تعلق دیہات سے ہے۔'' وہ اسے غور سے دیکھ رہے تھے۔ ''بیٹا دیہاتی تو میں بھی ہوں۔ گاؤں سے شہر آیا تھا۔ تمہاری ماں بھی ایک دیہاتی کی اولاد ہے تو پھر ہمارے لیے کیا سزا ہے؟ بولو! رہا سوال اس کے مڈل پاس ہونے کا۔'' وہ اسے خاموش دیکھ کر دوبارہ بولے تو اس کی وجہ یہ ہے کہ گاؤں میں مڈل تک ہی اسکول تھا۔ اس کے بعد کی داستان قربانی کی داستان ہے۔ جس سے تمہیں یقیناً کوئی دلچسپی نہیں ہوگی۔ لیکن صرف تمہاری معلومات کے لیے بتارہا ہوں۔ مینا کا باپ ایک قابل پروفیسر تھا‘ سارے جہان میں علم بانٹنے والا گیا اپنی اولاد کو بھول جائے گا‘ اس نے بیٹی کو شہر بھیجنا چاہا مگر وہ خود نہیں گئی۔ جانتی تھی ’باپ بیمار ہے۔ گھر میں مسائل ہیں۔ اسی لیے اس نے پڑھا تو بہت کچھ ’مگر پرائیویٹ اپنے قابل باپ کی زیر نگرانی۔''

وہ بول رہے تھے مگر وہ اسی طرح لاتعلق بیٹھا تھا۔

''بیٹا! اپنی مصنوعی اور نمائشی دنیا سے باہر آؤ۔ انسان کی قدر کرنے کے لیے اتنی بات کافی ہے کہ وہ انسان ہے۔ اور جان لو‘ علم ڈگری کا محتاج نہیں‘ نہ ہی ڈگری علم کی ضمانت ہے۔ میں برسوں سے مینا کے باپ کو جانتا ہوں۔ میں نے دیکھا ہے کہ مسائل کے باوجود یہ سب ایک دوسرے سے جڑے ہوئے ہیں۔ ایک دوسرے پر جان چھڑکتے ہیں۔ تب مجھے یقین ہوگیا کہ میرے خاندان کو بے حسی اور خود غرضی سے اگر کوئی بچا سکتا ہے تو وہ یہی لڑکی ہے۔''

وہ بڑے یقین سے کہہ رہے تھے۔

''مینا ہی وہ لڑکی ہے جو تمہارے گھر میں اس نسل کی بنیاد رکھ سکتی ہے جو محبت‘ خلوص اور احساس جیسی

خوبیاں رکھتی ہو۔ میں تمہارے سامنے یہ بات کرنا نہیں چاہتا مگر حقیقت یہ ہے کہ تمہاری ماں سے شادی میری زندگی کی سب سے بڑی غلطی تھی، میں اپنی اولاد کو نہ ماں دے پایا نہ گھر۔"

ان کے لہجے میں پچھتاوا تھا۔ "پھر میرے بیٹے بھی چمک کے پیچھے ہی بھاگے میں انہیں پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ فرمان نہیں سنا پایا کہ لوگ شادی کے لیے خاندان، حسن اور دولت دیکھتے ہیں، مگر تم دین دیکھنا، ان کی ایسی کوئی تربیت ہی نہیں کی تھی۔ اپنی اور اپنے بیٹوں کی زندگی برباد کرنے کے بعد میں اس نتیجے پر پہنچا کہ عورت کا گھر میں رہنا کس قدر ضروری ہے۔ ارے چھوٹی سی کریانے کی دکان تک تو چلتی نہیں جب تک مالک خود نہ بیٹھے تو گھر، جہاں نسلوں کی آبیاری ہوتی ہے۔ عورت کے بغیر چل سکتا ہے کیا؟ یہ بات اب تو تمہاری ماں کی سمجھ میں بھی آگئی ہے۔ اسی لیے میں نے جب مینا کو تمہارے لیے منتخب کیا تو اس نے میرا ساتھ دیا۔ کیونکہ وہ بھی بہوؤں سے بہت مایوس تھی۔ جو اپنی ذات میں سے کسی کو کوئی حصہ یا حق دینے کو تیار نہیں۔ پھر تم بھی کسی نہ کسی طرح مان گئے۔ شاید اللہ کو اس خاندان کی حالت زار پر رحم آگیا، بیٹے میں اپنے ہی گھر سے مایوس اور ہارا ہوا انسان ہوں۔"

ان کے لہجے میں عجیب سی تھکاوٹ تھی۔ "مینا کی صورت میں امید کی ایک کرن چمکی ہے اسے بجھنے نہ دینا۔ اپنی بیوی کی قدر کرو ورنہ تمہارا حال بھی مجھ سے مختلف نہیں ہوگا، کیونکہ اس عمر میں مایوسی اور تنہائی بہت تکلیف دیتی ہے۔"

ڈیڈی خاموش ہو گئے تھے اور وہ بھی کسی سوچ میں گم، آفس آگیا تھا۔

☼ ☼ ☼

آج عاصم کے ساتھ اس کی اہم میٹنگ تھی۔ وہ اس کا بچپن کا دوست بھی تھا اور اب بزنس پارٹنر بھی، مگر وہ بھی آج بہت تھکا ہوا اور بے زار لگ رہا تھا۔

رات اس نے اپنی بیوی کے ساتھ ڈنر اس کے گھر پر ہی کیا تھا۔ تب تو وہ بالکل ٹھیک تھا۔

"یہ تھکن تو اب ساری زندگی کی کہانی ہے۔" پوچھنے پر وہ سر دباتے ہوئے بولا تھا۔

"اور اس کہانی کا ولن یقیناً" ہماری بھابھی ہیں۔" سلمان شرارت سے مسکرایا۔

"بالکل۔"

"ارے ہاں بھابھی سے یاد آیا۔ تم دونوں میاں بیوی تو بڑے چھپے رستم نکلے اور زیادہ افسوس اس بات کا ہے کہ تم نے کبھی کچھ نہیں بتایا۔" وہ شکایتی لہجے میں بولا۔

"بھئی کیا نہیں بتایا؟" وہ اس کی بات سمجھ نہیں پا رہا تھا۔

"آج کا اخبار دیکھا، ہماری بھابھی کا بڑا زبردست کالم چھپا ہے۔" عاصم نے جیسے بریکنگ نیوز دی۔ "بھئی کیا گرفت ہے موضوع پر، کیا تجزیہ ہے۔ میں تو یہی سمجھتا رہتا کہ یہ کسی بڑی عمر کے تجزیہ کار اور دانشور کا کالم ہے۔ وہ تو کل شائستہ نے بتایا کہ یہ مشہور کالم نگار جن کا کالم بیک وقت انگریزی اور اردو اخبار میں چھپتا ہے کوئی اور نہیں ہماری بھابھی ہیں زرمین جمال، بھئی میں تو حیران رہ گیا۔ مجھے تو ہمیشہ سے ان کے کالم بہت پسند رہے ہیں۔ ان کا فیس بک پیج دیکھو، لاکھوں فالوورز ہیں۔ جو عالمی ایشوز پر ان کی رائے کا انتظار کرتے ہیں، اسے اہمیت دیتے ہیں۔"

"تو آج تھا ہی انکشافات کا دن۔" اس نے اپنے آپ کو بہلایا اور حقیقت تو یہ ہے کہ اس کی بیوی کا نام اور کام کیا تھا۔ وہ دوسروں سے سن رہا تھا۔ نکاح کے وقت اس کا اصل نام سنا ہوگا۔ مگر تب وہ ذہنی طور پر وہاں تھا کہاں پھر گھر میں سب اسے مینا ہی کہتے تھے۔ وہ کیسے جان پاتا کہ اس کے گھر میں اس کے ساتھ رہنے والی مینا ہی دراصل مشہور کالم نگار زرمین جمال ہے۔

آدھی آدھی رات تک وہ کچھ لکھتی تو ضرور تھی۔ دودھ والے کا حساب لکھ رہی ہوگی دیسا تن، اس نے ہمیشہ یہی سوچا تھا۔

گھر آنے والے اخبارات کی تعداد میں بھی اضافہ ہوا تھا۔ جو اکثر اسی کے کمرے میں پائے جاتے۔ اچھا!

تو محترمہ اخبار کی دنیا کا ہاٹ کیک تھیں۔

"اور ہاں شائستہ بتا رہی تھی۔" عاصم کی کہانی ابھی ختم نہیں ہوئی تھی کہ بھابھی کو ایک دو غیر ملکی یونیورسٹیز سے انٹرنیشنل ایشوز پر لیکچرز کی بھی آفر ہے مگر انہوں نے گھریلو مصروفیات کا کہہ کر معذرت کر لی ہے۔"

"گھریلو مصروفیات!" وہ تکلیف دہ ہنسی ہنسا تھا۔ "آخری دفعہ تم نے کب سنا کہ میری بیوی یا تمہاری بھابھیوں نے حتیٰ کہ ہماری ماؤں نے گھریلو مصروفیات کی بنا پر اپنی کوئی تفریح چھوڑی ہو؟"

عاصم اس سے پوچھ رہا تھا مگر وہ اپنی ہی سوچ میں گم تھا۔

تو کیا میرے گھر کا انتظام چلانا اور میرے لان میں پھل پھول اگانا اس کے لیے اتنا اہم تھا کہ وہ اس کے لیے کچھ بھی چھوڑ سکتی تھی۔ وہ خود کو بہت عقل مند سمجھتا تھا، شرمندہ ہونا نہیں چاہتا تھا۔ مگر ہو رہا تھا۔

☼ ☼ ☼

تنازعہ تو دونوں کے درمیان عرصے سے چل رہا تھا مگر نتیجہ طلاق ہوگا' یہ کسی نے نہیں سوچا تھا۔ دو واقعات ایک ساتھ ہوئے۔ عدیل بھائی کے ہاں بچے کی پیدائش اور آفرین بھابھی کی ان سے علیحدگی۔ عدیل بھائی کو طلاق اور اپنے بچے کی ماں سے محرومی نے اتنی تکلیف نہیں دی تھی۔ جتنی اس خبر نے دی کہ آفرین بھابھی کے معاملات بہت عرصے سے اپنے ایک کولیگ کے ساتھ چل رہے تھے۔ وہ بہت پہلے طلاق لے لیتیں مگر بچے کی پیدائش تک انہیں رکنا پڑا۔ وہ ماضی کی کوئی نشانی ساتھ نہیں لے جانا چاہتی تھیں۔ انہوں نے کبھی بھی عدیل بھائی کو اپنے لائق نہیں سمجھا تھا۔ صرف آسائشوں کے حصول کے لیے انہیں استعمال کیا تھا۔

بڑی بھابھی بھی راحیل بھائی کو لے کر اپنے ماں باپ کے گھر شفٹ ہو چکی تھیں کیونکہ وہ قریب تھا کلینک سے۔ اپنے گھر کے ہوتے راحیل بھائی گھر داماد جا بنے تھے زندگی پر پہلے ہی ان کا اختیار بہت کم تھا اب تو وہ بالکل ہی بے بس ہو گئے تھے۔

ادھر عدیل بھائی کی طبیعت اچانک ہی بہت بگڑ گئی تھی۔ انہیں اسپتال شفٹ کرنا پڑا تھا۔ وفا سے خالی عورت اتنا بڑا سانحہ ہو سکتی ہے' وہ سوچ بھی نہیں سکتا تھا۔ ممی ڈیڈی اسپتال میں ہی تھے۔ وہ ابھی ابھی گھر آیا تھا۔ مینا دو تین دفعہ آچکی تھی۔ شاید عدیل بھائی کا پوچھنے یا پھر کھانے کا۔ مگر پھر بغیر کچھ کہے چپ چاپ چلی گئی تھی۔ ٹھیک بھی لگا تھا' ان کے بیچ کچھ کہنے سننے کا تعلق بنا ہی کب تھا' اور اب وہ مصروف بھی بہت تھی' عدیل بھائی کے بچے کو وہ سنبھال رہی تھی۔

ان کی حالت سلمان کو بہت کچھ سوچنے پر مجبور کر رہی تھی۔ گھر بنانے کے لیے ضروری چیز کیا تھی؟ عورت کی محبت' وفا' قربانی یا پھر اس کا گلیمر' جس عورت کے لیے سیلف گرومنگ سب کچھ ہو۔ وہ خود غرضی کی دلدل میں دھنستی چلی جاتی ہے۔ اپنے لیے ہی جیتی ہے۔ جو کچھ آفرین بھابھی نے کیا اگر یہی کچھ ممی نے کیا ہوتا یا پھر مینا نے.....

اسے ایک دم سے گلے میں پھندا سا محسوس ہوا تھا۔ وہ اس سے آگے کچھ نہیں سوچ سکا تھا۔ اس کے اندر کی طبیعت اس کے خیالات سے بالکل مختلف نکلی تھی۔ عدیل بھائی جیسا سانحہ اسے اپنے لیے ناقابل برداشت لگ رہا تھا۔ اس نے ریموٹ اٹھا کر ٹی وی آن کر لیا۔ کوئی مارننگ شو ہوسٹ اچھل اچھل کر گھر برباد کرنے کے سارے نسخے بتا رہی تھی' گھر آباد کرنے کا ایک بھی نہیں۔ اس نے بیزاری سے ٹی وی بند کر دیا۔ کہیں سکون نہیں تھا اس کے اندر ایک جنگ چل رہی تھی۔ ساری زندگی کے پالے پوسے نظریات بدلنا آسان نہیں تھا۔

☼ ☼ ☼

پچھلا ایک ہفتہ اس پر بھاری گزرا تھا۔ وہ اپنے آپ کو بہت تنہا اور کمزور محسوس کر رہی تھی۔ اس نے اپنے ابو کو ہی نہیں بلکہ ان کی شکل میں ایک بہترین دوست' استاد اور ہمدرد کو بھی کھو دیا تھا۔ اچانک ہی ان

کی وفات کی خبر ملی تھی۔
سلمان اسے لے کر فوراً" گاؤں روانہ ہو گیا تھا۔
یہاں آکر اس نے سارے معاملات اپنے ہاتھ میں لے لیے تھے۔ آج ابو کو گئے کئی دن ہو گئے تھے۔ مگر وہ ایک عجیب کیفیت میں تھی۔ وہ اسے بڑی مشکل سے باہر لایا تھا کہ شاید اس کی طبیعت بحال ہو جائے۔ موسم خوش گوار تھا۔ بارش کے بھی آثار تھے۔ ان کے آس پاس سرسبز لہلہاتے کھیت تھے۔ جن میں سرسوں پھولی ہوئی تھی۔ گویا کہ سبز اور پیلے رنگ کا ایک سمندر تھا جو ہوا کے دوش پر بہہ رہا تھا۔ باہر آکر وہ واقعی بہتر محسوس کر رہی تھی۔ اور نروس بھی ہو رہی تھی اس کی نظریں مسلسل اس پر تھیں۔

"مجھے تمہارے ابو کی وفات کا بہت دکھ ہے۔"

وہ باضابطہ طور پر شاید پہلی بار اس کے سامنے افسوس کر رہا تھا۔ "میری ان سے ملاقات کم رہی مگر میں جانتا ہوں وہ ایک نہایت قابل اور شکر گزار انسان تھے۔"

ان کی یہ خوبیاں مینا سے بہتر کون جانتا تھا۔ ابو کی پینشن کم تھی اور گھر کا خرچ زیادہ۔ کئی دفعہ سودا سلف اور دوائی میں سے کسی ایک کا فیصلہ کرنا پڑتا تب وہ چپ چاپ جاکر گھر کا سودا سلف لے آتے۔ امی ناراض ہوتیں وہ اس وقت بہت چھوٹی تھی مگر سب سمجھنے لگی تھی۔

یہی وجہ تھی جب ابو نے اسے پڑھائی کے لیے شہر بھیجنا چاہا تو اس نے انکار کر دیا۔ مالی مسائل میں گھرے بیمار باپ کو چھوڑ کر جانا اس نے پسند نہیں کیا۔ پھر شروع میں اس نے ضرورت کے تحت اخبار میں لکھنا شروع کیا۔ اگرچہ لکھنے کا شوق بھی تھا پھر آہستہ آہستہ اس کا کالم لوگوں کی توجہ حاصل کرنے لگا۔

حالات کو سمجھنے ان کا تجزیہ کرنے کی صلاحیت کو چمکانے میں ابو نے اہم کردار ادا کیا۔ اس کا کالم اخبار کی ضرورت بنتا گیا۔ اس کی آمدنی بڑھتی گئی اور اب جب زندگی کے سفر میں چھاؤں آئی تھی۔ تو چپ چاپ چلے گئے۔

"تم اگر چاہو تو اپنی امی اور بھائی کو اپنے ساتھ رکھ سکتی ہو۔"

اس کی آواز پر وہ خیالوں سے باہر آگئی تھی۔ تو اس کا اندازہ غلط نہیں تھا۔ وہ ایک اچھا انسان تھا۔ پھر جس طرح ابو کی وفات کے بعد سے اس کے خاندان کے تمام معاملات سنبھال رکھے تھے۔ وہ اس کی احسان مند تھی۔ اس کا مزاج اس کا رویہ بدل رہا تھا۔ اس کا کالم بھی وہ باقاعدگی سے پڑھتا تھا۔ یعنی وہ جان چکا تھا۔

وہ اپنی سوچوں میں گم تھی اور وہ اسے بہت غور سے دیکھ رہا تھا۔ اس کی سادگی میں بھی ایک خوب صورتی تھی۔ نہ نچی ہوئی بھنویں، نہ رنگے ہوئے بال، نہ میک اپ زدہ چہرہ اس کی صورت ویسی ہی تھی جیسی اللہ نے بنائی تھی۔

"میں نے تمہیں بہت پریشان کیا نا۔" اس کے لہجے میں پچھتاوا تھا۔ "دراصل میں تمہیں سمجھ نہیں پایا اور شاید خود کو بھی، مگر اب میں نے تمہیں پہچان لیا ہے۔ تم بہت خاص ہو۔" اس کی آواز سرگوشی میں ڈھل گئی تھی۔ "تم مجھے وہ سب دے سکتی ہو، جس کی مجھے اور میرے گھر کو سخت ضرورت ہے۔ محبت، خلوص، وفا، وہ تم ہی ہو میں جس کے ساتھ خوش رہ سکتا ہوں۔"

"کیونکہ انگریزی اخبار میں میرا کالم چھپتا ہے؟" وہ خود کو کہنے سے روک نہ پائی۔

"نہیں زبان دراز لڑکی! یہ سچ نہیں۔ بلکہ سچ تو یہ ہے کہ میں تم سے متاثر ہوں، صرف تم سے۔" وہ بڑے یقین سے مسکرایا تھا۔ موسم کے ساتھ اس کا لہجہ بھی دلنشین تھا۔ وہ اس کے چہرے کا ایک ایک نقش جیسے دل میں اتار رہا تھا۔ جو آج تک نہیں بتایا تھا وہ سب بتا رہا تھا۔ لیکن مینا کا دل بس اتنا کہہ رہا تھا۔

تمہاری بات لمبی ہے
مثالیں ہیں
دلیلیں ہیں
ہماری بات چھوٹی ہے
ہمیں تم سے محبت ہے

نادیہ جہانگیر

چٹنی

"ارے نائلہ پکوڑے بنائے ہیں تو ساتھ چٹنی بھی بنالیتیں اب خالی پکوڑے کھائے جائیں گے بھلا؟" وہ گرما گرم پکوڑے نکال کر پلیٹ بھر کر ابھی اماں بھائی اور بھابھی کے سامنے رکھ ہی رہی تھی کہ جب اماں بغیر چٹنی کے پکوڑے دیکھ کر بولے بغیر نہ رہ سکیں۔

"اماں! آپ تو رہنے ہی دو یہ تازہ پکوڑے ہیں ایسے ہی چٹاچٹ فٹافٹ صاف ہوجائیں گے۔" اس نے ایک بھاپ نکلتا پکوڑا منہ میں ڈالتے ہوئے گویا ناک سے مکھی اڑائی تو اماں نے بے حد ناگواری سے اسے دیکھا جب کہ بھابھی نے مسکرا کر کہا۔

"یوں کہو نا تمہیں چٹنی پسند ہی نہیں۔"

"ہاں۔۔۔ ہے تو سچ بات پھر خواہ مخواہ کا تردد کاہے کو کرتی۔" اس نے ایک اور پکوڑا منہ میں ڈال لیا۔

"عجیب لڑکی ہو تم لوگ تو چٹنی کے پیچھے بھاگتے ہیں اور تم ہو کے چٹنی سے بھاگتی ہو۔"

"یہ بھی کوئی کھانے والی چیز ہے بھلا۔"

"منہ پھٹ لڑکی! یہ بھی خدا کی نعمت ہے۔" اماں نے اسے ڈپٹنا چاہا لیکن جواباً اس نے دونوں ہاتھ اوپر اٹھا لیے۔

"اے اللہ! میرے دشمنوں کو بھی چٹنی کھانا نصیب نہ کرنا۔"

"خدانخواستہ۔۔۔ کبھی ایسا وقت بھی آن پڑتا ہے جب کھانے کو کچھ نہ ہو تو چٹنی کا سہارا لینا پڑجاتا ہے۔ تب پیٹ کو چٹنی سے بڑھ کر کوئی اور چیز بہتر نہیں لگتی۔"

اماں نے اسے حقیقت میں ڈرانا چاہا بھابھی نے بھی سر ہلا کر ان کی تائید کی تو اس نے زور زور سے نفی میں گردن ہلائی۔

"اول تو رضوان مجھ پہ ایسا وقت آنے نہیں دیں گے اور دوم اگر ایسا ہو بھی جائے تو میں تب بھی چٹنی کو سہارا نہیں بناؤں گی۔ بھوکا رہ لوں گی مگر چٹنی نہیں کھاؤں گی۔" اس نے اتنے یقین سے کہا تو اماں اسے دیکھ کر رہ گئیں۔

☆ ☆ ☆

"ایک بات تو بتاؤ نائلہ۔۔۔ چٹنی سے اتنا بھاگتی کیوں ہو؟" بھابھی ہنس کر اس سے پوچھنے لگیں۔ لیے چٹنی بنا رہی تھیں کہ انہیں پلاؤ پہ بھی چٹنی ڈال کے کھانے کا شوق تھا جس پہ اس نے انہیں دیکھتے

"بھابھی! جب رب تعالیٰ نے اتنی اچھی اور عمدہ نعمتوں سے نواز رکھا ہو اتنے عمدہ کھانے دے رکھے ہوں تو یہ چٹنی کھانے کا کیا فائدہ اور مجھے تو یہ سمجھ میں نہیں آتا آپ لوگوں کو چٹنی اتنی پسند کیوں ہے؟"

"چٹنی دیکھنے اور کہنے میں حقیر سی چیز ہے نائلہ! لیکن اس کے فوائد بہت زیادہ ہیں۔"

"ہاں۔۔۔ پیٹ کا درد ٹھیک ہوجاتا ہے۔ ہاضمہ درست رہتا ہے۔ کھانے میں ذائقہ آجاتا ہے وغیرہ وغیرہ۔۔۔" اس نے تیزی سے بھابھی کی بات کو مکمل کیا تو بھابھی ہنس پڑیں وہ سر جھٹک کر کچن کی کھڑکی سے باہر جھانکنے لگی۔ جہاں رضوان کی بڑی سی گاڑی آکر رکی تھی۔

"رضوان آگئے۔" اس نے سرگوشی کی۔

"چلو تم جلدی سے تیار ہوجاؤ۔ پھر کھانا لگاتے ہیں آج تم نے واپس بھی جانا ہے۔" بھابھی نے فوراً اس کے ہاتھ سے رائتے کا باؤل لے لیا۔

"ہاں۔۔۔ رضوان مجھے لینے ہی تو آئے ہیں۔" وہ

مسکرا کر باہر نکل گئی۔

☼ ☼ ☼

”رضوان! کاروبار کیسا جا رہا ہے تمہارا؟“ کھانے کی میز پر بھائی نے یوں ہی بات بڑھانے کی غرض سے پوچھا تو رضوان کے چہرے پہ سایہ سا لہرا کر گزر گیا جسے بھائی نے دیکھ لیا۔

”خیر تو ہے یار! سب ٹھیک ہے نا؟“ بھائی نے فوراً اس کے ہاتھ پہ ہاتھ رکھا تو اس نے زبردستی مسکرا کر اثبات میں سر ہلا دیا۔

”ہاں سب ٹھیک ہے۔“ اس کے کمزور سے لہجے کو

نائلہ نے بہت بری طرح سے محسوس کیا تھا‘ لیکن وہ تب اس لیے نہ بولی کہ گھر کے تمام افراد موجود تھے‘ ایسے میں رضوان یقیناً اسے کچھ نہ بتاتا۔

”ارے نائلہ! یہ پلاؤ پہ چٹنی بھی تو ڈالو‘ رافعہ نے بہت مزے کی بنائی ہے۔“

”نہیں بھائی! آپ جانتے ہیں نا چٹنی مجھے کبھی اچھی نہیں لگتی۔ میں یہ رائتہ‘ سلاد اور سالن ڈال کے کھاؤں گی۔“

”او... میں تو بھول ہی گیا۔ چٹنی سے تو تمہیں الرجی ہے۔“ بھائی نے ہنس کر چٹنی اماں کی طرف بڑھا دی۔

☼ ☼ ☼

”کیا بات ہے رضوان‘ آپ آج کل بہت پریشان

دکھائی دے رہے ہیں۔" مگر اگر اس نے سب سے پہلی بات یہی پوچھی تو رضوان کو چپ سی لگ گئی، وہ بے چین سی ہو گئی۔

"رضوان! کوئی پرابلم ہے۔ پلیز مجھے بتائیں۔"

رات جب وہ دیر تک جاگتا رہا تو وہ اس کے پاس آ کھڑی ہوئی تو وہ مڑ کر اسے دیکھنے لگا۔

"کیا بتاؤں یار... ان دنوں کاروبار بہت ڈاؤن جا رہا ہے۔ بہت لاس ہو گیا ہے۔"

"تو پھر اب؟ اب کیا ہو گا؟" وہ اس سے زیادہ پریشان ہوئی۔

"مجھے پیسوں کی بہت ضرورت ہے۔"

"کتنے پیسے؟"

"پانچ چھ لاکھ لازمی چاہئیں۔"

"میں اماں، بھائی سے بات کروں؟" اس کے ذہن میں سب سے پہلا خیال اپنے میکے والوں کا ہی آیا۔

"نہیں... میں ادھار نہیں لینا چاہتا۔" اس نے فوراً منع کیا۔

"تو پھر کیا کریں گے؟"

"تمہارے پاس کتنا زیور ہے؟" اس نے ہچکچاتے ہوئے پوچھا تو نائلہ کا چہرہ تاریک پڑ گیا۔

"آپ میرا زیور بیچیں گے؟"

"اس کے بغیر کوئی چارہ بھی تو نہیں اور تم فکر نہ کرو کاروبار جیسے ہی دوبارہ سے چلے گا میں تمہیں اس سے دگنا زیور بنوا کر دوں گا۔" اس نے جیسے اسے ساتھ ہی نئی امید بھی تھمانی چاہی تھی۔ وہ کچھ بول نہ سکی۔

☼ ☼ ☼

"یہ زیور پورا تو نہیں۔" دوسرے دن جب وہ اسے زیور کے ڈبے تھما رہی تھی وہ آدھا زیور دیکھ کر ٹھٹک گیا۔

"ہاں... یہ آدھا زیور ہے، سات تولے میں نے رکھ لیا اور یہ سات تولے ہے۔" اس نے اقرار کیا تو وہ اسے گھور کر دیکھنے لگا۔

"تم نے کیوں آدھا رکھ لیا۔ تمہیں کیا ضرورت ہے اس کی؟"

"دیکھیں رضوان! یہ زیور وغیرہ برے وقت کے لیے ہوتے ہیں۔ کوئی مشکل وقت آ جائے۔"

"اس سے برا اور مشکل وقت میرے لیے کیا ہو گا؟" اس نے ترشی سے اس کی بات کاٹ کر پوچھا تو وہ لب کچلنے لگی اور پھر اندر گئی اور آرام سے باقی کا سارا زیور لا کر چپ چاپ اس کے ہاتھوں پہ رکھ دیا۔ رضوان کی آنکھیں چمک اٹھیں۔

"تم... تم بہت اچھی ہو نائلہ..." رضوان کی محبت عود کر آئی تو اس نے سر جھکا لیا کہ رضوان کو وہ کبھی پریشان نہیں دیکھ سکتی تھی۔ اس کی خوشی میں ہی اس کی خوشی اور سکون تھا۔ اس نے ایک بار پھر اسے ڈبل زیور بنانے کا کہا اور زیور اٹھا کر باہر نکل گیا۔

لیکن دن گزرتے گئے۔ رضوان کی پریشانی کم ہونے میں نہ آئی۔ زیور، روپیہ سب لگ گیا اور کاروبار سنبھلنے میں آ ہی نہ سکا۔ رضوان کی سیاہ پڑتی رنگت دیکھ دیکھ کر نائلہ کو ہول اٹھتے۔ اس نے اپنی کلائیوں میں سجے دونوں کڑے اتار کر بھی اسے دے دیے۔ معاملہ تب بھی نہ سنبھلا تو اس نے اپنے کانوں کو بالیوں سے بھی آزاد کر دیا۔

"شوہر کی خاطر اپنا آپ بھی ہار دو تو کم ہے۔" اس نے یہ جملہ بہت پہلے پڑھا تھا، لیکن اب جب وہ سب کچھ شوہر پہ ہارتی جا رہی تھی۔ اب اسے سب سمجھ میں آ رہا تھا۔ مہینے کا آخر چل رہا تھا۔ گھر میں سودا سلف ختم ہوتا جا رہا تھا اور جیسے جیسے سودا ختم ہو رہا تھا۔ اس کی اپنی رنگت بھی رضوان کی طرح سیاہ پڑتی جا رہی تھی۔ شوہر کی طرح اسے بھی اپنے ماں، بھائی کے سامنے ہاتھ پھیلاتے ہوئے شرم آتی تھی۔ حالانکہ بارہا جی چاہا تھا ان سے اپنے گھر کے حالات کے بارے میں بات کرے، لیکن انا اور حیا آڑے آ جاتی۔ جبھی تو بات فاقوں تک آ گئی۔

رضوان شدید ٹینشن کی وجہ سے بیمار پڑ گیا تو اس کے ہاتھ پیر پھول گئے۔ ڈاکٹر نے اسے اچھی خوراک اور اچھا ماحول دینے کا کہا تو وہ چپ چاپ سر ہلانے

گئی۔ رضوان سب جانتا تھا۔ جب ہی افسردگی سے مسکرایا۔

"ٹینشن نہ لو۔ سب بہتر ہو جائے گا۔" بیڈ کے کراؤن سے سر ٹکا کر رضوان نے اس کے ساتھ جیسے خود کو بھی حوصلہ دیا تھا۔ وہ سر ہلانے لگی۔

"کچھ کھانے کے لیے ہے تو پلیز جلدی سے لے آؤ۔ بعد میں مجھے دوائی بھی لینی ہے۔"

رضوان کی بات پہ وہ جلدی سے سر ہلا کر کچن میں چلی گئی، لیکن کچن میں آ کر وہ سوچ میں پڑ گئی کہ سوائے چاولوں کے اس کے پاس کچھ بھی نہ تھا اور چاول پکانے کے لیے، نہ گھی تھا، نہ پیاز، مرچ، ٹماٹر۔ اک سوچ کے تحت اس نے چاول ابالنے کے لیے رکھ دیے کہ اب اس کے بغیر کوئی چارہ بھی نہیں تھا۔ چاول ابل گئے تو خالی چاول دیکھ کر اس کا دل بھی خالی ہو گیا کہ صرف ابلے ہوئے چاول کوئی کیسے کھا سکتا ہے۔ سوچ سوچ کر اس کا سر پھٹنے کے قریب ہو گیا تھا کیبنٹ پہ پڑی سوکھے پودینے کی شیشی دیکھ کر اس کے ذہن میں جھماکا سا ہوا۔ بجلی کی سی تیزی سے اٹھ کر اس نے وہ شیشی اٹھائی تو اس میں سوکھا پودینہ دیکھ کر اس کا سانس وہیں بحال ہو گیا۔ (صد شکر، تھوڑا سہی، لیکن پودینہ موجود تھا) "چٹنی" اس نے گویا دل سے چٹکی بجائی اور شیشی کو متاع جان کی طرح ہاتھ میں دبوچ لیا۔

☆ ☆ ☆

ابلے ہوئے چاولوں کے ساتھ چٹنی دیکھ کر رضوان کی بھوک جیسے مزید بڑھ گئی تھی اور اس کی اپنی بھی حالت جیسے ایسی ہی تھی۔

"جلدی کرو نائلہ! بہت بھوک لگی ہے۔"

رضوان کے جلدی مچانے پہ اس نے فوراً دونوں پلیٹوں میں چاول نکالے اور اوپر چٹنی انڈیل دی۔

اور جب چاول منہ میں ڈالے تو چٹنی کے ذائقے نے گویا اس میں نئے سرے سے روح انڈیل دی ہو۔

"بہت مزے دار ہے یار۔" رضوان جلدی جلدی کھانے لگا۔ تب باہر گھنٹی ہوئی تو وہ اپنی پلیٹ وہیں چھوڑ کر دروازہ کھولنے چلی گئی۔ باہر بھائی اور بھابھی تھے۔ وہ انہیں دیکھ کر کھل اٹھی۔ انہیں اندر لیے چلی آئی تو بھائی بھابھی چاول دیکھ کر خوش ہو گئے۔

"واہ بھئی! چاولوں کی طلب تو پہلے سے ہو رہی تھی، کیا پتا تھا آتے ہی مل بھی جائیں گے۔" بھابھی نے آتے ہی اس کی پلیٹ اٹھا کر چاول کھائے تو ان کی آنکھیں وہیں حیرت سے کھل گئیں۔

"نائلہ! اس میں تو چٹنی۔۔۔" بھابھی کی بات پہ وہ کنفیوز سی ہو گئی اور پھر آہستہ سے سر ہلا دیا۔ "ہاں اس میں چٹنی ہے۔"

"لیکن تمہیں تو چٹنی کبھی بھی اچھی نہیں لگی اور تمہارے چاولوں میں چٹنی۔۔۔؟" بھائی بھی حیران تھے۔

"دراصل میں چٹنی مجھے اچھی لگتی ہے اور میری خاطر ہی نائلہ بھی چٹنی کھانے لگی ہے۔" رضوان نے فوراً بات کو سنبھالا۔

"اور میں حیران ہوں کہ چٹنی اتنی بھی مزے دار ہوتی ہے۔" نائلہ نے کھل کر اظہار کیا تو سب مسکرا دیے۔

"یہ بات ہے تو پھر میں تمہارے لیے پکوڑے لایا ہوں۔ چٹنی اس لیے نہیں لایا کہ تمہیں پسند نہیں، اب خالی کھا سکو تو کھالو ورنہ۔۔۔"

"ورنہ کیا۔۔۔ میں ابھی چٹنی بناتی ہوں۔" اس نے بھائی کے ہاتھ سے پکوڑے لے کر خوشی سے کہا اور بھاگ کر کچن میں چٹنی بنانے چلی گئی۔ پہلے اس نے مجبوری میں چٹنی بنائی تھی اور اب شوق سے اور دونوں بار ہی اسے ذائقہ بہت پسند آیا تھا، لیکن جو چٹنی مجبوری میں بنائی تھی وہ اس کے لیے زیادہ اہمیت کی حامل تھی کہ مشکل وقت میں چٹنی نے اس کا ساتھ دیا تھا اور برے وقت کے ساتھی کو کوئی کیسے بھول سکتا ہے بھلا۔۔۔؟

مصباح علی

حاصلِ کشتِ غمِ دوراں

رکی ہوئی برسات کی سیلن میں حبس بڑھتا جارہا تھا۔ وہاں پر موجود جم غفیر نے گھٹن مزید بڑھادی۔ سانولے، نکھرے سانولے، گورے، بچے بوڑھے، جوان عورت مرد سب طرح کے لوگ موجود تھے ایسا لگتا تھا آج سارا شہر مسافر بنا اڈے پر آرکا ہے۔ ریڑھیاں، ٹھیلے، بے ہنگم آوازیں اور رش اس رش کو چیرتی مختاراں اس کا ہاتھ تھامے تیزی سے لاری کی سمت بڑھ رہی تھی۔ وہ ایک ہاتھ میں چھوٹی سی گٹھڑی اور دوسرے ہاتھ سے گھونگھٹ سنبھالے کھنچتی گئی۔ ماسی مختاراں کا بس نہ چلتا تھا کہ وہ ایک قدم اٹھائے اور اڑ کر اپنی بھتیجی زہرہ کے پاس پہنچ جائے۔ اس سے جدائی کے لمحات سوچ سوچ کر آواز بھرا جاتی، آنکھیں برسنے لگتیں۔
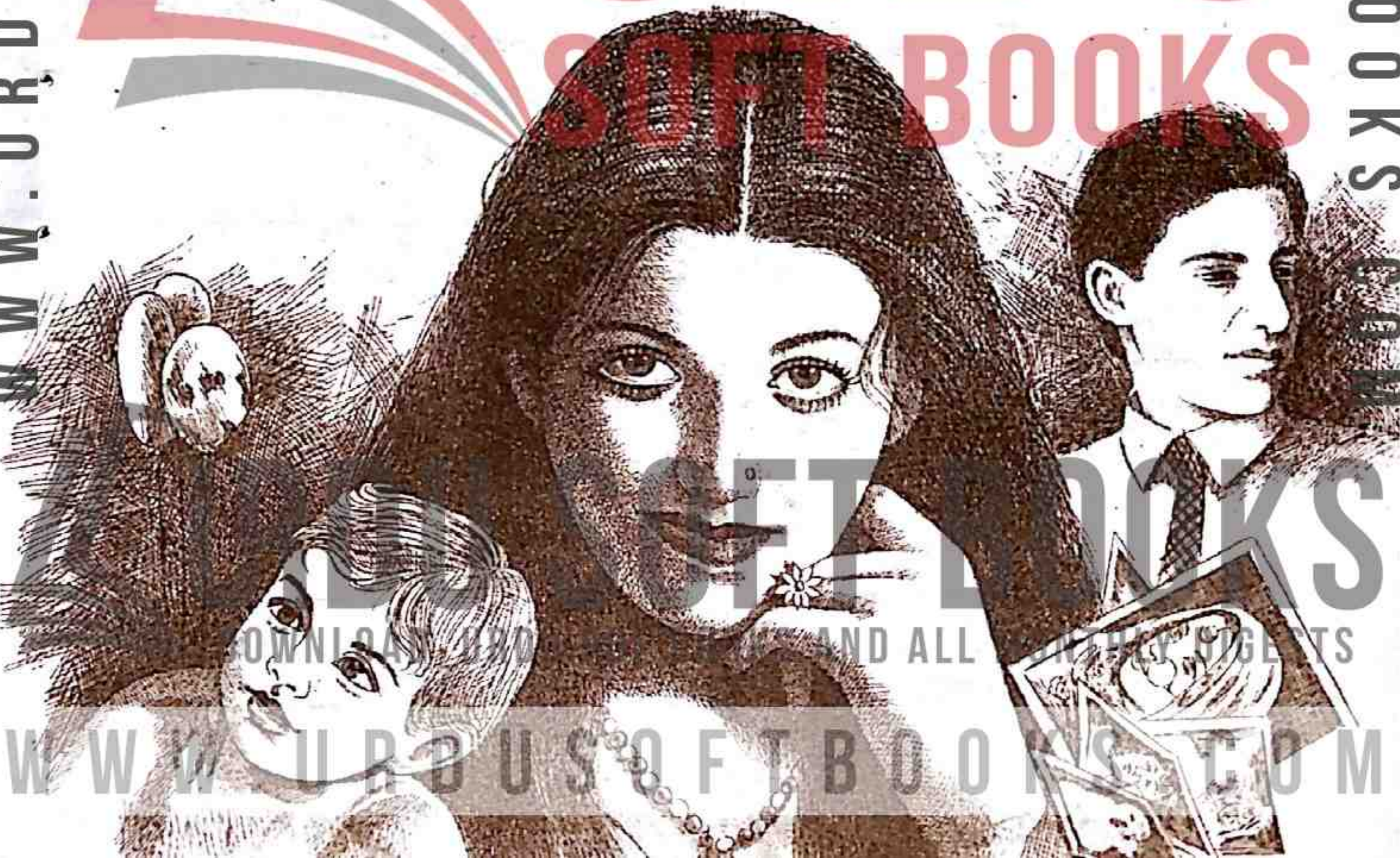
انبالہ سے قصور ہجرت کے وقت ان کا قافلہ دو حصوں میں بٹ گیا تھا۔ پاکستان آکر کوئی کہیں، کوئی کہیں پہنچ گیا۔ بہت ملنے کی کوشش کی، لیکن اللہ کو منظور نہ تھا۔ خاندان کے تقریباً سب لوگوں کا پتا چل گیا، صرف زہرہ اور اس کی ماں کا کچھ پتا نہ چلا۔ چار سال بعد کسی نے بتایا وہ بہاول پور کی کسی مندر نما حویلی میں دیکھی گئی ہیں۔ ماں نے مرنے سے پہلے

مکمل ناول
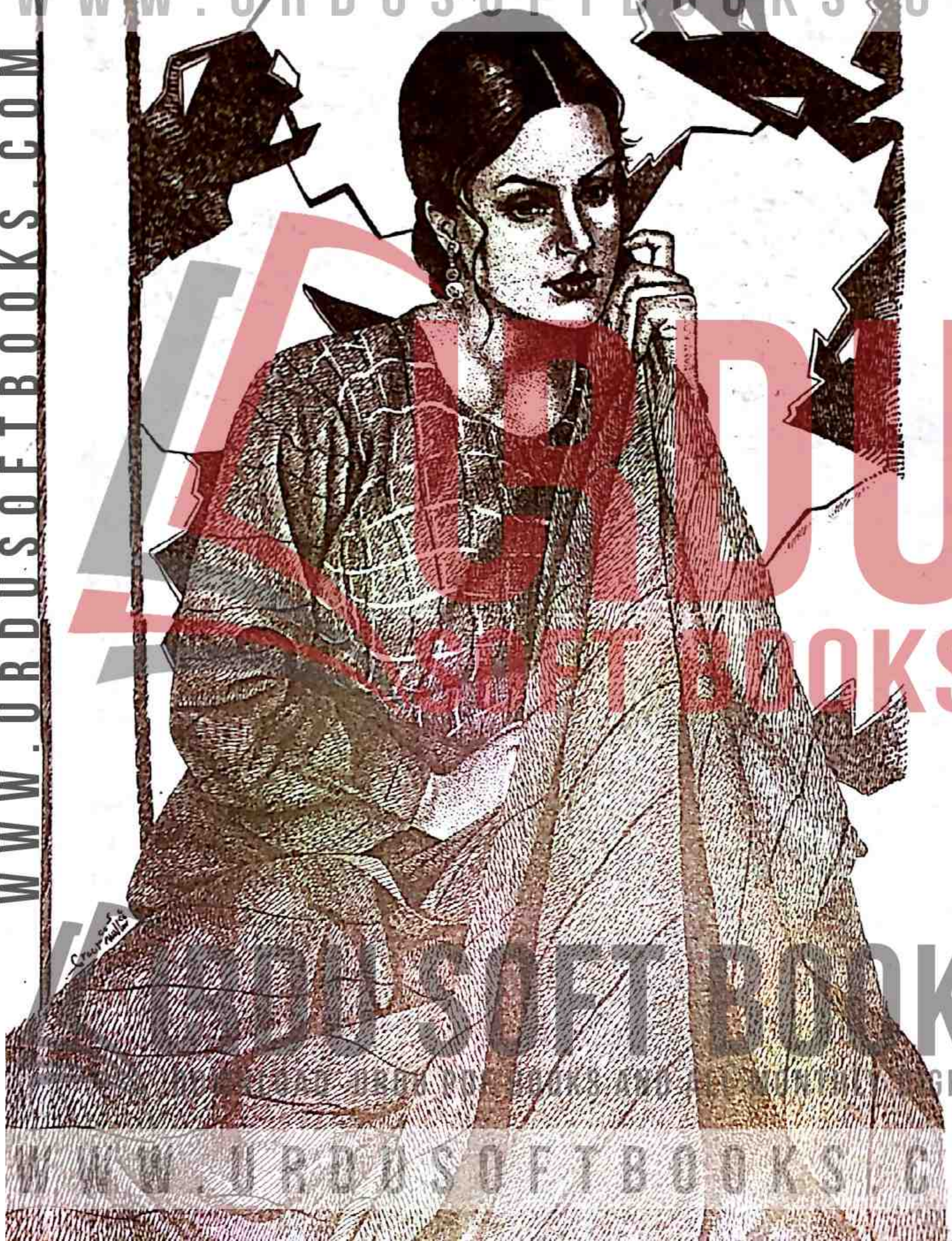
شادی کرلی، زہرہ کے سر کا سائیں بہت ہی خوب صورت ہے۔

مختاراں پتا لے کر ڈھونڈتی ڈھانڈتی وہاں تک پہنچی پتا چلا کچھ دن پہلے ہی اس کے سائیں کو نوکری مل گئی اور یہاں سے چلے گئے۔ اتا پتا کسی کے پاس نہیں۔ وقت پندرہ چوبارے چڑھ گیا، لیکن یاد اسی طرح دل کی گلیوں میں بھٹکتی رہی۔ اب پچھلے مہینے کسی پرانے ملنے والے نے اسے لاہور میں دیکھا تھا۔ پتا لا کر مختاراں کو تھمایا۔ اس نے اب کے چلنے سے پہلے خط ڈال کر اپنے آنے کی اطلاع دی، مبادا اب پھر نہ آگے پیچھے ہو جائے۔ خوشی ماسی مختاراں کے چہرے سے پھوٹتی تھی وہ بس میں بیٹھی مسلسل زہرہ کا ذکر کرتی رہی۔

"زہرہ کو گھٹی میں نے دی تھی، بچپن سے میرے ساتھ رہی، کھایا، پیا، سوئی۔ بالکل میرے جیسی ہے، عمر تیرے جیسی ہوگی۔" سوبار کے سنے ہوئے زہرہ نامہ میں بی بی کو قطعاً" دلچسپی نہیں تھی، وہ بس اتنا سوچتی رہی، جب بچھڑے ملتے ہیں تو کیا اتنی ہی خوشی ہوتی ہے، کیا میرا کوئی اپنا ہے، دل مٹھی میں جکڑ گیا۔ آواز آئی۔

"میرا کون ہے.... میرا بھلا کوئی کیسے ہو سکتا ہے، تنہا تھی، تنہا ہوں۔" اس کی سوچوں کا ارتکاز ماسی کے ٹہوکے نے توڑا۔ جانے کس وقت اس نے بھنے چنے خریدے، کاغذ کا لفافہ اس کی سمت بڑھاتے کہہ رہی تھی۔

"لے کھالے، بھوک لگی ہوگی.... میری زہرہ کو چنے بڑے ہی پسند ہیں، میرے ہاتھ کی چاٹ پر جان دیتی تھی۔" اس نے تھوڑے سے چنے اپنے ہاتھ میں اٹھا لیے۔ بھنے ہوئے کالے چنے اور اس کے جھریوں زدہ سیاہ ہاتھ دونوں ایک سے لگ رہے تھے بھٹی میں اچھل اچھل کر پکے ہوئے۔

"یہ تو تقسیم نے ورچھوڑے ڈال دیے، ورنہ اپنوں سے جدائی کا کوئی کیوں سوچے۔" ماسی پھر شروع ہو گئی۔ چھک چھک کرتی لاری گول بجری سے بنی پکی سلیٹی سڑک پر آہستہ آہستہ بڑھ رہی تھی۔ لاری میں بیٹھے ہر شخص کی الگ داستان تھی۔ تقریباً" ڈیڑھ دہائی مکمل ہونے کو آگئی، لیکن لوگوں کی جدائی کے قصے ختم ہونے کو نہ آتے۔ جہاں دو لوگ اکٹھے ہوئے، باتوں میں آنسو ڈیرہ ڈال لیتے۔ اڈے پر پہنچتے ہی وہ تانگہ روک اور بیٹھ گئیں۔ گھوڑا بڑی سڑک پر بھاگتا تنگ گلیوں میں جانے لگا۔ ایک قدرے تنگ گلی کے نکڑ پر رکا اور کوچوان بولا۔

"لو بھئی بیبیوں، آگیا۔"

ماسی اسے پیسے ادا کر، گٹھری بی بی کو پکڑا اور بے تابی سے گلی میں داخل ہوئی، وہ تھکے گمشدہ مسافر کی طرح مرے قدموں سے پیچھے چل رہی تھی۔ ماسی مختاراں کو اپنی زہرہ واقعی مل گئی تھی۔ دونوں بے تابی سے لپٹیں۔ ایک دوسرے کے گال، آنکھیں، ہاتھ چومے۔ زہرہ کی سوالیہ نظروں پر خالہ نے ہلکا سا سر ہلا کر اس کا تعارف کرایا۔ پھر وہ ان دونوں کو اندر پکے کمرے میں لے گئی، مسہری پر بٹھایا۔ سرخ سیمنٹ کا پکا فرش، دیواروں پر پلستر کے ساتھ روغن بھی چڑھا تھا۔ تین کمروں کا چھوٹا سا صاف ستھرا گھر۔ ضرورت کا بہتر سامان، آسودگی ظاہر کرتا تھا۔ پھر تقریباً" آٹھ برس کا گول مٹول سا بچہ نانی سے ملنے آیا۔ اس کی آنکھیں ہونٹ، بی بی کو کہیں دیکھے بھالے لگ رہے تھے۔ اس نے چاہا اس کے پاس بیٹھے، وہ اسے غور سے دیکھے محسوس کرے یاد کرے، مگر وہ بچہ تھا اس کی اکھڑی، کٹی پھٹی گہری سیاہ رنگت سے خوف زدہ ہو کر سلام کر کے نانی کے پاس ٹک گیا۔ وہ گردن کو خم دیے ترچھی نظروں سے اسے تکے جا رہی تھی۔ وہ نانی کے ساتھ جڑا بیٹھا مسلسل پاؤں ہلا رہا تھا۔

"اتنا بڑا ہو گیا تو، مگر کھوتوں کی طرح کھر بجانے نہ چھوڑے، پاؤں مت ہلایا کر رشتوں پر نحوست پڑتی ہے۔" جواباً" اس نے فلک شگاف قہقہہ لگایا۔

"ماں! رشتے پاؤں پر بندھے ہیں، جو ہل کر گر جائیں گے۔" بی بی اپنے کانوں کی گونج پر چونکی۔ اس کی سانس سمٹی اور نظروں کا رخ بدل لیا۔ بچہ ابھی بھی

پاؤں ہلا رہا تھا۔

سفید گوری رنگت، بیضوی مسکراتا سا چہرہ، بڑی بڑی سیاہ آنکھوں پر گھنیری لمبی پلکیں، بھرے بھرے نارنجی ہونٹ وہ کھڑی ناک کو مزید سمیٹتے جھجکنے کے انداز میں اندر داخل ہوئی۔ وہ تقریباً بارہ برس کی ہوگی۔ سلور کی ٹرے میں دو گلاس لال شربت کے رکھے سلام کرتے ہوئے ان کے سامنے کیے۔ بی بی اسے دیکھتے ہی اگلا سانس لینا بھول گئی تھی۔

کون ہے یہ، ایسے جیسے بہت عرصے سے جانتی ہو، جیسے ہمیشہ سے اس کے آس پاس رہی ہو، وہی نین نقشہ، مسکراتے ہوئے بائیں رخسار پر گڑھا، آخر اسے کہاں دیکھا، کہاں ملی ہے، کچھ یاد نہ آتا۔

"بی بی! پانی لے لے، ایمان سے بڑی گرمی ہے۔"

ماسی مختاراں نے اسے متوجہ کیا اور اپنا گلاس ایک سانس میں اٹھا چڑھا گئی۔ وہ ڈکار لے کر دونوں بچوں کو بازوؤں میں دبوچے چٹا چٹ چوم رہی تھی، زہرہ بھی پھوپھی سے لپٹ لپٹ جاتی۔ پائنتی پر ٹکی جھجکائی لڑکی ایک آدھی نگاہ بی بی پر ڈالتی پھر مسکرا کر سمٹ جاتی۔

وہ بولتا ہوا گھر میں داخل ہوا تھا۔ ان وقتوں میں دن دیہاڑے دروازے مقفل کرنے کا رواج نہیں تھا۔ وہ کچھ کہتا ہوا سیدھا اندر کی جانب آرہا تھا۔ شاید اس کے ساتھ بھی کوئی بچہ تھا جسے قائل کرنے لگا۔

"یار ایک تو تو بات نہیں مانتا، ہر بار غلط ضد، جانور ہمیشہ ایک رنگ کا پیارا لگتا ہے، سفید والا کتنا پیارا تھا، وہ کالے والا بھی اچھا تھا... پر نہ جی تجھے تو وہ چیت کبرا میمنا پسند آرہا ہے، مجھے تو وہ گھر میں اچھلتا کودتا ذرا نہیں بھائے گا۔" وہ قریب بڑھتی آواز نہیں تھی کوئی پگھلتا ہوا گرم سیسہ تھا۔ اس کے کانوں میں ٹپکتا گیا۔

بی بی کا وجود گمنام بے جان چیز کی طرح ساکت ہوا، مسہری میں دھنستا جا رہا تھا۔ دل اس قدر تیز دھڑکا جیسے پھٹ جائے گا اور اس نے چاہا کہ اب یہ پھٹ ہی جائے۔

اس کی آواز پر پھوپھی اور زہرہ اٹھیں اور باہر نکل گئیں۔ ماسی کے آنے کی انہیں خط کے ذریعے اطلاع تھی۔ وہ خود لینے آجاتا اگر پھوپھی خط میں اپنا پتا بھی لکھوا دیتی۔ انہیں پھوپھی کے ملنے کی بہت خوشی اور آنے کا انتظار تھا اور اس وقت ان کی سلام دعا کی آوازوں سے خوشی چھلکتی تھی کی۔ بی بی نے کسی خیال کے تحت چادر کا پلو قدرے آگے کرلیا اس کی بھاری آواز پر بدن ہولے ہولے لرزا اور کمرے میں داخل ہوتے قدموں کی چاپ پر جسم کے ہر مسام سے پانی پھوٹ پڑا، ہاتھ پاؤں یخ ٹھنڈے ہوگئے اس نے کپکپاتے ہوئے پیٹھ دروازے کی جانب کرلی اور پلو بائیں رخسار پر اچھا خاصا آگے کرلیا۔ وہ اس کو دیکھ کر ٹھٹکا۔ چوکھٹ پر رک، زہرہ کو استفہامیہ نگاہ سے دیکھا۔ جواباً وہ مسکراتی ہوئی اندر داخل ہوئی۔

"یہ پھوپھی کی بیٹی ہے۔"

"ہیں.... "اسے حیرت ہوئی۔

"ہاں ...... بیٹی ہی ہے، اور ان کے ساتھ رہے گی۔" وہ احتراماً کھڑی ہو چکی تھی اس نے اسے

"بیٹھو بیٹھو۔" کہا اور پھوپھی سے سفر کے متعلق پوچھنے لگا۔

"آپ لوگ خیریت سے پہنچ گئے' کوئی پریشانی' تکلیف تو نہیں ہوئی' گھر آسانی سے مل گیا۔" اس نے ڈرتے ڈرتے اک ترچھی نگاہ سے اسے دیکھا۔ وہ تقریباً" پینتیس' چھتیس سال کا مضبوط جثے والا مرد تھا۔ وقت کے ساتھ شخصیت میں مردانگی اور رعب بڑھ گیا۔ کچھ سرکاری دفتروں میں اٹھنے بیٹھنے سے سراپے میں مزید نکھار آگیا۔ وہ پھوپھی سے مخاطب تھا اور بی بی ڈری ڈری چور نگاہ سے اس کا سراپا دیکھ رہی تھی۔ اس کے سوکھے کانپتے ہونٹ دانتوں نے بھینچ لیے' نگاہ اس کی سنہرے تلے والی جوتی پر گڑی رہ گئی۔

☼ ☼ ☼

"مبرا پتر۔ او کہاں ہے تو۔۔۔؟" وہ کھرے کے پاس بیٹھی تھاپی مار مار کپڑے دھو رہی تھی۔ تایا صلاح الدین کی آواز کیسے اس تک آتی۔ اس کا دھیان بار بار پیان کی جانب بھٹکتا تھا۔ اس کی موجودگی میں کپڑے دھونے کا لطف ہی الگ تھا۔ اور کپڑے کیا ہر کام ہی۔ اس کی نگاہیں اس کے سارے وجود کو گرما دیتی تھیں۔

ہری چرن نے جب سے ان کے کپڑے دھونے سے انکار کیا تھا' اچھا خاصا مسئلہ بن گیا تھا۔ تائی ثریا کے کندھے جوڑ سردی سے اینٹھ جاتے۔ مبرا نے ان کے کندھے دباتے ہوئے نرمی سے کہا۔

"تائی جی! کپڑے ہوتے ہی کتنے ہیں' دو تو جی ہیں۔ تایا اور۔۔۔" وہ لمحہ بھر کی' موتیے کی کلی جیسے چہرے پر زعفرانی سایہ پڑا۔

"اور اس کے۔۔۔ میں دھو لیا کروں گی۔" ہری چرن نے بڑا سا میلا گٹھڑ واپس کیا تھا۔ اس نے کاسٹک سوڈے کا پتلا پتلا سا صابن پکایا' تسلا کھرے میں رکھ' چوکی پر بیٹھ کپڑے دھونے لگی۔ وہ باہر جانے کی غرض سے قریب سے گزرا تھا۔ اتنا جاڑا' ٹھنڈا پانی' سردی سے اکڑی پتلی پتلی انگلیاں۔ سفید ملائی جلد پر نیلگوں رگوں کا جال۔ وہ لمحہ بھر ہی دیکھ سکا۔

"ٹھنڈے پانی میں کیوں دھو رہی ہے۔ رک ذرا۔!" اسے کہہ کر اس نے مٹی کے چولہے میں اور لکڑیاں ڈالیں۔ تانبے کا گاگر اس پر چڑھا لیا۔ تھوڑی دیر میں پانی کھولنے لگا تو اتار اس کے قریب رکھ دیا۔ وہ شرمساری سے اسے دیکھتے کہہ رہا تھا۔

"آئندہ زیادہ گندے نہیں کروں گا۔" لمبی سیاہ پلکوں کا خم دار سایہ آتشیں گالوں پر کانپنے لگا۔ دھڑکن بے حد تیز۔ اس کے سامنے پہلے کبھی یہ کیفیت نہیں ہوئی تھی۔ بے شک کچھ معمول سے ہٹ کر ضرور ہوتا تھا' مگر ان دو مہینوں میں اس کی نگاہ محسوس ہوتے ہی بدن ہولے ہولے لرزتا۔ لفظ کانپ جاتے وہ بمشکل کہہ پائی۔

"گندے۔۔۔! یہ تو میلے ہی نہیں ہیں۔" وہ استہزائیہ' گردن مار چولہے کی جانب بڑھا۔ جلی لکڑی باہر نکال' زور سے فرش پر ماری۔ ٹوٹے نارنجی انگارے انگیٹھی میں بھر اس کے قریب رکھ باہر نکل گیا تھا۔ اسے دیکھ کر ساگ کی گندلیں چھیلتی تائی ثریا کے ہونٹ مبہم سے پھیلے تھے۔

"ابھی صرف دو بول پڑھائے ہیں تو یہ عالم ہے' جس دن باقاعدہ گھر والی بن جائے گی' پھر جانے کیا کرے گا۔"

"خیر!" وہ مسکرائیں۔ ان کے لیے اس سے بڑھ کر کیا خوشی تھی کہ وہ خوش ہے۔

"بس جلدی سے وہ دن آجائے کہ اس کا سہرا کھلے' بچوں کا انگنا میں شور ہو۔"

پھر جب' جب وہ کپڑے دھوتی وہ معمول کی طرح پانی گرم کر کے اس کے قریب دھر جاتا' ایک طمانیت سی اندر تک بھر جاتی تھی۔ موسم بدل گیا نل کا پانی ہی اچھا آنے لگا۔ پھر پانی گرم نہ کرتا دو تین بالٹیاں بھر کر کھرے میں رکھ جاتا' لیکن آج وہ جلدی میں تھا بھول گیا۔ وہ کچھ دیر منتظر رہی پھر پانی بھر کر کپڑے دھونے لگی۔ ہنڈیا بھونتی تائی نے چھیڑا۔

"کچھ دیر انتظار کر لے ورنہ کپڑے تو دھوئے گی' تھک وہ جائے گا۔" وہ شرم سے دہری ہو گئی۔ ہر طرف
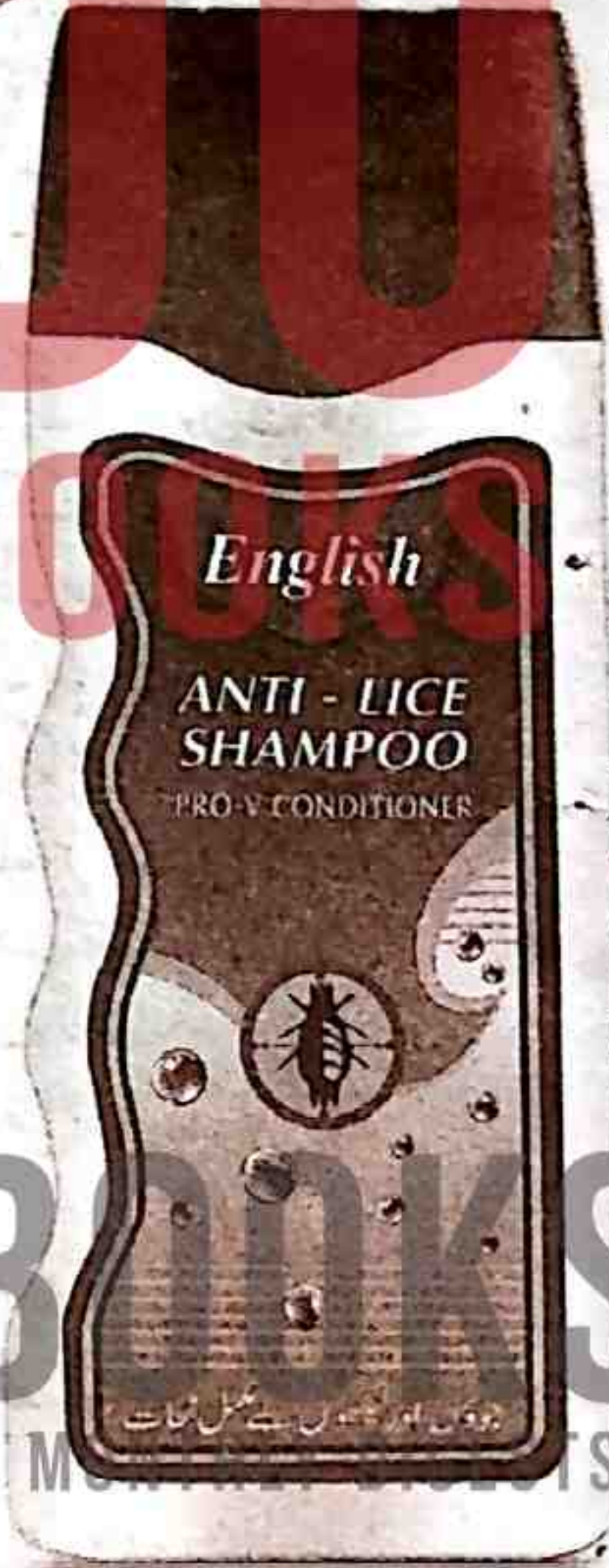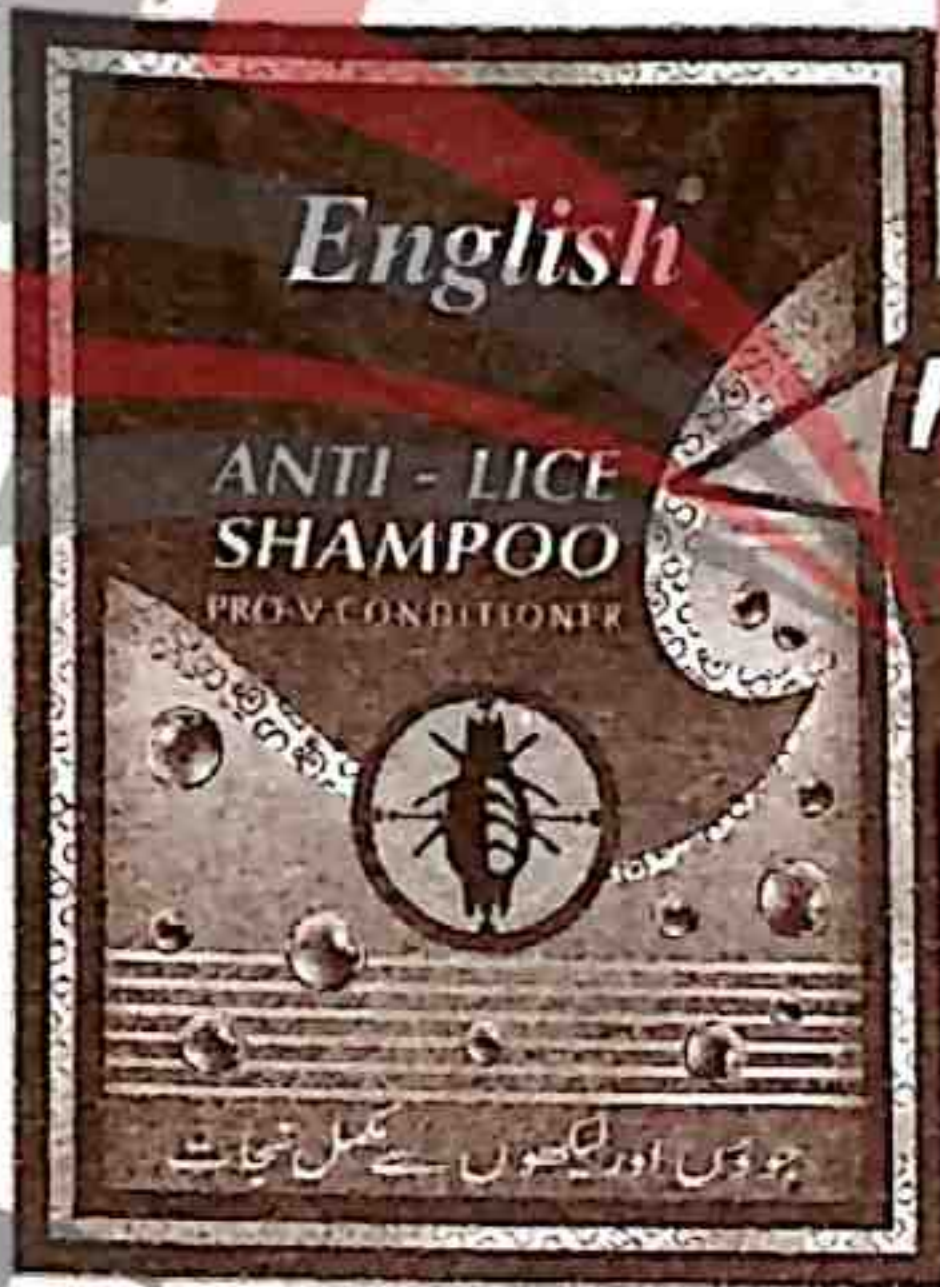
پیان مچلنے لگا۔ اس کی ہلچل تایا صلاح الدین کی دوسری تیسری پکار نے توڑی۔

"منسرا پتر لالٹین لادے، آج ڈھکن لگوالاتا ہوں۔ اور بھی جو چیزیں ہیں ٹھیک کروانے کی نکال دے جلدی کر شاباش۔" دو مہینے سے لالٹین کی چپی کا ڈھکن جانے کہاں گر گیا تھا۔ مل کر نہ دیا۔ وہ تین بار پیان نے لکڑی کا ڈاٹ اس میں اڑایا، مگر جب تیل ڈالتی پھنسانا بھول جاتی۔ ایک دو بار موم جامے کا ٹکڑا رکھ دھاگہ باندھا، وہ لپیٹنا بھول گئی۔ ایک بار پیان نے ڈپٹا۔

"اگر تیل گر گیا، آگ لگ جائے گی۔"

"احتیاط تیل گرنے نہیں دیتی۔"

اور واقعی دو مہینے گزر گئے تھے، تیل نہیں چھلکا تھا۔ اس نے احتیاط کی تھی۔ بے احتیاطی تو حواس باختگی میں ہوتی ہے۔ آج تایا نے ڈھکن لانے کا ارادہ کیا۔ وہ چوکی سے اٹھ کر گھڑونچی کے شہتیر پر لٹکی لالٹین لینے آئی تھی۔ گھڑولے کا سرخ اینٹوں کا فرش، گھڑے کے ایک جانب گھڑونچی پر تین گھڑے اور ایک صراحی ہوتی تھی۔ پیان ہمیشہ صراحی کا پانی پیتا تھا۔ ٹھنڈا میٹھا فرحت بخش، لیکن اب وہاں صرف گھڑے تھے، صراحی نہیں تھی۔ گھڑے میں نل لگا تھا کپڑے، برتن دھونے کے لیے۔ گھڑولے کی دیوار پکی اینٹوں کی جالی نما تھی۔ جہاں سے اندر تازہ ہوا آتی گھڑولا ٹھنڈا رہتا اور باہر بہت دور دور تک دکھائی بھی دیتا تھا۔ وہ شہتیر سے لالٹین اتار عادتاً" جالی کے قریب آگئی۔ ململ کا فیروزی چنا دوپٹا، پلو دانتوں میں دبا، کالی سیاہ بڑی بڑی آنکھیں سوراخ میں ٹک گئیں۔ مٹی کا صاف چٹیل میدان، پھر کچی سڑک جس کے دونوں اطراف دور دور تک لہلہاتے کھلیان، کسی وقت میں وہ ساڑھے آٹھ قلعے کے کھلیان ان کے تھے، پھر موہن گپتا ان پر قابض ہوگیا۔ جعلی کلیم بنوالیے۔ لڑائی جھگڑا، پنچایت اکٹھی ہوئی۔ ٹھاکروں، راٹھوروں، پنڈت کے علاوہ صلاح الدین، ضیاالدین نے مولوی نظام کو بھی بٹھایا، مگر گپتا نے حمایتی اکثریت کی وجہ سے انہیں دبالیا۔ اس وقت ان کا ساتھ صرف ایک رنداوہ سنگھ نے دیا تھا۔ ایک تو وہ پڑوسی تھا دوسرا دوست۔ اس کی نیت تو اللہ جانتا تھا مگر بظاہر گپتا پر چڑھ چڑھ جاتا۔ بے شک وہ اپنی زمینیں گپتا سے چھڑوا نہ سکے، مگر رنداوہ نے حمایت کر کے دل میں خوب جگہ بنالی تھی۔ پھر اس نے مشورہ دیا۔ "یار صلاح چھوڑ اسے، جو چند قلعے تیرے پاس رہ گئے ہیں، اسی سے اناج روٹی کھالو، قتل فساد میں کیا رکھا ہے۔" نہ چاہتے ہوئے بھی اس کی بات دل کو لگی۔ اب اس چٹیل میدان کی اوطاق سے ملحقہ دو قلعے کا کھلیان ان کا تھا۔ لہلہاتی فصل میں اس کے گھبرو کے ٹاپوں کی آواز اپنے دل کی دھک دھک پر حاوی ہوتی چہرہ سرخ کررہی تھی۔ اس آواز میں عجیب سرور تھا۔ جب وہ گیارہ، بارہ برس کی تھی وہ سفید ٹٹو بھگا تا لاتا۔ وہ اور اس کا دوست امرت سنگھ، امرت کا پھوپھی زاد ارجیت سنگھ۔ تینوں قہقہے لگاتے، سرپٹ ٹٹو بھگاتے۔ ابا، تایا صلاح الدین اور امرت کا باپ رنداوہ سنگھ اوطاق میں لگے برگد کے درختوں کے نیچے چارپائیاں بچھائے اپنے اپنے حقے کی گڑگڑاہٹ میں ان کی حرکتوں پر ہنستے۔ ارجیت ان میں بڑا اور اسکول جانے لگا تھا۔ وہ انہیں اسکول کے قصے سناتا، سرکنڈوں کی عینک لگا، منہ بگاڑ بھاری آواز میں ماسٹر کی نقل اتارتا۔ ان دونوں کے کان پکڑ کر پٹائی شروع اور وہ آگے آگے بھاگتے۔ پھر دھولی ہری چرن کی گھاٹ سے اس کا گدھا کھول لے جاتے اور سارے گاؤں میں بھگاتے۔ ہری چرن پتھر، شاخیں چھڑیاں، ان پر اچھالتا، گالیاں بکتا ان کے پیچھے پیچھے بھاگتا۔ شرارت کا سرور ایسا تھا۔ اس کے پاس سے ہوا کی طرح گدھا اڑالے جاتے جب قابو نہ آتے تو وہ ان کے باپوں کے پاس رونے دھونے لگتا۔

"ہری بابا تم بیٹھو ادھر۔" ضیاالدین نے پیر سمیٹتے جگہ بنائی۔

"دو بھی آنے دو کمینوں کو، مرغا بنا کر ایک ایک کی خبر لوں گا، گھاٹ پر تمہارے ساتھ کپڑے بھی دھلوائیں گے۔"

"نہیں، نہیں مہاراج۔" وہ ہچکچاتا، ظاہر ہے،

ہچکچانا بنتا تھا۔ صلاح الدین' ضیا الدین دونوں بھائیوں کے مستقل کپڑے تو دھوتا تھا' مگر وہ اجرت کے علاوہ فصل سے کچھ حصہ جامن' آم کا پھل اور جب کپڑے لینے دینے آتا تو کھانا پینا بھی۔ اور ہاں اس کا گدھا اکثر ان کے کھیتوں میں چر تا بھی تھا۔ لالچ سے عاری دل' سادہ لوح' سادہ زبان' مذہب فرقہ اگر نہ چھیڑو تو آبادی میں خاصی یک جہتی تھی اس وقت۔ اسی لیے وہ پسیج جاتا۔

"بچے ہیں مہاراج' عقل آتے سے آجائے گی' بس اتنا سمجھا دینا' میرا گدھ کیچڑ میں نہ پھینکا کریں۔" وہ گدھے پر رکھا سامان بنا دیکھے پھینک کر بھاگ جاتے۔

"ضرور ضرور' ضیا الدین گردن ہلاتے دھیما سا مسکراتے۔

کچھ عرصے بعد ضیا الدین کی گھوڑی نے جڑواں بچے دیے تھے۔ گھوڑی تو ضرورت پڑنے پر بیچ دی' مگر وہ بچے امرت اور پیان کو دیتے وقت کہا تھا۔

"ایک تیرا اور دوسرا تیرا' کھلاؤ' پلاؤ جب تمہارا وزن اٹھانے کے قابل ہو جائیں تو اپنا اپنا لے جانا۔" امرت کو ہمیشہ اچھی چیز پسند آتی تھی۔ سفید اور بھورے صحت مند کو دیکھ کر فوراً" ہاتھ رکھا۔

"چاچا' یہ چتکبرا میرا۔۔۔۔"

"ہاں ہاں تم لے جانا۔" ضیا مسکرائے۔

"اور یہ میرا چاچا جی۔۔۔۔" پیان کو چتکبری چیزیں ویسے ہی ناپسند تھیں۔ اس نے سفید بادلوں جیسے دبلے پتلے بچے کے ماتھے کو چھوا۔

"ٹھیک ہے' لیکن وعدہ کرو' اب ہری چرن کے گدھے کو تنگ نہیں کرو گے۔"

"ٹھیک ہے چاچا جی۔" دونوں بیک زبان بولے۔

انہیں اب نیا مشغلہ مل گیا۔ امرت اپنے ساتھ ارجیت کو بھی لے آتا۔ پہلے تینوں کھیتوں سے چارہ اکٹھا کرتے' پیان بوتلوں میں دودھ بھر لاتا اور گھاٹ کے پاس بنی لمبی سے ناند میں چارہ ڈال' زبردستی ان کے منہ میں دودھ ٹھونستے' ماؤں سے مہندی گھلواتے' ان پر چاند تارے بناتے۔ پیان کا گبھرو' امرت کا شیرو۔

"یار!" امرت اپنے چھوٹے سے سر پر پگڑی درست کرتے ہوئے فکر مندی سے بولا۔ "شیرو سست ہوتا جا رہا ہے۔"

"تم اگر ہر وقت کھلاتے رہو گے تو' سست ہو کر او نگھتا ہی رہے گا نا۔" ضیا الدین ان کے گھوڑوں کے لیے گھنٹیاں اور پیتل کے جھانجھ بنوا لائے تھے' تاکہ وہ دور جائیں تو آواز سے پہچانے جائیں۔ انہوں نے جھانجھریں' گھنٹیاں انہیں پکڑا دیں۔ وہ شیرو کو جھانجھر باندھتے مسلسل گبھرو کو تک رہا تھا۔

"میں نے جلدی میں غلطی کر دی' مجھے چاچا سے گبھرو لینا چاہیے تھا۔" وہ دن میں کئی بار یہی سوچتا۔ گبھرو تھا بھی ایسا' جتنا پیدائش کے وقت کمزور تھا اب دن بدن اتنا ہی طاقت ور و توانا ہوتا جاتا تھا اور جب انہوں نے اس پر سواری شروع کی' اس کی رفتار' ٹاپوں کی آواز شیرو سے کہیں زیادہ۔۔۔۔

جاڑے کا موسم تھا' سر شام ہی آسمان پر سیاہی پھیلنے لگتی۔ ان وقتوں میں دھند کا راج نہیں تھا البتہ سردی کڑاکے دار پڑتی تھی۔ وہ دونوں اپنے گرد لال' پیلی اونی شالیں لپیٹے ٹاٹ کے ٹکڑے پر بیٹھیں۔

امرت' پیان کی گھوڑا ریس دیکھنے میں محو تھیں۔ وہ گھوڑے سرپٹ بھگاتے کھیت سے آگے نہر' کیکر کے جھاڑوں کو پار کر ہری چرن کی گھاٹ تک کئی چکر لگا آئے۔ کبھی شیرو آگے' کبھی گبھرو۔ گھر کے قریب آتے ہوئے شیرو کا پاؤں ریت کر پھسل گیا' مگر بچت ہو گئی۔ امرت اچھل کر نیچے اترا۔ پیان نے بھی طنابیں کھینچ لیں۔

"چوٹ تو نہیں لگی؟" اس کے استفسار پر امرت تیوری چڑھائے بولا۔

"ضیا چاچا نے اچھا گھوڑا تجھے دیا ہے' تب ہی ہر بار تو جیت جاتا ہے۔" اس کی بے جا خفگی پیان نے قہقہے میں اڑائی۔ سہتی جھلا کر بولی تھی۔

"امرت' ہار کر تو ایسے نہ کہا کر' جھوٹے۔۔۔۔ شیرو تو نے اپنی مرضی سے پسند کیا تھا' اب پیان کی طرح بھگا نہیں سکتا تو شیرو کا کیا قصور۔" دوست کے لیے بہن کی حمایت اس کے اندر کڑواہٹ گھول گئی۔ ہتک سے

پہلے ہی بھرا تھا۔ چلا کر بولا۔

"تو یہاں کیا کر رہی ہے' دفع ہو گھر۔" وہ ایک ہاتھ سے شیرو کی طنابیں پکڑے دوسرے سے سہتی کی نازک کلائی دبوچے لے جا رہا تھا اس کے شور مچانے کے باوجود اسے گھسیٹتا گھر تک لے گیا۔ پیان کی ہانک۔ "یار آرام سے' بہن ہے تیری۔" پر کبھی اسے فرق نہیں پڑا تھا۔ اب وہاں صرف مبرّا کھڑی پیان کو دیکھ رہی تھی۔

"اتنی سردی میں تم دونوں روز' روز کیوں آجاتی ہو' بیمار ہو جاؤ گی۔" وہ جواباً "صرف ستائشی لہجے میں بولی۔

"تیری دوڑ دیکھنے۔"

"تجھے سردی لگ جائے گی.... مبرّا' چل بیٹھ اس پر' گھر لے چلوں۔" یہی وہ لمحہ تھا جس کا اسے انتظار رہتا تھا۔ وہ اپنا گھوڑا بھگاتا لاتا۔ وہ اور سہتی رسہ' گیند پٹے' اسٹاپو' کیکلی ہر کھیل چھوڑ اس کی راہ میں کھڑی ہو جاتیں کہ اب اس کی واپسی کا وقت ہے۔ وہ اپنے گھوڑے پر اسے بٹھائے گا' گھوڑے کی لگام پکڑ کر گھر تک آگے آگے چلے گا اور اسے اپنا آپ کسی مہارانی کی طرح لگتا تھا۔ سہتی حسرت سے دیکھ کر کہتی۔

"کاش! وہ کبھی مجھے بھی بٹھائے۔"

صلاح الدین کے اکلوتے بیٹے پیان الدین کی رندھاوا سنگھ کے بیٹے امرت سنگھ سے بچپن سے ایسی یاری تھی جیسے صلاح الدین اور رندھاوہ کی۔ ہم عمر' محلے دار' بڑوں کا پرانا میل ملاپ' دکھ سکھ' عید تہوار میں خاندان برادری کی طرح شرکت کی جاتی۔ اپنے مذہبی اقدار و روایات کا پاس اپنی جگہ برقرار تھا۔ مگر دلوں میں اتنی وسعت ضرور تھی کہ حق ہمسائیگی' انسانیت کے ناطے اک دوجے سے اپنے مسائل پر تبادلۂ خیال کرتے۔ بس آپس میں رشتے ناتے نہیں گندھے تھے باقی کوئی پابندی کا تصور نہیں تھا۔ ہندو خاندان سے اٹھ بیٹھ ضرور تھی مگر سکھ برادری اپنے معاملات گرم جوشی سے نبھا رہی تھی' یہی چیز اگلی نسل میں منتقل ہو گئی۔

امرت کی چھوٹی بہن سہتی ضیاء الدین کی بیٹی مبرّا کی ہم جولی تھی۔ راج نگر کی گلیوں میں ان کا بچپن اکٹھے کھیلتے کودتے گزرا' جوانی میں وہ خود ان کے گھر آنے کے بہانے ڈھونڈتی' کبھی سلائی کڑھائی' سینے پرونے کے بہانے' کبھی کوئی نیا پکوان تائی ثریا سے سیکھنے' امرت اور پیان سارا دن گلیوں' کھیتوں میں پھرتے' اکٹھے اسکول آتے جاتے' صرف مسجد گردوارے کے اوقات الگ الگ تھے' بچپن کے یارانے وقت کے ساتھ لڑکپن تک جگری دوستی میں بدل گئے۔ پیان خلوص میں خوب آگے تھا۔ بچپن میں بیر' جامن' نالٹے کچھ بھی کھیتوں سے توڑنا سب سے پہلے' ارجیت کی جانب بھاگتا تھا۔ کچھ بڑے ہوئے' کبڈی' کشتی' میلوں میں ایک دوجے بنا شرکت تو کیا کرنی' غلیل یا ابا کی بندوق سے چڑے' بٹیر شکار کرتا' سب سے پہلے ان کا خیال آتا تھا۔

☆ ☆ ☆

روشنی جامن کے درختوں سے پھسل کر سارے کچے صحن میں رقصاں تھی' کالی چڑیاں' بلبل' کوئلیں نئی لپائی کیے مٹی کے فرش سے تنکے چن چن کر لے جا رہی تھیں۔ وہ ایک تھیلے میں بہت سے بٹیر ڈالے تیزی سے اندر داخل ہوا۔ وہ لال چارپائی پر بیٹھی بستر کی چادر پر رنگین بیل بوٹے کاڑھ رہی تھی۔ دونوں گھر ساتھ ساتھ جڑے تھے' درمیانی دیوار برائے نام تھی چھلانگ مارو یا اک چھوٹا سا دروازہ بھی تھا جو ہر وقت کھلا رہتا۔ زینب (مبرّا کی ماں) کی وفات کے وقت مبرّا بمشکل آٹھ برس کی تھی' ماں کو یاد کر کے ہر وقت روتی' ثریا ایک پل بھی اسے خود سے دور نہ کرتیں' لپٹا لپٹا کہ پیار کرتیں' رات کو ضیاء الدین کھیتوں سے پلٹتے' کھانا کھا کر اس کی انگلی پکڑ کر گھر لے جاتے۔ دو چارپائیاں ساتھ جوڑ اسے تھپک کر سلا دیتے' جیسے جیسے بڑی ہوئی چارپائیوں میں فاصلہ بڑھتا گیا لیکن سویرے اٹھ کر تائی ثریا کے ساتھ ناشتا اور پھر سارا دن ادھر۔ ناظرہ' سلائی کڑھائی' کھانا پکانا سب تائی نے سکھایا تھا۔ سب سے پہلے ابا اور تایا کے بستر کاڑھے تھے' پیان نے دبا سا شکوہ اپنے لیے کیا تو اب اسی کی چادر بنا رہی تھی۔ یوں

اچانک اس کے آنے اور قریب سے گزرتی ترچھی نگاہ ڈالنے پر وہ جزبز ہوئی اور سوئی پور میں۔ "اچھا" اس کے آگے بڑھتے قدم رک کے پلٹ آیا۔ زیادہ تو نہیں لگی؟" انگلی دانتوں میں دابے نفی میں سر ہلا دی گئی۔ اس نے پل بھر دیکھا پھر تھیلا اس کے قریب رکھ دیا۔

"جب اٹھو تو یہ تنور میں بھون دینا! شام کو امرت، ارجیت کی دعوت ہے۔" وہ تھیلے کو تکتی ذرا توقف سے بولی۔

"تو امرت، ارجیت سے ذرا فاصلہ رکھا کر۔"

"کیوں۔۔۔؟" اسے اچنبھا ہوا تھا۔

"پتا نہیں۔۔۔" اس نے کندھے اچکا کے خفت بھرے انداز میں کہا۔

"وہ دونوں بہت عجیب ہوتے جارہے ہیں، انہیں دیکھ کر میرا دل ڈرتا ہے۔۔۔ بس اب تجھے ان سے دور ہونے کی کوشش کرنی چاہیے۔"

"پاگل۔۔۔!" اس نے گردن گھمائی۔ "اس کی بہن، تو تیری بڑی پکی سہیلی بنی پھرتی ہے، اس سے ڈر نہیں لگتا؟"

"سہتی اس جیسی نہیں ہے۔" اس کی برجستگی پر وہ ٹوکتے ہوئے کہنے لگا تھا۔

"حالانکہ مجھے وہ لگتی ہے، آدھی نہیں پوری پاگل۔" وہ بچہ نہیں تھا کہ خود پر جمی اس کی حسرت بھری نگاہیں محسوس نہ کرتا لیکن جگری دوست کی بہن اور مہرا کی سہیلی ہونے کے سبب درگزر کر کے کبھی ذکر نہیں کیا تھا۔ امرت، ارجیت کے حوالے سے مہرا کے بے جا خدشے پر اس نے قہقہہ لگایا اور اندرونی کمروں کی جانب بڑھا جاتے جاتے اسے "پریشان نہ ہوا کر" کی تنبیہہ کی اور اچھا پکانے کی یاددہانی کرائی۔

تائی ثریا مؤذن کی آواز پر باہر نکلی تھیں بیان کی فرمائش سنتے ہی گھور کر بولیں۔

"پہلے اسے نماز پڑھ لینے دے۔"

"اماں ابھی تو اذان ہوئی ہے، گھنٹے دو گھنٹے تک وقت ہوتا ہے۔"

"دو وقت نہیں ہوتا، مہلت ہوتی ہے۔" اس کی حجت پر ان کی تیوری چڑھ گئی تھی "کبھی مسجد میں اذان کے گھنٹے دو گھنٹے بعد جماعت ہوتی دیکھی کہ چلو بھیا ابھی وقت رہتا ہے، اذان ہوتے ہی جماعت کھڑی ہوتی ہے، دیر تک مہلت تو اللہ نے اس لیے دی ہے کہ کسی مجبوری کی وجہ سے اس کے بندے کی نماز قضا نہ ہو بلکہ کچھ ٹھہر کر وقت ملے تو بندہ ادا کرلے، اولین وقت کی نماز اول ہوتی ہے۔۔۔ اور تیری کون سی مجبوری ہے سکھوں کی دعوت؟" ان کے غصے کو وہ ناک چڑھائے سن رہا تھا۔ اور وہ اس کی خفگی کے سبب بے چارگی سے منہ بنائے کہنے لگی۔

"جلدی سے پڑھ کر آ ابھی بھون دوں گی۔" وہ مسکرا کر اندر جانے لگا کہ ثریا کی آواز نے قدم روک دیے۔

"اندر کہاں جارہا ہے، باہر نکل مسجد جا۔"

وہ اپنی گردن گھما کر خجالت دور کرتا باہر کی جانب بڑھا تھا اور وہ گھڑولے کی اینٹوں سے بنی جالی میں اس کا گم ہوتا سراپا تکنے گئی۔ دل رک رک کر دھڑکتا تھا۔ کچھ تھا جو غلط ہونے جارہا تھا۔ ہر وقت ایک بے چینی رہنے لگی، اب پہلے والے حالات نہیں رہے تھے۔ بچپن کا ساون، پھاگن بیت چکا تھا۔ جوانی کا جیٹھ، اساڑھ چڑھتا آرہا تھا۔

تعلقات، بچپن کی محبتوں پر نادیدہ اوس دن بدن بڑھتی جارہی تھی۔ شہروں میں برسوں سے چلتی شورش زور پکڑتی گاؤں تک پہنچ چکی تھی۔ اس شورش کا سر پیر، مقصد کچھ واضح نہ ہو پاتا تھا۔ حکومتیں تو بنتی اور ٹوٹتی رہتی ہیں۔ مگر دیس، ملک کب بنتے یا ٹوٹتے دیکھے؟؟

پہلے پہل فرنگیوں کی آمدورفت گاؤں میں بھی ہوتی رہتی تھی، کبھی اکیلے آتے تو کبھی چھوٹی سی جیپ نما ٹم ٹم پر ایک دو گوریاں بھی ساتھ بیٹھی ہوتیں۔ پھر وقت کے ساتھ ان کی آمد بڑھنے لگی۔ شورش بڑھنے پر جب کوئی نیا افسر یا وائسرائے آتا تو ٹھاکروں کے راج نگر کا چکر لازمی لگاتا تھا۔

کالے سیاہ قیمتی گھوڑوں کی ٹاپوں میں اس کی سفید

ٹم ٹم چلتی۔ تنگ گلیوں میں رتھ کے گرد سفید جالی لگا کر اس کی میم کو سیر کروائی جاتی۔ درختوں، باغوں سے اچھا پھل توڑ کر خدمت میں پیش کیا جاتا۔ اور وہ گلابی، نیلی، سفید جالی دار لمبی میکسی پہنے سر پر برطانوی گول ہیٹ سجائے، سچے موتیوں کی جھولتی مالا پہنے مسکرا مسکرا کر گاؤں اور گاؤں کی آبادی کو دیکھتی۔ مگر وقت کے ساتھ ساتھ سب پر ان کی اصلیت کھلنے لگی۔ تو ان کی مسکان کراہت زدہ لگتی۔ ان کی چمکتی نیلی، سبز آنکھوں میں ہوس جھانکتی تھی۔ جو ہر کسی کو محسوس نہیں ہوتی تھی۔ اور شاید ٹھاکروں، راٹھوروں کو تو محسوس نہ ہوتی تھی۔

اور وہی ان کے گرد زیادہ دکھائی دیتے تھے۔ ہاتھ جوڑے، "کانپتے" مہاراج، مہاراج کرتے۔ ان کی خوشامدیں کرتے۔ ہری چرن کی کھاٹ سے خاصے فاصلے پر ریسٹ ہاؤس تھا۔ جب کوئی اپنی میم کے ساتھ آتا تو ایک آدھ دن وہاں قیام و طعام ہوتا اور گاؤں کے تمام حالات سے آگاہی کے لیے ہری چرن ساتھ ساتھ۔ کبھی پہلے وہ چھوٹی چھوٹی ضرورتوں، خواہشوں کے لیے اکثر صلاح، ضیاء کے پاس بھاگا آتا تھا لیکن 1940ء کے بعد اس کے چکر کم اور پھر بہت کم ہوتے گئے۔ یہاں تک کہ کچھ عرصے بعد اس نے ان کے کپڑے دھونے سے بھی انکار کردیا تھا۔ اور امرت کا باپ بھی اب پہلے کی طرح اوطاق میں بیٹھا اونگھتا نہیں تھا، وقت کے ساتھ ان کے مزاج میں برہمی نمایاں ہونے لگی اور پچھلے مہینے نئی فصل آنے پر ضیاء نے گندم کی بوری اس کی طرف بھجوائی جیسے ہر نئی فصل آنے پر بھجواتے تھے۔ اگر کبھی بھول چوک سے رہ جاتی تو چھوٹا سا امرت شکوہ کرنے لگتا۔

"چاچا! آپ کی مونگ تو اس بار بہت اچھی ہوئی ہے، مگر آپ کا بھتیجا ابھی تک مونگ کی پھلیوں کو ترس رہا ہے۔" وہ قہقہہ لگا کر ایک دھپ لگاتے۔

"تیری بوری اوطاق میں رکھی ہے، اپنے شیرو پر اٹھا کر لے جا، اور پھلیاں میرے لیے بھی لانا۔" پھلیاں تو جانے کبھی لایا تھا یا نہیں مگر ہر طرح کی فصل میں حصہ ضرور لیتا مگر اس بار بوری لینے سے صاف انکار کردیا۔

"تمہاری پہلی ہی ختم نہیں ہوئی۔"

ضیاء الدین کو بہت حیرانی ہوئی، کیا دلوں میں تیڑیں (دراڑ) آنی شروع ہوگئیں؟ ان کے دن بدن بچے تلے [illegible] لب و لہجے بتانے کو کافی تھے، تقسیم کا عمل دور نہیں برصغیر پر انگریز تسلط وہاں کے باشندوں نے کبھی قبول نہیں کیا تھا۔ راٹھوروں، ٹھاکروں نے دو تین بار زوردار لڑائیاں بھی کیں۔ چھوٹی موٹی جنگیں، تحریکیں شروع ہوتیں پھر بنا مضبوط سرپرستی کے دم توڑ دیتیں۔

لیکن پہلی عالمی جنگ کے بعد علی برادران کی تحریک خلافت نے خوب زور پکڑا۔ اس علاقے کی کمزور، ڈرپوک قوم اس تحریک کے پھیلنے سے خوف زدہ تھی۔ اس علاقے پر صدیوں مسلمان حکومت کر چکے تھے اور اگر پونی صدی کا فرنگی تسلط، جاتے جاتے سارا علاقہ پھر سے انہیں حکومت سونپ گئی تو ان کی قوم تو پھر پسپا ہی رہے گی۔ اسی خدشے کے پیش نظر اندرون خانہ سازشوں، فریب کاریوں کا جال بچھایا گیا اور شدھی تحریک کا آغاز ہوا۔

اس تحریک میں اسلامی بنیادوں کو بدعت کے ذریعے ہندوانہ مذہب کی طرف راغب کرنے کی ازحد کوشش کی گئی۔ لیکن عالم دین نے شدھی تحریک کو سنگھٹن تحریک کے ذریعے دبایا۔ یہ تحریکیں مخصوص علاقوں میں کام کرتیں اور ان ہی لوگوں کو متاثر کر رہی تھیں لیکن جب علی گڑھ کالج کے فارغ التحصیل طلباء نے باقاعدہ گاؤں گاؤں، قریہ قریہ جا کر تصور پاکستان اجاگر کیا تو لوگوں میں سوچنے سمجھنے کی صلاحیت پیدا ہوئی تھی۔ قوموں کے نظریات، اہمیت سامنے آئی۔ اور ان ہی دنوں الٰہ آباد میں ایک اجلاس ہوا اور باشعور افراد نے قرار داد پیش کی۔ وہ کچھ عرصے میں منظور بھی ہوگئی۔ اس کی منظوری پر ایک تعمیر یادگار ہوئی جہاں پر خوشی میں بہت بڑا جلسہ بھی ہوا تھا۔ اس جلسے میں شرکت کے لیے صلاح الدین، ضیاء الدین اپنے چند مسلمان دوستوں کے ساتھ لاہور گئے تھے۔ اپنے حقوق کے لیے کھڑے ہونا، اپنے عقائد و نظریات کے

ساتھ پُرامن زندگی گزارنا اپنی نسلوں کی بقا تھا گناہ نہیں۔ یہ کوئی جیت یا اعلان جنگ نہیں تھا جو وہ اپنے راٹھور، ٹھاکر، سنگھ برادران سے کنارہ کش ہوتے، بلکہ یہ ان کے بھی فائدے کی بات تھی۔ وہ اپنے نظریات و عقائد کے مطابق اپنے خطے میں زندگی گزاریں۔ فسادات سے پاک پُرامن خطہ بن جائے۔ لیکن نسلوں سے چلتی تعلق داری، دوستی، محبت، آپس کا میل ملاپ ان کی ایک شرکت نے کنارے لگا دیا۔ رنداوہ سنگھ نے تب سے اوطاق میں آنا چھوڑ دیا۔ ملاقات پر لہجے میں واضح برہمی جھلکنے لگی اور تو اور اب موہن گیتا اور اس کی اولاد سے خوب راہ و رسم بڑھا لی تھی۔ ضیاء الدین، صلاح الدین کو اس بات کا دلی دکھ تھا۔ اسی نہج پر صلاح الدین نے پیمان کو ان سے محتاط رہنے کا کہا تھا مگر اس کے نزدیک بچپن کی دوستی بڑی مقدس چیز تھی۔

"ابا! بچپن کی یاریاں بے اعتبار نہیں ہوتیں، تیرا وہم ہے۔۔۔ مجھے امرت سے کوئی خطرہ نہیں۔"

بہادر، کڑیل، جواں ہوتے پیمان کی سوچ اس کی صاف رنگت، کھلی پیشانی جیسی تھی۔ اٹھارہ سالہ پیمان چوبیس پچیس سالہ مضبوط جثے والا نوجوان لگتا تھا۔ صاف ستھرا ماحول، خالص غذا، فکر سے آزاد زندگی، جو ایک بار دیکھ لیتا نگاہوں میں ستائش ابھرتی تھی، عقل و ذہانت میں بھی سب دوستوں سے آگے۔ گھڑ سواری، نیزہ بازی کے کتنے مقابلے جیت رکھے تھے مگر امرت سے مقابلہ کرنے سے وہ خود اجتناب کرتا تھا۔ غالباً امرت سے ہارنا نہیں چاہتا تھا اور اسے ہرا کر خوشی منانا دشوار تھا۔ پچھلے ہفتے کی بات تھی۔ امرت اور ارجیت کے بے حد اصرار نیزہ بازی کا مقابلہ کیا اور سب سے پہلے پیمان نے نیزے سے کلی اکھاڑی۔ اس نے گھنی ابرو اٹھا کر اسے استہزائیہ دیکھا تھا اور لحہ بھر میں ہی اس کی آنکھوں میں سرخ لکیریں تنی، نتھنے پھولے۔ پیمان ہنس دیا۔

"کیا ہوا یار، تیری فرمائش پر مقابلہ ہوا تھا۔۔۔ اور میں کون سا جیتا ہوں، تیرا یار جیتا ہے۔" اس کی پیار بھری دھپ سے امرت کا مزاج قدرے معمول پر آیا مگر خاصی دیر خاموش رہا تھا۔ اب اتنی سی خفگی پر کیسے گمان ہوتا کہ سیاسی، جغرافیائی تبدیلی سے دوستی بے اعتبار ہو سکتی ہے۔

وہ بھنے بٹیوں کی دعوت دینے امرت کی طرف گیا تھا۔ وہ گھر کے بیرونی احاطے میں رنداوہ کے لیے حقے کی چلم بھرتے بے اعتنائی سے بولا۔

"میرا پیٹ خراب ہے۔۔۔ مجھے نہیں کھانے بٹیر۔"

"کیا ہوا؟" وہ اس کے کندھے پر دھپ لگاتے چارپائی پر اس کے قریب بیٹھ گیا۔ "کل تک تو تو ٹھیک تھا۔"

"لمحے میں دنیا بدل جاتی ہے پیمان، تو کل کی بات کر رہا ہے۔" چلم میں انگارے ابھی دہکے نہیں تھے سلگتے دھواں چھوڑ رہے تھے۔ پیمان آنکھیں سکیڑ کے مسکرا دیا۔

"زیادہ فلسفی نہ بن، چل حکیم شکورے کا چورن لے آتے ہیں۔"

"میں نے کہا ناں، مجھے نہیں کہیں جانا، تو اب جا۔" وہ درشتی سے کہہ، چلم اٹھا اندر کی جانب بڑھ گیا تھا۔ اس وقت پیمان کو اپنا آپ وہاں بے وقعت لگا تھا۔ گھر کے بیرونی حصوں، صحن تک میں ان دونوں کا آنا جانا اک عام سی بات تھی۔ اور پیمان تو بہت کم اس کی طرف آتا تھا۔ اکثر وہ ہی ان کے احاطے میں آ جاتا تھا۔ لیکن جب بھی پیمان اس کی طرف آیا، وہ ایسے کبھی اٹھ کر نہیں گیا تھا۔ کوئی چیز اندر دینی یا منگوانی ہو تو کسی کو آواز دے دیتا تھا مگر اب اس طرح اٹھ کر چلے جانا واضح اعلان تھا کہ وہ وہاں سے چلا جائے۔ وہ کچھ دیر متذبذب سا کھڑا دیکھتا رہا، پھر نگاہ اندرونی کمروں کے دریچے پر کھڑی سہتی پر گئی۔ وہ ہمیشہ کی طرف مسکراہٹ سجائے اسے دیکھنے میں محو تھی۔ اس نے تلخ نگاہ اس پر ڈالی اور واپس مڑا۔ اک الجھن نے آ گھیرا۔

"امرت نے ایسے کیوں کہا؟ ہو سکتا ہے اس کی طبیعت واقعی خراب ہو یا پھر چاچا رنداوہ نے کچھ کہا ہو۔ ابا بھی تو ہر وقت فاصلہ، فاصلہ کی رٹ لگائے رکھتا

ہے، ٹھیک ہے علاقے بٹنے والے ہیں، مگر دوستی تو نہیں بٹ سکتی۔ چلو پھر کسی وقت پوچھوں گا۔" وہ خود کو تسلیاں دے رہا تھا مگر وہ تسلیاں زیادہ عرصہ نہیں رہیں۔ رویے کھل کر سامنے آنے لگے تھے۔

☼ ☼ ☼

آئی گرمی کی بات تھی رات میں کچھ خنکی ضرور تھی مگر راتیں ابھی ویران نہیں ہوئی تھیں۔ علی الصبح ہی راج نگر میں شور مچ گیا تھا۔ مولوی نظام علی، اس کی حاملہ بیوی اور بیٹے کو سانپ نے ڈس لیا۔ آبادی کے بہت سے مردان کے گھر جمع تھے۔ اکثریت مسلم تھی۔ چہ مگوئیاں، شور شرابا۔۔۔ نظام علی کی برادری اکٹھی اور گھر میں صف ماتم۔ ہر شخص غم زدہ اور حیران کہ وہ کمرے میں ہی تڑپ تڑپ کر مر گئے۔ آخر باہر کیوں نہ نکلے، کوئی تو بچتا۔ کیا ایک سانپ نے سب کو ڈس لیا۔ اب یہ اللہ ہی جانتا تھا ایک سانپ تھا یا کئی۔ گاؤں کا مشہور سراغ رساں کرم داس کھرے کی نوعیت اور سائز دیکھ کر نہ تک پہنچ جاتا تھا۔ وہ بہت دیر تک نشان دیکھتا رہا۔ کمرے میں سانپوں کے لوٹنے کی لکیریں ضرور تھیں مگر کمرے میں داخل ہونے یا باہر نکلنے کا نہ نشان، نہ سوراخ، ایک چوڑے پاؤں کی آئی چپل کے نشان تھے۔ بہت سنبھل سنبھل کر رکھے قدم، قدموں کے وزن سے لگتا تھا ہاتھوں میں کوئی قیمتی، کوئی محتاط سامان ہے۔ چوکھٹ کے قریب قدم گہرے تھے، وہ کچھ دیر وہاں رکا ہوگا؟ پھر ان ہی نشانوں پر ہلکا سا پاؤں سرکنے کا گمان تھا۔ غالباً" اس نے ارد گرد دیکھا ان ہی پر الٹے پاؤں واپسی کے قدم رک رک کر چلے گئے تھے۔ تو کیا کسی نے باہر سے کنڈی لگادی اور کچھ دیر بعد کھول بھی دی۔ یہ کرم داس کی گہری سوچ تھی۔ وہ ان نشانوں کو چھڑی سے کریدتا، کھوجتا گھر سے بہت دور کھیتوں میں سے ہوتا ہری چرن کے گھاٹ پر، بہت سے قدم گھل مل گئے تھے۔ کرم داس کی نگاہ سامنے کھڑے چوڑے پیروں پر پڑی۔ نگاہ سرکتی اٹھی۔ چند پل نگاہ ہری چرن کی نگاہوں پر جمی رہیں۔ استفسار، کوئی بھانپ لینے کا اظہار محسوس ہوتا تھا۔ بہت سے لوگ پوچھتے پچھاتے کرم داس کے ساتھ چلتے یہاں تک آئے تھے۔ پیان سے صبر نہ ہوا وہ کرم داس سے استفسار کر رہا تھا۔

"چاچا! پتا نہیں چل رہا؟" وہ یک لخت چونکا اور اپنی ایک مرے کی عینک سنبھالتے ہوئے کہنے لگا تھا۔

"مولوی صاحب کے گھر تک ایک ہی کھرا ہے۔ ہوسکتا ہے وہ ان ہی کا ہو۔"

"یہ کیا بات ہوئی چاچا؟"

پیان کو اچنبھا ہوا "مولوی صاحب کھسہ پہنتے تھے، کھرا ہوائی چپل کا ہے۔۔۔ پھر سانپ کا لہریا بھی نہیں کوئی بات تو ہے، تیری سمجھ میں نہیں آئی یا تو بتانا نہیں چاہ رہا۔"

"نہیں، نہیں۔۔۔" کرم داس نے انکار کیا۔۔۔ اور ہری چرن لوگوں کے پیچھے ہوتا مجمع سے غائب ہوگیا تھا۔ کرم داس کے علاوہ کوئی نہیں جانتا تھا۔ نشان چوڑے چپٹے پاؤں کا ہے اور اکثر دھوبیوں کے پاؤں چوڑے ہوتے ہیں۔ امرت خوامخواہ ناک چڑھا کر بول پڑا تھا۔

"مولوی نظام بڑا کہتا تھا ناں، دوزخ میں سانپ، بچھو ہوں گے، یہ ہوگا، وہ ہوگا۔۔۔ تیرے گرو نے وہاں سے بھیج دیا ہوگا، اسے درشن کرانے، جگ میں ہی دیکھ لے کیسے ڈستے ہیں۔۔۔ ہاہاہا۔۔۔" پیان کو اس سے ایسی گھٹیا بات کی قطعاً" امید نہ تھی۔ اس نے سرعت سے نگاہ اٹھائی۔ وہ دن بدن بدلتا جا رہا تھا۔ اب وہ پہلے والا چودہ، پندرہ سالہ امرت رہا تھا نہ پہلی محبت نہ یاری، لفظوں میں درشتی بڑھتی جا رہی تھی۔ دو چار سال میں بہت تلخ ہوگیا تھا، ان دونوں نے قریبی قصبے سے اکٹھے آٹھویں جماعت پاس کی تھی تب تک دوستی مثالی تھی۔ پھر جیسے جیسے حالات بدلے 47ء قریب آنے لگا امرت کا رویہ بدلتا جاتا تھا۔ مگر اس سال واضح بدلاؤ محسوس ہونے لگا تھا۔

چند مہینے پہلے کی بات تھی کسی ظالم نے قرآن پاک کے بہت سے اوراق شہید کرکے گھاٹ کی ندی میں پھینک دیے۔ علاقے کی مسلم آبادی غیض و غضب

میں تھی۔ مولوی نظام نے باقاعدہ لوگوں کو جمع کر کے احتجاج بھی کیا۔ لمبی لمبی تقریریں کیں بہت رویا۔ دعا کی اللہ سے معافی مانگی۔ اسی حوالے سے ایک دن ان دوستوں میں بحث ہو گئی تھی ارجیت ان دنوں نیا نیا کلکٹر بھرتی ہوا تھا۔ جب بات کرتا گردن اکڑ جاتی سینہ پھول جاتا۔

"صفحے ہی تو تھے' اس میں اتنا چیخنے کی کیا ضرورت ہے' اور لکھ لے نظامہ کہ یاد نہیں رہے اسے۔" قریب حقہ پیتے ہری چرن نے قہقہہ لگایا۔ یہان کی آنکھوں میں سرخی اتر آئی۔

"زبان سنبھال کر.... ارجیت۔" وہ غرایا اور ہری چرن کو گھورا۔ "وہ ہماری مقدس کتاب ہے' اس کی حفاظت ہمیں اپنی جان سے بھی پیاری ہے۔"

"اچھا!" وہ استہزائیہ ہنسا۔ "پہلے تو نظامہ کہتا تھا اس کی حفاظت کا ذمہ تیرے رب کا ہے۔" پھر ہری چرن کے استہزائیہ گھومتے ڈیلے' ارجیت کے لفظ اس کو بتا گئے۔ اس نے لمحے میں ہی ارجیت کا گریبان پکڑ لیا تھا۔ اس سارے عرصے میں امرت خاموش بیٹھا تھا مگر جیسے ہی دست درازی دیکھی میکانکی انداز میں اٹھا اور اس کے ہاتھ جکڑ لیے۔

"ہونہہ۔ جوانی کا خون ابل رہا ہے' مگر یہ نہ سمجھ اجیت اکیلا ہے' اس کا بھائی زندہ ہے ابھی۔" اس کا تنا سینہ' جتاتی آنکھیں' یہان کے لیے بہت تکلیف دہ تھیں۔ بچپن کا دوست ہمیشہ بھائی کی طرح سمجھا' کبھی پہلے مذہب پر کوئی بات نہیں کی مگر آج اپنے اندر کی شیطانیت دکھا رہا ہے' یہان نے بہت دکھ سے اسے دیکھا تھا۔ ہری چرن ان دونوں کو وہاں سے ہٹا لے گیا۔

"یہ سارا فتنہ نظامے کا ہے' ہو جائے گا اس کا بندوبست۔" دھوتی بڑبڑا رہا تھا۔ کئی دن گزر گئے دوبارہ ان کا آمنا سامنا نہیں ہوا تھا۔ بہت دنوں بعد سرِ راہ وہ ملا اک اجنبی کی طرح۔ اس نے حوالدار کی وردی پہن رکھی تھی۔ ان دونوں نے کئی بار قریبی شہر میں نوکری کی درخواست دی تھی' سرکاری دفاتر کے چکر لگائے' ہر بار جواب ملتا "جگہ خالی نہیں ہے۔" اب اچانک امرت کو مل گئی۔ کانوں کان پتا بھی نہ چلا۔ ویسے بھی تمام اداروں میں اکثریت راٹھوروں' ٹھاکروں' برہمنوں کی تھی۔

مسلمان بھی کوئی کوئی بھرتی ہو جاتا اور پھر سب خوشی مناتے۔ امرت کو نوکری مل گئی خوشی میں شامل تو کیا کرنا تھا' بتانا گوارہ نہیں کیا۔ پہلے تو وہ نظر انداز کیے گزرنے لگا تھا مگر پھر پرانی مروت کے تحت سرد انداز میں مبارک دے ڈالی۔

"تیری نوکری لگ گئی تو نے بتایا بھی نہیں۔"

"تیری بھی لگ جاتی' اگر ان بے تکے جلسے جلوسوں میں وقت برباد نہ کرتا۔"

اسے اس کی بات بہت چبھی تھی' پہلے تو اس نے ایک دو جلسوں میں ہی شرکت کی تھی مگر اب ضد نے سر اٹھایا۔ ان دنوں علی گڑھ کالج کے طلباء بہت متحرک تھے گاؤں گاؤں' قریہ قریہ جاتے' آزادی کی دی گئی تاریخ پر ڈٹے رہنے کا عزم پیدا کرتے۔ چند دن پہلے مولوی نظام کے گھر آئے' جمعہ کے خطبے کے بعد بہت سے معززین سے مشاورت کی' ایک رات کا قیام و طعام بھی کیا تھا۔ اس رات یہان بھی وہاں موجود تھا۔ اور آئندہ ان کے ہر جلسے میں مولوی صاحب کے ساتھ شرکت کی یقین دہانی بھی کرائی تھی۔

اگلا جلسہ ہفتے کے روز برابر گاؤں میں تھا مگر اس سے پہلے ہی مولوی صاحب کی حادثاتی موت ہو گئی۔ موت حادثہ یا سانحہ' وہ بھی پورے کنبے کے ساتھ۔ اتنے پر سوز لمحات پر امرت کا ہنسنا' یہان کے کانوں کی لوئیں سلگنے لگیں۔ وہ پہلی بار امرت کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالے سامنے آکھڑا ہوا۔

"امرت تو ہوش میں رہ کر بات کر' یہ نہ سمجھ میں تیری وردی سے ڈر جاؤں گا۔"

"کیوں؟" اس کے چبا چبا کر بولنے پر امرت تڑخا۔

"نظامہ تیرا ماما لگتا تھا' یا میں اس کا ہاتھ پکڑ کر دوزخ میں ڈال آیا ہوں' جو تجھے اتنی تپ چڑھی ہے۔" یہان اس پر چڑھ دوڑنے کو تھا لوگوں نے بمشکل قابو کیا۔

”میں نے تیرے گرو کو آج تک کچھ نہیں کہا اور تو۔“
”ہوں‘ تو کچھ کہہ بھی نہیں سکتا۔“ امرت جواباً گردن مار کر چلایا تھا۔ بیان کے سینے پر ہاتھ رکھے کتنے لوگ اسے قابو کر رہے تھے وہ جھٹ جھٹ جاتا لیکن امرت وہاں سے چلا گیا تھا۔ پھر کس نے کس کو ڈھونڈتا تھا‘ مولوی نظام علی کا معاملہ بھی بہت سے معاملے کی طرح دب گیا تھا۔ البتہ بیان کے دل میں ایک دیوار اٹھ گئی تھی۔ بچپن کی یاری‘ سارا خلوص اس کے نیچے کہیں دب گیا۔ اتنے لمبے عرصے کی دوستی پر صرف اسے دکھ تھا بلکہ پچھتاوا بھی تھا۔
”اس کے بجائے کسی کتے سے دوستی کی ہوتی‘ کم از کم وفادار تو رہتا۔“

✡ ✡ ✡

وہ صبح سے باورچی خانے میں لگی پوری دل جمعی سے کڑھی‘ خشکہ ابال رہی تھی۔ بیان کو کڑھی خشکہ بہت پسند تھا۔ کڑھی میں چمچ ہلاتے اس میں بنتے پھٹتے بلبلے دیکھتے وہ خیالوں کی رو میں جانے کہاں سے کہاں گم تھی۔ وہ کب پیچھے آن کھڑا ہوا؟ بڑا سا بلبلہ یک لخت پھٹا اس کا چھینٹا اس کی سڈول کلائی پر آگرا۔
”اوچ‘ سس۔“ اس کی سسکاری پر وہ تفکر سے آگے بڑھا تھا۔
”دماغ کہاں ہے تیرا۔“ کلائی پکڑ کر اپنے دامن کے کنارے سے پونچھی‘ سپید نازک کلائی پر گلابی دھبہ بن گیا تھا۔ اس نے اپنی پوریں دھبے پر رکھیں اور ٹھنڈی راکھ چٹکی میں بھر کر اس پر چھڑکی تھی تاکہ آبلہ نہ بنے۔ مبرا کے کہیں بہت اندر تک ٹھنڈک اتر رہی تھی۔
”جلن کم ہوئی؟“ استفسار پر اس نے اثبات میں سر ہلایا اور اپنی کلائی کھینچ لی۔ وہ بھی یک لخت سٹپٹایا۔ اور مڑتے ہوئے کہا۔ ”دھیان سے کام کیا کر‘ جانے کیا سوچتی رہتی ہے۔“
کڑھی پر تیز پات‘ ڈوڈی مرچ کا تڑکا لگتے ہی سارے گھر میں خوشبو پھیل گئی۔ بڑی سی تام چینی کے تھال میں خشکہ کی تھالی‘ کڑھی اور اچار کٹوری اس کے سامنے رکھ گئی۔ کبھی یہ کھانا اسے سوغات کی طرح لگتا تھا جس دن بھی بنتا اوطاق میں پلیٹیں بھر بھر لے جاتا۔ کڑھی پر تیر ماسی کی تھی کا تڑکا نتھنوں میں جاتی سوکھی میتھی گرم مسالے کی خوشبو۔ یک لخت وہ بے دردیاد آگیا تھا۔
”یار جو تیرے گھر کی کڑھی کا ذا نقہ ہے نا‘ پورے راج نگر میں نہیں ملتا۔“ بیان کا دل کھانے سے اچاٹ ہو گیا تھا۔
”آخ۔“ چاولوں بھرا چمچ پلیٹ میں پٹخ کر نفرت کا گھونٹ اندر انڈیلتا اٹھ کر کمرے میں چلا گیا۔ ٹرے وہاں دھری کی دھری رہ گئی تھی۔ شیشے کا رنگین پراندہ لہراتی سہتی جانے کہاں سے آدھمکی۔ جب سے اس کی امرت سے تو‘ تکار ہوئی تھی مبرا نے سہتی سے بھی فاصلہ کرلیا تھا۔ بیان باہر کے معاملات کبھی گھر میں آکر نہیں بتاتا تھا اور پھر امرت سے جھگڑا‘ نا ممکن۔ گلی محلے کے بچوں سے پتا چلا تھا۔
”باجی‘ مولوی صاحب کے گھر کے باہر بیان باؤ نے امرت جی کا گریبان پکڑ لیا تھا۔“
”کیوں؟“ اس نے دل تھاما۔
”کچھ بڑی لڑائی تھی امرت جی نے کچھ کہا۔ بڑا غصہ کیا بیان باؤ نے..... لوگوں نے بڑی مشکل سے بیچ بچاؤ کرایا‘ گندی گالیاں دے رہے تھے ایک دوسرے کو۔“ اسے بچوں کی باتوں پر کبھی یقین نہ آتا اگر بیان کا الجھا‘ خاموش رویہ محسوس نہ کرتی۔ پھر شام کو تائی ثریا نے تصدیق کے لیے پوچھ بھی لیا۔
”تو امرت کے ہتھے چڑھا تھا۔؟“
”مجھے کیا ضرورت ہے‘ اس کتے کے منہ لگنے کی۔“ اس نے کندھے پر رکھا صافہ جھاڑا اور اٹھ کر باہر جانے لگا۔
”دیکھ بیان الدین۔“ تائی اس کے سامنے کھڑی ہو گئی تھی۔ ”اب تقسیم کا وقت قریب ہے‘ وہ اور اس کے جیسے بار‘ بار الجھیں گے۔ تو ٹھنڈا رہا کر‘ گھر میں دیوار اٹھانا آسان نہیں ہوتا۔“

"کیوں۔" وہ دانت جما کر بولا۔ "اس کے باپ کا گھر ہے۔"

میرا حق دق دیکھتی رہ گئی تھی! امرت کے بارے میں کبھی ایک لفظ نہیں سنتا تھا اور اب اتنی نفرت۔ حالانکہ امرت اسے خود بھی کبھی اچھا نہیں لگا تھا عجیب گھٹیا لالچی سا۔ اور اب اپنی پرائی اور بہت کی سہیلی صرف امرت کی بہن ہونے کے سبب چبھنے لگی تھی۔ حالانکہ سہتی خود بھی بھائی کے خلاف ہی تھی۔ کتنی بار تو وہ میرا کو کہتی۔

"امرت کے مقابلے میں پیان ہیرا ہے۔ اور ہیرے چھپے رہیں تو اچھا ہے۔" میرا تب بھی اس کی بات ناگواری سے سنتی اور دن بہ دن انداز میں روکھا پن لے آئی' مگر وہ ڈھیٹ۔ نہ صرف آجاتی بلکہ پہلے کی طرح بے تکلف ہنسی ٹھٹھول۔۔۔ اب بھی سیدھی چارپائی کے پاس رکی اور میرا کو نروٹھے پن سے گھورا۔

"تو نے گڑھی خشکہ بنایا' اور میری طرف بھیجا بھی نہیں۔۔۔ بے دید' بے وفا۔" چارپائی پر چسکڑا مار پلیٹ اٹھا کھانے لگی۔ میرا گھور رہی تھی جس کے لیے بنائے اس نے چکھے بھی نہیں' اور وہ ندیدوں کی طرح ہڑپ کر رہی ہے۔

"گھور کیوں رہی ہے' نظر لگائے گی۔۔۔" اس نے اچار کی پھانک کھاتے ہوئے اسے استفہامیہ دیکھا اور پھر چٹخارہ لیتے کہا۔ "جا۔ جا کے ایک گلاس پانی لے کر آ۔" اس کے انداز پر وہ چڑ گئی۔

"جا کر پی لے۔ تیرے پیروں پر مہندی لگی ہے۔"

"ہا۔ آ۔ ہائے۔۔۔ جا دفع ہو۔" ہاتھ جھٹک' پلیٹ دھر۔۔۔ اٹھی۔ وہ گھڑولے کی جانب بڑھی کہ امرت چلاتا ہوا دندناتا اندر آگیا۔ آج سے پہلے وہ ہمیشہ کھنکھار کر "بوا ثریا۔" آواز دے کر اندر قدم رکھتا تھا۔ مگر آج لال پیلا ہوا جا رہا تھا۔ اسے پہلی نظر میں ہی سہتی دکھائی دی وہ اس کی جانب بڑھا۔ اور سہتی کو چٹیا سے پکڑ لیا۔

"کیوں مری ہے یہاں بے غیرت' نمک حراموں کے گھر۔۔۔ آئندہ آئی تو ٹانگیں توڑ دوں گا۔" میرا دوپٹا لپیٹتی سہم کر کئی قدم پیچھے ہو گئی تھی۔ پیان' ثریا شور کی آواز سن کر باہر آئے تھے۔ امرت کی چیخ پکار اسے سلگا گئی۔ اس کے کانوں کی لو' کنپٹی کی رگیں' چہرے کی لالی اس کے شدید غصے کی غماز تھی' وہ تیزی سے اس کی جانب بڑھا۔

"تیری جرأت کیسے ہوئی' میرے گھر میں شور شرابا کرنے کی۔۔۔ اور نمک حرام کسے کہا۔ نمک حرام تو تم ہو' ساری زندگی ہمارا کھاتے رہے' اب جدائی کے وقت آنکھیں ماتھے پر رکھ لی ہیں۔"

"او۔۔۔ بکواس بند کر اپنی۔" امرت نے نتھنے پھلائے چٹیا پر گرفت بھی سخت ہو گئی تھی۔

"بکواس تو بند کر۔ آئندہ یہاں قدم رکھا۔۔۔ تو!"

"کیا تو؟ تو نے بڑے یہاں خزانے داب رکھے ہیں۔" طنزیہ کہتے اس کی نگاہ پیان کے پہلو میں کھڑی نازک سی میرا پر رکی تو فوراً" لہجے میں تمام خباثت اتارتا اس پر آنکھیں جمائے بولا تھا۔

"ویسے۔۔۔ خزانے تو یہاں ہیں۔۔۔"

"الو کے پٹھے۔۔۔" پیان نے اسے گریبان سے جا پکڑا۔ "اگر اس پر نگاہ بھی ڈالی' تو تیری آنکھیں نکال لوں گا۔"

"نگاہ! ہونہہ۔۔۔" سہتی کی چٹیا چھوڑ' جھٹکے سے اپنا گریبان چھڑایا۔ "اگر تو نے جلسے' جلوس' نعرے بازی نہ چھوڑی' نگاہ تو کیا' ساری کی ساری کو اٹھا لوں گا۔"

"امرت۔۔۔!" پیان کی دھاڑ سے در و دیوار لرز اٹھے تھے اس نے قریب رکھا تیز دھار کھرپا اٹھا لیا۔ ثریا' میرا نے چلاتے ہوئے اسے کھینچ کر قابو کیا۔

"رب کا واسطہ تجھے پیان۔۔۔ ٹھنڈا رہ۔۔۔"

سہتی الگ بھائی سے چپکی چلا رہی تھی۔ "امرت ہوش کر' وہ تیرا دوست' تیرا یار ہے۔ کچھ عرصے میں چلا جائے گا۔ چل یہاں سے' آئندہ بھی نہیں آؤں گی۔ چل میرا ویر۔"

"ہونہہ۔" اس نے تضحیک سے تھوکتے ہوئے ہاتھ ہوا میں اٹھایا۔ "بڑا آیا' پی ٹی جگر ٹھنڈا کرنے والا۔" ہاتھ زور سے گھڑونچی پر رکھی صراحی کو مارا۔

چھناکے سے مٹی کا کوزہ ٹوٹا۔ ٹھنڈے پانی نے سرخ گول اینٹوں کے فرش کو جل تھل کردیا تھا۔

☆ ☆ ☆

کھلی فضاؤں میں چیل کوے بڑھتے جا رہے تھے جہاں کہیں شکار دیکھتے جھپٹ پڑتے۔ ان کا بچا کچھا گدھ نوچنے آجاتے۔ پورے ماحول میں بے ہنگم سا شور برپا تھا۔ معصوم چڑیاں، مینا سہم کر بیٹھی اپنی سہیلیوں کو بھی ترستیں۔ آج پھر وہ بڑی سی چادر اوڑھے چھپتی چھپاتی کوئی تیسری بار صراحی لے کر آئی تھی۔ سرخ، نیلی، سفید، پیلے پھول پتوں کی رنگین صراحی۔

"نمبرا، تو میری سہیلی ہے، ناں... رکھ لے اسے۔ پیان کو گھڑے کا پانی پسند نہیں ہے۔"

"تو، تیرا کیا خیال ہے، یہ بات مجھے نہیں پتا، تیرے سے پہلے اسی دن میں نے یہاں صراحی لاکر رکھی تھی، مگر وہ کہتا ہے، اب بھی صراحی کا پانی نہیں پیے گا، تو نہیں پیے گا، تو جانتی ہے ناں وہ اپنی بات کا کتنا پکا ہے۔"

"یہ تو صحیح ہے مگر... ؟ وہ پیاسا رہتا ہوگا تو کہیں چھپا کر رکھ دے، چپکے سے اس کا پانی دے دیا کر۔" وہ صراحی زمین پر رکھتے ہوئے منمنائی تھی۔

"اچھا! جیسے وہ بچہ ہے۔" وہ جتا کر بولی تھی۔ "میں یہ سب کرکے دیکھ چکی ہوں اور یہ بتا، تو کیوں اتنی ہلکان ہو رہی ہے کیا لگتا ہے تیرا...." اس کی تفتیشی نگاہ پر وہ جزبز ہوئی۔

"میرا... میرا کیا لگتا ہے۔ جو لگتا ہے، تیرا ہی لگتا ہے۔"

"چل پھر یہ اٹھا۔" نمبرا نے ابرو اٹھا کر صراحی کی طرف اشارہ کیا تھا۔ "اور جا... وہ آجائے گا۔" اس کی کاجل بھری آنکھیں پانی سے لرزنے لگی تھیں۔

وہ گنا چھیلتا گھر میں داخل ہوا تھا۔ کانوں تک آتے گھنگھریالے بال، چوڑے شانے، کھلا رنگ، آسمانی کرتے میں وہ مضبوط جوان لگتا تھا، وہ لمبے ڈگ بھرتا صحن عبور کر رہا تھا جب اس کی نظر رنگین شیشوں سے سجی نارنجی اوڑھنی پر گئی۔ وہ فوراً سمجھ گیا تھا۔ ہو نہ ہو یہ سہتی ہے۔ اس نے گنا ایک جانب پھینکا اس کا پھوک تھوکا۔

"کیوں آئی ہے یہ...؟" اس کی گمبھیر تا آواز کاٹ دار تھی۔ اس نے چونک کر پیچھے دیکھا گلابی ہونٹوں میں نارنجی اوڑھنی کا پلو آنکھوں میں ٹمٹماتا پانی۔

"یہ... صر... صراحی..." وہ بمشکل بولی تھی۔

"یہ تیری یا تیرے بھائی کی بھول ہوگی سہتی کہ میں صراحی کا پانی پیے بنا تڑپ کر مر جاؤں گا، صراحی نہیں تو گھڑا، نلکا، ندی، نالہ، جوہڑ کوئی سا بھی پانی پی کر جی لوں گا، پیاسا زندہ رہ لوں گا۔ میرا پانی ضائع کرکے جو سمجھتا ہے نا ڈر جاؤں گا پیاس سے.... اس کی بھول ہے۔ صرف بھول.... جو اس نے سوچ رکھا ہے نا ہندوستان پر فرنگی کے بعد راٹھور، ٹھاکروں کی حکومت.... وہ کبھی نہیں ہو سکتی، بتا دے اسے، ہم لہو دے کر وطن بنا لیں گے، پانی کیا چیز ہے.... پاکستان بنے گا ان شاءاللہ ضرور بنے گا۔ ہونہہ۔" اس نے جاتے جاتے صراحی کو زور سے ٹھوکر ماری۔ وہ گول گھومتی زمین سے ٹکرائی، اس کا بل دار او نچا منہ چیخ کر ٹکڑے ہو گیا۔ دو موٹے سے آنسو رخساروں پر بہہ گئے تھے۔ وہ زمین پر بیٹھی چیخی صراحی اور ٹکڑے سمیٹ رہی تھی۔ نمبرا نے بھی اپنے آنسو بہت مشکل سے روکے تھے۔ اپنے گھر میں یوں اپنی سہیلی کی بے وقعتی وہ بھی صرف اس کے بھائی کی وجہ سے، اس کی برداشت سے بالکل باہر تھا۔ وہ اس کے شانے سہلاتی اس کے برابر بیٹھ گئی۔

"سہتی تو یہاں مت آیا کر، پیان کا تجھے جھڑکنا مجھے اچھا نہیں لگتا۔" اس نے چادر سے آنسو اور ناک پونچھتے ملتجی نگاہ اٹھائی، نمبرا نے اسے گلے لگا لیا۔

"تو امرت کی بہن ہے اور امرت.... کیسے آنکھوں میں خون لیے پھرتا ہے، بچپن کی یاری، دوستی کسی بات کا خیال نہیں، صرف ملک بننے سے وہ اپنے جگری دوست کا دشمن بن گیا۔"

"نمبرا یہ صرف نہیں ہے۔" اس نے سر اٹھا کر نمبرا کے چہرے کو ٹٹولا، اپنا ہاتھ اس کے رخسار پر رکھا،

دوسرے رخسار سے رخسار جوڑ لیا۔ "یہ ذرا سی بات نہیں ہے۔ گھروں میں دیواریں اٹھ رہی ہیں' آپس داری' بچپن کی سکھیاں' بچھڑیں گی' سرحدیں قائم ہوں گی' بہت دوری آجائے گی۔ مبرا۔"

"سمجھتی' جب زمین کسی ایک قوم و فرقے کے لیے تنگ کردی جاتی ہے تا پھر وہاں دیواریں تو اٹھتی ہیں' سرحدیں کھنچ جاتی ہیں۔"

"کیسی تنگی مبرّا۔۔۔؟ سب کچھ تو ہے تمہارے پاس۔ کھیت کھلیان۔۔۔ گھر' رشتے۔"

"ہاں۔۔۔ بچے کھچے کھیت۔۔۔ آدھے سے زیادہ تو موہن گپتا نے قبضے میں لیے۔ کسی نے انصاف دیا ہمیں؟ الٹا چپ کرا دیا۔۔۔ ارجیت کلکٹر لگ گیا۔۔۔ امرت کو حوالداری مل گئی اور پیان وہ بھی تو اتنا ہی پڑھا لکھا ہے' اسے کیوں نہیں ملتی نوکری۔۔۔؟ کیوں کہ وہ مسلمان ہے' شہر کے اسکولوں میں انگریزی' سنسکرت کو اہمیت دی جارہی ہے' اردو پہ کیوں پابندی ہے' مسلمانوں کے گھر جل رہے ہیں' دین کی بے حرمتی ہو رہی ہے' ہر جگہ ہمارے رستے تنگ اور تو کہتی ہے ہم آزادی کی بات نہ کریں۔"

اس نے سسکتے ہوئے "نمبرّا" کہا اور گلے میں بانہیں ڈالے لپٹ کر رونے لگی۔

"اپنی جنم بھومی پر سرکار سب کو برابری پر رہنے کیوں نہیں دیتی؟ اپنے بچپن کے سنگی ساتھی سے کتنی یادیں' محبت ہوتی ہے کتنا مشکل ہے ان کے بغیر جینا۔۔۔" وہ کراہتے ہوئے کہہ رہی تھی۔ "نمبرّا۔۔۔ تم نہ جانا۔۔۔ گرو کے واسطے تم لوگ مت جانا' میں تو مرجاؤں گی اگر تم لوگوں کو نہ دیکھا۔" اور دل پکار رہا تھا۔

"پیان کو نہ دیکھا تو۔"

"کوئی کسی کے لیے نہیں مرتا' پگلی۔۔۔ اپنی آئی پر جاتے ہیں اور جب حالات اچھے ہوں گے' ہم آتے جاتے رہیں گے۔۔۔ ایک دوسرے کو یاد کریں گے' خط لکھیں گے۔" دونوں لڑکیاں بہت دیر روتی رہی تھیں۔ ایک کے آنسو آنے والی آزاد فضاؤں کی امید و بیم کے لمحات کے تھے' کہیں کہیں سہیلی کا دکھ بھی تھا'

مگر دوسری کی سسکیاں صرف بچھڑنے کی تھیں' جانے کس سے؟ کیا خوف' کیا اندیشے؟

☆ ☆ ☆

کونے میں بنے باورچی خانے میں وہ بہت دیر سے کام میں مشغول تھی۔ وہ جب سے یہاں آئی تھی غیر محسوس طریقے سے سارے گھر کے کام آہستہ آہستہ اپنے ذمہ لے لیے۔ صبح سب سے پہلے اٹھتے ہی سارا گھر صاف کرلیتی' برتن دھو کر ٹھکانوں پر رکھتی' جب تک سب افراد اٹھتے وہ ناشتا تیار کرچکی ہوتی۔ ناشتے سے فارغ ہوتے ہی باتوں باتوں میں زہرہ کے ساتھ سبزی بنالیتی' روٹی کبھی وہ تو کبھی زہرہ اتار لیتی تھی۔ بچوں کے اسکول سے آتے ہی بھاگ بھاگ ان کے کام کرتی۔ ان کے منہ چومتی۔ پھوپھی مختاراں دو ماہ رہ کر واپس اپنے گھر جانے لگی جب بی بی سے چلنے کو کہا۔ وہ جھجکتے ہوئے بولی۔

"ماسی مجھے زہرہ اور بچوں کے پاس چھوڑ دے۔"

زہرہ تو سنتے ہی کھل گئی۔ اس کے آجانے سے اسے بہت آرام ہوگیا تھا۔ کب کیسے سارے کام ہوجاتے' وہ آرام سے پڑوس میں ملنا ملانا بھی کرلیتی۔ اس نے بھی پھوپھی سے فرمائش کی۔ برسوں بعد اس نے فرمائش کی تھی' وہ مان گئی۔

درمیان میں ایک دو چکر لگائے' مگر بی بی کا دل ایسا یہاں لگا وہ کہیں جانے کو تیار نہ تھی۔ بچے بھی اس سے بہت مانوس ہوگئے تھے' چھوٹا فیضان اس کی جلی ہوئی جلد سے ڈر جاتا۔ ڈرتے ڈرتے کوئی چیز پکڑتا' پکڑاتا۔ چونک بڑے بھی جاتے تھے اگر کبھی یک لخت سامنے آجاتی۔ رنگت اچھی خاصی گہری سرخ سانولی تھی' لیکن دس سالہ عثمان اور خاص کرام ہانی کی اس سے بہت دوستی ہوگئی۔ اس کے پاس بیٹھی قصے کہانیاں سنتی' بال بنواتی جب وہ باورچی خانے میں ہوتی تو کھانا پکانے کے طریقے پوچھتی رہتی۔

ام ہانی اس کے قریب چوکی پر بیٹھی باتیں بگھار رہی تھی۔ اس نے کڑھی دم پر رکھی۔ دم لگا خشکہ اتار کر

نیچے رکھ دیا۔ وہ سفید لٹھے کے سوٹ پر سیاہ واسکٹ پہنے ابھی دفتر سے واپس آیا تھا۔ وہی بارعب سراپا، چوڑی اٹھان آج بھی کسی کو اپنے پیچھے پاگل کر سکتا تھا۔ وہ قدم قدم بڑھتا اس کے قریب سے گزرا "السلام علیکم" اس کی بھاری آواز کڑھی میں پتے بلبلے کی مانند اسے اپنا دل پھٹتا محسوس ہوا۔ اس نے رخ پھیرتے ہوئے سر کے خم سے جواب دیا۔

وہ پہلے اپنے کمرے میں گیا پھر کپڑے اٹھائے غسل خانے کی جانب بڑھ گیا۔ کچھ دیر بعد تازہ دم ہو کر صحن میں بچھی چارپائی پر بیٹھ گیا۔ زہرہ اس کے پاس آ بیٹھی اور فیضان کا بازو کھینچ کر باپ کے سامنے کیا۔ روزانہ کی طرح شکایتیں شروع کر دی تھیں۔ وہ اس کی کسی بات پر مسکرا دیتا، کسی پر فیضان کو گھور کر دیکھتا۔ کڑھی کے تڑکا لگنے کی خوشبو پر وہ لمحہ بھر کے لیے چونکا تھا پھر باتیں کرنے لگا۔ اس نے ایک بڑی ٹرے میں چاول، کڑھی، سلاد اور پانی رکھ کر ام ہانی کو تھمائی۔

"جا اپنے ابو کو دے آ۔" اس نے ٹرے پکڑتے ہوئے کہا تھا۔

"بی بی ایک کٹورے میں شکر اور گھی بھی ڈال دو ابو کڑھی نہیں کھاتے۔"

"کیا۔۔۔!" اس نے حیرت سے اسے دیکھا اور غیر ارادی نگاہ قدرے فاصلے پر بیٹھے سائیں پر گئی۔ اب وہ فیضان کے گھنگھریالے بالوں میں انگلیاں پھنسائے اسے چھیڑ رہا تھا۔ نگاہ پلٹ آئی۔

"کیوں کیوں نہیں کھاتے۔۔۔؟"

"وہ کہتے ہیں کڑھی سب کو پکانی نہیں آتی۔"

"صحیح کہتے ہیں۔۔۔ وہ تو کوئی اور ہی تھی جس کی کڑھی سارے گاؤں میں مشہور تھی۔"

اس کی بڑبڑاہٹ پر ہانی نے پوچھا۔ "بی بی کیا کہا۔۔۔؟"

"کچھ نہیں۔۔۔ جا تو یہ لے جا۔۔۔ اگر پسند نہ آئی تو گھی شکر لے جانا۔" شرمیلی سی ام ہانی نے ٹرے باپ کے سامنے رکھی تھی۔ پہلے نوالے پر ہی وہ پل بھر کے لیے دم بخود رہ گیا۔ اک استفہامیہ نگاہ اٹھا کر زہرہ سے پوچھا۔

"تو نے پکائی ہے۔"

"نہیں۔۔۔ بی بی نے بنائی ہے۔" اک ترچھی نگاہ دور اس لڑکی کی پشت پر گئی تھی جو چولہے میں بجھی راکھ کو تنکے سے کرید رہی تھی۔ وہ پھیکا سا مسکرایا۔

"اس کے ہاتھ کا ذائقہ بہت مانوس سا ہے۔"

"ہاں کہتی ہے اسے اور اس کی سہیلی کو کام کرنے کا بہت بچپن سے شوق تھا۔ دونوں نے مل کر بہت جلدی سارے کام سیکھ لیے تھے۔" وہ کھانا کھاتے آہستہ آہستہ اثبات میں سر ہلاتا رہا۔ کئی بار نگاہیں اس پر ڈالیں، وہ جوں کی توں جھکی بیٹھی تھی۔ پتا بھی نہ چلا کب پلیٹ صاف ہو گئی۔ زہرہ بھی حیران رہ گئی۔ پھر تو کئی بار اس نے خود کہہ کر کڑھی خشکہ بنوایا۔ جیسے وہ کڑھی کے ذائقے پر ٹھٹکا تھا اسی طرح کئی اور ذائقے چونکا دیتے کھانے تو کھاتے ہی اور کئی معمول کے معاملات تھے وہ پل بھر کے لیے دم بخود رہ جاتا اور پھر ساری رات بے چین کروٹوں میں گزرتی، صبح آنکھوں کے گرد لالی اس کے رت جگے کی چغلی کھاتی۔

سائیں نے کئی بار زہرہ سے پوچھا تھا۔

"تم نے پوچھا اس سے، کس علاقے کی ہے۔"

اس کے بارے میں جو تھوڑا بہت مختاراں کو پتا تھا زہرہ کو بتا دیا اور زہرہ نے میاں کو، لیکن اس سوال پر اس نے ناک ہونٹ تاسفانہ پھیلائے۔

"کہتی ہے علاقہ یاد نہیں، بس چار افراد تھے گھر کے سب آگے پیچھے ہو گئے، بے چاری کسی سہیلی کے ذکر پر گم صم ہو جاتی ہے۔"

"آہ۔۔۔!" سائیں نے ٹھنڈی سانس کھینچی۔ "زہرہ وہاں کی یادیں ہیں ہی گم صم کر دینے والی، بڑا کرب ہے اس ہجرت میں۔" اس کے چہرے کی اذیت و کرب کی لکیریں زہرہ کے دل میں انی کی طرح پیوست ہو جاتی تھیں۔ وہ اس کے کرب سے بہت اچھی طرح واقف تھی۔ سائیں نے پہلی رات ہی بنا کسی لگی لپٹی کے اپنا دل کھول کر اس کے سامنے رکھ دیا تھا۔

"میں یہ نہیں کہتا میں تیری عزت نہیں کروں گا،

حفاظت نہیں کروں گا تو میری عزت ہے، ذمہ داری ہے، لیکن مجھ سے یہ مت چاہنا کہ وہ میرے دل سے نکل جائے گی! اس کی خوشبو میرے خون میں تیرتی ہے، اپنی آخری سانس میں بھی اسے دیکھنے، پانے کا تمنائی رہوں گا۔" اس نے لب کچلتے بھر آئی آنکھیں اٹھا کر اسے دیکھا اور بہت ڈرتے ڈرتے اپنے نازک ہاتھ اس کے مضبوط ہاتھوں پر رکھ دیے۔

"لیکن سائیں کوشش تو کر سکتی ہوں۔۔۔نا۔۔۔"

اس نے اس دن پہلی بار اسے سائیں کہا تھا جب سے وہ اب تک سائیں ہی تھا۔

"ہاں! کر لینا۔۔۔ میں تیری کامیابی کے لیے دعا کروں گا، لیکن مجھے یقین نہیں ہے۔" اس کی درد سے مندی گہری آنکھوں پر اس نے اپنا گھونگھٹ پھیر لیا۔

☆ ☆ ☆

پاکستان آجانے کے بعد وہ بالکل بے آسرا ہو گئی تھی۔ باپ بھائی راستے میں مارے گئے۔ بوڑھی ماں کے ساتھ ایک مندر نما حویلی کے ایک کمرے میں رہنے لگی۔ ایک سال میں ہی ماں کو ٹی بی ہو گئی، خون تھوکنے لگی، واحد رشتے دار پھوپھی تھی، اس کا پتا نہ چلتا تھا۔ برابر کمرے والی ثریا خالہ جب بھی اس کی ماں کی عیادت کو آتی اس لڑکی کو دیکھ کر بہت ترس آتا تھا۔ ایک دن اس کی ماں نے روتے ہوئے ثریا کی منتیں کیں۔

"میں مر گئی تو لوگ اس کو نوچ کھائیں گے، تو میری بیٹی کی عزت بچا لے۔" انہوں نے ویسی ہی منتیں پیان جی بھی کی تھیں، مگر وہ مان کر نہ دیتا تھا۔

"جانے والوں کو بھول جاتے ہیں پیان۔۔۔"

"اس کے چلے جانے پر میرا دل راضی نہیں۔"

"دل کا کیا ہے۔" ثریا نے اس کی پشت کو سہلایا۔ "دل حقیقت کب تسلیم کرتا ہے، یہ تو خواب دیکھنے کا عادی ہے۔" دو سال بعد ثریا کی بے تحاشہ منتیں، فریاد کے بعد نہ چاہتے ہوئے بھی اسے راضی ہونا پڑا۔ غالباً زہرہ کی ماں مر گئی تھی اور وہ بے آسرا ہو گئی۔ شادی کے بعد اس نے اس سے کچھ نہیں چھپایا تھا۔ پندرہ برس گزر گئے تھے۔ اتنے عرصہ بعد بھی اس کے چہرے پر وہی پہلی رات والا کرب دیکھ کر اس کا دل پاتال میں اتر جاتا پھر وہ اپنی کوشش اور باتونی فطرت سے فوراً اس کے درد کو یہ کہہ کر نکالتی۔

"چلو سائیں اللہ پاک جانے والوں کو بخشے۔" پھر بچوں میں الجھا دیتی۔ اپنی اولاد سے محبت فطری جذبہ ہے۔ وہ بھی ان کے خوب لاڈ اٹھاتا، لیکن کسی کسی معاملے پر اڑ جاتا تھا۔ عثمان کے روٹھنے اور ضد کرنے پر بھی اسے اس کی مرضی کا میمنا لے کر نہیں دیا تھا بلکہ جو سفید خود کو بھایا، وہی لے کر دیا۔ عثمان منہ پھلائے اس کی رسی تھامے ڈھیلے قدموں سے گھر میں داخل ہوا تھا اور شام کو ماں اور بی بی کے پاس بیٹھا شکوے کر رہا تھا۔

"مجھے سفید اور بھورا پسند آیا تھا، ابو نے وہ لے کر نہیں دیا۔"

"یہ بھی بہت پیارا ہے، سفید دودھ جیسا۔" بی بی میمنے کی پشت پر ہاتھ پھیرتے نرمی سے سمجھا رہی تھی۔

"تجھے پتا تو ہے، ابو کو ڈب کھڑبی چیزیں پسند نہیں۔۔۔ ایویں ضد کر رہا ہے۔" ام ہانی کے لفظوں پر بی بی کی سلوٹ زدہ آنکھیں پوری کھل گئیں۔ کھردرا سیاہ ہاتھ نرم براق بالوں سے پھسل کر نیچے جا گرا، پھر تریاق نگل جلد سنبھل گئی۔ ویسے بھی اسے جلد سنبھلنے کی عادت ہو گئی تھی۔ عثمان کو خوش کرنے کے لیے اس نے میمنے کی خوب خاطر کیں۔ وقت کے ساتھ وہ اچھا خاصا پلا ہوا بکرا بن گیا۔ بی بی کو دیکھتے ہی اچھلتا دونوں اگلی ٹانگیں اٹھا کر چھنکتے گھنگھروں والے کھر دھم سے نیچے مارتا تھا۔

☆ ☆ ☆

اس کے شیرو کے ٹاپوں کی آواز ریسٹ ہاؤس سے ہوتی نہر کے ساتھ ساتھ آگے بڑھ رہی تھی۔ ضیا الدین کھیتوں کو پانی لگانے کے بعد گھر کی جانب چل

پڑے۔ سورج ان کی پشت کی جانب قدرے نیچے ہوتا جا رہا تھا۔ نماز عصر قضا ہونے کے خدشے سے انہوں نے اپنا پھاوڑا قریب رکھا اور نہر پر ہی وضو شروع کر دیا۔ شیرو کی عنانیں کھینچے سے ہنہنانے کی آواز انہیں بالکل اپنے عقب میں محسوس ہوئی۔ مڑ کر دیکھا۔ امرت چہرے پر رعونت سجائے مونچھوں کو تاؤ دیتا بیٹھا تھا۔ دوسرے ہاتھ سے شیرو کی باگیں اتنی زور سے کھینچیں کہ اس کی گردن بھی اسی طرح تنی، منہ بے بسی سے کھل گیا۔ وہ شیرو کو کبھی دو قدم آگے، کبھی دو قدم پیچھے کرتا تمسخرانہ ہنسا۔

"سنا ہے چاچا تو سیالکوٹ حج کر کے آیا ہے۔"

ضیا الدین نے ناگواری سے اسے دیکھا تھا۔ "تو کیا جانے حج، نماز... جا، جا کر اپنا کام کر، میری نماز قضا ہو رہی ہے۔"

"ہونہہ..."

اس نے لگام میں ڈھیلی چھوڑتے ہوئے تنفر سے نتھنے پھلائے۔ "ہمارا ہندوستان قضا کر کے تجھے اپنی نمازوں کی پڑی ہے چاچا..."

"نہ کس بات کا تنتنا ہے تجھے امرت۔" وہ گیلے بازو پر آستین برابر کرتے مقابل آ کھڑے ہوئے۔

"جانتا ہے نا تو کس پر سوار ہوا تن رہا ہے۔" ان کا جلاتا انداز اسے سیخ پا کر گیا۔ وہ آنکھیں پھاڑے تضحیک آمیز غرایا۔

"ہاں ہاں یاد ہے اور تیرا تحفہ ہی تیری قضا بنے گا۔" وہ یک لخت اتنی تیزی سے ان سے بھڑ کر گزرا کہ ضیا الدین کو سنبھلنے کا موقع تک نہ ملا۔ وہ لڑکھڑائے۔ امرت جاتے جاتے تانبے کی رکاب میں پھنسا پاؤں پوری قوت سے ان کی کن پٹی پر مار کر گزرا۔ بوڑھے ضیا الدین کے ماتھے سے اک خون کا فوارہ ابل پڑا۔ وہ زمین پر گرے، گھوڑے کا سم ان کے ہاتھ پیر رگیدتا آگے بڑھ گیا۔ بچپن کے تقابل بھی عجب ہیں چلنا سیکھتے ہیں تو سب سے پہلے چاند، سورج کی رفتار سے مقابلہ پہلے کون پہنچے گا۔ نہر کے تیز دھارے سے دوڑ۔ وہاں بھی کئی بچے ربر کا ٹائر ڈنڈے سے گھماتے نہر کی تیز لہر کے ساتھ ریس لگاتے آرہے تھے۔ جو بچوں میں نسبتاً" بڑا اور قدرے آگے تھا وہ خون میں لت پت تڑپتے ضیا الدین کو دیکھ کر پہلے ٹھٹکا پھر چلایا۔

"ضیا چاچا..." پھر بہت سے لوگ اکٹھے ہوتے گئے۔ خون رکنے کا نام نہ لیتا تھا۔ گھر لے جانا بے وقوفی تھی۔ بیان کو پیغام بھیج بلایا تھا۔ تب تک ضیا الدین اتنے نڈھال ہو گئے کہ غشی سے زبان ساتھ چھوڑتی تھی۔ حکیم شکورے کا مطب کئی دن سے بند تھا۔ جانے کہاں چلا گیا تھا۔ بلکہ وہ کیا بہت سے مسلمان گھرانے اچانک سے غائب ہو جاتے۔ شاید خاموش ہجرت شروع ہو چکی تھی۔ غالباً" کچھ لوگ فضا میں بدلی بو سونگھ لینے کی صلاحیت زیادہ رکھتے ہیں اور شکورا تو حکمت سے بھرا تھا۔

شہر میں ایک چھوٹا سا اسپتال تھا اور شہر زیادہ دور بھی نہیں تھا، لیکن وہاں لے جانے کے لیے کسی تیز رفتار سواری کا ہونا ضروری تھا۔ کمہار دتے کا بیل بیمار تھا، زیادہ چل نہیں سکتا تھا اور بیان کے گھوڑے پر لے جانا ناممکن، صلاح الدین نے سواری کے انتظام کی کوشش کی۔ ریسٹ ہاؤس بھی گئے شاید کوئی بندوبست ہو سکے، کچھ لوگوں نے وہاں سے ٹم ٹم جاتے دیکھا تھا، مگر وہاں پہرے پر بیٹھے ایک ٹھاکر اردلی نے صاف کہہ دیا۔

"او میاں، صاحب آرام کر رہے ہیں، ہم اجازت کے بغیر کچھ نہیں کر سکتے۔"

"تو جگا دو انہیں۔"

صلاح الدین نے ہاتھ جوڑے۔ "کچھ دیر کے لیے سواری دے دیں، ہم زیادہ کرایہ دے دیں گے، میرا بھائی خون میں نہا رہا ہے۔"

"کیا ہم نے نہلایا ہے؟ جاؤ یہاں سے، خود ہی مرہم پٹی کر لو، ٹھیک ہو جائے گا۔" اس کا ہتک آمیز رویہ بیان کی برداشت سے باہر تھا۔ آج سے کئی برس پہلے چاچی زینب (مبرا کی ماں) درد زہ سے تڑپ رہی تھی۔ دائی نے بھرپور کوشش کے بعد کہہ دیا۔

"شہر یا برابر گاؤں دوسری دائی کے پاس لے جاؤ، میرے بس کی بات نہیں۔" سواری کا بندوبست اس

وقت بھی مشکل تھا۔ کسی نے بیل گاڑی تک نہ دی۔ چارپائی پر ڈال کر برابر گاؤں تک لے جا رہے تھے۔ بمشکل آدھا راستہ طے ہوا تھا جب وہ مردہ بچے کو جنم دے کر ابدی پر سکون نیند سو گئی۔ بیان اس وقت گیارہ برس کا تھا۔ کچھ سمجھ نہیں تھی کہ چاچی چارپائی پر کیوں گئی نہیں تڑپی ہاں اتنا یاد تھا اس کے ٹھنڈے وجود اور پہلو میں معصوم پھول کو دیکھ کر سارا محلہ تڑپا تھا اور آٹھ سالہ مہرا کی آنکھوں میں ٹھہرا نمکین پانی آج بھی یاد آجاتا تھا۔ پھر اپنی آنکھوں دیکھے کتنے واقعے کوندے کی طرح لپکے تھے۔

رام چند لوہار کا دن بدن بڑھتا تاپ دماغ کو چڑھ گیا تھا اسے فریڈی نائیکل (فرنگی آفیسر) نے اپنے گھوڑے بان کے ساتھ شہری اسپتال علاج کے لیے بھیجا تھا۔ مستری راج پت ریسٹ ہاؤس کی مرمت کے دوران گرا، ٹانگ ٹوٹی اس کے لیے ٹم ٹم کا انتظام ہو گیا تھا۔ امرت کی ماں کوٹی بی تھی کتنی بار اسے شوفر کے ساتھ شہر آتے جاتے دیکھا۔ عبدالغفور نان بائی روز کا سینکڑوں روٹی لگانے والا جانے کیسے تنور میں گر گیا، کسی نے دشمنی میں دھکا دیا یا امر ربی، 40ء سے 47ء تک کے سفر میں ایسے امر ربی بہت عام ہو گئے تھے پتا ہی نہ چلتا کون، کیسے جل گیا، مر گیا، کوئی مسلمان مسافر نہر کنارے پھسل کر ڈوب مرتا، کوئی بے احتیاطی میں ابلتے چونے کے ڈرم میں جا گرتا، کوئی اپنے کنبے سمیت چولہے میں رہ جانے والے بجھے انگاروں سے ہی راکھ بن جاتا اور نہیں تو چارہ کاٹنے کی مشین سے ٹکرا کر مرتا۔ بالکل اسی طرح عبدالغفور بھی جھلس گیا۔ وہ تنور سے ”معجزۃ“ سانس لیتا نکلا تھا، مگر بروقت سواری کا انتظام نہ ہونے سے وہ شکورے کے مطب میں دم توڑ گیا۔ بالکل نہر، چونے، مشین میں گرے، جھلسے خاکی بدنوں کی طرح، زینب کی طرح اور ضیاالدین کی طرح بیان نے نتھنے پھلاتے جبڑے جمائے اور اردلی کو دبوچ لیا۔ وہ گندی گالی دے کر چلایا تھا۔

”او ئے...۔ تو جگا رہا ہے... یا...“ شور سے لوئیس مارک کی آنکھ کھلی، وہ کسمساتا جمائی روکتا باہر نکلا، پوری بات سنی۔ شوفر ٹم ٹم دینے کے لیے نیم رضامند سا لگتا تھا، مگر عقب سے آتی نوعمر لڑکے کی آواز شائد تھی۔

”ضیا چاچا کا سورج ڈوب گیا ہے۔“ سانپوں کو آستینوں میں پال کر دودھ پلایا تھا۔ انہوں نے ڈسنا تو تھا ہی، جنہیں اپنے منہ کے نوالے کھلاتے رہے انہوں نے حلق میں انگوٹھے ٹھونس دیے تھے۔

اتنی جلدی سورج کیسے ڈوب سکتا ہے نور کیسے بجھ سکتا ہے، ابھی تو ان آنکھوں نے پاکستان کی رو پہلی شعاع دیکھنی تھی، کتنی خواہشیں، کتنے شوق ان کی آنکھوں میں جلتے بجھتے تھے، پاکستان کا نام لے کر ہی چہرہ کھل جاتا تھا۔ دیوانگی اس حد تک بڑھ چکی تھی نیند میں ان کی واضح بڑبڑاہٹ محسوس ہوتی۔

”لے کر رہیں گے پاکستان، بن کر رہے گا پاکستان، سینے پر گولی کھائیں گے پاکستان بنائیں گے....“ دو ماہ پہلے کی بات تھی کہنے لگے۔

”سوچ رہا ہوں بھر جائی، پاکستان ایک بار دیکھ آئیں صبر نہیں ہوتا“ پھر اچانک سے سیالکوٹ دیکھنے کا پروگرام بنا لیا، اور چلے بھی گئے، ”تقریباً“ ہفتہ لگا کر آئے تھے، رو ئیں، رو ئیں میں خوشی، لفظوں میں چاشنی، سیالکوٹ کا تذکرہ کرتے صبح بیٹھے رات ہو جاتی۔

”بس بھر جائی، پاکستان کی ثانی کوئی مٹی نہیں، ایسی سوندھی ہے کیا گیہوں کیا سونا، کھیتوں کے رنگ ہرے بھرے، دھلے دھلائے لہلہاتے، ہوا مشک بار، بدن کو چھوئے جگہ فرحت آگیں۔ پانی ایسا زم زم جیسا، بی بی طبیعت سیر نہ ہو۔“ خدا جانے حقیقتاً ”ایسا ہی تھا یا ان کے صاف دل لوگوں میں اپنی ہونے والی مٹی سے عقیدت کا جذبہ اس قدر تھا۔ ہر احساس پر حاوی، ہر چیز سے محبوب۔

”کیا واقعی بھائی جی!؟“ تائی ثریا کی آنکھیں استعجابیہ پھیلیں۔

”میں جھوٹ تھوڑی کہہ رہا ہوں۔“ ضیاالدین نے بولتے ہوئے قمیص کے کھیسے میں ہاتھ ڈالا۔ ایک رومال کی چھوٹی سی پوٹلی باہر نکالی اور سب کے

سامنے کھول کر رکھ دی۔ سنہری تازہ تازہ مٹی کی سوندھی خوشبو ایسے تھی جیسے کنواری حسینہ کے بدن سے اٹھتی ہو' نتھنوں کے ذریعے دماغ کی ہر نس کو تراوٹ بخشتی تھی۔ سب نے تبرک کی طرح ہاتھوں میں لے کر سونگھی' چومی' صلاح الدین نے چٹکی بھر مٹھی میں رکھ لی اور تفاخر سے بولے

"تب ہی کہوں' ضیاالدین ایک ہفتے میں جوان کیسے ہو گیا' بھئی جنت سے ہو کر آرہا ہے۔"

"ضیا چاچا۔" بیان کو شرارت سوجھی۔ "ایک ہفتے میں جوان ہو گئے' ہمیشہ رہیں گے تو... نوجوان... کہیں نئی چاچی ڈھونڈنی نہ پڑ جائے۔" بیان کے مذاق پر صلاح نے گھر کا' ثریا' مہرا شرمائیں' مگر ضیا الدین مسکرائے تھے پھر تاسفانہ ہو کا بھرا۔

"نک ہا... بیٹا یہی تمنا سینہ جلاتی ہے' تیری چاچی کی ڈھیری کسی طرح اپنے ساتھ اٹھا لے جاؤں' وہ ظالموں کے بیچ کیا کرے گی۔" چاچی زینب کی ڈھیری تو کیا ساتھ جاتی وہ خود بھی وہیں ڈھیر ہو گئے تھے۔ ہر تمنا' ہر آرزو' آزادی' وطن سب مٹی کی اک قبر میں دب گئی۔ ان کی روح کے قرار کے لیے بیان نے سیالکوٹ کی وہ مٹی جو پوٹلی میں بند دو مہینے سے چاچا کی جیب میں تھی ان کی لحد کے اندر اور اوپر چھڑکی اور بہت دیر وہاں بیٹھا روتا رہا۔

"یوں اچانک سے موت' جانے پہچانے رستے پر کیسے پاؤں رپٹا' ایسی بھی کیا چوٹ لگی' جان ہی لے لی۔ بے شک ان کا پھاوڑا ان کے پاس سے ملا تھا' گرنے سے گھاؤ سر کی پشت کے بجائے کن پٹی پر؟ کیا ترچھے گرے تھے؟ زخم کی گہرائی' موٹائی پھاوڑے کی دھار سے خاصی موٹی؟ اگر بیان کو پتا چل جاتا کہ اسی ناگ نے ڈسا ہے جسے بانہوں میں کھلایا تھا تو وہ اس کے بدن کو لیر و لیر کر دیتا' اتنے گھاؤ لگاتا کہ امرت شمار نہ کر سکتا' مگر یہ وہ معمہ تھا جو مٹی میں دبتا جاتا تھا۔ بالکل مولوی نظام علی کے خاندان کی طرح اور جانے کتنے عاشقان وطن کے معمے یونہی مٹی میں دبے جاتے تھے۔

مٹی سے لپے زرد گھر کے در و دیوار پر سوگ' سسکیاں ہر طرف جھانکنے لگی تھیں۔ رات کی سیاہی میں ابا کے خراٹوں کی آواز پر وہ چونک' چونک اٹھتی۔

"ابا... ابا" پکارتی اور گھٹنوں میں سر دیے گھنٹوں روتی بلکتی۔ تائی ثریا اسے اپنے ساتھ چمٹائے خود بھی رونے لگ جاتیں۔ ان دنوں بجلی گاؤں تو کیا شہر کے ہر گھر میں نہیں تھی' سب لالٹین ساتھ رکھتے تھے۔ بیان سر شام ہی لالٹین اماں یا اس کی چارپائی کے پائے پر جلا کر لٹکا جاتا تھا' چاچا ضیا کی زندگی میں وہ رات کو ہمیشہ اپنے گھر میں رہتی تھی' مگر اب مستقل تایا صلاح الدین کے ہاں رہنے لگی۔

دن' ہفتے' مہینے گزر گئے۔ اللہ کی بے شمار نعمتوں میں بھول بہت بڑی نعمت ہے۔ اگر یہ انسانی دل و دماغ کے لیے نہ بنائی جاتی تو دنیا پہلے غم پر ختم ہو جاتی۔ اماں حوا' ہابیل کے غم میں اور بچے جننا بھول جاتیں۔ صدمے' مقصد کائنات روک دیتے' مگر اللہ عزوجل کا بڑا احسان ہے اس نے انسان کے لیے بھول بنائی اور انسان غم سے نکل کر آہستہ آہستہ زندگی کے راستے پر سوار ہو جاتا ہے۔ زندگی ضیا الدین کے بعد پہلے رکتی محسوس ہوئی پھر آہستہ اور پھر معمول پر چلنے لگی۔ زندگی کے متحرک ہوتے ہی عزیز و اقارب کی صدمے سے تالو لگی زبانیں حرکت میں آگئیں۔

"اے ثریا! تو اتنی سمجھ دار بنی پھرتی ہے اور جوان بچے گھر میں ایسے ہی چھوڑ رکھے ہیں' پہلے تو سر پر باپ تھا' مگر اب...؟ تیرے سامنے پلی' بڑھی' سوہنی کڑی۔ بیاہ کیوں نہیں دیتی اپنے لڑکے سے۔"

"آپا! میں تو پل نہ لگاؤں' مگر تیرا بھائی کہتا ہے اپنے دیس جا کر پہلی خوشی کریں گے۔"

"اے پاگل..." وہ پھر کہنے لگیں۔ "حالات تو دیکھو' ایسے میں بندہ پیدا ہوتی بیاہ دے..." مگر ثریا کیا کرتیں۔ پاکستان جا کر خوشی منانا صرف صلاح الدین ہی نہیں بیان الدین کی بھی خواہش تھی۔ جب تذکرہ بیان کے سامنے چھڑا تو اس نے لگی لپٹی رکھے بغیر کہہ دیا۔

"اماں! خوشیاں اپنے گھر' اپنی مٹی پر اچھی لگتی ہیں

اور یہ زمین ہم پر تنگ اور یہاں کے باسی ہمارے پرائے۔" اعلان پاکستان میں جانے سرکار نے کتنا وقت لگاتا تھا تاریخ دی جا چکی تھی مگر جھنڈا لہرانے میں زبردست رخنے پڑ رہے تھے۔ لوگوں کی باتوں اور خدشات سے گھبرا کر جمعے کے دن نماز جمعہ کے بعد سادہ سی نکاح کی تقریب رکھی گئی۔ پیان کی تمنا کا بھی خیال کیا گیا۔

"کہ اماں ٹھیک ہے جیسے آپ اور ابا رشتے کو محترم بنانا چاہیں مگر باقاعدہ رخصتی دعوت ولیمہ میں اپنے گھر پاکستان میں کروں گا۔" کسی کو اعتراض نہیں ہوا تھا۔

بیس سالہ کڑیل خوبرو پیان سفید لٹھے کی قمیص شلوار کالی واسکٹ جناح کیپ میں بھرا بھرا مضبوط آج کل کے پچیس، چھبیس سال کے اسمارٹ نوجوان سے زیادہ پرکشش، وجیہہ لگ رہا تھا۔ سبز ہریالی ساٹن کا کھلا کھلا قمیص شلوار جس کے دامن اور گلے پر سلور چمپا کلی گوکھرو سے باڈر بنا تھا گوٹے کناری والا بڑا سا سبز دوپٹا سر سے سینے تک گھونگٹ نکالے۔ سیاہ بڑی بڑی آنکھوں میں کاجل کے ڈورے دمکتی گوری رنگت، ہونٹوں پر سرخی۔ سترہ سالہ مبرا تائی ثریا کے ساتھ شرمائی، جھجک کر بیٹھی تھی۔ نکاح کے تحفے کے طور پر پیان بہت ڈھونڈ کر بہت خوب صورت چیز لایا تھا اور وہ اس کی ستواں ناک میں جب تائی ثریا نے پہنائی سیاہ نگوں کے لونگ کی چمک ہی بدل گئی۔ وہ ناک میں سکڑتی، نگ لشکارے مارنے لگتے۔ ثریا اپنی بہو کے لیے سرخ شنیل کا جوڑا منگوانا چاہتی تھیں مگر پیان نے قدرے جھجکتے ہوئے کہہ دیا۔

"اماں لال رنگ سے خون کی بو آنے لگی ہے، تم سبز بنالو، ہرا بھرا، امن و سکون کا رنگ۔۔۔ اور جب ہم پاکستان جائیں تو مبرا وہی پہن کر، ہری بھری امیدوں کے ساتھ جائے گی۔"

"چل دیوانے۔" انہوں نے اس کے شانے پر پیار بھری دھپ لگائی۔ "خون کیوں؟ شگن کا رنگ بھی لال ہوتا ہے مہندی نہیں دیکھی کیسی لال ہوتی ہے۔"

"میری ماں، مہندی تو ہری ہوتی ہے، پتا نہیں رنگ لال کیوں چھوڑ جاتی ہے۔" آہ کتنی حقیقت ہے اس بات میں، امن و سکون کا ہرا رنگ کیسے ہر چیز سرخ کر دیتا ہے برسوں اس کی سرخی نہیں جاتی زمین، مٹی، ندی، نالے سب سرخ کرم سیال۔

تایا صلاح الدین نے اس کے سر سبز آنچل پر مان بھرا ہاتھ رکھا، اقرار لینے کے لیے نکاح کا رجسٹر اس کے سامنے پھیلایا تاکہ انگوٹھا لگا دے، مگر اس نے انگوٹھے کی جگہ ٹوٹا پھوٹا ہی سہی، مگر اپنا نام "مبرا پیان" لکھ دیا۔ تایا حیران۔ انہیں کیا پتا بچپن میں پیان سے ہی اس نے نام لکھنا سیکھ لیا تھا۔ گھر میں دو ہی بچے تھے۔ جیسے سب پکارتے "مبرا۔۔۔ پیان" ویسے ہی اس نے لکھنا شروع کر دیا۔ دونوں کا نام ساتھ جڑا الوہی چمک دیتا تھا۔ ہر لب پر مبارک سلامت تھا۔ وہ تایا کے سینے میں گھسی گہرے سانس لیتی تھی۔ کالا کاجل آنسوؤں میں لپٹ کر صلاح الدین کا گریبان، بہت دیر بھگوتا رہا۔

ستارے ٹکے گوٹے کناری والے سبز آنچل سے اسے الوہی سی محبت ہو گئی تھی، جس دن سے وہ اوڑھ کر پیان سے نام جڑا تھا اس میں سے عقیدت و اعزاز کی خوشبو محسوس ہوتی۔ ایسی مہک جو چہار اطراف حصار باندھ لے۔ جلترنگ بج اٹھیں، رباب کے تار چھڑ جائیں، ہر طرف پیان دھڑکتا ہو۔۔۔ تائی ثریا کے سامنے شرم کے مارے کبھی دوپٹے پر نگاہ بھی نہ ڈالی، مگر چوری چھپے کبھی دن میں، کبھی شام، رات میں دوپٹا نکالتی سونگھتی، چومتی، اوڑھتی پھر شرما کر خود میں سمٹ جاتی۔ نکاح کے بول کی طاقت کا اندازہ پیان کو بھی بعد میں ہوا تھا۔ اسے پکارنے، بلانے میں آواز لہجہ دونوں بدل گئے۔ خاصے فاصلے سے گزرنے پر بھی دل کی دھڑکن غیر معمولی ہو جاتی، اسے چلتے پھرتے، کام کرتے دیکھ کر اچھا خاصا دھیان بٹ جاتا، نگاہ بار بار اسے ڈھونڈتی۔۔۔ راتوں میں چارپائی کی چرچراہٹ بڑھ جاتی، کتنی بار اٹھ کر ضیا الدین چچا کے کمروں میں جا سویا تھا۔ بس ایک تمنا روکے تھی، اپنے وطن میں جا کر نئی زندگی آباد کریں گے۔

☆ ☆ ☆

امرت بہت دنوں سے گاؤں میں نظر نہیں آیا تھا۔ سننے میں آیا تھا اُس کا تبادلہ دور ہو گیا ہے۔ پیان نے اسے اپنے نکاح کے کچھ دن بعد ریل کی پٹڑی والے رستے پر دیکھا تھا۔ اس کا گمان تھا شاید وہ اسے مبارک دینے آیا ہو۔ کسی وقت کا پکا یار تھا۔ غالباً" نکاح کا دعوت نامہ جمنے نائی کے ہاتھ بجھوایا بھی تھا، مگر اس کے باپ رندھاوا نے کہہ دیا۔

"وہ ایسے فضول کاموں کے لیے فارغ نہیں ہوتا۔" اب پتا چلا ہو اور آگیا ہو، اسی خام خیالی میں وہ پرانی رنجش بھلا کر ہاتھ ملانے آگے بڑھا، مگر وہ استہزائیہ مونچھوں کو بل چڑھانے لگا۔

"سنا ہے راج نگر کی سوہنی تیرے نام چڑھ گئی ہے۔" پیان کی آنکھیں تحیر سے پھیلیں، پیشانی تنی۔ "حالانکہ ہرنی، ہرن کے ساتھ سجتی ہے۔"

"امرت!" وہ چلایا۔ "تجھے کوئی شرم حیا ہے یا ماں، بہن کا احترام بھی نکل گیا۔"

"بہن لگتی تھی وہ تیری۔" اس نے کمینے پن سے انگشت سینے پر رکھی۔ "میرے تو یہاں بستی تھی۔"

اس کی ہر حد جواب دے گئی تھی۔ اس نے بائیں ہاتھ سے بے حد زور سے طمانچہ امرت کے منہ پر مارا کہ ہاتھ پر بندھی نئی گھڑی جھٹکے سے کھل گئی۔ دونوں کے بیچ گالم گلوچ، شدید لڑائی ہوئی تھی۔ گھونسے، تھپڑ گریبان چاک ہو گئے۔ کچھ راہ گیروں نے بیچ بچاؤ کروایا تھا۔ امرت کے منہ اور پیان کی ناک سے خون بہنے لگا۔ اس نے ناک آستین سے پونچھتے ہوئے کہا تھا۔

"اس خون کی بددعا ہے تجھے امرت! جیسے تو نے دوستی کو بے اعتبار کیا، اسی طرح تیرے اپنے بے اعتبار ہو کر تیرا خون پئیں گے۔۔۔ تو روک نہیں پائے گا۔"

"او۔۔۔ دفع ہو! بڑا آیا بددعا والا۔" گھر میں داخل ہوتے ہی وہ گھڑونچے کی جانب تیزی سے بڑھا تھا۔ نلکا چلایا اور منہ دھویا۔ گریبان چاک، آستین پر خون کے دھبے دیکھ کر ثریا دہل کر سینہ تھامے اس کی سمت بڑھیں۔

"کیا ہوا پیان، خون کیسا ہے؟" مبرا چولہا، ہانڈی چھوڑ، پلو منہ میں داب پیچھے آکھڑی ہوئی۔ ننھا کا ایک پلو پھاڑ کر اس کی جانب بڑھایا۔

"نہیں۔۔۔" اس نے انکار کرتے اپنا بازو اوپر اٹھایا آستین سے ناک منہ رگڑ لیا۔ "آج کے بعد گھر سے باہر قدم مت نکالنا، کبھی، کسی صورت بھی۔۔۔ جب تک میں نہ کہوں۔" وہ پورے استحقاق سے اسے کہہ رہا تھا۔

"آخر بتا تو سہی ہوا کیا ہے؟" ثریا نے پوچھا۔

"ابھی کچھ نہیں ہوا، مگر ہو ضرور جائے گا، اگر امرت کا سایہ بھی گھر کے باہر سے گزرا۔۔۔ اور سن لیا تو نے۔۔۔" پاس سے گزرتے ہوئے پھر سے یاد دہانی کروائی تھی۔ وہ ہونقوں کی طرح اسے دیکھے گئی۔ اتنے ٹھوس، اٹل انداز میں تو وہ کبھی بھی بات نہیں کرتا، بھلے کچھ ہو جائے۔ "ہاں" اسے یاد پڑتا تھا آج سے کئی برس پہلے تب وہ بارہ تیرہ برس کی تھی۔ پیان سے نیا نیا اپنا نام لکھنا سیکھا تھا۔ ٹیڑھا میڑھا چار حرفی نام لکھنا آہی گیا۔ مہندی گھول اس کے سفید گبھرو کی گردن پر بڑا سا لکھ دیا۔ "مبرا"

"یہ تو نے اس پر کیوں لکھا ہے؟" لہجہ ترش، کھردرا تھا۔

"تجھے یہ گھوڑا پسند ہے نا، بس اسی لیے۔"

"بے وقوف!" اس نے گردن جھٹکی۔ "یہ ڈنگر ہے اور مبرا کوئی ڈنگر نہیں۔۔۔ سمجھی! آج کے بعد میں نہ دیکھوں، اس پر تیرا نام۔" اس کا تحکم بھرا لہجہ بالکل آج جیسا تھا۔ ہرنی جیسی بڑی بڑی آنکھیں وحشت سے پھیلیں پھر سمٹ گئیں، اس نے ہلکا سا اثبات میں سر ہلایا تھا اور اندر کہیں بہت دور تک تحفظ کا احساس آن بسا تھا۔

☆ ☆ ☆

ساون کی بارشوں کا زور ٹوٹ چکا تھا۔ نہریں بھر

گئیں' نہر پہنی چھوٹی سی پلی کی دیوار بیٹھ گئی۔ گنگا جمنا خوب اچھل اچھل' بہتے ۔۔۔ راوی کنارے ہوا کی بدھر خنکی میں سارنگی کا گمان ہوتا تھا۔ موسم کی تازگی اور آنے والے لمحات کا احساس رگوں میں اپنی جگہ 'ممرول کو ہر وقت اک دھڑکا سا لگا رہتا جانے کب کیا ہو جائے' پورے علاقے میں اندرون خانہ سازشوں کا جال بچھا جاتا تھا۔ بظاہر ہمدرد' مہربان بنے' پشت سے کھال اتارنے کے درپے تھے۔

رمضان المبارک کا خوب صورت چاند نئی نویلی دلہن کی طرح مسکراتا تاروں کے جھرمٹ میں گگن پر نمودار ہوتے ہی چھپ گیا۔ فضاؤں میں عقیدت کے رنگ سما گئے' مؤذن کی خوش الحانی بڑھنے لگی' گھروں میں تلاوت قرآن پاک' وظائف عروج پر تھے۔ لمبے گرم دنوں کی بڑھتی کٹھن کے روزے بھی برصغیر کے مسلمانوں کے لیے روح افزاں تھے۔ اک ٹمٹماتا تارا جسے دیوانے کا خواب' احمقوں کی جنت' بے عقلوں کی سوچ کہہ کر تضحیک کی گئی' مگر اب اس کی لو دن بدن تیز ہو رہی تھی۔ بس کوئی پل تھا۔ جھنڈا لہرایا کہ لہرایا۔

لاہور سیکرٹیریٹ پر توکب کا اک دلیر متوالی نے اپنے آنچل کا بنا کر لہرا دیا تھا' مگر سارے دیس پر لہرانا باقی تھا۔ ریڈیو پر خبرنامے کا ساز گونجتے ہی گھر کے تمام افراد پروانوں کی طرح اس کے گرد جمع ہو جاتے آواز تو آواز سانس تک روک لیتے مبادا اشاعت کسی خبر سے محروم نہ رہ جائے۔ زمینی' فضائی' حد بندیاں طے پا چکی تھیں' پانی کی تقسیم اور دوسرے معاہدے ہو رہے تھے۔ ادارے بٹ رہے تھے' فوجیں بن رہی تھیں' ہر جگہ' ہر چیز پر مسلمانوں کو سمجھوتہ کرنا پڑ رہا تھا۔ چپ کروایا جا رہا تھا زبان سے' نہیں تو جان سے' کنوئیں سے نکلے چند ڈول پر بھی مسلم سجدۂ شکر بجا لاتے۔

مخالف قوم اک قطرہ دینے پر رضامند نہ تھی۔ خواص سے زیادہ عوامی طبقہ آنکھوں میں لہو لیے پھرتا۔ بات بے بات دست و گریباں ہو جاتے۔ ساتھ بیٹھ کر دعوتیں لوٹنے' میلے دیکھنے والے اک دوجے کے لہو سے خود کو رنگنے کے لیے بے تاب رہتے۔ وہ جب گھر سے نکلتا پیچھے اس کا نازک دل ہولتا رہتا تھا۔ امرت دشمنی پر اتر آیا تھا۔ کتنی بار تو سہتی خود دبے لفظوں میں کہہ گئی تھی۔

"یہاں کے حالات اب تم لوگوں کے لیے اچھے نہیں رہے' بیان کو ہوشیار رہنا چاہیے۔" مبرا کا دل مٹھی میں سمٹ جاتا۔ بار بار بہانے بہانے سے اینٹوں کی جالی میں نگاہ جمائے اس کی راہ تکتی رہتی۔ اب بھی لالٹین ہاتھ میں پکڑے' بہت دیر سے سرخ جالی کے پار جانے کیا دیکھ رہی تھی۔ فیروزی ململ کا چنا دوپٹا منہ میں دابے اس کے گھنگرو کے ٹاپوں کی آواز جیسے جیسے قریب آئی شکر بھرا سانس اندر تک پھیل گیا۔

"مبرا۔۔۔ اے مبرا۔" عقب سے تائی ثریا کی آواز پر وہ چونک کر مڑی۔

"کیا دیکھ رہی ہے۔۔۔ آنے ہی والا ہو گا وہ۔۔۔" راز فاش ہونے پر منہ واہوا گیلا پلو چھٹ گیا۔ دودھیا بے داغ رخساروں پر حیا کی لالی' دھڑکن بے ترتیب' پلکوں پر لرزہ۔ ثریا مبہم مسکرا دیں۔

"تیرا تایا' تجھے آوازیں دے' دے کر چلا بھی گیا۔ لالٹین کا ڈھکن آج پھر رہ گیا' اب تو نے یاد رکھنا ہے' بیان کو کہہ دوں گی' وہ لگوا لائے گا۔۔۔ پاکستان جاتے اپنی روشنی ساتھ لے کر جائیں گے۔" وہ اس کی خفت مٹانے کے لیے اس کی کلائی تھامے باہر چارپائی پر لے کر بیٹھ گئیں۔

✡ ✡ ✡

"شام کا وقت تھا۔ وہ قیلولے کے بعد کمرے سے نکلا' پانی پینے کی غرض سے گھڑونچی کی جانب بڑھا تھا۔ پٹ سن کی گیلی بوری لپٹے گھڑے کے ساتھ ایک رنگین صراحی بھی دھری تھی۔ تقریباً" سولہ سترہ سال بعد اس نے گھر میں صراحی دیکھی تھی۔ اس نے تحیر سے بھنویں سکیڑ کر زہرہ کو دیکھا۔

"یہ کون لایا ہے؟"

"بی بی نے ریڑھی والے کمہار سے خریدی ہے' کہہ رہی تھی اس کا پانی بڑا ٹھنڈا' میٹھا' فرحت بخش

ہوتا ہے، بوری لپیٹنے نہیں پڑے گی۔" اس کی سن نگاہیں کمرے کی کھڑکی سے دکھائی دیتی بی بی کی پشت پر گڑ گئیں۔ وہ پانی پینا بھی بھول گیا تھا۔ فرش پر چکراتی ایک رنگین، صراحی کی ٹوٹتی گردن اور سانولی سہمی کی پیالی سے لبالب بھری آنکھیں نگاہوں میں آ رکیں۔ اس دو ڈھائی سال کے عرصے میں وہ بات بات پر چونکتا اور کئی کئی دن کے لیے الجھ کر رہ جاتا۔ ایک دن اس نے ٹھان ہی لی اس سے خود پوچھے گا۔ وہ کہاں کی رہنے والی ہے، کس خاندان سے ہے۔

✡ ✡ ✡

زہرہ اپنے کمرے میں سو رہی تھی اور وہ چائے دم پر رکھے سر جھکائے بیٹھی تھی۔ سائیں اس کی جانب آ کھڑا ہوا اور اس کے سوال نے اسے سٹپٹا دیا۔ اس نے سمٹتے ہوئے سر گھٹنوں میں دے لیا۔ وہ اس کے سامنے اچھا خاصا گھونگھٹ کیے اور بائیں رخسار سے پلو دانت میں دابے ہمیشہ خاموش رہتی تھی۔ زیادہ سے زیادہ سر ہلا کر کسی بات کا جواب دے دیا، لیکن آج کے سوال پر اس کا سر بھی نہ ہلا۔

"بی بی میں بھی تمہاری طرح مہاجر ہوں، بڑی عزت کرتا ہوں تمہاری، میری بہنوں کی طرح ہو تم۔"

وہ اس کے سر پر مان بھرا ہاتھ رکھ اندر کمرے کی جانب بڑھا تھا۔ آج اس کے ہاتھ کا لمس پگھلتے گرم لوہے کی طرح بدن پر گرا تھا۔ اس کا سارا بدن آگ کی طرح تپ گیا۔ زمین پھٹے وہ اس میں سما جائے۔ بہت سے لوگ جل کر مرتے دیکھے تھے۔ آخر یہ کیوں نہیں جل کر مر جاتی۔ سرخ نارنجی دہکتے انگاروں کو دیکھ کر اس کا جی چاہا پرات بھر بھر انگارے اپنے اوپر ڈال لے۔ وہ اپنے کمرے میں بے حد شرمندہ بیٹھا تھا۔

"جانے میرے بارے میں وہ کیا سوچتی ہو گی، مجھے یوں اکیلے میں اس کے پاس نہیں جانا چاہیے تھا، زہرہ اور بچے بھی تو پاس نہیں تھے۔ آئندہ احتیاط کروں گا۔"

براہ راست پوچھنے کی کیا ضرورت ہے، زہرہ پوچھ تو لیتی ہے، اگر بتانا ہو گا بتا دے گی۔ ویسے بھی مہاجروں کی عادتیں ملتی جلتی ہوتی ہیں، میرا دل دکھا ہوا ہے اسی لیے بار بار شک اپنے علاقے سے تعلق پر جاتا ہے۔"

✡ ✡ ✡

بیان کے نام پر اس کی کانپتی پلکیں، شرم سے لرزتا بدن، نرم گورے گالوں پر دوڑتی حیا کی سرخیاں ثریا کو بے حد پسند تھیں۔

پہلے اس کے سامنے جان کر بیان کا تذکرہ چھیڑتیں پھر مسکرا مسکرا کر اسے دیکھتیں، خود میں بھینچ لیتیں۔ وہ دونوں چولہے کے پاس بیٹھیں افطاری بنا رہی تھیں۔ ثریا آہستہ آہستہ اسے گھر داری، مردوں کا مزاج، ازدواجی زندگی، بچوں کی پرورش کے بارے میں بہت سی باتیں بتا رہی تھیں۔ سل پر پودینے، انار دانے کی چٹنی رگڑتے اس کا چہرہ انگارے کی طرح لو دیتا تھا۔ چٹنی زور زور سے رگڑنے سے کان کا بالا ہلتا جو خاصی دور جامن کے درخت تلے بچھی سفید چاندنی پر بیٹھے ہاتھ اٹھاتے بیان کی دعا میں کچھ خلل سا ڈالتا اس نے قدرے پہلو بدلا۔

آج کل عبادت اور دعاؤں پر خوب زور تھا۔ غالباً دیوانے کا خواب مجسم حقیقت ہوا چاہتا تھا۔ افطار اور اس کے نتیجے میں ملی عید ——— کی خوشی اللہ عزوجل نے پہلے روزے کے ساتھ ہر مسلم کے لیے عطا کر دی تھی، لیکن سن 47ء کے رمضان میں افطار، عید، باب الریان کے ساتھ برصغیر کے پسے مسلمانوں پر اپنی بہترین مقبول ترین مبرک رات میں ماوی کی وادیوں سے ایک ٹکڑا اپنے بندوں کی جھولی میں ڈالا ہا اس تبرک کا خیال رکھنا، سنبھال رکھنا، امن سے، قوت سے وحدت سے۔ پھیلو، راج کرو، صحرا، سمندر، پہاڑ، مٹی اور اس میں دفن بیش قیمت خزینے مختص کر دیے تھے۔

فرشتوں کی پرنور جماعت کے ہمراہ ہواؤں، فضاؤں، پانیوں میں، اپنے معصوم بھولے لوگوں کو کتنی بے حرمتی سے ہماری نسل کہہ دیتی ہے۔

"پاکستان میں کیا رکھا ہے، باہر چلو، مستقبل بناؤ۔"

کتنے منکر، سفاک ہیں وہ خدشے۔

"پاکستان کے جو حالات ہیں، وہ ٹھیک ہوتے دکھائی نہیں دیتے۔ پتا نہیں۔ ؟ چند سال بعد۔ ؟ کہیں یہ ملک بھی۔ ؟ کیا تبرک میں بخشی گئی چیز اور دینے والا شہنشاہ کل اپنی بخشش واپس لے سکتا ہے؟

ہرگز نہیں! البتہ ہم اپنے اعمال، عادات، حرص، ہوس سے اس کی اہمیت کم ضرور کر سکتے ہیں، اس لہو کو جو اس دھرتی کو رنگ دینے میں نچھاور کیا، وہ خواہشیں دفن ہوئیں، وہ محبتیں جو جلتی بجھتی اپنی آنکھوں پر، نفس، خواہشات کی پٹی باندھ کر سب پس خیال ڈال سکتے ہیں، لیکن خالق اکبر و حقیقی اپنی مخلوق سے نذرانہ واپس نہیں لیتا، جو دے دیا سو دے دیا، تبرک بھلے چٹکی بھلے تھال۔

اک تھال کی طرح سجا چٹیل میدان کہیں پانی کی لکیریں، کہیں ذخیرے، کہیں بلند و بالا کہسار، برف سے نکلتے آبشار، اک خطہ مقدس، دھرتی ماں اپنی اماں کی پیشانی کا پتا ملتے ہی سکون اندر تک تراوٹ اتار تا تھا۔ ہندوستان میں منائی گئی وہ عید ایسے تھی جیسے نامہ اعمال ــــ لے کر پل صراط پار جنت ہو۔ پل صراط تو پل صراط ہے ناں، راہ تیز دھار، ہر قدم دشوار اور اس راہ کی تیز دھاری عبور کر آئی تھی۔ جن فصیح و دور اندیش لوگوں نے فضا میں لال اندھیرے کی بو سونگھ کر ہجرت جلد کی وہ امن میں رہے، لیکن جنہیں ہمسائیوں پر مان تھا، دوستی پر بچا کچھا یقین تھا وہ لٹ گئے کوئی راہوں میں کوئی پناہوں میں۔

تائی ثریا کی بوڑھی والدہ کچھ عرصہ سے علیل تھیں۔ عورت کی گھٹی میں اپنی ہر چیز سے محبت گندھی ہوتی ہے۔ اپنی مٹی، اپنا گھر، اپنا سامان، ایک ایک چیز کی دیکھ ریکھ کی، تنکا تنکا جوڑ آشیانہ بنایا۔ بھلے زیادتیاں تھیں، مگر گھر تو اپنا تھا۔ اتنی آسانی سے کیسے سب چھوڑ کر کہیں اور چل پڑیں۔ اندر ہی اندر غم گھن کی طرح چاٹنے لگا۔ کھانسی تیز بخار میں بدلنے لگی۔ جھنڈا لہرا دیا گیا تھا۔ سرزمین وطن کے ترانے بج گئے تھے۔ خوشی بہت تھی مگر جنم بھومی کے چھوٹنے کا غم بھی بہت تھا۔

اسی لیے بیمار ہو گئیں۔ پیمان کے نکاح پر ثریا کے میکے سے سوائے ایک بھائی کے کوئی نہیں آیا تھا۔ ٹیلی گرام، تار کے ذریعے اماں کی دن بدن بگڑتی سنبھلتی طبیعت کا پتا چل جاتا۔ اب جب قافلے آئے دن نکل رہے تھے انہوں نے بھی سامان باندھنا شروع کر دیا تھا۔ ثریا نے زندگی میں پہلی بار اپنی ماں سے ملنے کی فرمائش کی تھی۔

"ایک بار ملوا دو، پھر جانے کب ملیں یا نہ ملیں۔ وہ لوگ اماں کی طبیعت سنبھلنے پر ہی نکلیں گے۔"

صلاح الدین نے ان کی فرمائش کا احترام کیا۔ صبح سویرے نکلنے کو کہا تھا۔ رام پت، راج نگر سے اتنی دور تھا تانگے پر صبح نکلتے تو سورج ڈھلنے تک پہنچ ہی جاتے۔ ایک دن جانے کا، ایک آنے کا، ایک دن کا قیام ہی طے ہوا تھا واپس آتے ہی پاکستان کے لیے نکلنا تھا۔ تائی ثریا جاتے جاتے مہرا کو گھر سنبھالنے کی ہدایات دے گئی تھیں۔

"ساری چیزیں باندھ کر رکھے، صندوقوں میں سامان سنبھال کر تالا ڈال دے، چارپائیاں رسی سے اکٹھی باندھے، برتن، بستر اور ہاں پرانے اچار کا مرتبان ذرا آگے رکھے، کچھ دن وہی کھاتے رہیں گے، اناج کی ایک دو بوری ــــ سل بٹہ بھی رکھنا، پیمان انار دانے کی چٹنی ضرور کھاتا ہے۔" وہ اپنے نام پر چونکا اور فہرست سن کر قہقہہ لگایا۔

"میری پیاری بھولی ماں! پاکستان اتنا سامان نہیں لے جاسکتے، ریڑھے، لاری پر بس انتہائی ضروری چیزیں جائیں گی۔۔۔ شکر کرنا جانیں پوری پہنچ جائیں۔"

غالباً" جو لوگ ذرا پہلے نکلے تھے وہ بہت سا سامان لے گئے تھے، مگر اب شورش، قتل و فساد میں بدل گئی تھی۔ قافلوں کو زدو کوب کیا جارہا تھا، جس گھر میں سامان سمیٹتا دیکھتے اسے آگ لگا دیتے، دن دیہاڑے مرد قتل ہوتے، آنچل روندے جاتے، مائیں لٹ جاتیں، کتنی بچیوں نے اپنی عزت بچانے کے لیے خود نہوں کنوؤں میں چھلانگیں ماری تھیں۔ شاید اسی لیے اب قافلے دن کے بجائے رات کو خاموشی سے نکلنے

لگے تھے اور خاموشی میں اتنا سامان ناممکن۔ سنتے ہی ثریا کی آنکھیں بھیگ گئیں۔

"کیا مطلب؟ سامان بغیر کیسے رہیں گے...؟"

"اماں جی، اپنی مٹی، آرام و سکون... تھوڑا تھوڑا کرکے سب بنا لیں گے اور اگر حالات اچھے ہو گئے تو بعد میں آ کر لے جائیں گے، یہاں ہی چھپا کر رکھ دو۔"

بسے بسائے گھر سے دستبرداری کا اعلان کر دینا بہت آسان، مگر کر دکھانا نہایت مشکل تھا۔ چند گاؤں چھوڑ کر اپنی اماں کے گھر وہ برسوں بعد جا رہی تھیں، پھر ملکوں کے فاصلے پر کون یہ چیزیں لینے آئے گا؟ ان کا ہاتھ سینے پر پڑتا تھا۔ اپنے ہاتھوں لپا فرش، چنی دیواریں، کسی چارپائیاں، بنی دریاں، کاڑھی چادریں، ایک ایک چیز پر پتلیاں گھومتیں، دل بیٹھنے لگتا۔ کئی مہینوں پہلے جب سہتی روز آ کر قائل کرتی۔

"تائی تم نہ جانا، سمجھا بیان کو، تایا کو... یہ گھر تو نے بنایا ہے، اس کے بنا کیسے دل لگے گا۔"

"کیوں نہیں لگے گا...؟"

انہوں نے بھنتی ہانڈی میں چھینٹا مارا۔ "وہ بھی تو اپنا گھر ہو گا... اسے بنا، سنوار لوں گی۔"

"تائی جی، پودے کی جگہ بدلنے سے، پودا سوکھ کر ختم ہو جاتا ہے، بڑھتا نہیں۔"

"سہتی! اگر پانی بروقت اور مٹی موافق ملے تو، جڑ بھی پکڑ لیتا ہے، پھل بھی دیتا ہے۔"

"یہ سب کہنے کی باتیں ہیں تائی! النفس کے پودے کو مرضی کی مٹی، پانی نہ ملے تو سوکھے گا ہی اور تو دیکھ لینا کچھ ہی عرصے میں، یہی علیحدگی کے نعرے مارنے والے، نفس کے پیچھے اک دوجے کو کاٹ کاٹ کھائیں گے۔"

کتنے سفاک، بے رحم، نفس کے پجاری بنتے جا رہے ہیں، ہم آج کل کے پاکستانی، اپنے آباؤ کی تمام قربانیاں ان کا بہتا لہو بھلا کر اس خود غرضی کی ماری سہتی کی بات پوری کر رہے ہیں، حالانکہ محب وطن خود دار پاکستانی بوڑھی ثریا نے اس لمحے بڑے فخر سے اس سے کہا تھا۔

"دور فٹے منہ تیرا، تیرے منہ میں سوا (راکھ) بدبخت، ہم پاکستانی مسلمان ہیں بھائی بھائی، بھوکے رہ کر بھی اپنے بھائی کا خیال کر لیں گے۔ اور ان چیزوں کی یاد تو کیا خیال بھی نہ آئے گا۔"

اس وقت بہت زعم سے انہوں نے کہا تھا، جذبہ اب بھی کم نہیں تھا، مگر اپنی چیزوں سے فطری محبت اندر سے کچوکے ضرور لگا رہی تھی۔

وہ علی الصبح انھیں فجر پڑھنے کے بعد رام پت کے لیے نکلنا تھا۔ جاتے پل انہیں ایسا محسوس ہو رہا تھا جیسے وہ اس گھر سے ہمیشہ کے لیے جا رہی ہیں کہیں بہت دور... شاید صلاح الدین نے کہا تھا جس روز واپسی ہو گی اسی شام یا صبح پاکستان کے لیے روانگی، وہ ایک ایک چیز پر ہاتھ پھیرتیں۔ ایک نوالہ بھی حلق سے اترتا نہ تھا۔ پھر سے مبرا کو ہدایت شروع کر دی۔ "اچھی طرح باندھ کر اوپر چارپائیاں رکھ دے نا" بیان الدین کہہ جو رہا ہے، حالات اچھے ہوئے تو آ کر لے جائے گا۔" دروازے سے نکلتے نکلتے پھر پلٹیں مبرا کو بہت زور سے لپٹایا ماتھا چوما۔

"اگر وہ کلموہی سہتی آئے، منہ نہ لگانا اور منع کرنا یہاں آنے سے...."

وہ حیرت سے تائی کا منہ تک رہی تھی۔ "بھلا اب سہتی یہاں کب آتی ہے؟ اس کے نکاح کے بعد وہ صرف ایک دو بار آئی تھی۔ آواز میں نہ سابقہ کھنکناہٹ تھی نہ چہرے پر تازگی۔ سانولا رنگ اور بھی سنولا گیا، آنکھیں چھوٹی کیے بس مبرا کو تکے جاتی۔

"ایسے کیا دیکھ رہی ہے؟" مبرا نے پوچھا۔ وہ پھیکا سا مسکرائی۔

"تیری لیکھ (قسمت) پر رشک کر رہی ہوں۔"

"کیسی لیکھ (قسمت)؟ بچپن میں ماں چھوڑ گئی، جوانی میں باپ، اب جب نکاح ہوا تو اپنا علاقہ، اپنی چیزیں، سکھیاں سب زبردستی چھوٹ رہا ہے۔"

"بیاہ کے بعد علاقے، سکھیاں تو سب کی چھوٹ جاتی ہیں۔" سہتی کے ہونٹ استہزائیہ پھیلے۔ "لیکن اگر بیان جیسا خوبرو ہم راہی مل جائے، پھر بھلے

دنیا چھٹ جائے گیا غم۔"

"جا دفع ہو۔ تو یمان کو نظر لگا کر رہے گی۔" مبرا نے خفگی سے چپت لگائی تھی اور پھر واقعی وہ ان کی طرف نہیں آئی۔ اگر آئی بھی تو دروازے سے جھانک، ایک دو بات کر کے واپس چلی جاتی۔ وہ سوچ رہی تھی۔

"اب آ بھی جا، دیر ہوتی ہے، کوچوان کو ستا ہو گا۔" تایا صلاح الدین نے کوئی چوتھی بار آواز لگائی تھی۔

"اچھا، رب کے حوالے۔" ثریا تائی نے مبرا کی پیشانی پھر چومی، یمان کے کندھے دابے پھر حسرت بھری نگاہ سارے گھر پر ڈالی تھی۔ "میں بیاہ کر یہاں آئی تھی، یمان الدین اور تو یہاں پیدا ہوئے تھے۔"

"اماں پریشان نہ ہو۔ ہم سب سنبھال کر رکھیں گے۔" نکلتے نکلتے درخت پر لٹکے کچے انار کو پیار کیا۔ "خدا جانے، تو ابھی تک کیوں نہیں پکا۔ چھوٹا سا پودا لگایا تھا تیرا، پانی دے گوڈی کر۔ اب جوان ہو گیا۔" وہ خود کلامی کرتی اوڑھنی سے آنسو پونچھتی صلاح الدین کے پیچھے چلتی جاتی تھیں۔

وہ صحن میں بیٹھی سفید کرتے کا گلا سفید ریشم سے کاڑھ رہی تھی۔ بہت دن ہوئے شروع کر رکھا تھا، مگر مکمل ہی نہ ہوتا تھا۔ وہ کرتا یمان نے پاکستان روانگی پر پہن کر جانا تھا۔ تائی ثریا کو گئے ایک دن ہو چکا تھا۔ سارا گھر سائیں سائیں کرنے لگا۔ یمان اندر کمروں میں کچھ کھٹر پٹر کر رہا تھا۔ کبھی کمرے میں جاتا کبھی کوٹھڑی میں تو کبھی ابا کی طرف.... کبھی صندوقچیاں کھولے بیٹھا رہتا۔ غالباً" صلاح الدین گھر اور زمینوں کے کھاتے اور رجسٹریاں سنبھالنے کا کہہ گئے تھے اور یہ بھی کہ پٹواری سے مل لے، ایک دو کاغذ اس کے پاس بھی ہیں۔ زبان عام تھا پاکستان جانے پر زمین کے کلیم کے بدلے کلیم ملے گا سو ساز و سامان کے بجائے کاغذ لے جاؤ۔ کماؤ اور کھاؤ، وہ موٹے موٹے کاغذ ایک دستی میں باندھ، اس کے پاس گزرتے گزرتے کہنے لگا۔

"میں پٹواری کے پاس جا رہا ہوں، دیر لگ جائے گی۔ ہوشیار ہو کر رہنا اور ہاں۔" اس کی نگاہ سفید کرتے پر گئی۔

"بقیہ چیزیں رکھ دیے، ضروری ضروری سامان سنبھال کر باندھ، کسی وقت بھی نکلنا پڑ سکتا ہے، ہو سکتا ہے اماں، ابا کے آتے ہی چل پڑیں، قافلہ تیار ہو رہا ہے۔ کسی بھی رات کو چل پڑے گا اور ہاں۔" اسے آگے بڑھتے ہوئے یاد آیا۔ "لالٹین ضرور رکھ لینا۔" وہ اثبات میں سر ہلاتی اپنی اوڑھنی سمیٹتے ہوئے اٹھی تھی۔ وہ چند قدم بڑھا، اس نے پیچھے سے پکارا۔

"وہ۔" وہ واپس پلٹا سوالیہ ابرو اٹھائے، مگر مبرا چپ اپنے ہونٹ تر کرتی، چباتی، تھوک نگلتی جیسے کچھ کہنا چاہتی ہو مگر الفاظ سلب.....

"کیا بات ہے... کچھ کہنا ہے...؟"

"ہا... ہاں..." بمشکل نکلا۔ "وہ۔ کا۔ کاغذ۔ رکھ لیا..." سیاہ گھنی مونچھوں تلے بھرے سرخ ہونٹ مبہم سے پھیلے اک ستائشی نگاہ اوڑھنی میں ملفوف حور پر سراپا سرکی۔

"وہ تو میں نے سب سے پہلے رکھ لیا تھا۔" اس نے جیب تھپتھپا کر نکاح نامہ ہونے کا یقین کیا تھا پھر چند پل اس کی جھجکی نگاہیں، اناری رخساروں پر لرزہ سیاہ سایہ، بھینچے ہونٹ اور قدرتی سپیدی میں گلال اترتا دیکھے گیا۔ وہ دھیرے سے بولا تھا۔

"اک بات کرنی تھی، تجھ سے۔" بمشکل لمحہ بھر کے لیے نوکیلی پلکیں اٹھیں، ہیروں کی طرح دمکتی سیاہ آنکھیں، مقناطیسیت سے بھرا عجب بے پروا معصوم چمکتا حسن، جس میں حیا کے سب رنگ تھے۔ اس کے سارے بدن میں سنسناہٹ دوڑی، اس نے سنبھلتے ہوئے اپنی نظروں کا زاویہ بدل لیا۔ اس کی خم دار باڑھ بجھ گئی۔

"مبرا۔" لمحہ میں ہی وہ سب بھول گیا تھا کیا کہنا تھا، کیوں کہنا تھا پھر ہمت کر کے یاد کیا۔

"مبرا! میرا رخصتی اور ولیمہ کے نادر فیصلے پر، تجھے اعتراض تو نہیں تھا؟" اس نے لمحے کے چوتھے پل میں گردن جھٹکے سے نفی میں ہلائی اور سانس روک لی، وہ

مسکرایا اور ایک ایک قدم آگے آگیا۔ اس کی سانسیں بے ہنگم ہونے لگیں، وہ پھر سے مسکرایا۔

"مگر تھا بھی تو پھر مجھے معاف کردے، میرا دل نہیں چاہتا اس زمین پر کوئی بھی اچھی یاد رکھنے کو۔" اس نے اپنے دونوں گرم مضبوط ہاتھ اس کے نازک شانوں پر رکھ دیے، وہ بے ہوش ہونے کی حد تک ٹھنڈی پڑ رہی تھی۔

"ایک بات تجھ سے کرنے کی نہ کبھی ہمت ہوئی، نہ موقع ملا۔" اس کی سانس رک سی گئی تھی۔ "تجھ سے محبت میرے دل اور دماغ کی ہر نس میں رچی ہے مہرا، کبھی تنہا نہیں چھوڑوں گا، بس تم بے اعتبار نہ ہونا۔"

جواباً وہ کپکپاتے لبوں سے کہنے لگی۔ "محبت کو صرف دل تک رہنے دے۔ پیان اگر یہ دل میں رہے تو عقیدت بنی رہتی ہے، جو دماغ کو چڑھ جائے تو جھل پن۔ صرف جھل پن۔" اس کے گہرے انداز پر پیان کا قہقہہ نکل گیا۔ اپنے دونوں ہاتھ اس کے شانوں سے اٹھائے۔

"بڑی باتیں آگئی ہیں، تجھے۔ اچھا چل ایک بات اور سن اپنا ہرا جوڑا نکال لے بلکہ پہن ہی لے، جانے کس وقت جلدی میں نکلنا پڑ جائے اور تیرے شگن کا جوڑا رہ جائے۔"

اس کی ساری قوت جواب دے گئی۔ لرزتی پلکوں سے دو موتی، خوشی، حیا، خفتگی کے گالوں پر پھسلے۔ پیان نے ہاتھ بڑھا کر اپنی پوروں پر سے چن لیے۔ وہ دو قدم مزید آگے آیا اس کے بھرے بھرے گرم ہونٹ اس کی ٹھنڈی نم آلود پیشانی پر ثبت ہوگئے تھے۔ وہ پرے ہٹتے ہوئے تیکھا سا مسکرایا اور "دجھلی" کہہ تیزی سے باہر نکل گیا۔

اس نے کچھ دیر بعد آنکھیں کھول کر اس کی چوڑی پشت کو گم ہوتے دیکھا تھا۔ اطمینان، آسودگی پور پور اترتی تھی۔ زندگی میں آج پہلی بار اسے اپنی پیشانی دنیا کی نایاب و قیمتی چیز محسوس ہوئی۔ اس نے دوڑ کر آئینے میں اپنا چہرہ دیکھا۔ آج اسے اپنا وجود کسی مہارانی سے کم نہیں لگ رہا تھا۔

وہ بہت دیر سے گھر کا سامان سمیٹ سمیٹ کر چھپا رہی تھی۔ پیان نے کہا تھا۔ سونے جیسی قیمتی چیزیں ساتھ نہیں رکھنی۔ لالچ میں ظالم ہاتھ کاٹ رہے ہیں۔ سامان کی وجہ سے قافلے لٹ رہے ہیں۔ سب سے پہلا خیال اسے اپنی بڑی سی ساٹن کی لونگ کا آیا۔ اتارنے ہی والی تھی کہ اس پاس تائی ثریا کی آواز ابھری۔

"یہ تو سائیں کے سلامت ہونے کی علامت ہے، بھلے جان چلی جائے، مگر بیاہی لڑکی کی ناک خالی نہیں ہونا چاہیے۔" اس کا سپید ہاتھ ناک سے پھسل کر دل پر جم گیا۔ اس نے پوری شدتوں سے پیان کی زندگی، صحت و سلامتی کی دعائیں مانگی۔

اس نے زمین میں ایک گڑھا کھودا۔ زینب، ثریا کے گلوبند، ہار، بالیاں اس میں دبائیں، مٹی برابر کردی۔ "پیان کہہ جو رہا ہے بعد میں آکر لے جائے گا۔ صندوقوں پر تالا ڈالا، چارپائیاں رکھیں، سب چادر سے ڈھانپ دیا۔ ہر چیز رکھتے سنبھالتے اس کا دل بھر بھر آتا۔ کتنا مشکل ہوتا ہے نا اپنے ہاتھوں سے بنائی سجائی چیزیں دوسروں کے لیے چھوڑ کر خود خالی ہاتھ نکلنا، لیکن آزاد مٹی کی خوشبو حوصلہ بڑھاتی گئی۔

"بریں مژدہ گر جان فشانم رواست"
ایسی خوشی پر جان بھی جائے تو شکر ہے۔

وہ سب کا ایک ایک جوڑا، پیان کا آدھا کڑھا کرتا اور اپنی سبز لال چوڑیاں ایک گٹھڑی میں باندھ رہی تھی کہ اسے اپنی پشت پر کسی کی موجودگی کا گمان ہوا، جھکے جھکے مڑ کر دیکھا۔ چٹیا آگے جھول گئی۔

سہمی کھڑی ایک ٹک اسے اور سمٹے سامان کو دیکھ رہی تھی۔ "یوں اچانک یہ کہاں سے آگئی۔" اس نے سیدھے کھڑے ہوتے سوچا۔ چٹیا پیچھے کمر پر ڈالی، پیان کے جانے کے بعد اسے کوئی خیال کہاں رہا تھا۔ حالانکہ وہ جاتے جاتے دروازہ بند کرنے کی تاکید کر گیا تھا، مگر پہلے اس کا لمس، اس کی خوشبو محسوس کرتی رہی پھر اسی کے بتائے سجھائے کاموں میں لگ گئی۔

"تو کب سے کھڑی ہے؟" اس کے استفسار پر وہ کھوئے لہجے میں بدبدائی۔

"میں تو کب سے کھڑی ہوں' پر کسی کو نظر ہی نہیں آتی۔" پھر قدرے زور سے پوچھنے لگی۔

"تو تم حقیقتاً" جا رہے ہو...؟"

"ظاہر ہے۔" اس نے لاپروائی سے کندھے اچکائے۔

"اور تایا' تائی وہ کہاں ہیں' دکھائی نہیں دے رہے۔" اس نے تفتیشی نگاہ دوڑائی۔

"وہ اپنی اماں کے گاؤں میل ملاپ کرنے گئے ہیں' کل ان کے آتے ہی ہم نکل پڑیں گے۔"

"اور پیان...؟"

"وہ پٹواری سے ملنے گیا ہے' اپنے کام نبیڑ کر ہی جائیں گے۔" کارنس اور شیلفوں پر سے چیزیں اتار اتار کر سنبھالتی وہ بہت سادگی سے سب کہتی رہی تھی۔

"سہتی! اگر تو میری پکی سہیلی ہے تو ہمارے گھر اور چیزوں کا خیال رکھنا' ہم اپنی چیزیں لینے آئیں گے۔"

"صبرا ایک بات پوچھوں...؟" سہتی کو اس کی باتوں سے کوئی سروکار نہیں تھا۔ بے دھیانی سے سہتی اپنی سوچوں میں الجھی تھی۔

"ہاں پوچھ۔" وہ ایک گٹھڑی پیٹی میں ڈالتے ہوئے بولی۔

"تجھے پیان سے واقعی محبت ہے؟" وہ ایک دم سے ٹھٹکی اور زور سے پیٹی کا ڈھکن چھوٹا۔

"میرا مطلب ہے' محسوس تو نہیں ہوتی' نہ تیرے لفظوں سے' نہ تیرے رویے سے۔"

"سہتی میری محبت اتنی ہلکی نہیں ہے۔" وہ دھیرے دھیرے چلتی اس کے مقابل آکھڑی ہوئی۔ "کہ لفظ اور رویے کے پلڑے میں تولوں' میری محبت قوس قزح کی متلاشی نگاہ جیسی ہے' اس کے خاموش رنگ گگن پر مٹ بھی جائیں تو بھی نگاہیں انہیں ٹٹول ٹٹول تھکتی نہیں۔"

"آہ!" سہتی نے آہ بھر کر پیٹھ موڑ لی۔ "مجھے بھی محبت ہے اور وہ چکوری کی طرح ہے جیسے شروع دن سے پتا ہے' وہ چاند تک نہیں پہنچ سکتی' مگر چاہت میں پر تڑوا لیتی ہے اڑان نہیں چھوڑتی۔"

"کیا مطلب؟" صبرا گھوم کر اس کے سامنے آئی۔ "تجھے واقعی ارجیت سے محبت ہو گئی ہے؟"

اس نے پچھلے مہینے ہی سنا تھا ارجیت سنگھ کا باپ ان کے گھر رشتہ لے کر آیا تھا اور امرت نے باپ سے پہلے ہاں کر دی۔ سگائی کا دوپٹا' چوڑی مہندی بھی رکھ لی۔ صبرا نے اس کے دونوں کندھے پکڑ' شرارتاً" جھلائے۔ اس نے خفگی سے جھٹک کر چھڑوائے۔ "پتا نہیں۔" کہہ کر تیزی سے باہر نکل گئی۔

☼ ☼ ☼

ابا کے گھر' کوٹھری' کمرے کے کواڑ بند کرکے وہ تائی ثریا کے برآمدے میں بیٹھی تھی۔ اس نے ہرا سوٹ پہن کر' کس کر چٹیا گوندھ رکھی تھی۔ نگاہ بار بار بیرونی دروازے پر جاتی۔

"پتا نہیں کب آئے گا' کہہ رہا تھا دیر ہو جائے گی' کتنی دیر...؟" تیز چمکتی دھوپ تقریباً" آدھے صحن سے سمٹ گئی تھی۔ اچانک سے دروازہ دھڑدھڑایا۔ وہ اوڑھنی سمیٹتی دروازے کی جانب بڑھی تھی۔

"کون...؟" پوچھنے پر سہتی کی گھبرائی آواز آئی۔

"صبرا' دروازہ کھول' جلدی کر..." اس نے دونوں پٹ کھول دیے۔ اس کی آواز سے زیادہ چہرے پر گھبراہٹ تھی۔ وہ تیزی سے اندر بڑھتے کہنے لگی۔

"صبرا جلدی کر' زیادہ وقت نہیں ہے' تجھے پیان بلا رہا ہے' جلدی نکل' جلدی۔"

"کہاں ہے پیان...؟" اس نے پہلے اسے پھر گھبرا کر باہر جھانکنے کی کوشش کی' مگر سہتی نے اس کی کلائی کھینچ لی۔

"یہاں نہیں ہے' جھلّی... وہ گھاٹ سے پرے ملا شیر کے گھر ہے' وہاں قافلہ تیار ہو رہا ہے' رات میں کسی بھی پل نکل پڑیں گے... تایا تائی راستے میں ہی قافلے میں شامل ہو جائیں گے۔ تو نکلنے کی کر' پیان نے تجھے جلدی پہنچنے کا کہا ہے۔"

"لیکن وہ خود کیوں نہیں آیا۔" اس کی کچھ سمجھ میں کچھ نہیں آرہا تھا کہ وہ کیا کہہ رہی ہے' ایسا کیسے ہوسکتا ہے' پیان اسے خود لینے نہ آئے۔

"بدھی گدھی... وہ کیسے آئے' اس کا رانے پٹواری سے فساد ہوگیا تھا' تو جانتی تو ہے اس کے غصے کو' پٹواری کا سر پھاڑ دیا اس نے' شکر کر ملاشیر موجود تھا۔ بیچ بچاؤ کروا کر اسے اپنے گھر چھپا رکھا ہے' پٹواری کے بندے اس کی بو سونگھ رہے ہیں تو یہاں گھر پر اکیلی ہے اس لیے تجھے وہاں بلایا۔" وہ ہونق سی ہونق تھی۔

"میں تو گھاٹ پر امرت کے کپڑے لینے گئی تھی' وہاں ملاشیر کے لڑکے نے دیکھ کر پیان کا پیغام دیا' زیادہ سوچ نہیں' نکلنے کی کر۔" اس کے ہاتھ پاؤں پھول گئے' حلق اندر تک خشک کانٹے دار' یہ تو معلوم تھا سب چھوڑ کر جانا ہے' مگر یوں تنہا... وہ کبھی سہتی کو کبھی گھر کو دیکھتی' ہونٹ کاٹتی کچھ سوچ رہی تھی۔

"اب کیا سوچ رہی ہے' کیوں دیر کر رہی ہے۔" اس نے اس کی ہری اوڑھنی اتار' اپنی شیشوں والی چادر اس پر لپیٹ دی۔ "یہ اوڑھ' تاکہ تیرا کسی کو پتا نہ چلے۔" وہ اس کا بازو تھامے باہر کی جانب کھینچتے جلدی جلدی مچاتی رہی۔

"ٹھہر تو سہی..." اس نے بازو چھڑایا' گھڑونچی پر سے لالٹین اور دیا سلائی اٹھائی۔ وہ خاص طور پر اس کی یاد دہانی کروا گیا تھا۔ پھر وہ گٹھڑی جو ابھی باندھی تھی اٹھانے کے لیے جھکی' سہتی نے اس سے پہلے جھک کر کھول دی۔

"کیا ہے اس میں؟" سب سے اوپر آدھ کڑھا سفید کرتا اور ہری لال چوڑیاں رکھی تھیں۔

"تو چوڑیاں لے کر جائے گی۔؟ یہ تو بجیں گی' کم عقل' شک ہوجائے گا کسی کو۔"

مبرا بے چارگی سے اسے دیکھنے لگی۔ "اچھا' یہ کرتا تو لینے دے' وہ پہن کر جائے گا ناں۔"

سہتی نے کرتا جھٹک کر اٹھالیا اور بغل میں داب لیا۔ "چل یہ لے لیتے ہیں' اب جلدی نکل۔" وہ اس کا بازو دبوچے کوئی لمبی چوڑی تفصیل سناتی کھینچتی' تیزی سے باہر بڑھ رہی تھی۔ اسے کچھ سنائی نہیں دے رہا تھا۔ وہ مڑ مڑ کر گلی' گھر' رستے کی جانب دیکھتی جاتی۔ آنسو جو آنکھوں سے پھسل کر گالوں پر پھیلتے جاتے تھے درختوں کی اوٹ' کیکر کے جھاڑوں سے ہوتی وہ وسطی پگڈنڈی سے خاصی دور عقبی کچے پر چل رہی تھی۔

"یہ کہاں لے جارہی ہے' مجھے؟" اس کو قدرے تشویش ہوئی۔

"شش... آہستہ بول۔"

وہ سرزنش کرتی کنویں کے پاس آرکی۔ "میری بات غور سے سن مبرا' سورج ڈوبنے کے بعد پیان یہاں کنویں کے پیچھے ملے گا' اب خاموشی سے ادھر آ۔" وہ پھر گھاٹ کے پیچھے دھوبی کی کچی پکی چہار اطراف سے ڈھکی برساتی کے پاس آرکی۔ برساتی کی دیوار کے باہر لمبی سی ناند تھی جہاں دھوبی کے گدھے کے ساتھ اور لوگ بھی چارہ ڈال کر اپنے چوپائے باندھ جاتے تھے۔ امرت بھی اکثر اپنا شیرو وہاں ہی باندھتا تھا۔

"تو اس میں چھپ جا۔" سہتی نے چارہ ایک طرف کرتے ناند میں اس کے لیے جگہ بنائی۔ مبرا کی آنکھیں تحیر سے پھیل گئیں۔

"اس میں...؟"

"ہاں آں..." مبرا بھنوئیں سمیٹے نفی میں سر ہلاتی رہی۔

"اچھا چل۔" سہتی نے چند پل سوچا پھر اسے کلائی سے گھسیٹتی برساتی میں گھس گئی۔ اس کے ایک کونے میں میلے' دھلے کپڑوں کے گٹھڑ رکھے تھے' دوسری جانب چارے کے بورے' اپلوں کا ڈھیر۔ اس نے گٹھڑیوں کی جانب اشارہ کیا۔

"ان کے پیچھے چھپ جا۔"

"لیکن کیوں؟" اس نے حیرانگی سے اسے دیکھا۔ "تو تو کہہ رہی تھی پیان کے پاس..."

"تو بہت ہی جھلی ہے مبرا' پٹواری کے بندے اسے ڈھونڈ رہے ہیں' تیرے جانے سے اگر اس کا پتا چل گیا پھر... تو یہاں بیٹھ' میں اسے بتا کر آتی ہوں تو کہاں

ہے۔ وہ اندھیرے میں نکلے گا نا۔"

"تم کیلیے مجھے ڈر لگے گا سہتی۔"

"ڈرنے کی کیا بات ہے۔ بچپن میں ہم ادھر کھیلتے نہیں تھے' تھوڑی دیر میں سورج چھپ جائے گا' گرو کے واسطے تو یہیں بیٹھی رہنا' جب تک میں یا بیان تجھے لینے نہ آجائیں اور ہاں۔" وہ جاتے جاتے مڑی لالٹین کو دیکھا۔

"یہاں بتی نہ جلانا' کہیں کسی کو شک ہو جائے' بس کچھ ہی دیر میں بیان کو چھپا کر لے آتی ہوں' ہوشیار رہنا۔"

وہ سمٹی' دبکی اک گٹھری بنی بیٹھی تھی۔ بے ہنگم جگہ' بساند ہی بساند' تنہائی' نیم تاریکی' اس کا دل بے طرح سے دھڑک رہا تھا۔ پل پل صدی کی طرح گزرتا تھا۔ اسے سہتی کے خلوص پر کبھی شک نہیں گزرا تھا۔ پچھلے دنوں کتنے حالات خراب ہوئے' مگر سہتی کے رویے میں قطعاً" فرق نہیں آیا تھا۔ تائی ثریا اور بیان کے کہنے پر اس نے اس سے راہ رسم بہت محدود کرلی تھی' لہجے میں ناگواری رکھتی' مگر وہ پہلی سی بے تکلفی ہی رکھتی تھی۔ اس کے نکاح پر بھی چوری چھپے آئی تھی۔ خاموش تھی' روئی بھی تھی اور بعد میں ایک دو ملاقات ہوئیں تب بھی بہت مضمحل لگی تھی۔ جس طرح ہر سہیلی اپنی سہیلی کے نکاح اور روانگی کے خیال سے اداس رہتی ہے بالکل اسی طرح' پھر کیسے اس کی محبت پر شک کرتی۔ وہ صرف انتظار کر رہی تھی' بیان اور سہتی کا انتظار۔

پٹوار خانے سے گھر کی جانب آتی پگڈنڈی سے نیچے درخت اور جھاڑ کی اوٹ میں وہ بہت دیر سے ایسے بیٹھی تھی جیسے کوئی بلی گھات لگائے بیٹھی ہو' وہ آنکھوں سے زیادہ کانوں سے کام لے رہی تھی۔ بار بار کان اوپر کر کے گھبرو کے ٹاپوں کی آواز سننے کی کوشش کرتی۔

"وہ یہاں سے ہی گزرے گا۔" اتنا یقین تھا' لیکن گھبرو کے ٹاپوں کی آواز نہ آنی تھی نہ آئی۔ سہتی اپنی ماں کو ماما جی کے گھر کا کہہ کر آئی تھی۔

"اماں' میترو نے چاولوں کی پنیاں بنوانی ہیں' ماما جی کے چلی جاوں۔" اماں کا اثبات میں ہلتا سر دیکھ کر فوراً" بولی۔ "آج رات ادھر ہی رہوں گی۔"

اماں نے لسی بلوتے کہا۔ "اچھا ٹھیک ہے' کل آتے ہے اپنی ماں کو ساتھ لے آئیو' تیری رضائیاں تلنی ہیں اور میترو کو بھی لے آئیو۔"

اماں کی کھلی چھٹی سے وہ بے فکر ہو گئی۔ سورج غروب ہوا چاہتا تھا۔ ابھی تاریکی سارے رستے پر چھائی نہیں تھی۔ خاصی دور کوئی بغل میں کچھ دابے تیز تیز چلتا اسی جانب بڑھ رہا تھا۔ متوازی چال' مضبوط کاٹھی والا' سر سے صافہ اتار کر جھٹکا' منہ پونچھ شانے پر دھرا' کانوں سے نیچے تک آتے گھنگریالے بال' ڈوبے آفتاب کی نیم تاریکی میں بھی اس کی چمکتی صاف رنگت' وہ آنکھیں سکیڑے بغور اسے تک رہی تھی۔ وہ لمبے ڈگ بھرتا درخت کے پاس سے گزرا' وہ جست لگا پگڈنڈی پر چڑھ گئی۔

"بیان!" پکار پر اس نے مڑ کر دیکھا' بھنوئیں استعجابیہ سکڑیں۔

"تو کدھر جا رہا ہے؟"

"ہاں۔ کیوں؟ تو کیوں پوچھ رہی ہے اور یہاں کیا کر رہی تھی۔" اس کے کرخت انداز پر اس نے اپنے سینے پر ہاتھ پھیلاتے سانس بحال کی۔

"انتظار! میرا مطلب ہے تیرا بہت دیر سے انتظار کر رہی تھی' مبرا نے بتایا تھا تو پٹوار خانے....."

"لیکن کیوں؟"

اس کے درشتی سے جملہ کاٹنے پر وہ تھوک نگل کر بولی۔ "وہ تجھے بتانا تھا۔ تیرے گھر پر کوئی نہیں ہے' مبرا چلی گئی۔"

وہ پوری شدت سے چونکا اور پھر گھر کی جانب تیز قدم اٹھے۔ وہ اس کی تقلید میں بھاگنے کے انداز میں چلتی کہہ رہی تھی۔

"تایا' تائی صبح یہاں پہنچ گئے تھے' کچھ دیر تیری راہ دیکھی' ایام کوٹ سے ایک سرکاری اربن لاری قصور جا رہی تھی۔ اس میں سوار ہو گئے' لاری میں بہت سی

عورتیں، بچے تھے تائی اور مبرا کے خیال سے کہ خیریت سے پہنچ جائیں تایا خود تو چھت پر لٹک کر گئے ہیں۔ تو، تو جوان ہے، ریل یا قافلے میں بھی آسکتا ہے، رات کی ریل کا پیغام دے کر گئے تھے تیرے لیے۔" اس کے ایک سانس اطلاع پر وہ میکانکی انداز میں چلتا، غرا کر دیکھا۔

"تو چپ کرتی ہے۔۔۔ یا۔۔۔!" سہتی کے قدم اور سانس دہشت سے رک گئے۔ "اور میرے پیچھے کیوں آرہی ہے؟"

اس نے ڈرتے ڈرتے کہا تھا۔ "مبرا نے تجھے پیغام دینے کو کہا تھا۔"

"دے دیا؟ اب جا! ہونہہ۔" وہ گردن جھٹک تیز چلنے لگا وہ بھی پہلے آہستہ پھر تیز اس کے پیچھے آرہی تھی۔ گھر کی چوکھٹ پر پہنچ کر ایک بار پھر اسے گھورا اور دونوں پٹ کھول کر اندر داخل ہو گیا۔ اندھیرا پھیلتا جاتا تھا۔ کھڑونچی والی لالٹین غائب تھی۔ اس نے چوکھٹوں کے ساتھ بنے طاقچوں کی قندیلیں جلائیں اور مبرا کو پکارتا ہمیروں کوٹھری کی جانب بڑھا۔

"تجھے یقین کیوں نہیں آتا، وہ یہاں نہیں ہے۔" سہتی کے جملے نے اس کے اعصاب مختل کر دیے۔ بھلا وہ تنہا کیسے جاسکتی ہے۔ ابھی صبح تو وہ یہاں چارپائی پر بیٹھی تھی۔ پورے چاند کی روشنی میں اس کی نگاہیں چاندنی میں نہائی خالی چارپائی پر تھیں۔ وہ تو اسے کہہ کر گیا تھا سامان سمیٹ کر تیاری رکھے، دیر کا ضرور کہا تھا، مگر نہ آنے کا تو نہیں، اس نے میرا اعتبار کیوں نہیں کیا، وہ جلدی ضرور آجاتا، مگر ایک تو پٹوار خانہ اگلے گاؤں، اوپر سے پٹواری کی بحث۔ بہتی گنگا میں سب ہی ہاتھ کیا پورا وجود دھونا چاہتے ہیں۔ پہلے کاغذوں پر آئیں بائیں کرنے لگا۔ پھر مطالبات، رقم اس کے پاس نہیں تھی جو اسے چپ کرواتا، لیکن رقم سے زیادہ قیمتی وہ، جسے اپنے اور اس کے بچپن سے پالا تھا۔ خوب دیکھ ریکھ کی گھبرو جو اس کا بہت لاڈلا تھا۔ پٹواری کی نگاہ اس پر ٹھہری۔ بہت مشکل فیصلہ تھا، مگر کرنا تھا۔ اسے پاکستان بھی نہیں لے جاسکتا تھا، چھوڑنا تو تھا ہی۔ کتنے لوگوں سے سنا تھا جانوروں کی رسیاں کھول کر اللہ کے نام پر چھوڑ گئے تھے، سو اس نے بھی دل پر پتھر رکھتے ہوئے اس کی باگ پٹواری کے حوالے کی۔ کتنی دیر اس کی پشت، پیشانی سہلاتا، چومتا رہا۔ تھکے قدموں وہ پیدل واپس آیا تھا، مگر ایسی بھی کیا دیر، اماں ابا آگئے تھے تو اس کا انتظار کیوں نہ کیا، کسی اور لاری میں چلے جاتے، مگر اکٹھے تو جاتے۔ جانے ان کی لاری کہاں کہاں ہوتی جائے، کہاں رکے، کیسے ڈھونڈوں گا انہیں۔ اس کے ذہن میں اک جھماکا سا ہوا۔

ابا کہہ رہے تھے۔ "ہم تو مرد ہیں، تنہا کہیں بھی آجا سکتے ہیں، مگر مبرا اور تیری ماں کے ساتھ ہم میں سے کسی ایک کا ہونا لازمی ہے۔" تو کیا ابا نے اپنا ہونا ضروری سمجھا، اسے چھوڑ گئے۔ نہیں ایسا کیسے ہو سکتا ہے اسے کچھ سجھائی نہ دیتا تھا۔ سر تھامے بہت دیر چارپائی پر بیٹھا رہا۔ میں نے جب سے اسے باہر نکلنے سے منع کیا تھا، اس نے قدم باہر نہیں رکھا، پھر آج میری اجازت کے بغیر، انتظار کیے بغیر کیسے چلی گئی۔۔۔ یہ جھوٹ بول رہی ہے۔ وہ جھپٹنے کے انداز میں اٹھا، اس کو دونوں شانوں سے پکڑ کر جھنجوڑا۔

"بتا مبرا کہاں ہے؟ سچ بول، ورنہ تیری جان لے لوں گا۔"

"تو قسم لے لے گرو کی، میری ماں کی، مبرا یہاں نہیں ہے، چلی گئی، وہ وہاں تیرا انتظار کر رہی ہے۔"

"بکواس کر رہی ہے تو، جھوٹ بول رہی ہے، وہ مجھے چھوڑ کر نہیں جاسکتی۔" اس نے جھٹکے سے اسے چھوڑا۔ غصے کی شدت سے آواز کانپتی، چہرہ انگارہ بنا تھا۔

"میں جھوٹ کیوں بولوں گی پیان۔" وہ دو قدم پیچھے ہٹ کر کھڑی ہو گئی۔ "میں نے ہمیشہ تیرا بھلا چاہا ہے، اب برا کیوں چاہوں گی۔"

وہ اس پر کرخت نگاہیں جمائے کھڑا تھا۔ اس کے آخری جملے سے الجھ سا گیا۔ اپنے بھائی کے مقابلے میں ہمیشہ وہ اس کی حمایت کرتی تھی اور جلنے جیسے امرت کا مزاج بگڑنے لگا تو کتنی بار اسے مبرا سے کہتے سنا۔

"پیان سے کہا کر' امرت' ارجیت سے پرے رہے' آج کل بڑی گرمی کھانے لگے ہیں۔" ایک بار براہ راست اسے سمجھا رہی تھی۔
"تو شہر جلسے میں گیا تھا نا' اب ذرا گھر ٹک کر بیٹھ' امرت غصے میں بھرا ہے۔"
"کیوں؟ میں ڈرتا ہوں اس سے' چوڑیاں پہن رکھی ہیں۔"
"تو نے تو نہیں پہن رکھیں' مگر کسی اور کی چوڑیاں روٹھ جائیں گی' امرت تیرے لیے اچھا خیال نہیں رکھتا۔ مجھے تیری فکر ہے۔"
"اچھا!" وہ استہزائیہ ہنسا۔ "اپنے بھائی کے مقابل میری فکر کیا لگتا ہوں تیرا؟" وہ بہت دیر چپ رہی پھر آہستگی سے بولی تھی۔
"میرا تو کچھ بھی نہیں لگتا' مگر میری سہیلی کا سب کچھ لگتا ہے۔"
"پھر فکر بھی سہیلی کو کرنے دے' چل ہٹ رستے سے...." نہ اسے اس روز یقین آیا تھا نہ آج آتا اگر وہ یک لخت آخری پتا نہ کھیلتی۔
"تجھے یقین نہیں آرہا نا' یہ دیکھ اوڑھنی۔" اس سارے عرصے میں اس نے پہلی بار اس کی ہری اوڑھنی کو غور سے دیکھا۔ قندیل کی لہراتی لو میں جھلملاتا گوٹے کناری والا سبز آنچل! اس آنچل سے وابستہ رشتہ اور لمس کو پہچاننے کے لیے تیز روشنی کی ضرورت نہیں تھی۔
"مبرا نے مجھے یہ کہہ کر دی تھی کہ تو اسے دیکھتے ہی میری بات کا یقین کرے گا اور یہ دیکھ...." اس نے بغل سے ادھ کڑھا کرتا نکالا جو گھبراہٹ میں مبرا کو لینا یاد نہیں رہا اور اس نے تو شاید جان کر نہیں دیا تھا جب سہتی' مبرا کی زبانی ساری تیاری اور جانے کا ارادہ سن کر گئی تھی۔ وہ ساری بازی ہار گئی تھی۔ اس کے ذہن نے تیزی سے کام کیا۔ چند گھنٹے تھے جو کرنا تھا' ان ہی میں کرنا تھا۔ اگر تایا تائی آگئے یا کسی طرح پکڑی گئی تو کیا ہوگا' زیادہ سے زیادہ پیان اسے مار دے گا یا پھر کبھی پلٹ کر نہیں دیکھے گا۔ دور تو وہ ویسے بھی جا رہا ہے اس کی جدائی میں ویسے بھی گھٹ گھٹ کر مر جائے گی' قسمت آزمانے میں کیا حرج ہے اور ویسے بھی لالہ پیان کو مبرا سے کہیں زیادہ چاہتی ہے' زیادہ خوش رکھے گی۔ امرت مبرا کو پسند کرتا ہے' اگر ذرا سے جھوٹ سے دو گھر خوش ہو سکتے ہیں تو برائی کیا ہے؟ یہ اس کی سوچ تھی۔ اس بات سے قطع نظر کہ دونوں خاندانوں میں کتنے فرق ہیں' مذہبی' معاشرتی اور اب تو ایک اہم سیاسی فرق بھی بن چکا ہے' مگر پھر بھی اس کے نزدیک عام سی بات تھی اور وہ اپنی سوچ میں کسی حد تک کامیاب ہی رہی جب پیان نے وہ کرتا دیکھا۔
"یہ دیکھ' مبرا نے دیا تھا' تو اسے پہن کر جائے گا' ہاں۔" وہ یک لخت ڈھیلا پڑ گیا۔ اک سنسناتی لہر سارے بدن میں تیرتی تھی۔ کرتا ایک مضبوط حجت کی طرح تابوت میں ٹھکا تھا۔
"تو واقعی اس نے میرا اعتبار نہیں کیا' چلی گئی۔" دانتوں تلے بھرے لب کو زور سے کاٹتا تھا۔
اب اسے پاکستان جانا تھا۔ ابھی' اسی وقت کوئی بھی ریل گاڑی یا قافلہ ملے' مگر ابھی جانا تھا۔

☼ ☼ ☼

خنک رات ہر طرف سناٹا بچھا چکی تھی۔ ایک پہر گزر چکا تھا۔ کہیں سے گیدڑوں کی چنگھاڑیں آتیں' کہیں گھوڑوں اور بیلوں کی گھنٹیوں کی۔ لحہ لحہ خوف خدشے بڑھتے جا رہے تھے وہ زندگی میں پہلی بار ایسے تنہا اک اجنبی' ہولناک جگہ پر تھی۔ دل کی دھڑکن بدن پھاڑ دینے کی حد تک تھی۔ وقت کا کوئی اندازہ نہیں ہوتا تھا۔ بس ایک سیاہ رات تھی۔ لمحے کے ہر پل میں اسے ایک ہی احساس تھا۔ کہیں کچھ غلط تو نہیں ہو رہا' سہتی اس کے ساتھ غلط کیوں کرے گی؟ ہو سکتا ہے بیداری کی وجہ سے پیان آج رکا رہے' دن چڑھے نکلے' کہیں خدانخواستہ.... اور پھر دل دھڑ' دھڑ' دھڑ....

☼ ☼ ☼

وہ بہت دیر اضطراری کیفیت میں اپنے گھنگریالے

بالوں میں انگلیاں چلاتا رہا۔ گہری سوچ سے اس کی چوڑی پیشانی پر شکنیں بڑھیں' قطرے چمکے' دانت بھنچ جاتے' کبھی پشت پر ہاتھ باندھے گہرے سانس لیتا' کبھی ہتھیلی پر مکے مارتا۔ رات کا بہت سا حصہ بیت چکا تھا۔ اس نے اپنا صافہ کندھے سے اتار کر چہرہ پونچھا اور پھر تیزی سے باہر نکلا تھا۔ کاغذوں والی دری نیچے میں اڑسی۔ وہ بھی پیچھے اسی رفتار سے چل رہی تھی۔ وہ لمبے ڈگ بھرتا کچی گلی عبور کر کے تیزی سے پگڈنڈی پر چڑھ گیا۔ وہ اپنی سوچوں میں اس قدر الجھا تھا کہ بہت آگے جا کر اپنے تعاقب میں آتے قدموں کا احساس ہوا۔ اس نے گردن موڑ کر دیکھا۔ چاند کی روشنی میں بھی اس کا سانولا وجود صاف دکھائی دیتا تھا۔ اس نے اپنا چہرہ بہت اچھی طرح ڈھانپ رکھا تھا۔ جیسے وہ رکا' وہ بھی رک گئی۔ اسے اب یاد آیا وہ تو بہت دیر سے اس کے ساتھ ہے۔ رات شروع ہونے سے پہلے سے' لیکن کیوں؟ اپنے گھر کیوں نہیں جاتی؟ پیغام دینا تھا دے دیا اب جائے! اس نے تنقیدی ابرو اٹھائیں۔

"اب کیا ہے' کیوں پیچھے آرہی ہے؟"

وہ چہرے کو دوپٹے سے مزید لپیٹتے ہوئے بولی۔ "پیچھے نہیں آرہی' تیرے ساتھ جا رہی ہوں۔"

"تو ہوش میں ہے؟" وہ کرختگی سے بولا تھا۔

"ہاں! پورے ہوش میں ہوں' اب اگر اتنی رات میں گھر جاؤں گی' امرت ویسے ہی مجھے مار دے گا' مجھے یہاں نہیں رہنا' جہاں تو جائے گا میں بھی چلی جاؤں گی۔"

"بکواس بند کر اپنی' جا یہاں سے' میری ریل آنے والی ہے۔" وہ پٹڑی سے کچھ ہی فاصلے پر تھے عموماً لاہور جانے والی ریل صبح وہاں سے گزرتی تھی۔ وہ اسی کے انتظار میں تھا۔ ابھی تک نہیں آئی تھی۔ وہ خود سپردگی کے عالم میں دو قدم آگے بڑھی۔

"تو مِراکو کیسے پہچانے گا' اس نے میری چادر اوڑھی ہے' اپنی چادر کو میں پہچان کر تجھے بتا دوں گی۔"

"میری آنکھیں سلامت ہیں' ڈھونڈ لوں گا اسے..." اس کے لہجے میں واضح درشتی تھی۔

"دیکھ پیان" اس نے ہاتھ جوڑے' خوف' امید' متذبذب انداز میں۔ اس کا نقاب گرا وہ منمنائی۔ "مجھے اپنے ساتھ لے چل' جو' جیسے تو کہے گا میں کروں گا' تائی کی خدمت' مفت کی نوکرانی۔ میں تیرا دم مرم بھی اپنا لوں گی' مگر مجھے چھوڑ کر نہ جا۔" وہ قدم قدم آگے بڑھی۔ اس نے انگشت سے روکا۔

"پیچھے ہو۔! تو جانتی نہیں ہے میرا تیری سہیلی سے کیا رشتہ ہے۔"

سہیلی کے ذکر پر وہ یک لخت ہکلائی۔ "ہاں ہاں۔ میں تو تم دونوں کی نوکرانی بن کر رہوں گی' اور مِرا تو مجھے دیکھ کر خوش ہو جائے گی' اعتراض نہیں ہوگا۔" وہ اس کی رونی صورت' جڑے ہاتھوں کو غصے سے دیکھ رہا تھا۔ ریل کی پٹڑی کے ساتھ ٹاپوں کی آواز آرہی تھی۔ پہلے دور پھر آہستہ آہستہ نزدیک آنے لگی۔ سہتی نے اپنا منہ پھر سے ڈھانپ لیا۔ سوار کے بائیں ہاتھ میں ایک کرپایا تھا جس کے سرے پر قندیل کی طرح آگ روشن تھی۔ سوار نے ان سے کچھ ہی فاصلے پر گھوڑے کی باگیں کھینچیں۔ سوار کا چہرہ سامنے آگیا۔ بڑی بڑی سیاہ مونچھیں' سر پر پگ' لمبے چہرے کی استہزائیہ کھنچی جلد۔ وہ اپنا چہرہ خوب لپیٹ پیان کی اوٹ میں ہوئی کانپ رہی تھی۔ سوار نے تضحیک آمیز قہقہہ لگایا۔ کرپایا ایک ہاتھ سے دوسرے میں اچھال کر پکڑا۔

"اچھا' تو یہ تو ہے۔ رات کے اندھیرے میں ڈر کر بھاگ رہا ہے..... اکیلا اکیلا....ہا۔ ہا۔ ہا بڑا جی ہے تیرا۔"

"ایک تو یہ رات نہیں' صبح چڑھنے والی ہے۔" پیان کی گمبھیر تا آواز اسی کے طنزیہ لہجے میں ابھری تھی "دوسرا ڈر کر نہیں' تھوک کر جا رہا ہوں۔ اور تیسرے۔ اکیلا نہیں ہوں۔" اس کے تیسرے جملے پر وہ پوری کمینگی سے ہنسا اور گھوڑے کو دو قدم اس کی پشت کی جانب بڑھایا۔ جہاں وہ چھپ رہی تھی۔

"نظر آرہی ہے' تیرے پہلو میں دبکی تیری رانی۔"

"ہنہہ" پیان خفیف سا مسکرایا۔ "لیکن تو جانتا نہیں ہے' یہ کون ہے۔" وہ اس کی آنکھوں میں بڑھتی

خباثت کو تحقیر سے دیکھتا جان کر ایک جانب ہٹا تھا۔ وہ ایک قدم اور آگے آگیا۔

"چھوڑ جا۔ ابھی آشنائی کر لیتا ہوں۔"

اس نے کمینے پن سے آنکھ دباتے ہری جھلملاتی اوڑھنی کھینچ لی۔ بہت زور سے بادل کڑکا تھا یا آتش فشاں ابلا۔ لال اندھیری یا پھر شدید گردباد' امرت کی آنکھوں سے نکلتی لپٹیں قندیل کی آگ سے کہیں تیز تھیں' وہ ایک جست میں شیرو سے نیچے تھا۔ شدید ردعمل' اس کے اک جھٹکے سے وہ بہت دور پتھروں پر جاگری۔ اس کا نرم ہونٹ پھٹا' لہو بہنے لگا۔ امرت نے پیان کو بری طرح دبوچ کر گرا دیا تھا۔

"تیری اتنی جرائت میری بہن کو بھگا کے لے جارہا ہے۔"

"اپنی بہن سے پوچھ بے غیرت' جو بھاگنے کے لیے مری جارہی ہے۔" غلیظ گالم گلوچ کے دوران وہ اس کا گلا دبانے کی کوشش میں تھا۔ پیان نے اس کے منہ پر تھوک دیا۔

"چھوڑ دے اسے امرت' اس کا قصور نہیں ہے' مجھے مار دے' میں خود اس کے ساتھ نکلی ہوں' نہیں رہ سکتی اس کے بغیر....." سہتی کی ملتجی رندھی آواز اسے گرم چابک کی طرح محسوس ہوئی۔ آنکھوں سے شعلے نکل آئے اس نے تہہ بند سے ایک خنجر نکالا اور بازو پوری قوت سے پیچھے لے جاکر آگے ہو پیان کو مارنے کو تھا۔ خدا جانے اس دبلی پتلی سانولی لڑکی میں کہاں سے اتنی طاقت آگئی اس نے بھائی کے ہاتھ سے خنجر چھینا اور آن واحد میں اس کی گردن میں گھونپ دیا۔

تڑپ کر گرتے امرت کو دیکھ کر نہ صرف پیان کی آنکھیں پھٹی رہ گئیں بلکہ سہتی پاگلوں کی طرح اپنے ہاتھ اور بھائی کی گردن دیکھنے لگی۔ اس گردن سے ابلتے لال فوارے کو دیکھ کر پیان نے متاسفانہ کہا تھا۔

"امرت' دیکھ لیا۔ مسلمان خون کی بددعا کا اثر' آج کیسے تو اپنے خون کے ہاتھوں موت کے منہ میں جارہا ہے۔" اس کی بند ہوتی آنکھوں کو اس نے تنفر سے دیکھا اور تیزی سے شیرو پر سوار ہو کر' اسے بھگا لے گیا۔ پاگلوں کی صورت بیٹھی سہتی میں یک لخت جان پڑ گئی وہ اپنی اوڑھنی سنبھالتی اسے پکارتی پیچھے پیچھے بھاگی۔

"پیان..... پیان' میری بات سن' مجھے ساتھ لے کر جا۔ واپس آجا۔" وہ گرتی پڑتی' لڑکھڑاتی ہذیانی کیفیت میں اسے پکارتی پیچھے پیچھے بھاگ رہی تھی۔ سبز جھلملاتی اوڑھنی ریل کی پٹڑی پر ہی گر گئی۔ اور وہ دھول اڑاتا بہت آگے نکل گیا تھا۔ سہتی ریل کی پٹڑی پر سر مار مار کر لہولہان ہوگئی پیان سے محبت اس کے دماغ کو چڑھ گئی تھی۔ دماغ نے اپنا کام کرنا چھوڑ دیا۔

☆ ☆ ☆

آسمان پر صبح کی سفیدی پھیل رہی تھی۔ آخری تارہ ڈوبنے سے پہلے آنکھ مچولی کھیل رہا تھا۔ اگرچہ کھیتوں میں ابھی نیم تاریکی تھی۔ مناظر غیر واضح سے تھے کچھ دیر پہلے تاریکی میں اس کا وحشت بھرا دل پوری شدت سے دھڑکا تھا۔ غیر معمولی گھبراہٹ' سانس رک رک جاتی۔ اس نے ڈرتے ڈرتے دیا سلائی سے لالٹین جلائی تھی۔ پھر ایک گٹھڑ سے لپٹ کر سسکنے لگی۔

"میرے سوہنے اللہ! اپنے وطن تک جانا کتنا مشکل ہے' ہجرت میں بڑی کٹھنائیاں ہیں۔" جیسے جیسے باہر صبح کا احساس جاگنے لگا۔ وہ ناند سے جڑی دیوار کے سوراخوں سے پار دیکھنے لگی۔ شاید پیان یا سہتی نظر آجائے۔ باہر ملگجا اندھیرا اور ہلکی ہوا کی سرسراہٹ تھی۔ اس نے کئی بار سوچا۔ یہاں سے گھر چلی جائے۔ گھر کا رستہ آتا تھا۔ مگر ہر بار کی طرح سوچ کر بیٹھ گئی۔

"کہیں پیان مجھے یہاں ڈھونڈ تا رہے' مجھے نہ پاکر پریشان ہوگا' جانے گھر کا خیال آئے گا بھی یا نہیں۔"

صبح کے اولین لمحے تھے۔ اوس کے قطرے جا بجا ہرے پتوں' کونپلوں کو غسل دیتے تھے۔ تازگی کی مہک چہار سو تھی۔ پرندے میٹھی آواز میں ذکر الٰہی میں محو اور شیطان اپنا شکار ڈھونڈ تا تھا۔

☆ ☆ ☆

وہ علی الصبح راج نگر پہنچا تھا۔ چہرے سے تھکاوٹ کے اثرات زائل کرنے کے لیے نہر کنارے بیٹھ کر ٹھنڈے ٹھنڈے پانی کے چھپکے مارے، کھڑے ہو کر باری باری دونوں پاؤں جوتے سمیت نہر میں ڈبو کر نکالے۔ وہ بہت عرصے بعد راج نگر آیا تھا۔ اور ماموں رندھاوا کے گھر صاف ستھرا ہو کر جانا چاہتا تھا۔ دل خوش گمان تھا شاید دروازہ سہتی ہی کھولے، وہ اس کے خیالوں میں مست گیلے چہرے کو ہاتھوں سے پونچھتا آگے بڑھ رہا تھا۔ اچانک اس کی نظر ہری چرن کی برساتی پر گئی۔ سوراخوں سے مدھم روشنی جھانک رہی تھی۔

"آج چرن بڑی صبح صبح آگیا۔" وہ خود کلامی کرتا مڑا۔ عرصہ ہو گیا تھا ہری چرن سے ملاقات کیے، وہ حال احوال پوچھنے کی غرض سے کھنکھارتا برساتی کی جانب بڑھا۔ وہ باہر کسی موجودگی کے احساس پر جھجکی، دل کہہ رہا تھا باہر پیان آگیا ہے، وہ لالٹین والا ہاتھ اونچا کیے اپنے چادر درست کرتی باہر کی جانب نکلی۔

"تو...!" وہ یکدم ٹھٹکا۔ بے یقینی، خباثت میں ڈوبنے لگی۔ اس کی وحشت بھری آنکھیں پھیلیں۔ نڈھال بدن لرزا، دھڑکن تیز، دودھیا بے داغ رخساروں پر خوف کا سایہ۔ وہ الٹے قدموں اندر کی جانب سرکتی نفی میں سر ہلا رہی تھی۔

"نہیں ارجیت... نہیں..." اس نے امرت کی زبانی مبرا کے ملکوتی حسن کے بڑے تذکرے سنے تھے۔ بہت عرصے پہلے اس گوری چٹی لڑکی کو دیکھا بھی تھا لیکن آج اس کا چڑھتا شباب اس کی آنکھوں میں شیطانیت بھرنے لگا۔ اس کی غلیظ نگاہیں پھیلتی جا رہی تھیں۔ سہتی تو اس کے پاسنگ بھی نہیں تھی۔ وہ ہونٹوں پر زبان پھیرتا آگے بڑھ رہا تھا۔

"ارجیت، مجھے ہاتھ مت لگانا، میں تیرے دوست کی امانت ہوں۔" اس کے چہرے پر تمسخر بکھر گیا۔

"چل کیا یاد کرے گی ہاتھ نہیں لگاؤں گا۔" وہ مزید آگے آیا۔

"ارجیت میں کہہ رہی ہوں۔ یہاں سے چلا جا...

ورنہ..."

"کیا ورنہ۔" لہجے میں للچاہٹ امڈتی تھی۔ "اب کون ہے تجھے بچانے والا یہاں۔"

"میرا رب۔ وہ بچائے گا مجھے۔" بے ترتیب سانسیں، ترحم بھری نگاہیں۔ کانپتے قدم ایک گڑھے میں الجھے، وہ دھڑام سے اوندھی گری، لالٹین ہاتھ سے چھوٹتے ہی الٹ گئی، کپی پر ڈھکن نہیں تھا۔ تیل گرا اور چنگاری نے بڑے سے گٹھر کو پکڑ لیا۔ خشک کپڑے، گھاس پھوس، اپلے اور ان سب کے بیچ نسوانی چیخیں، پیان کی پکار۔ یک لخت پھیلتی آگ دیکھ کر ارجیت خوف زدہ ہو باہر کی جانب لپکا تھا۔ اور اسے اس تنور میں جلنے کے لیے چھوڑ گیا۔

آگ کے دریا میں، خوں اپنا جلایا تھا
اے خاک وطن، تجھے کیسے بسایا تھا

کچھ ہی دیر میں اس تنور کے گرد کئی راہگیر اکٹھے ہو گئے۔ نہر سے بھر بھر بالٹیاں پھینکتے، شعلے پھیلتے جاتے۔ شعلے ٹھنڈے ہونے تک نسوانی آواز آنا بند ہو گئی تھی۔ ہری چرن کو خبر ہوئی۔ دل تھامے گرم جلتی بجھتی راکھ میں کود گیا۔ اندر راکھ کے سیاہ ڈھیر، دھوئیں کے بادل اور کسی جسم کے جلنے کی شدید بدبو تھی۔

☼ ☼ ☼

وہ شیرو کو بھگاتا بہت دور نکل گیا تھا۔ تقریباً حد بندی کے قریب ہی تھا جب بہت دور کوئی قافلہ جاتا دکھائی دیا۔ اس نے شیرو کو ایڑھ لگائی اور تیز بھگاتا قافلے میں جا ملا۔ خاصا دن چڑھ آیا تھا۔ ہر منظر دھوپ کی تمازت میں دہک رہا تھا۔ چند افراد سے ملتے ہی اس نے رام پت کے قافلے کو پہچان لیا۔ اسی میں اس کے ننھیالی اور اماں ثریا بھی شامل تھیں۔ صلاح الدین کی غیر موجودگی پر اس نے ماں سے استفسار کیا تو ثریا کا منہ کھلا رہ گیا۔

"وہ تو راج نگر تم دونوں کو لینے گیا ہے۔" غالباً صلاح الدین رام پت سے تنہا آرہے تھے۔ ثریا کی والدہ کی طبیعت اگرچہ خراب تھی۔ مگر شوق دید وطن

بے طرح تھا۔ بھائیوں نے اگلے دن ایک قافلے کے ساتھ جانے کا انتظام کر رکھا تھا۔ ثریا نے بھی صلاح الدین سے ان کے ساتھ جانے کی اجازت طلب کی۔
"نہیں اماں کے ساتھ چلی جاتی ہوں' بیمار ہیں دھیان رکھ لوں گی تم مبرا' پیان کو لے پہنچ جانا۔"
صلاح الدین ان کے قافلے کو رخصت کرنے کے بعد راج نگر کے لیے نکلے۔ ابا کا سنتے ہی پیان کے ہوش اڑ گئے۔
"تو کیا اس سہتی کمینی نے میرے ساتھ جھوٹ بولا.... پھر مبرا کہاں گئی؟" وہ وہاں سے ہی واپس پلٹنا چاہتا تھا۔ اس نے بہت کوشش بھی کی مگر ثریا رونے پیٹنے لگ گئیں۔
"پیان الدین وہاں بہت قتل و غارت ہو رہا ہے' ہم پرسوں کے نکلے راستے بدل بدل آج یہاں تک پہنچے ہیں اگر تجھے کچھ ہو گیا میں یہاں اکیلی کیا کروں گی۔"
"لیکن اماں.... وہاں ابا اور.... مبرا جانے کہاں ہے کس حال میں ہے۔"
"میرے پتر تو فکر نہ کر' تیرا باپ راج نگر پہنچ چکا ہو گا وہ مبرا کو ڈھونڈ لائے گا۔"
انہیں پاکستان کیمپ میں آئے کئی روز گزر چکے تھے۔ ہر نئے آنے والے قافلے کو وہ پوری طرح دیکھتا ریڈیو پر روز اعلان کرواتا لیکن صلاح الدین اور مبرا کی کوئی خیر خبر نہیں تھی۔ ماں کے ہزار رونے منع کرنے کے باوجود وہ اس رات راج نگر جانے کی تیاری کر رہا تھا جب ملا شبیر کے قافلے نے آ کر صلاح الدین اور مبرا کے ختم ہونے کی اطلاع دی۔
صلاح الدین جب راج نگر پہنچے گھر خالی تھا سامان سمٹا ہوا اور برآمدے میں اک آدھ کھلا گٹھڑ پڑا تھا ان کا دماغ ماؤف ہو گیا۔ وہ بچوں کی تلاش میں ادھر ادھر نکلے' نہر کے رستے پر ہری چرن سے ملاقات ہوئی وہ خاصا بوکھلایا ہوا تھا۔ اس نے رازدانہ انداز میں بتایا تھا۔
"مہاراج بہت عرصہ تمہارا کھایا ہے' سچ کہتا ہوں فوراً پاکستان چلے جاؤ۔ یہاں حالات بہت خراب ہیں' مبرا اور پیان بھی یہاں سے چلے گئے ہیں' خود جاتے دیکھا ہے۔" اس نے اپنی برساتی میں مبرا کے جل جانے کی خبر بہت ہوشیاری سے چھپالی تھی۔ مبادا وہ اسی پر شک کریں اور بدلے میں اسے یا اس کے خاندان کو جلا دیں۔ پیان کے غصے سے تو وہ خوب واقف تھا۔ اس کی بات پر شاید انہیں خاص یقین نہ آتا پر ایک دو اور ملنے والوں نے بھی ایسا ہی قیافہ لگایا۔ وہ ریل کی پٹڑی کے پاس سے گزر رہے تھے جب گرد میں اٹے سبز جھلملاتے آنچل پر نگاہ گئی۔ وہ چونکے جھاڑ کر اٹھا لیا۔ وہ یہ خود خرید کر لائے تھے کیسے بھول سکتے تھے۔ انہوں نے متلاشی نگاہ چہار جانب دوڑائی۔ پھر ایک ہی خیال آیا تھا۔ "ممکن ہے ریل پر چڑھ گئے ہوں' آنچل چمک دمک کی وجہ سے پیان نے پھنکوا دیا ہو۔" کیونکہ اس قسم کے واقعات سننے میں آ رہے تھے ملا شبیر اپنی بیوی' بیٹی اور کئی دوسرے افراد کے ساتھ پاکستان کے لیے روانہ ہونے کو وہاں سے ریڑھوں پر گزر رہا تھا صلاح الدین بھی اس میں شامل ہو گئے۔ فتنہ پرست گوروں نے پاکستان کو وہ علاقے دیے تھے جن کے اکثر راستوں میں ٹھاکروں' راٹھوروں کے گاؤں پڑتے تھے۔ وہ پتھر دل تقریباً" ہر قافلے پر ٹوٹ پڑتے۔ اس قافلے پر بھی دھاوا بول دیا کئی افراد قتل کرنے کے بعد ایک بدبخت کی نگاہ ملا شبیر کی لڑکی پر پڑی وہ اس کا بازو کھینچنے لگا صلاح الدین سامنے آ گئے۔ اس ظالم نے ان کے پیٹ میں اپنا کرپا گھونپ دیا اور پیچھے سے کوئی خنجر اس لڑکی کے بھی آ لگا وہ تڑپتے صلاح الدین کے بازو پر جا گری۔
بڑی غمگین' لہو رنگین ہے اک داستان
ہمارے آباء نے رکھا تھا' جس کا نام پاکستان
کل ساٹھ افراد کا قافلہ تھا جن میں سے گنتی کے چند لوگ بھاگ کر اپنی جان بچا پائے۔ انہوں نے ہی آ کر صلاح الدین اور اس کے بازو پر پڑی لڑکی کا بتایا تھا۔
"نہیں' نہیں چاچا' وہ مبرا نہیں ہو گی۔ مبرا کیسے مر سکتی ہے۔" اس کا دل اس خبر پر یقین کرنے پر آمادہ نہ تھا۔ اسے کیا خبر اس کی محبت چیختی چلاتی اسے پکارتی شعلوں کی نذر ہو گئی تھی۔

وہ چلا چلا کر ایک ہی بات کر رہا تھا "نہیں تجھے غلط فہمی ہوئی ہوگی۔"

"کیوں باؤلا ہوا ہے' تیرے باپ کے بازو پر بھلا اور کون ہو سکتی ہے۔ صبر کر بیان الدین صبر۔"

صبر اس سے سانس لینا دشوار تھا اس کا بس نہیں چلتا تھا ابھی راج نگر جائے اور کونہ کونہ چھان مارے کہیں سے بھی مبرا کو نکال لائے۔ لیکن ثریا نے رو رو کر برا حال کر لیا تھا۔ اسے خدا کے' اپنی بیوگی کے واسطے دیتیں۔ اور دو سال یہی واسطے دے دے کر آخر اس کا نکاح زہرہ سے کروا دیا۔ ان کا خیال تھا شادی ہوگی' بچے ہوں گے تو بھول پڑ جائے گی۔ یہاں تو اسے کیا بھولتا خود ان کے لیے مبرا کو بھلانا مشکل ہو گیا۔ سال بعد ہی اللہ تعالیٰ نے مبرا کی ہم شکل ام ہانی عطا کر دی۔ جیسے جیسے وہ بڑی ہوتی گئی' ہو بہو مبرا جیسی بنتی گئی۔ اسی طرح شرماتے گال لال کر لینا۔ پلکیں جھپکنا' مسکراتے رہنا۔ یہاں تک کہ بائیں گال پر ہنستے ہوئے مبرا کی طرح گڑھا پڑتا۔ ثریا اسے اپنے ساتھ لپٹا لپٹا تیں اور ساری رات اسے یاد کر کے آنسو بہتے رہتے۔ بہت سے پچھتاوے گھیر لیتے آخر ان ہی پچھتاوؤں میں انہوں نے آخری ہچکی بھی لے لی۔ اور پر سکون ہو گئیں۔

✡ ✡ ✡

پاکستان کی سیاسی قیادت کو دشمن جمنے نہ دیتے تھے کوئی نہ کوئی مسئلہ اٹھتا رہتا' اس کمزوری کو بھانپتے ہوئے فوج نے ملک پر اپنی گرفت مضبوط کر دی۔ سرپرستی سے محروم زمین پر دشمن نے رات کے سیاہ سناٹے میں اپنا وار کیا۔ قوم متحد تھی۔ ابھی کسی کے بھی زخم پوری طرح نہیں سلے تھے۔ مرد باڈروں پر جانے کے لیے تیار تھے اور خواتین گھروں میں باقاعدہ قرآن خوانی کی محفل رکھ لیتیں' اپنی فوج' اپنے ملک کی سلامتی کے لیے جذبے سے دعا مانگی جاتی۔ مسجدوں میں نوافل ادا کیے جاتے۔

عثمان سفید ریشم سے کڑھا کرتا پہنے اپنے بکرے سے کھیل رہا تھا۔ سائیں کی نگاہ کڑھائی پر جمی تھی۔ زہرہ سے استفسار پر پتا چلا یہ بھی بی بی نے بتایا ہے ہمیشہ کی طرح غیر ارادی سرد نگاہ دور اس کی پشت پر گئی اور پلٹ آئی۔ ام ہانی بی بی سے اپنی چٹیا گندھوا کر غسل خانے کی جانب وضو کرنے کے لیے بڑھی تھی۔ عثمان کو لاپروائی سے کھیلتے دیکھ کر زور سے چلائی تھی۔

"تو نے اذان نہیں سنی' جا۔ جا کے نماز پڑھ' حاجت کے نفل بھی پڑھ کر آ۔"

"پڑھ لوں گا' ابھی بڑا وقت ہے۔" وہ کہہ کر بکرے کے منہ میں گھاس ٹھونسنے لگا' اس نے بھائی کے ہاتھ سے گھاس کا دستہ کھینچ لیا۔

"بھول گیا کل بی بی نے کیا کہا تھا' یہ وقت نہیں ہوتا مہلت ہوتی ہے کہ مجبوری کی وجہ سے اگر دیر ہو گئی تو بندہ ٹھہر کر ادا کر دے' تجھے کیا مجبوری ہے' اسے زبردستی گھاس ٹھونسنے کی۔"

اس کے لفظ اور انداز نے سائیں کو متحیر کر دیا۔ جملے مناظر سمیت آنکھوں میں ناچنے لگے۔ شکن آلود پیشانی سے قطرے صاف کرتے ہوئے اونچی آواز میں ام ہانی کو پاس بلایا بمشکل رکی سانس بحال کی اور دھیرے سے کہا۔

"تو اپنی بی بی سے پوچھ' وہ کس علاقے سے آئی ہے' آخر بتاتی کیوں نہیں۔" پھر قدرے توقف سے بہت مدھم سا بولا۔

"اچھا چل رہنے ہی دے۔" بیٹی کے کندھے پر ہاتھ رکھ اٹھا اور بیرونی دروازے کی سمت بڑھا عثمان فیضان کو بھی اپنے ساتھ نماز کے لیے لے گیا تھا۔

✡ ✡ ✡

ریڈیو پر خبروں کے ساتھ جوشیلے ترانے لگتے۔ اور ساتھ ساتھ فوجی امداد و سامان کے لیے دعاؤں کی درخواست نشر ہوتی' وہاں چندے کی اپیل بھی شامل تھی۔ مسجدوں' اداروں' اسکول اور گھروں میں بھی سب نے چندہ مہم شروع کی تھی۔ ام ہانی نے رات زہرہ کو میڈم کی ساری تقریر سنائی جو چندہ جمع کرنے کے

لیے تھی۔ زہرہ کے پاس چند روپے تھے۔ صندوق سے نکالے دے دیے۔ بی بی نے سنا بے دم ہو کر لیٹ گئی۔ بی بی ساری رات جاگتی رہی گرم قطرے سکڑی جلد کو بھگوتے رہے "اگر پیسے کی کمی سے جنگ ہار گئے' تو کیا ہوگا۔ بغیر جنگ کے پہلے اتنا قتل وغارت ہوا تھا' اپنے بچھڑ گئے' اور اب جنگ ہار جانے پر تو شاید کوئی بچے گا ہی نہیں۔۔۔ آہ! میرے پاس تو کچھ بھی نہیں جو چندے کے لیے دوں۔"

وہ روتی جاتی اور فوج کی سلامتی کے لیے دعائیں مانگتی جاتی۔ آنسو پونچھتے ہوئے اس کا ہاتھ اپنی ناک سے ٹکرایا۔ وہ فوراً" اٹھ بیٹھی اور لمحے میں فیصلہ کیا۔ اس نے اپنا کوکا اتارا دوپٹے کے پلو پر باندھا' ناک ننگی ہونے کے خدشے پر کر ہن چارپائی کی بان کا تنکا توڑ کر پرد لیا۔ زہرہ ہمسایوں کے ہاں قرآن خانی پر گئی تھی۔ جنگ آخری مراحل میں تھی دعاؤں پر زور تھا۔ دونوں لڑکے بھی ساتھ لے گئی تھی۔ ام ہانی اور بی بی گھر پر تھے اس نے دوپٹے کا پلو کھول کر ام ہانی کے ہاتھ پر کوکا رکھا۔

"یہ میڈم کو چندے کے لیے دے آ۔" وہ کچھ دیر حیرت سے دیکھتی رہی پھر پوچھا۔

"کتنے کا ہوگا بی بی۔"

"پتا نہیں' لیکن بہت قیمتی ہے۔" اب وہ بچی کو اس کی قیمت کیا سمجھاتی۔ یہ واحد نشانی تھی لیکن ایسی نشانی کا کیا کرنا جب نشانی دینے والوں کی جانیں ہی خطرے میں ہوں۔ میڈم کا گھر چند گلیاں چھوڑ کر تھا۔ وہ دوپٹا پھیلاتی باہر نکل گئی۔ گلی کے نکڑ پر ہی سائیں دفتر سے آتے ہوئے مل گیا۔ بھنوئیں اچکا کر پوچھا۔

"کہاں جارہی ہے؟" اس نے مٹھی کھول کر باپ کے سامنے کردی۔

"بی بی نے دیا ہے' چندے کے لیے۔" اسے لگا تھا دل کئی دھڑکنیں بھول کر پھر سے دھڑکا تھا' آنکھیں پتھرائی' قدم ایسے جم گئے جیسے میخیں گڑ گئی ہوں وہ سات سیاہ نگوں کا سونے سے بنا بڑا سا لونگ تھا۔ بہت چاہت سے نکاح کے تحفے کے طور پر ڈھونڈ کر لایا تھا۔ مبرا کو تو اس کا لایا کانٹا بھی دل جان سے قبول تھا لیکن لونگ ثریا کو بہت پسند آیا۔ اور اس کی ناک میں ڈال دیا۔ چند دن میں ہی اس کا درمیانی بڑا نگ نکل کر کہیں گر گیا تھا۔ کوکا برا لگنے لگا۔ مبرا نے اتار کر سنبھال لیا۔ ثریا نے ڈپٹا تھا۔

"بھری ناک سہاگن کی علامت ہوتی ہے۔ ڈال لے۔"

"لیکن تائی وہ برا لگ رہا ہے' جیسے کانا ہو۔" ثریا پہلے اس کی بات پر ہنسی پھر اس سے لے کر اسی وقت ہمسائے میں رہنے والے نجو سنار کے ہاں گئیں۔ اس وقت اس کے پاس سیاہ نگ نہیں تھا۔ ثریا نے کہا۔

"پاجی کوئی بھی لگادو۔" ایک زرد موٹا سا موتی تھا اس نے وہ دکھا کر اچھی طرح گاڑھ دیا۔ جب پیان نے دیکھا اسے بہت غصہ آیا۔

"اماں یہ کیا تو نے دو رنگی بھدا کروادیا۔ مجھے اتروا کر دینا میں ٹھیک کروالاؤں گا۔" جس طرح اور بہت سے کام آج کل پر ٹلتے رہے اس کوکے میں بھی زرد موتی ٹنکا رہ گیا۔ ام ہانی کی ہتھیلی سے کوکا اٹھایا۔ اپنی پوروں میں گھمایا گم صم تھا۔ پھر اسے کہا۔

"تو جا' یہ میں دے آؤں گا۔"

بچی اثبات میں سرخم کرتی سامنے اپنی سہیلی کے چلی گئی۔ وہ نل پر کھڑی وضو کررہی تھی۔ اسے داخل ہوتا دیکھ کر فوراً" چادر کھینچ کر آگے کی۔ اور پلو سے بایاں رخسار چھپالیا۔ شاید اسی لیے آج تک کوکے پر نگاہ نہ جاسکی تھی وہ تیزی سے بڑھا اور اس کی پشت پر کھڑا ہوا۔

"کون ہو تم۔؟" بی بی نے سر جھکاتے اپنا رخ مزید موڑلیا۔

"میں نے تم سے پوچھا ہے' کون ہو تم' اور یہ کہاں سے ملا' کس نے تمہیں دیا تھا۔" اس کا لہجہ خاصا کرخت تھا۔ تین سالوں کے کسی ایک پل میں بھی اسے یہ گمان نہیں گزرا تھا اگر کبھی اس کی آواز سنی تو وہ ساکت بھی ہو سکتا ہے۔ کئی بار اس کے کاموں' باتوں پر ٹھٹکا' اس کا گمان تھا شاید یہ راج نگر سے ہو۔ اماں نے بہت سی لڑکیوں کو قرآن پاک پڑھا رکھا تھا۔ سلائی

کڑھائی، کھانا پکانا سکھایا تھا ہو سکتا ہے کبھی آتی ہو اور ہو سکتا ہے اس سے مبرا کے بارے میں کچھ پتا چل جائے مگر وہ چپ رہتی تھی۔ بغور اس کا چہرہ دیکھنا معیوب حرکت تھی۔ لیکن آج اس کی آواز۔

"اب ان باتوں کا کوئی فائدہ نہیں سائیں، میرا وقت گزر گیا۔" اس کے گرد دھماکوں کا ایسا شور تھا جتنا کہ سرحدوں پر نہ تھا۔ درودیوار چہار اطراف گھومتے محسوس ہوئے، زمین پیروں تلے کھسکتی جا رہی تھی۔ اسے اپنے گنگ ہونے کا گمان گزرا۔ وہ اسے گم صم دیکھ کر نل سے ہٹی اور جانے لگی اس نے بہت ہمت سے اس کا پلو دبوچا اور پلو بائیں رخسار سے سرکتا چلا گیا۔ زمین شدت سے کانپی تھی آسمان گرنے کو تھا۔ شاید بھاگتے دشمن نے کہیں قریب ہی بم پھینکا تھا۔

"تت۔۔۔ تو۔۔۔!!!" ہری چرن بدبودار دھوئیں کے مرغولوں میں چیزیں دیکھ رہا تھا۔ اس کا ہاتھ ایک ٹھنڈے وجود پر پڑا۔ پوری قوت سے اسے سیدھا کیا۔ وہ بہت بہت دیر بعد سانس لے رہی تھی۔ آدھے سے زیادہ چہرہ جل چکا تھا۔ ہاتھ پاؤں بری طرح جھلس گئے تھے۔ اس نے باہر آکر لوگوں کو معمولی نقصان کا بتایا۔ لوگ آگے پیچھے ہو گئے۔ پھر اس نے اسے سیدھا کر لٹایا۔

"یہ تو ضیاء الدین کی لڑکی ہے۔ یہاں کیا کر رہی تھی۔" اسے پہان اور صلاح الدین سے بہت خوف آیا، مبادا وہ اس کی سازش سمجھ کر اسے یا اس کے بچوں کو نہ جلا دیں۔ جیسے ہی صلاح الدین ملے، پہلے انہیں وہاں سے چلتا کیا۔ پھر فوراً" اپنے قریبی دوست تارا ناتھ حکیم کے پاس گیا۔ اس نے آکر اس کا معائنہ کیا۔ دوائیں لگائی تھیں تیسرے دن اسے تھوڑا تھوڑا ہوش آیا تھا۔ وہ اسے بڑی مشکل سے سہارا دے کر اپنے مطب تک لے گیا۔ اور علاج شروع کیا۔ ہری چرن تقریباً" ہر شام کو اس کا پوچھنے آتا۔ دو ماہ میں اس کے ہاتھ پاؤں کے زخم قدرے بہتر ہوئے تھے۔ البتہ چہرے کے ایک جانب چادر کے شیشے گڑھ جانے سے زخم بہت گہرے تھے۔ مندمل ہونے میں خاصا وقت لگا تھا۔ اس نے ہری چرن کو اپنے وہاں موجود ہونے اور سہتی ارجیت کا سارا قصہ سنایا تھا۔

"اوہ۔۔۔ وہ بدبخت تو پاگل ہو گئی ہے۔"

"کیا۔" اس کی آنکھیں تحیر سے پھیلیں۔ "سہتی پاگل ہو گئی ہے؟"

"ہاں پتر۔۔۔ امرت کو جانے اس رات کس نے قتل کر دیا، بھائی کے غم میں وہ پاگل ہو گئی اور اپنا سر ریل کی پٹڑی پر بیٹھی پھوڑتی رہتی ہے، ارجیت نے منگنی بھی توڑ دی، سہتی کی ماں اسے زنجیر ڈال کے رکھنے لگی ہے۔" مبرا اس کی پوتی کی عمر کی تھی اس کی تکلیف دہ حالت پر اسے اور اس کی بیوی کو بہت ترس آتا۔ ہری چرن کے بدلنے کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ کچھ مہینے پہلے اس کے اکلوتے نواسے کو بچھو نے ڈس لیا اور موقع پر مر گیا۔ اس وقت اسے مولوی نظام کی موت بری طرح یاد آئی تھی۔ مندر میں جا کر بھگوان سے رو پیٹ کر معافی مانگی۔ اب دل خاصا نرم ہو گیا تھا۔ وہ کچھ دن بعد اسے تارا ناتھ کے مطلب سے اپنے گھر لے گیا تھا وہ بار بار پاکستان جانے کی ضد کرتی۔ روتی، پوٹوں کے زخم نرم ہو کر پھیلتے جاتے۔ ہری چرن کی بیوی اور بیٹی اسے تسلی دیتے تھے۔

"جب حالات اور تو ٹھیک ہو جائے گی، خود تجھے چھوڑ آئیں گے۔" تقریباً" دو ڈھائی سال بعد اس نے کچھ لوگوں کے ہمراہ اسے بھی بھیج دیا تھا۔ پاکستان آکر وہ ان لوگوں کے ساتھ رہنے لگی۔ اپنوں کا کہیں کوئی پتا نہ چلتا تھا۔ اکثر لوگ اس کے چہرے ہاتھ پاؤں سے کراہت کھاتے لیکن عورت عورت سے بھلے جل کر بدشکل ہو جائے، نسوانیت تو رہتی ہے اور شیطان نسوانیت پر مرتا ہے۔ ایک رات اسی گھر کا مرد اسے قابو کرنے لگا تھا۔ لیکن وہ بچ کر ایسی بھاگی آگے پیچھے نہیں دیکھا اسے دوسری بار اللہ نے شیطان سے بچایا تھا۔

مختاراں کے گھر میں نل نہیں تھا۔ وہ آدھی رات کو ہمسائیوں کے گھر سے ڈول بھرے اپنے گھر آ رہی تھی جب ایک بدصورت لڑکی آکر ٹکرائی۔ سارا پانی گر گیا۔

وہ لڑکی حال سے بے حال تھی۔ چادر تک غائب تھی۔ زہرہ کی جدائی نے مختاراں کا دل زخمی کر رکھا تھا فوراً اس لڑکی کو سہارا دیا۔ مختاراں اور اس کے بہو بیٹے بہت خدا ترس نکلے کہ اس بی بی کو بارہ سال سے زیادہ ساتھ رکھا۔ اسے چپ لگ گئی تھی۔ اپنے بارے میں اس خوف سے نہیں بتاتی تھی کہیں اپنے پہچاننے سے انکار نہ کر دیں۔ پیان کے گھر وہ بالکل قدرتی پہنچی تھی لیکن بکرے کی جلد پر باپ بیٹے کی بحث نے ہر خواہش، آرزو کا گلا دبا دیا۔ اسے خوف آیا کہیں وہ اس کے کراہیت زدہ چہرے سے نفرت نہ کرے، اس کی نفرت جیتے جی مار دے گی۔ بہتر ہے اجنبی بن کر اسے دیکھتی رہوں۔ آج وہی اجنبی اس کے دونوں شانے پکڑے بے طرح جھنجوڑ کر اس کی ساری داستان سن رہا تھا۔ اس کا جی چاہا ارجیت کے ٹکڑے ٹکڑے کر دے، بچپن کے بعد آج پہلی بار ہری چرن اچھا لگا تھا۔ اسے مبرا پر بھی غصہ تھا اتنے برس اجنبی بن کر رہی۔

"تو اتنی کٹھور نکلی، تین برسوں میں مجھ پر ایک بار ترس نہیں آیا۔"

"اور اگر تو اس ڈب کھڑبی جلد سے گھن کھاتا۔ پھر؟ تجھے چتکبرا میمنا گھر میں پسند نہیں، میں کہاں سے۔" اس کی رندھی آواز پر اس نے بے اختیار پوری قوت سے اسے خود میں بھینچ لیا۔

"میں نے تو بہت پہلے کہا تھا، تو میرا ہے، کوئی ڈنگر نہیں، بھول گئی آخری بار کیا کہا تھا، کبھی تنہا نہیں چھوڑوں گا، بس تو بے اعتبار نہ ہونا، تجھے اپنے پیان پر اعتبار نہیں تھا۔"

اس نے نرمی سے اسے خود سے الگ کیا اور چہرہ ہاتھوں میں لیے آنکھوں میں دیکھ رہا تھا۔ "تجھے کس نے کہا مجھے تیرے رنگ روپ سے محبت تھی۔" دونوں کی آنکھوں سے بے اختیار بہت سا پانی چھلکا۔

"مجھے تجھ سے محبت تھی، محبت ہے یہ دل تیرا نام لے لے کر خاموشی سے دھڑکتا ہے۔"

"لیکن پیان! تیری بیوی، بچے ہیں، اگر اسے پتا چل گیا میرا یہ ٹھکانا بھی چھن جائے گا۔"

"پاگل۔" اس نے مسکرا کر کہا "زہرہ کو سب پتا ہے، دوسرے یہ صرف اس کا گھر نہیں ہے، تیرے پیان کا بھی ہے۔ اور ٹھکانہ تو اس نے تیرا لیا ہے۔" ہاں میرے بچے اور وہ میرے بچوں کی ماں ہے، میں اس کی بے حد عزت کرتا ہوں، وہ میرے سر آنکھوں پر رہتے ہیں لیکن اس دل میں صرف میری مبرا رہتی ہے، تو نے خالی کیا ہی نہیں کہ کوئی اور بسیرا کرتا، زہرہ بہت اچھی ہے، مجھے یقین ہے وہ تجھے کچھ نہیں کہے گی، وہ تو تیرے ملنے کی خود دعائیں کرتی تھی۔"

یہ تو زہرہ کا دل جانتا تھا کہ وہ کیا دعائیں کرتی تھی۔ جب جب سائیں بے قرار ہو کر رو پڑتا تو وہ بے چین ہو جاتی اور پوری شدت سے دل ہی دل میں کہتی۔

"اللہ! مبرا اس بندے کو کبھی نہ ملے، دل میں نہ سہی مگر میں اس کی آنکھوں میں تو رہتی ہوں، اگر وہ مل گئی پھر تو آنکھوں سے بھی نکل جاؤں گی۔"

اس وقت وہ دروازے کا پٹ کھولے خاصے فاصلے سے سب دیکھ اور سن رہی تھی، ٹانگیں بالکل بے جان ہو گئی تھیں، دل کی دھڑکن بہت سست تھی۔ کاش! پھوپھی مختاراں کبھی بھی نہ ملتی "اس کے دل نے چٹکی بھری پھر بہت ہمت مجتمع کر کے وہ معمول کی طرح آہستہ آہستہ اندر آئی۔

"پاکستان نے تو جنگ جیت ہی لینی ہے لیکن میں تجھ میں رہ کر بھی تیرا دل نہ جیت سکی سائیں۔" اس نے ایک زبردستی مسکراتی نگاہ دونوں پر ڈالی اور اندر اپنے کمرے کی جانب بڑھ گئی۔

بنت سحر

کنزاں کے نام

السلام علیکم!

سب سے پہلے تو معذرت کہ اتنے عرصے بعد خط لکھ رہی ہوں۔۔۔ مگر کیا کروں، بڑی مشکل میں تھی۔ مگر پھر ہوا وہی جو آخر میں ہوتا ہے۔ ہوتا آیا ہے۔

مشکلیں اتنی پڑیں کہ آسان ہو گئیں۔

میرا بھی یہی حال ہوا۔۔۔ اور خوب ہوا۔۔۔ یوں لگا جیسے رات، دن کا چین سکون "گروی" رکھ دیا گیا ہو۔

مجھے تمہاری بڑی یاد آئی کنزاں۔۔۔ ساری ساری رات ہاسٹل کی کھڑکی میں بیٹھی سود و زیاں کا حساب کتاب رکھنا آسان تو نہیں ہوتا۔ میرے لیے بھی آسان نہیں تھا۔

پتا ہے یہ جو ہم گاؤں کے سادہ لوح انسان ہوتے ہیں نا، شہر آکر اپنی "اوقات" ہی بھول جاتے ہیں۔ (معذرت کے ساتھ اوقات کا لفظ استعمال کرنا پڑا، مگر تم سب سمجھتی ہوں نا۔) میں بھی اوقات بھول گئی کنزاں۔ بڑی مشکل سے اپنا آپ سنبھال پائی ہوں، یہاں تم جو نہیں ہو۔ (آنسوؤں کے نشان دیکھ کر اب تم بھی رونے نہ بیٹھ جانا، تمہاری پرانی عادت ہے۔)

میں بڑی "ناقدری" ہوں، جب وہاں تھی تو کسی چیز کی قدر نہ تھی، مگر اب گاؤں کی ہوا تک ۔۔۔ یاد آتی ہے اور وہ سکھ چین کے پیڑ کا جھولا تو بھولتا ہی نہیں۔۔۔ میں ایک ماہ بعد اپنے فائنل امتحان دے کر آؤں گی تو اسی جھولے پر بیٹھ کر اپنے کھاتے کھولیں گے۔

تمہیں بڑا اشتیاق ہوتا تھا نا بریکنگ نیوز کا۔۔۔ تو سنو۔۔۔ مجھے "محبت" ہو گئی تھی۔

میں اچھی طرح جانتی ہوں لفظ "محبت" نے تمہیں سو واٹ کا جھٹکا دیا ہو گا اور لفظ "تھی" نے تو تمہاری جان ہی نکال دی ہو گی۔ جان تو میری بھی نکلی، دل تو میرا ابھی میرے بس میں نہ رہا۔

اس سارے فساد کی جڑ "ریاض علی" ہے۔ انگلش ڈیپارٹمنٹ کا ڈیشنگ سی آر۔۔۔ پوری یونی ورسٹی کی لڑکیاں اسے دیکھ کر آہیں بھرتی ہیں۔۔۔ اور "وہ" مجھے دیکھ کر آہیں بھرتا تھا۔۔۔ کہتا تھا۔

"سلمیٰ! تمہیں دیکھ کر میرا دل سو برس جینے کو کرتا ہے۔" اور میں بڑا ہنستی تھی اس بات پر، مگر آج سوچتی ہوں تو روتی ہی ہوں۔ وقت، وقت کی بات جو ہوئی۔

پہلی بار وہ مجھے انگلش ڈیپارٹمنٹ کی اندھیری گیلری میں ملا تھا۔ گھپ اندھیرے میں وہ مجھ سے ٹکرایا تھا اور میری ساری کتابیں زمین بوس ہو گئی تھیں۔

"دیکھ کر نہیں چل سکتے۔ خواہ مخواہ شوخے بنے مست بیل کی طرح دندناتے پھر رہے ہو۔۔۔ کوئی میز ہوتے ہیں، ایٹی کیٹس ہوتے ہیں، مگر نا جی۔۔۔ لڑکیاں دیکھ کر شو ضرور مارنی ہوتی ہے۔" کتابیں اٹھا کر میں اندھیری گیلری میں آگے بڑھ رہی تھی۔ جب پیچھے سے اس کی آواز آئی تھی۔

"آپ کی آنکھیں بہت خوب صورت ہیں، اندھیرے میں بھی چمکتی ہیں۔" میں ٹھٹکی تھی، بہت چاہا آگے بڑھوں، مگر زمین میں گڑی رہ گئی۔ کسی پتلے کی مانند جس کے سینے میں سوئی چبھو کر زمین میں گاڑ دیا گیا ہو۔ وہ پلٹ گیا تھا۔ اس دن آسمان پر بادل تھے۔ گھرے۔۔۔ کالے گویا آدھی رات تھی۔۔۔

"لڑکیوں کو کبھی بھی غیر مرد سے تعریف کی "چاہ" نہیں رکھنی چاہیے۔" کیونکہ پھر یہی ہماری بڑی کمزوری بن جاتی ہے۔ جیسے میری بن گئی۔۔۔ اس دن میں نے آئینے میں اپنی آنکھوں کو بیس سے زائد مرتبہ تو دیکھا ہی ہو گا۔

اور اپنی روم میٹ سے پوچھا تھا۔ ”نائلہ... میری آنکھیں کیسی ہیں؟“ دکالی ہیں... ”ارے یہ بتاؤ... کیا خاص بات ہے ان میں؟“ میں نے اشتیاق سے جاننا چاہا تھا۔

”ایسا خاص تو کچھ نہیں، ویسی ہی ہیں جیسی سب کی ہوتی ہیں... عام انسانوں جیسی...“ اور مجھے نائلہ کا جواب پسند نہیں آیا تھا، جانے کیوں... میں اپنی روم میٹ پر بھروسا نہیں کرپارہی تھی، جسے میں جانتی تھی اور میں اس شخص پر یقین کر بیٹھی تھی جو میرے لیے

مکمل اجنبی تھا۔ صرف ایک پہر کا عام سا تعلق۔ ایسا کیوں ہوتا ہے؟ ایسا کیوں ہوتا آرہا ہے؟

دوسری بار مجھے وہ کیفے میں بیٹھا نظر آیا تھا اور وہ ہنس ہنس کر کسی سے باتیں کر رہا تھا۔ میں اور نائلہ جب برگر اور بوتل کھا پی کر کاؤنٹر پر پہنچے تو پتا چلا کوئی ہمارا بل ادا کرچکا تھا۔ مجھے خاصی حیرت ہوئی تھی۔ میرے حلقے میں ایسا کوئی "سخی" نہیں تھا۔ پوچھنے پر پتا چلا تھا کہ ریاض علی نے بل ادا کیا تھا۔ نائلہ کو وہیں چھوڑ کر میں اس تک آئی تھی۔

"آپ نے ہمارا بل پے کیا۔۔۔ کیوں؟ میں آپ کو نہیں جانتی اور آپ مجھے نہیں جانتے۔۔۔ پھر۔۔۔ آپ نے ایسا کیوں کیا؟" میں نے اس سے سخت لہجے میں جواب مانگا تھا اور اس کا جواب میرے اوسان خطا کر گیا تھا۔

"آپ کی آنکھیں ہی نہیں آپ کی تو آواز بھی بہت مترنم ہے، آپ اگلے کو "چپ" کرا دیتی ہیں۔"

اور میں پلٹ آئی تھی۔۔۔ ہمارے درمیان وہ پہر آن موجود ہوا تھا اور مجھے پتھر نہیں ہونا تھا کنیزاں۔۔۔ کبھی نہیں۔۔۔ یہاں شہر کی دھوپ بھی پرائی لگتی ہے تو لوگ کیسے اپنے ہوتے۔۔۔ مگر میں سمجھ ہی تو نہ سکی اور کنیزاں! یہ جو ہم لڑکیاں ہوتی ہیں نا، ہمیں سب خبر ہونی چاہیے۔۔۔ سب پتا ہونا چاہیے۔

اور پھر ایک دن مجھے ایک کتاب موصول ہوئی۔۔۔ وہ وصی شاہ کی "مجھے صندل کردو" تھی۔ اس کے ساتھ ایک رقعہ بھی تھا، جو کسی قیمتی خوشبو میں بھیگا ہوا تھا۔ میں منٹوں اسے تھامے اس کی خوشبو کے سحر میں گرفتار بیٹھی رہی۔ نائلہ سو رہی تھی۔ وال کلاک کی ٹک ٹک کا شور تھا۔ یا پھر ہاسٹل کی کھڑکی کے پار سے آتی ہوا کی آوازیں۔۔۔ میں نے دھیرے سے رقعہ کھولا تھا، لکھا تھا۔۔۔

"پیاری سنو وائٹ۔۔۔" میں نے سنو وائٹ کو نہیں دیکھا، مگر تمہیں دیکھا ہے اور مجھے یقین ہے سنو وائٹ تم سے زیادہ خوب صورت نہیں ہوگی۔ اسی لیے تمہیں سنو وائٹ کہہ کر مخاطب کر رہا ہوں۔ جب سے میں نے تمہیں دیکھا ہے، یوں لگتا ہے دل کا خانہ خالی سا ہو گیا ہو۔۔۔ ایسا کیوں ہے۔۔۔ بہت ڈھونڈا اس سوال کا جواب، مگر نامراد ٹھہرا۔۔۔ اور پھر مجھے لگا مجھے تم سے پوچھنا چاہیے۔۔۔ خیر۔۔۔ میں نے ایک اندازہ ضرور لگایا ہے، وہ یہ کہ شاید میری ڈکشنری میں اس کیفیت کو "محبت" کہتے ہیں۔۔۔ تم کیا کہتی ہو؟"

"تمہارا اسنو مین۔"

رقعہ پڑھ کر مجھے لگا تھا جیسے زیرو واٹ کے بلب کی ملگجی روشنی والے کمرے میں "تمہارا اسنو مین" ڈھیروں جگنو چمکنے لگے ہوں۔

میں پھر کہتی ہوں کنیزاں۔۔۔ لڑکیوں کو جھوٹی تعریفوں، جھوٹے لفظوں کی چاہ نہیں رکھنی چاہیے ورنہ بڑا نقصان ہوتا ہے۔۔۔ باقی کچھ نہیں رہتا۔

میں نے اس کے رقعے کا کوئی جواب نہ دیا۔ خاموشی اختیار کرلی تھی۔ کیا کہتی؟ کیا جواب دیتی؟ سوال بھی مشکل تھا اور جواب بھی۔۔۔ اور جب دونوں اتنے مشکل ہوں تو خاموشی ہی بہتر ہے۔

وہ اتوار سے اگلا دن تھا جب ہم انگلش ڈپارٹمنٹ میں گئے تھے اور لان میں نمک مرچ لگا کر کینوں کھائے جارہے تھے۔ میں ٹہلتی ہوئی لطف اندوز ہو رہی تھی، جب وہ میرے ہم قدم ہوا۔ میں رک گئی تھی۔

"میں نے سچ کہا تھا نا؟" اس کے وجیہہ چہرے پر پھیلے یقین کو دیکھ کر مجھے خوف آیا تھا۔

"میں کچھ نہیں جانتی۔۔۔ کیوں میرے پیچھے پڑ گئے ہو؟" میرا لہجہ یہ کہتے ہوئے کپکپایا تھا۔ مجھے آج بھی یاد ہے۔

"محبت ہوگئی ہو تو پیچھے پڑنا اشد ضروری ہوتا ہے۔" وہ مسکرایا تھا۔

"لوگ دیکھ رہے ہیں۔" میں ہراساں تھی اور وہ آرام سے کھڑا تھا۔ مجھے ٹکٹکی باندھے دیکھتا ہوا۔

"پھر مجھ سے ملو۔ شام کو کہیں۔" وہ مصر تھا۔۔۔ اور میں

ہار گئی۔۔۔ میں نے اس کی بات مان لی تھی۔ مجھے ارد گرد کی نظروں سے خوف آیا تھا۔۔۔ اور یہ میری پہلی غلطی تھی کنیزاں۔۔۔ اور لڑکیوں کے پاس تو پہلی اور آخری غلطی کا "آپشن" ہی نہیں ہونا چاہیے۔۔۔ ورنہ۔۔۔ نہ دل رہتا ہے اور نہ ہی عزت۔۔۔ میں نے بھی "دل" ہار دیا۔۔۔ صد شکر کہ "عزت" بچالی اور ہم شام کو ملے تھے۔ گولڈن زون کیفے میں کی گئی باتوں کی بازگشت آج بھی میں نہیں بھولی۔ کوشش تو بہت کی' مگر ہر کوشش' ہر بار رائیگاں ٹھہری۔

وہ جادوگر تھا یا پھر کوئی لفظوں کا شعبدہ باز۔۔۔ اور پھر میں "میں" نہ رہی۔ "وہ" ہوگئی۔۔۔ اور وہ میرے وجود پر مسلط ہوگیا۔۔۔ اور پھر مجھے بھی لگا کہ شاید میری ڈکشنری میں بھی یہ کیفیت "محبت" ہی ہے۔

زمین پر چاند اترے۔۔۔ خوشبوئیں مہکیں۔۔۔ محبتوں میں یہی تو ہوتا ہے' میرے ساتھ بھی ہوا۔۔۔ اور بہت برا ہوا۔۔۔

"تمہاری پلکوں پر تارے ٹانک دوں؟"

"ٹانک دو۔" میں ہنستی۔

"تم ہنستی ہو تو لگتا ہے ساز بج رہے ہوں۔۔۔ اور میں بے بس ہوجاتا ہوں۔۔۔ مدہوشی سی طاری ہوجاتی ہے۔"

"اچھا۔۔۔ جی۔۔۔ اتنی محبت کرتے ہو؟"

"جان سے بھی زیادہ۔" وہ کہتا اور میں جیسے ہوا کی رتھ پر سوار ہوجاتی تھی۔

پھر وہ اور میں لائبریری میں بیٹھے رومانوی ناول پڑھتے ہوئے چپکے سے ایک دوسرے کو دیکھ کر آہستہ آواز میں باتیں کرتے۔۔۔ خنک شاموں میں روشنیوں سے جگمگاتے آئس کریم پارلرز میں ہم آئس کریم کھاتے۔۔۔ دھند بھری دوپہروں میں یونی کے واکنگ ٹریکس پر ہم نے بہت چہل قدمی کی ہے اور جیسے میں غافل ہوگئی۔۔۔ رشتوں سے۔۔۔ پڑھائی سے۔۔۔

کیا محبت ایسی ہوتی ہے؟ غفلت جیسی موذی کیفیت میں باندھ کر رکھ دینے والی۔۔۔

لڑکیوں کو غافل نہیں ہونا چاہیے۔۔۔ میں غافل بھی ہوئی اور میں نے اعتبار بھی کیا۔

ہک ہاہ۔۔۔ اعتبار۔۔۔ اعتبار کا کیا بتاؤں کنیزاں۔۔۔ یہاں شہر کی زمین بنجر ہے' یوں لگتا ہے یہاں اعتبار کی فصل اگتی ہی نہیں اور میں نے اگائی۔۔۔ بیج سڑتے رہے۔

کونپلیں کہاں سے پھوٹتیں؟

اور اس شام جب میں خوب بن سنور کر ریاض علی کے ساتھ جانے والی تھی اور بار بار آئینے میں خود کو دیکھ رہی تھی تو نائلہ نے پوچھا تھا۔ "اتنا تیار ہو کر کہاں جارہی ہو؟" اس سوال میں کتنی حیرت تھی' مجھے پتا تھا۔

"کچھ نہیں' بس ایسے ہی آوٹنگ کا پروگرام ہے۔" میرے لہجے میں کتنی سچائی تھی' وہ واقف تھی۔

"اس راستے پر قدم نہ رکھنا جہاں سے واپسی ناممکن ہو۔" اگر وہ نصیحت تھی تو میں نے ایک کان سے سن کر دوسرے سے اڑادی تھی۔

جب ہم ریاض علی کے فلیٹ پر پہنچے تو ابھی شام نہیں اتری تھی۔ ہم نے کافی پی اور بہت ساری باتیں کیں۔

"مجھے ہاسٹل چھوڑ آؤ۔۔۔ بہت وقت ہوچکا۔" میں نے کلائی پر بندھی گھڑی کو دیکھا تھا۔

"ایسے کیسے چھوڑ آؤں۔۔۔ آج رات یہیں گزاریں گے۔" وہ میرے قریب تھا' میری لٹ کو کانوں سے پیچھے اڑس دیا۔

"نہیں پلیز۔۔۔ مجھے چھوڑ آؤ۔" میں روہانسی ہورہی تھی۔۔۔ رات اترنے کو تھی۔

وہ اور میرے قریب ہوا تھا۔ "یہاں آئی تم اپنی مرضی سے ہو' مگر جاؤگی میری مرضی سے۔۔۔" وہ مسکرایا تھا اور وہ "مسکراہٹ" میں آج تک نہیں بھولی۔

"پلیز ریاض۔۔۔ مجھے چھوڑ آؤ۔۔۔ میں ہاتھ جوڑتی ہوں۔" وہ میرے جڑے ہاتھوں کو نہیں دیکھ رہا تھا۔۔۔ وہ

اور قریب ہوا' میرے اوسان خطا ہونے لگے اور جیسے جان نکلنے لگی تھی۔

"یہ جو تم لڑکیاں ہوتی ہو نا۔۔۔ بڑی ہی سادہ لوح اور سیدھی ہوتی ہو۔۔۔ تمہیں گھیرنے میں چار لفظ لگتے ہیں۔۔۔ بس چار لفظ جتنی اوقات ہے تمہاری۔۔۔"

اور میں ساکت کھڑی لفظوں کی بازگشت کے آگے نڈھال کھڑی تھی۔ آہ۔۔۔

"آپ کی آنکھیں بہت خوب صورت ہیں۔"

"اور آپ کی آواز مجھے جکڑ لیتی ہے۔"

وہ سب فریب تھا کنیزاں۔۔۔ سب۔۔۔ اور اس شام میں بڑی مشکل سے اس فلیٹ سے بھاگی تھی۔۔۔ میں نہیں جانتی کہ میری کون سی نیکی کام آئی تھی۔ محبت محرم اور نامحرم کے اور پردے کا نام نہیں ہوتی' یہ تو احترام کی پہلی سیڑھی ہوتی ہے۔ ہم لڑکیاں واقعی سادہ لوح اور سیدھی ہوتی ہیں۔

یہاں کی ہوائیں' یہاں کے لوگ سب اجنبی ہیں کنیزاں۔ سب۔۔۔

شاید سارے ایسے نہ بھی ہوں' مگر جو۔۔۔ مجھے ملے ہیں' وہ تو اجنبی ہی تھے۔۔۔ مجھے تمہاری بڑی یاد آتی ہے۔

"میں جلد آؤں گی' بس امتحان ختم ہو جائیں۔۔۔ دل بھر آرہا تھا تو سوچا تمہیں خط لکھ کر دل ہلکا کر لوں۔۔۔"

اور ہاں۔۔۔ اب تم کوئی چار صفحوں کا دلاسوں' تسلیوں سے بھرا ہوا خط نہ لکھ دینا۔۔۔ ۔۔۔ میں اب اس دور سے گزر چکی ہوں۔۔۔ سنبھال لیا ہے خود کو۔۔۔ تم تو اچھی طرح جانتی ہو نا کنیزاں کہ تمہاری دوست ٹھوکر کھا کر سنبھل جانے والوں میں سے ہے۔

تمہیں بڑا شوق ہے نا ہاسٹل کے قصے سننے کا' تو صبر رکھو۔۔۔ آکر چیدہ چیدہ واقعات تمہارے گوش گزار کروں گی۔

اب تو شام اتر چکی ہے۔۔۔ مصنوعی روشنیاں جو شہر کی علامت ہیں' جل چکی ہیں۔۔۔ کہیں دور سے اونچی آواز میں اسٹیریو بج رہا ہے اور کسی کم بخت نے بے ڈھنگا اور فضول بھارتی آئٹم سانگ لگا رکھا ہے۔

خیر۔۔۔ مجھے تو بڑی چڑ ہے اس اوٹ پٹانگ اور بے ہنگم موسیقی سے' مگر یہ اچھی طرح یاد ہے کسی زمانے میں ایسے "دھوم دھڑکے" تمہارے خاصے فیورٹ ہوتے تھے۔ اب کی خبر نہیں۔۔۔ عرصہ ہوا۔۔۔ لاعلم ہوں۔

اور تم تو جانتی ہو کنیزاں کہ میں تو محمد رفیع اور مہدی حسن کی شیدائی ہوں اور وہ والی غزل تو ہر ہفتے سنتی ہوں جو ہم آم کے باغ میں ریڈیو پر "سر سہیلی" میں سنا کرتے تھے۔

اب کے ہم بچھڑے تو شاید کبھی خوابوں میں ملیں
جس طرح سوکھے ہوئے پھول کتابوں میں ملیں

تمہیں پہلے خبردار کر رہی ہوں۔ جب میں گاؤں آؤں تو مجھ سے لپٹ کر پھپک پھپک کر رونے نہ لگ جانا۔۔۔ تمہاری بڑی پرانی عادت ہے۔۔۔ خود بھی روتی ہو اور دوسرے کو بھی ریت کا محل کر دیتی ہو۔ تمہاری چیزوں کی لسٹ محفوظ پڑی ہے میرے پاس۔۔۔ آؤں گی تو لے آؤں گی۔۔۔ ایک بات سمجھ میں نہیں آتی' یہ تم "گلابی ربن" تیسری بار منگوا رہی ہو۔۔۔ تمہارا تو گلابی رنگ بڑا فیورٹ ہے۔۔۔ تائی کو کہوں گی تمہاری شادی کا جوڑا بھی گلابی لے لیں۔۔۔ اس میں تم بجلیاں گراتی۔۔۔ "مس ہنکشن" لگو گی۔

رات ڈھل رہی ہے۔۔۔ اور نائلہ کے خراٹے ناقابل برداشت ہو رہے ہیں' آج تو کانوں پر تکیہ رکھ کر سونا پڑے گا اور سنو۔۔۔ اداس مت ہونا تم۔۔۔ میں بالکل ٹھیک ہوں اور ہنسنے بھی لگی ہوں۔

اب اجازت چاہتی ہوں سب تک سلام پہنچا دینا۔

والسلام۔۔۔

تمہاری پیاری سلمیٰ

ایمل رضا

پیاس آشنا

ایک بوڑھا وجود برگد کے ذریعے اپنے شکوے اپنے پیاروں تک پہنچا رہا ہے۔

نانو ہینڈی کرافٹ کا کام کرتی ہیں۔ انار کلی بازار میں وہ ایک دکان بڑی کامیابی سے چلا رہی ہیں۔ نانو یشار اور باسل دونوں بھائیوں کی سرپرست بھی ہیں۔ یشار نفسیات کا ڈاکٹر ہے اور اپنا کلینک چلاتا ہے۔ باسل اس کا چھوٹا بھائی اس کا اسسٹنٹ ہے۔ دونوں ایک سیمینار میں شرکت کے لیے فرانس جاتے ہیں جہاں ان کی ملاقات زمل سے ہوتی ہے۔ زمل اپنے ڈیڈ کی نفسیاتی کیفیت کی وجہ سے پریشان ہے۔ وہ لاتعداد ڈاکٹرز سے علاج کروا چکی ہے اور اب یشار کو آخری امید سمجھ کر اس کے پاس آتی ہے۔ علاج کے دوران باسل اور زمل کی کئی ملاقاتیں ہوتی ہیں، جس کے باعث دونوں میں محبت کا جذبہ پنپنے لگتا ہے۔

حال کی کھڑکی بند ہوتے ہی ماضی اپنا در وا کرتا ہے جہاں نگار ایک جرات مند اور نڈر لڑکی موجود ہے۔ یونی ورسٹی کے پہلے دن کے مذاق کی بدمزگی کے بعد اسے اپنے کلاس فیلوز زیان عالم اور اس کے گروپ سے نفرت ہو جاتی ہے۔ اسی وجہ سے جب زیان عالم یونین کے صدر کی حیثیت سے الیکشن لڑتا ہے تو نگار اس کے مخالف مصباح کو سپورٹ کرتی ہے۔ نگار کی نظر میں زیان عالم ایک برے کردار لڑکا ہے۔ جس کی والدہ گلناب عالم بھی متنازعہ شخصیت کی مالک ہیں۔ ہال میں ہوتی تقریر
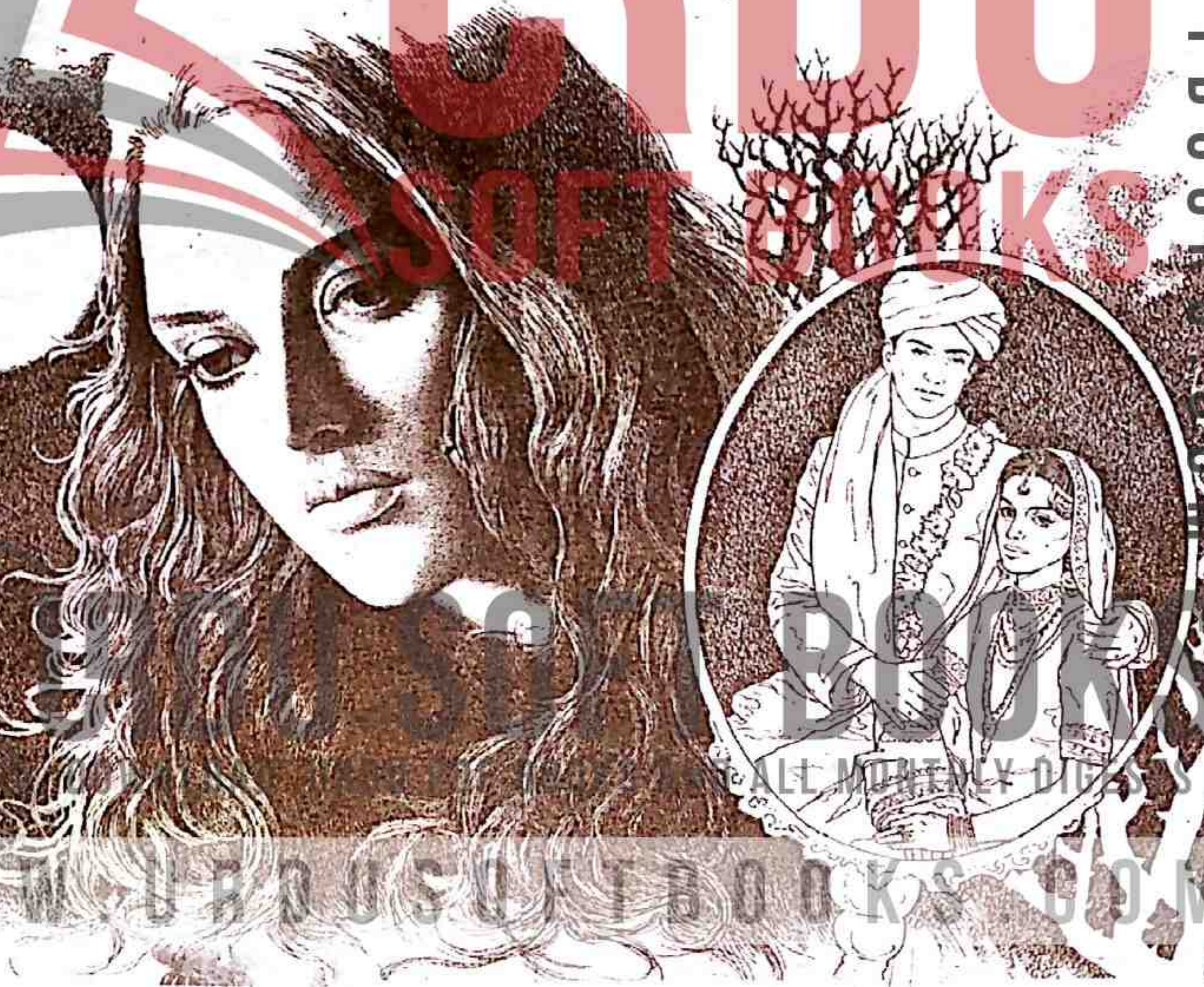
کے دوران نگار، زیان کو اس کی ماں کے گرے ہوئے کردار کا طعنہ دیتی ہے اور زیان بدلے کے طور پر نگار اور حسن کی تصویریں یونی ورسٹی کے نوٹس بورڈ پر لگا دیتا ہے۔ نگار غصے میں گرم چائے کا کپ زیان کے منہ پر دے مارتی ہے۔ زیان غصے سے پاگل ہو جاتا ہے۔ وہ نگار کو اغوا کرنے کی کوشش کرتا ہے لیکن پروفیسر صغیر ربانی کی وجہ سے ناکام ہو جاتا ہے۔

نگار گھر آتی ہے تو اسے معلوم ہوتا ہے کہ اس کے لیے ایک رشتہ آیا ہے۔ زیان عالم کا۔

یشار زل کو پاکستان آنے کے لیے کہتا ہے کہ وہ پاکستان آکر اپنے دادا، دادی کی قبریں تلاش کرے۔ زل پاکستان آچکی ہے۔ نانو زل سے کہتی ہیں کہ وہ ان کے گھر رہ لے جس پر زل نانو کے گھر رہنے لگتی ہے۔ باسل اور زل میں محبت بڑھنے لگتی ہے۔ باسل زل کو شادی کے لیے پروپوز کر دیتا ہے۔

حسن نگار کو چھوڑ کر امریکہ جا چکا ہے۔ نگار یونی ورسٹی کے تمام واقعات اپنے باپ کو بتا دیتی، جسے سمجھ کر وہ گلناب عالم کو زیان عالم کے رشتے کے لیے انکار کر دیتے ہیں۔ نگار کے والد یار کا ایکسیڈنٹ ہو جاتا ہے، جہاں اتفاق سے زیان عالم موجود ہوتا ہے اور وہ خدا یار کا بہت خیال رکھتا ہے۔ آخر کار نگار زیان سے شادی کے لیے مان جاتی ہے۔ شادی ہو چکی ہے۔ دونوں سیر کے لیے سیاحتی مقام پر آئے ہیں۔ نگار زیان کو پسند کرنے لگی ہے۔ ریسٹ ہاؤس میں وہ زیان کے ساتھ یشب اور سدیم کو دیکھ کر چونک جاتی ہے۔ زیان ان دونوں دوستوں کی موجودگی میں نگار کو طلاق دے کر اپنی اصلیت کا نقاب الٹ دیتا ہے۔ زیان کا چہرہ اس قدر بھیانک ہوگا۔ نگار کو اس کا اندازہ نہیں تھا۔ وہ اس کی گردن دبوچ کر اس پر شراب الٹ دیتا ہے۔ تین شیطان صفت انسان حوا کی عزت پر غالب آجاتے ہیں۔

ایک ہفتے بعد نگار اس ریسٹ ہاؤس سے نکلنے میں کامیاب ہو پاتی ہے۔ وہ رحمٰن، رحیم، ہادی خدا سے اب "عادل" بننے کا تقاضا کرتی ہے لیکن زیان کی بچھائی بساط میں ابھی صرف مہرے ہی آگے کو کھسکے ہیں۔ نگار کی شکست کا لمبا کھیل باقی

مکمل ناول

ہے گلناب عالم بالآخر زیان کی سنائی کہانی پر یقین کرلیتی ہیں۔
نگار گھر آتی ہے تو ہمایوں بھیا اور زلیخا بی اس پر لعن طعن کرتے ہیں کہ وہ ریسٹ ہاؤس میں زیان کو چھوڑ کر کسی کے ساتھ بھاگ گئی تھی۔ ہمایوں نگار کو زبردستی گلناب عالم کے گھر لا کر ان کے پیروں میں پٹختا ہے۔ نگار کی کسی بات کا یقین نہیں کیا جا رہا۔ اس کے آنسو بے فائدہ ہیں۔ زیان آتا ہے اور نگار پر یہ الزام ثابت کردیتا ہے کہ وہ اس سے شادی پر خوش نہیں تھی۔ اس نے خدایار کے کہنے پر شادی کی۔ اور اب وہ اس سے طلاق چاہتی ہے۔ نگار زیان عالم کے منہ پر تھوک دیتی ہے۔ زیان طیش میں آجاتا ہے اور نگار سے زبردستی کرتا ہے۔
"اللہ کی ڈھیل کو اس کی کمزوری نہ سمجھو۔" صغیر ربانی عین موقع پر پہنچ کر زیان کے منہ پر تھپڑ مار کر کہتے ہیں۔
زل باسل کو شادی کے لیے ہاں کہنے کے لیے شطرنج پر "یس" لکھواتی ہے۔ نانو باسل اور زل کی محبت سے واقف ہیں۔ مصباح کا قتل یشب نے کیا تھا۔ زل کو یہ بات معلوم ہو جاتی ہے۔ یہ خبر اس کے لیے حیران کن اور دل توڑ دینے والی ہے۔ اسے اپنے ڈیڈ کی معصومیت پر دکھ ہے کہ سب نے مل کر اس کے ڈیڈ کی زندگی میں زہر گھولا اور انہیں ذہنی مریض بنا دیا۔ نانو زل کو نگار کو کھانا دے کر آنے کا کہتی ہیں۔ تب حال کی نگار، برگد کے سامنے بیٹھا بوڑھا وجود اپنے کمرے میں چلا رہا ہوتا ہے۔ "میری عزت کے ساتھ کھیلنے والے وہ تین تھے۔ "سدیم یشب اور زیان عالم" زل پر یہ لفظ بجلی بن کر گرتے ہیں۔

چھٹی اور آخری قسط

چہار سُو خاموشی کا راج تھا۔ ایسی جان لیوا خاموشی میں ایک آواز اس کے کانوں میں پڑی اور اس کا سویا ہوا وجود جاگ اٹھا۔
"تم واپس چلی جاؤ۔۔۔" باسل نے تیز آواز کے ساتھ کہا تھا۔
آواز پُرتپش تھی، گرمانے اور جلانے والی۔۔۔ نگار تخت پر سے اٹھی۔ کھڑکی کی سلاخ کو تھام کر اس کا سہارا لے کر وہ کھڑکی کے قریب ہوئی۔ باسل کا لب و لہجہ اس کی شخصیت اور نانو کی تربیت کے برخلاف تھا۔ وہ یہ بات کس سے کہہ رہا تھا۔ نگار اچھی طرح جانتی تھی۔
"میری ماں کے ساتھ جو کچھ ہوا اس کا کفارہ معافی کے الفاظ ادا نہیں کرسکتے۔" وہ بولا۔ غصے سے، دکھ سے، درشتی سے، اور اپنے غم کے بے انت ہونے کی بے بسی سے۔۔۔ کیا وہ یہ سب واقعی میں زل سے کہہ رہا تھا یا خود سے۔۔۔؟ نگار نے کھڑکی کی دیوار کے ساتھ اپنا سر جوڑ لیا۔ اس کی اداس آنکھوں میں نمی تھی۔
دروازے سے باہر کھڑکی سے پرے۔۔۔ بوڑھے درخت کے پیچھے دو محبت کرنے والے اپنی ماں، اپنے باپ کی زندگیوں کے حساب کتاب کو نپٹاتے نپٹاتے اپنی محبت ختم کرنے پر آگئے تھے۔
"اپنی ماں کی صداؤں کو میں فراموش نہیں کرسکتا۔" جوان لڑکے کی آواز رندھی ہوئی تھی۔۔۔ کوئی بھی سننے والا ان صداؤں کو فراموش نہیں کرسکتا تھا اور جن کے لیے وہ صدائیں تھیں، انہوں نے انہیں جیسے سنا ہی نہیں تھا۔ ان کا کوئی جواب نہیں دیا تھا۔ شاید وہ اس قابل ہی نہیں تھی، اسے کوئی جواب دیا جاتا۔ خدایار، زلیخا، صغیر ربانی کسی نے کوئی جواب نہیں دیا تھا۔ اب اس کے پاس کیا رہ گیا تھا آخر۔۔۔ وہ تو ان پیغامات سے بھی ہاتھ دھو بیٹھی تھی۔ سب چاہتیں، تقاضے فنا ہوگئے تھے۔ نگار کے آنسو بہنے لگے۔
"میں نانو اور نگار آنٹی۔۔۔" زل نے روہانسی آواز میں کہا۔

"ان دونوں سے تمہارا کوئی رشتہ نہیں۔" باسل نے غصے سے اسے روکا اور زمن کی دھڑکنیں بھی جیسے رک گئیں۔۔۔ گلی میں ایستادہ بام کے درخت جھومنے لگے۔ وہ جھوم جھوم کر جیسے کسی کو بلا رہے تھے۔ کس کو؟ کہیں اس کو۔۔۔ نگار کو تو نہیں کہ وہ آئے۔۔۔ تیس سال بعد قدم باہر رکھے اور درخت تلے ہوتی اس جمع تفریق کو اختتام تک جانے سے روک لے۔۔۔ نگار خاموشی سے وہیں کھڑی رہی۔ اس کے پیروں میں اتنی سکت نہیں تھی کہ وہ باہر جا سکتی۔ اس کی آواز بھی بند ہو چکی تھی اور وہ کسی جانے والے کو صدا دے کر روک نہیں سکتی تھی۔ انصاف کے تقاضوں نے اس کا گلا خشک کر دیا تھا۔

دھاڑ سے دروازہ بند ہونے کی آواز اس نے سنی۔۔۔ باسل اندر آچکا تھا۔ رات ڈھل رہی تھی اور بہت سے رازوں، وعدوں اور جذبوں کو نگل چکی تھی۔

باسل اپنے کمرے میں جانے کے بجائے مکان کے اس حصے میں چلا آیا۔ جہاں مور تھے، فاختائیں تھیں۔ تالاب کا کائی زدہ پانی تھا۔ اور برگد بھی۔۔۔ باسل درخت کی موٹی شاخ پر ہاتھ ٹکا کر کھڑا ہو گیا۔ کچھ پتوں کے سائے، کچھ دن کی کم ہوتی روشنی اور کچھ لمبی لمبی جٹاؤں نے اسے اپنے اندر سمو لیا تھا، لیکن نگار دیکھ سکتی تھی کہ اس کے کھڑے ہونے میں کیسی شکستگی ہے۔ وہ اس اندھیرے میں نہ جانے کیا کھوج رہا تھا۔ نگار بھی ادھر ہی دیکھنے لگی۔ مگر دونوں کے لیے وہاں کچھ بھی نہیں تھا۔

باسل نے اتنے دنوں میں جو فیصلہ کیا اس پر عمل بھی کر دیا اور نگار اس نے تو کبھی کچھ سوچا ہی نہیں تھا۔ اس کے لیے قدرت نے ہر فیصلہ کیا تھا اور ان فیصلوں کے نتیجے میں دونوں کے وجود اب اندر باہر سے سیاہ تھے۔

"میرے ڈیڈ کو ان کے کیے کی سزا مل گئی۔ انہوں نے پوری زندگی بہت تکلیف میں گزاری۔" زمل کے آنسوؤں میں بھیگے فقرے کی بازگشت ابھی تک گونج رہی تھی۔ باسل سر جھٹکتا ہوا باہر نکل گیا۔

کیا عدل شیشے کی دیواروں کی طرح بے نقاب ہونا چاہیے۔ کھڑکی کی دیوار کے ساتھ سر جوڑے نگار ساری رات یہ ہی سوچتی رہی۔

☆ ☆ ☆

نگار خانہ کی سالانہ صفائی ہو رہی تھی۔ ملازم جھاڑ پونچھ کر رہے تھے اور ہر طرف گرد ہی گرد تھی۔ نانو نے دکان کے داخلی دروازے کو بند کیا اور کلوز کا بورڈ لٹکا کر دکان کی پچھلی طرف قائم کارخانے میں چلی آئیں۔ جہاں کاریگر آمنے سامنے زمین پر بیٹھے مختلف اشیا کو ان کے طے شدہ قالب دے رہے تھے۔ کارخانہ ہتھوڑیوں کی ہلکی بھاری ضرب کی ٹھک ٹھک سے گونج رہا تھا۔ نانو کو یہ آوازیں ہمیشہ ہی سے بڑی بھلی لگا کرتی تھیں۔

لیکن آج یہ آوازیں نانو کے اعصاب پر وزنی ہتھوڑوں کی طرح برس رہی تھیں۔ اور وہاں ایک لمحہ کھڑے رہنا ان کے لیے مشکل ہو گیا تھا۔ ان کے پیچھے گرد تھی۔ آگے بھیانک شور۔۔۔ اور گھر میں وحشت۔۔۔۔ خاموشی سے ایک کونے میں جا کر کرسی پر بیٹھ گئیں۔ ملازموں نے انہیں تاسف سے دیکھا اور دوبارہ اپنے اپنے کاموں میں لگ گئے۔

دائیں بائیں مختلف چیزیں بن رہی تھیں۔ شور ہو رہا تھا۔ اداسی سے سب دیکھتی نانو کے آگے منظر جیسے وسیع تر ہو گیا۔ اور لمحے بھر میں وہ کارخانہ قدرت میں داخل ہو گئیں۔ جہاں ان کے کارخانے کی طرح ہی زندگیوں کو مختلف اشکال دی جا رہی تھی۔ وہاں بھی بہت کچھ بن رہا تھا۔ دونوں کارخانوں میں کوئی فرق نہیں تھا۔ نانو کسی خواب کے عالم میں سب دیکھنے لگیں۔

ہاں بعض زندگیاں اس نیلے جیڈ کی شطرنج جیسی ہی تو ہوتی ہیں۔ بیک وقت اپنے اندر جیت اور ہار کو سمیٹے ہوئے۔۔۔ بعض ان نگی جانوروں کی طرح۔۔۔ جن کے نصیب میں دو ہی باتیں درج ہوتی ہیں۔۔۔ کھیلنا اور ٹوٹنا۔۔۔ کچھ تنکا ورک کی طرح کی بھی ہوتی ہیں۔۔۔

سالوں ایک دیوار پر ٹنگے رہنا اور بوسیدہ ہونے کے بعد گھر سے باہر پھینک دیا جانا۔
ان کی اپنی زندگی کیا تھی۔ وہ سوچنے لگیں اور اپنی زندگی کا نمونہ تلاش کرنے لگیں۔۔۔ کیا مرمر کا وہ پہلا جام۔۔۔ جسے صرف اس لیے کبھی استعمال نہیں کیا جاتا کہ ٹوٹ نہ جائے۔۔۔ اور اس ڈر کے باعث جام اور استعمال نہ کرنے والا دونوں تشنہ رہتے ہیں۔۔۔ چاندی کا لیپ۔۔۔ جو ہزاروں لاکھوں چوٹیں سہ کر بھی خوشنما دکھائی دیتا ہے۔

اس کارخانے کا شور یہاں کے شور سے کچھ زیادہ تھا۔ کوئی ایک ضرب نانو کی سماعت کی رگ پر پڑی اور چونک کر انہوں نے اپنی آنکھیں کھول دیں۔ مکمل حواسوں میں آنے میں انہیں بہت دیر لگ گئی۔ کسی نے انہیں بلا کر پریشان کرنا مناسب خیال نہ کیا۔

"یہ۔۔۔ یہ آپ کیا بنا رہے ہیں۔۔۔؟" نانو نے ایک کاری گر کو اپنی طرف متوجہ کیا۔ جو تصویر کا چوکھٹا صدف اور کوڑیوں سے سجا رہا تھا۔ کاریگر نے اپنے کام سے سر اٹھا کر انہیں دیکھا۔

"دکھایے۔۔۔ ذرا یہ مجھے۔۔۔" نانو نے کہا۔ ملازم نے تقریباً" مکمل ہو چکا چوکھٹا ان کی طرف بڑھایا۔ نانو پہلی نظر میں ہی جان گئی تھیں کہ کام بالکل غلط ہو رہا ہے۔ فارمولے سے ہٹ کر۔۔۔

"یہ کیا کیا ہے آپ نے۔۔۔ بالکل غلط بنایا ہے۔۔۔" نانو نے نرمی اور تاسف سے کہا۔

"صدف کو آپ نے کناروں پر لگا دیا ہے۔۔۔ اور آدھا باہر بھی نکال دیا ہے۔۔۔ یہ دیکھیں اس سے چوکھٹے کے خط میں کتنا فرق پڑا ہے۔ اور پائیداری میں بھی۔۔۔ کناروں پر صرف کوڑیاں لگتی ہیں۔" نانو نے سمجھانے والے انداز سے کہا۔

"یاد رکھیے گا۔۔۔ کوڑیاں صدف سے نازک ہوتی ہیں۔ لیکن چوکھٹے کے خط پر آنچ نہیں آنے دیتیں۔ نہ پائیداری پر اور نہ ہی خوب صورتی پر۔۔۔" نانو پیار سے سمجھاتی گئیں۔ کاریگر سر ہلانے لگا۔

"جی ٹھیک۔۔۔ میں سمجھ گیا۔۔۔ لیکن یہ چوکھٹا آپ کا ہوا بنایا نمونہ دیکھ کر ہی تو تیار کیا ہے۔۔۔" کاریگر ملازم نے قیامت خیز راز عیاں کیا۔

"کیا۔۔۔؟" اور سارا کارخانہ جیسے نانو کے وجود پر آگرا۔

"جی۔۔۔ یہ۔۔۔" ملازم نے ایک تیار شدہ اور سوکھ چکا چوکھٹا انہیں دکھایا۔

"آپ نے ہی تو کہا تھا کہ اس جیسے اور پیس تیار کر لیے جائیں۔۔۔" ملازم بول رہا تھا۔ اور نانو کا دل اس بری طرح دھڑکنے لگا تھا جیسے وہ پیدل پوری دنیا کا چکر لگا کر آئی ہوں۔ دوسرے تمام ملازم بھی اپنے اپنے کام روک کر انہیں دیکھنے لگے۔ چند لمحے تو نانو کی سمجھ میں ہی نہ آیا کہ وہ کیا بولیں۔ پھٹی پھٹی آنکھوں سے وہ اس چوکھٹے کو گھورتی رہیں جو بقول کاریگر کے۔۔۔ انہوں نے بنایا تھا۔ اور جس کو بنانے کا وقت ان کو یاد نہیں آرہا تھا۔

"کب کی بات ہے یہ۔۔۔" نانو نے کانپتی آواز سے پوچھا۔

"دو دن پہلے کی۔" نانو نے اپنا سر تھام لیا۔ تو کیا وہ اب ناکارہ ہو چکی تھیں؟ ان کے ذہن نے کام کرنا بند کر دیا تھا؟ اور ایسا کیا تھا کہ وہ اب اپنے دل پسند کام کو کرنے کے قابل بھی نہیں رہی تھیں۔

"آپ ٹھیک کر لیں اسے بھی۔۔۔ مجھ سے یہ غلط بن گیا ہے۔" نانو کی آواز میں شکست تھی۔ وہ اپنی جگہ سے اٹھیں۔

"یہ اب ٹھیک نہیں ہو سکتا۔۔۔" ملازم مسکرایا۔ "آپ جانتی ہیں اپنے کام کو۔۔۔ اب یہ صدف ٹوٹ تو سکتی ہیں لیکن اپنی جگہ سے اکھڑ نہیں سکتیں۔" ملازم شاید اس بات کے ذریعے انہیں دلاسا دینا چاہ رہا تھا۔

"میرا کام ویسا نہیں رہا۔۔۔ یہ آسانی سے اکھڑ جائیں

گی" کہتی ہوئی وہ واپس دکان میں آئیں۔ ان کے لیے وہاں سب ملازموں کے سامنے کھڑے رہنا' ان سے نظریں ملانا دو بھر ہو رہا تھا۔

دکان میں اس قدر گرد اڑ رہی تھی جیسے وہاں کوئی

صحرائی طوفان آگیا ہو۔ یہ اتنی ڈھیر ساری گرد دکان میں کب اکٹھی ہوگئی تھی۔۔۔ انہیں پتا ہی نہیں چلا تھا۔ وہ ایسی لاپروا ہرگز نہیں تھیں۔ دکان کی صفائی کے معاملے میں وہ کبھی سستی نہیں کرتی تھیں۔ صغیر ربانی کی ڈائری میں درج یہ الفاظ انہیں کبھی بھولے ہی نہیں تھے۔

"جگہیں گرد آلود ہوجائیں تو پھر وہاں فرشتوں کے بجائے شیطان بسیرا کرلیتے ہیں اور شیطانی جگہوں پر اللہ کی رحمت نازل نہیں ہوتی۔"

تو یعنی اب خدا کی رحمت ان پر ختم ہونے والی تھی یا ہوگئی تھی؟

"دروازہ کھول دو۔۔۔ اور پنکھا بھی چلادو۔۔۔۔ کس قدر مٹی جمع ہوگئی ہے دکان میں۔" انہوں نے تیز آواز میں کہا۔ آمنے سامنے سیڑھی پر چڑھے دونوں ملازموں نے ایک دوجے کو دیکھا اور خاموش رہے۔

"پنکھا چل رہا ہے۔ اور دروازہ بھی کھلا ہوا ہے۔" کسی نے ان سے کہا تھا۔ آواز کچھ جانی پہچانی سی تھی۔ گرد کے باعث انہیں کہنے والے کا چہرہ نظر نہ آیا۔ پھر رفتہ رفتہ منظر واضح ہونے لگا۔ ان کے سامنے باسل کھڑا تھا۔ بڑے دنوں کے بعد اسے اپنے سامنے کھڑا دیکھ کر نانو ایک لمحے کے لیے اپنی جگہ سے ہل بھی نہ سکیں۔

"باسل! تم آگئے۔" خوشی کے مارے نانو پوری کی پوری کانپ گئیں۔ آگے بڑھ کر انہوں نے باسل کو والہانہ اپنے گلے سے لگالیا۔ ان کی آنکھیں نم ہوگئیں۔ وہ جذباتی ہورہی تھیں۔ باسل بھی نانو کے گلے سے لگا رہا۔

"کہاں چلے گئے تھے باسل؟" انہوں نے اپنے آنسو پونچھتے ہوئے باسل سے شکوہ کیا۔

"اب آگیا ہوں نا۔" باسل نے جواب دیا۔ نانو سمجھ گئیں وہ اس معاملے پر مزید بات نہیں کرنا چاہتا۔

"تمہیں پتا ہے میں کتنی پریشان رہی۔۔۔۔ نگار، ایشال اور زمل تو۔۔۔۔"

"گھر چلتے ہیں نانو۔" اس نے انہیں درمیان میں روکا۔ نانو اس کی صورت دیکھنے لگیں۔

"ہاں ٹھیک ہے۔" انہوں نے آمادگی ظاہر کی۔ باسل سے مزید کوئی سوال پوچھنے کا ارادہ ترک کرتے ہوئے۔ وہ کہاں تھا، کیوں چلا گیا تھا؟ ان سوالوں سے کہیں بہتر بات یہ تھی کہ بالآخر وہ ان کے ساتھ تھا۔ واپسی کا سفر خاموشی سے طے ہوا۔ نانو بار بار باسل کو دیکھ رہی تھیں۔ وہ چاہتی تھیں کہ باسل ان سے کوئی بات کرے۔ اور وہ اس کی ایک بات کے بدلے میں اس سے جی بھر کے باتیں کرلیں۔ لیکن وہ خاموش تھا۔ گھر میں بھی ویسی ہی خاموشی چھائی تھی۔ پرانے قلعوں کے کھنڈرات جیسی۔ نانو کو گھٹن کا احساس ہوا۔ اس گھر میں کچھ ہو کر گزر چکا تھا۔ جس کا وہ اندازہ نہیں لگاپائی تھیں۔

"زمل سے ملے ہو؟" گھر کے اندر داخل ہوتے ہوئے انہوں نے پوچھا۔

"مجھے بہت بھوک لگ رہی ہے نانو۔" اس نے الگ ہی بات کی۔ نانو ــــــــ مسکرادیں۔

"میں ابھی انتظام کرتی ہوں۔" منہ ہاتھ دھو کر وہ کچن میں کھانا بنانے کے لیے چلی گئیں۔

زمل پچھلے کافی دنوں سے کچن میں آکر ان کی مدد کردیا کرتی تھی۔ یا ان کے آنے سے پہلے تھوڑا بہت ضروری کام کرکے رکھ دیا کرتی تھی۔ لیکن آج کچن میں کوئی بھی چیز تیار نہیں تھی۔ انہوں نے زمل کو پکارنا مناسب نہ سمجھا اور خود ہی کھانا بنانے لگیں۔

باسل باہر دھوپ میں سوکھنے کے لیے رکھے شیشے جڑے گلدان اندر صحن میں منتقل کرنے لگا۔ رات کی نمی ان کی گوند کو خراب کرسکتی تھی۔ اس کام سے فارغ ہونے میں اسے بڑی دیر لگ گئی۔ ایک ایک گلدان کو پکڑنا۔ کچھ سوچنا۔ پھر اندر رکھنا۔ پھر سے سوچنا، کھڑے رہنا۔ باہر آنا، دیر تو لگنی ہی تھی۔ پھر شیشے کے ننھے ننھے گول ٹکڑوں میں نظر آتا اپنا ہی عکس، اپنا اداس چہرہ۔۔۔۔ حالانکہ جیسا اس نے سوچا تھا، فیصلہ کیا تھا، بالکل ویسا ہی کیا تھا۔ پھر یہ افسردگی تو بے سبب تھی۔ اس کے پاس اپنی اس کیفیت کا کوئی جواز نہیں

تھا۔ "چند دن گزریں گے اور سب ٹھیک ہوجائے گا۔" اس نے خود کو تسلی دی۔ یہ تسلی کس حد تک اطمینان بخش تھی۔ یہ آنے والا وقت ہی بتا سکتا تھا۔

یشار بھی کلینک سے آگیا تھا اسے باسل کی آمد کا علم تھا۔ دوپہر میں فون پر اسی نے تو باسل کو بتایا تھا کہ زنل شام کے وقت قبرستان سے واپس آئی ہے۔

تھوڑی دیر بعد دونوں ڈائننگ ٹیبل پر بیٹھے تھے۔ نانو برتن لگانے لگیں۔

"زنل کو بھی بلالاؤ۔" نانو نے دونوں سے ہی کہہ دیا تھا۔۔۔ یشار نہیں اٹھا۔۔۔ باسل اب گھر واپس آگیا تھا تو بہتر تھا کہ وہ اپنے حواسوں میں بھی واپس آجائے۔ اور یہ کام خود کرے۔ لیکن باسل بدستور اپنی جگہ پر بیٹھا پلیٹ میں چمچ کھڑکھنے کی مشق۔۔۔ کرتا رہا۔

نانو ٹرے میں کھانا رکھ کر نگار کو دینے چلی گئیں۔ پھر انہوں نے ٹیبل پر لا کر کھانا رکھا اور زنل کو اس کے کمرے سے بلانے خود ہی چلی گئیں۔ چند لمحوں بعد وہ گھبرائی ہوئی آئیں۔

"زنل کمرے میں نہیں ہے۔" نانو نے تیزی سے آتے ہوئے کہا۔ یشار چونک کر نانو کو دیکھنے لگا۔

"کمرے میں نہیں ہے تو پھر کہاں ہے؟"

"وہ قبرستان سے واپس لوٹی تھی کہ نہیں؟" نانو نے پوچھا۔ یشار نے باسل کی طرف دیکھا۔ گھر پر صرف وہ ہی تھا۔

"باسل!" یشار نے اسے پکارا۔

"ہاں۔۔۔" باسل نے چونک جانے کی بھرپور اداکاری کی۔

"کیا زنل گھر آئی تھی۔" باسل بات سن کر دوبارہ پلیٹ چمچ کے ساتھ مصروف ہوگیا۔

"ہاں۔" اس نے مختصر جواب دیا۔

"تو پھر کہاں ہے؟"

"وہ واپس چلی گئی ہے" اس نے دونوں میں سے کسی کی بھی طرف دیکھے بغیر کہا۔

"واپس!" نانو نے حیرانی سے پوچھا، باسل کو دیکھا۔ اور اس سے بھی زیادہ حیرانی سے وہ سوچنے لگیں۔

"کیا زنل کے پاس واپسی کے لیے بھی کوئی جگہ ہے۔ کیا وہ ہمیشہ سے یہیں نہیں رہتی آرہی!!"

"ہاں واپس۔۔۔ فرانس۔" اس نے دونوں لفظوں پر زور دے کر کہا۔ نانو کو ایک چکر سا آیا۔ یشار بنا پلکیں جھپکائے باسل کو دیکھنے لگا۔

"کیوں؟"

"مجھے نہیں پتا۔" وہ بے زار ہوا۔

"کب گئی وہ؟" نانو نے سرسراتے ہوئے لہجے میں پوچھا۔

"آپ شاپ پر تھیں۔ اس نے اپنا سامان پیک کیا اور وہ چلی گئی۔"

"تم کیا کہہ رہے ہو باسل! میری سمجھ میں کچھ نہیں آرہا۔۔۔" وہ روہانسی ہوئیں۔

"وہ واپس چلی گئی ہے نانو۔۔۔ ہمیں چھوڑ کر۔۔۔ ہمیشہ کے لیے۔۔۔ اتنی سی بات آپ کی سمجھ میں کیوں نہیں آرہی۔" وہ جواباً چلایا اور پوری قوت سے پلیٹ پر چمچ دے مارا۔ پلیٹ دو ٹکڑے ہوگئی۔۔۔ نانو اس کے اس طرح چلانے اور اس کے رویے پر خاموش ہوگئی تھیں۔ اور یشار کو ساری بات سمجھنے میں ایک منٹ بھی نہیں لگا تھا۔

"تو تم نے اسے روکا کیوں نہیں؟" بڑی دیر کے بعد نانو نے اس سے پوچھا۔ باسل ٹوٹے ٹکڑوں کو دیکھتا رہا۔

"جواب دو باسل!"

"میں نے ہی اس سے کہا تھا کہ وہ یہاں سے چلی جائے۔" اور نانو شاید یہ ہی سننا چاہتی تھیں۔ ان کی آنکھوں سے آنسو ٹپ ٹپ گرے۔ باسل کو یہ منظر دیکھ کر غصہ آیا۔ نانو پر اور اس ساری صورت حال پر وہ زنل کے لیے آنسو بہانے والی ہمدردی رکھتی تھیں۔ اس بات نے باسل کو سخت طیش دلایا۔ اس کا دل چاہا کہ پورا ٹیبل الٹ دے۔ اور گھر کے سارے دروازے کھڑکیاں توڑ ڈالے۔

یشار اس ساری گفتگو کے دوران خاموش رہا تھا۔ وہ جانتا تھا کہ زنل کی ذرا سی بھی طرف داری باسل کو اس

سے بدظن کردے گی۔ اور باسل کی حمایت نانو کو ناگوار گزرے گی۔

کھانا ٹھنڈا ہو رہا تھا۔ اور نانو کا کرسی پر بیٹھنے کا کوئی ارادہ نہیں تھا۔ وہ جیسے کھڑی تھیں۔ ویسے ہی کھڑی رہیں۔ پھر ان کے وجود سے رندھی ہوئی آواز برآمد ہوئی۔ جس میں شکوے کی رمق تھی۔

"تم اتنے بڑے کب سے ہو گئے باسل۔۔۔ تم اتنے بڑے کب سے ہو گئے۔" وہ چادر میں منہ چھپا کر روتی ہوئی اپنے کمرے کی طرف چلی گئیں۔

☼ ☼ ☼

ٹرے میں رکھا ہوا کھانا جوں کا توں پڑا تھا۔ باہر سے نانو اور باسل کی آوازیں اندر آ رہی تھیں۔

"اتنی سی بات آپ کی سمجھ میں کیوں نہیں آ رہی۔" باسل چلا رہا تھا۔ اس کی آواز کے ساتھ شور بھی اٹھا تھا۔ نگار آہستگی سے تخت پر سے اٹھی۔

"تم نے اسے روکا کیوں نہیں۔۔۔؟" نانو کے سوال میں التجا، غم، دکھ، آس سب کچھ شامل تھا۔ نگار چلتی ہوئی دروازے تک آئی۔ باسل کے پاس نانو کے سوال کا جواب تو تھا لیکن ان کے دکھ کا علاج نہیں۔ یہ علاج خود نگار کے پاس بھی نہیں تھا۔

"تم اتنے بڑے کب سے ہو گئے باسل؟" وہ اب باقاعدہ روتے ہوئے کہہ رہی تھیں۔ اور پھر تیزی سے چلتے ہوئے اسی طرف آئی تھیں۔ اپنے کمرے کی طرف۔۔۔ اندر داخل ہونے سے پہلے وہ رکیں۔ انہوں نے نگار کے کمرے کی طرف دیکھا۔ دروازے میں کھڑی نگار کو دیکھ کہ بے اختیار انہیں جیسے مزید رونا آ گیا۔ اور وہ اپنے کمرے میں جا کر بند ہو گئیں۔ نگار بے بسی سے انہیں دیکھتی رہی، پھر اپنے کمرے سے باہر نکل آئی۔ نانو کے رونے کی گھٹی گھٹی آواز دروازے کے پار سے آ رہی تھی۔ نگار نے ان کے دروازے پر دستک دینی چاہی لیکن پھر رک گئی۔ اور باہر آ گئی۔ ڈائننگ ٹیبل سے لیشار بھی اٹھ کر جا چکا تھا۔ صرف باسل بیٹھا ہوا تھا اور وہ بھی کھانا نہیں کھا رہا تھا۔

باسل نے آہٹ پہ سر اٹھا کر نگار کو دیکھا۔ اس کی آنکھوں میں وہ عکس تھا جس کے بارے میں مفروضے، کشف اور پیش گوئیاں بھی بے کار ثابت ہوئی ہیں۔ نگار باسل سے کچھ کہنا چاہتی تھی۔ کیا کہنا چاہتی تھی اسے یاد نہ آیا۔۔۔ یاد ہی نہ آیا۔

☼ ☼ ☼

فرانس کا شہر۔۔۔ پیرس۔

دریائے سین بہہ رہا تھا۔ روز کی طرح سورج کی کرنوں کو چاٹتے مغرب کی طرف۔۔۔ وہ بہہ رہا تھا۔ اس کے آنسوؤں کی طرح بھی، جن کا اندرونی، بیرونی۔ حجم اب اس قدر زیادہ ہو چکا تھا کہ دو اور دریا موجوں سمیت بہہ سکتے تھے۔ اس نے اس دریا پر کوئی بند نہ باندھا۔ اپنے آنسو اس نے صاف نہ کیے بہنے دیے۔

جب وہ چھوٹی تھی تو سدیم انکل اسے چھوڑ کر چلے گئے تھے۔ ذرا بڑی ہوئی تو ممی نے اسے چھوڑ دیا۔ اس کے جذبے، لگن، تحریک یہ سب بھی باری باری اس سے اپنا دامن چھڑاتے رہے۔ کیا ذات کا خراج یہاں تک کافی نہ تھا۔ کیا اس کی تقدیر کو اس سے زیادہ محصول چاہیے تھا جو ڈیڈ نے بھی اسے چھوڑ دیا ہمیشہ کے لیے۔ وہ اس کی زندگی کا واحد سہارا تھے۔ واحد رشتہ تھے۔ ٹھیک ہے اس نے اس جدائی پر بھی صبر کر لیا تھا۔ وہ اللہ کی مرضی کے آگے چپ ہو گئی تھی۔ لیکن باسل؟ باسل نے اسے کیوں چھوڑ دیا؟ اسے زندگی میں محبت ملی ہی کب تھی جو وہ محبت میں پھونک پھونک کر قدم رکھنے کے تجربے سے واقف ہوتی۔ اس کے باوجود وہ اس محبت میں بہت احتیاط سے آگے بڑھی تھی۔ اور منزل پر پہنچ کر ساری احتیاطیں بے کار ثابت ہوئی تھیں۔ محبت شیشے کا جام تھی جو بالآخر ٹوٹ گیا تھا اور اس کے ہاتھ ٹوٹے ہوئے ٹکڑے بھی نہ آ سکے۔ سب پلک جھپکتے ہی فنا ہو گیا تھا۔

اس نے ہتھیلیوں سے۔۔۔ اپنے آنسو صاف کیے۔ یہ محبت اتنی جلدی اور صرف آنسوؤں سے ڈھلنے والی نہیں تھی۔ ابھی اسے صبر کا مظاہرہ کرنا تھا۔ یہ محبت

اس کی جان ہی لے کر ——— چھوڑنے والی تھی۔

پاکستان سے واپس آئے اسے ایک ماہ گزر چکا تھا۔ گھر کی میڈز اور بٹلرز زیان عالم کی وفات اور اس کی حالت دیکھ دیکھ کر افسردہ تھے۔ خاص طور پر ڈیوڈ۔۔۔ وہ کافی عرصے سے زیان عالم کے قریب تھا۔ ان کے آخری سالوں میں تو بے حد قریب رہا تھا۔ اس ساری صورت حال نے گھر کی فضا کو سوگوار بنا دیا تھا۔ ماتم کا چاند طلوع ہو کر غروب ہونے کا نام نہیں لے رہا تھا۔ بے تحاشا روشنی کے باوجود بھی اسے سارا گھر اندھیرے میں ڈوبا ہوا نظر آتا۔ جیسے تمام در و دیواروں پر کسی نے تار کول کا لیپ کر دیا ہو۔

خاموشی میں اسے ہنسی کی آوازیں آتیں۔ خوفناک ہنسی کی آوازیں۔۔۔ وہ بری طرح ڈر جاتی۔ اسی خوف نے اسے کمرے میں قید کر کے رکھ دیا۔ ملازمائیں اسے کھانے پر بلاتیں۔ کمرے سے باہر نکلنے کا کہتیں لیکن وہ انکار کر دیتی۔ این جی او کی طرف سے بھی مسلسل فون آ رہے تھے۔ وہ شہر کے اندر اور شہر سے باہر ہونے والے سیمینارز میں اس کی موجودگی چاہتے تھے۔ لیکن فی الحال وہ خود میں کسی کا سامنا کرنے کی ہمت نہیں رکھتی تھی۔

ڈیڈ کی موت کی خبر ممی کو بھی ہو چکی تھی۔ انہوں نے زمل کو فون کیا تھا۔ سیل فون پر اور گھر کے نمبرز پر۔ بار بار۔۔۔ وقفے وقفے سے مگر زمل نے بات نہیں کی۔ آنسرنگ مشین پر اس نے ممی کے دو پیغام سن لیے تھے' جن میں طویل خاموشی اور مختصر تسلی تھی۔ ان کے اور اس کے لیے یہ ہی کافی تھا۔

ایک پیغام یشب انکل کی طرف سے بھی تھا۔ جس میں اسے حوصلے سے کام لینے کی تلقین کی گئی تھی' پیغام کے ـــ بس پردہ پیغام کچھ اور تھا۔ وہ چاہتے تھے زمل زیان عالم کی برباد ہو چکی کمپنی ان کو بیچ دے۔ زمل سن کر ہنسنے لگی تھی۔ کمپنی خرید کر یشب انکل کیا کرنے والے تھے؟ سدیم انکل اور ڈیڈ کے بعد یشب انکل کا انجام بھی اب زیادہ دور کہاں رہ گیا ہوگا۔ حوصلے کی ضرورت یقیناً "ممی کو پڑنے والی تھی اور بہت جلد پڑنے والی تھی۔

دونوں میں سے کسی ایک نے بھی اسے اپنے پاس آنے کے لیے نہیں کہا تھا اور وہ ان سے اس بات کی توقع بھی نہیں کر رہی تھی۔ اگر وہ اسے اپنے گھر آ کر رہنے کی دعوت دیتے بھی تو انکار کے علاوہ وہ کچھ اور نہ سنتے۔ اس کے باوجود اسے دکھ ہوا تھا۔

وہ مدتوں بعد دریائے سین کو ایک بار پھر سے ایسے دیکھنے لگی جیسے اس سے اپنے ساتھ روا رکھے گئے ظلم کا حساب کتاب مانگ رہی ہو۔ یا جیسے سین اپنے اندر کسی پرانے رجسٹر میں اس کی محرومیوں کا اندراج چھپائے بیٹھا ہو۔ ایک اور عورت کو وہ جانتی تھی۔ جو یہاں سے بہت دور حبیب اللہ روڈ کے پرانے گھر کے کمرے میں بیٹھی کھڑکی کی سلاخوں کو تھامے مدتوں سے برگد سے جواب کی آس لگائے بیٹھی تھی۔ اور۔۔۔ ایک وہ خود تھی۔ جو سین کو امید بھری نظروں سے دیکھ رہی تھی کہ وہ ہی کچھ بول دے۔ انسان جب ہر طرح کے انسانی سہاروں سے تہی دامن ہو جاتا ہے تو شاید ایسی ہی چیزوں کو اپنا سہارا سمجھ لیتا ہے۔ اسے چیخوف کی وہ کہانی بھی یاد تھی جس میں ایک کوچوان کو جب اپنا غم سنانے کے لیے کوئی نہیں ملتا تو وہ اپنے گھوڑے کے گلے لگ کر ہی رونا شروع کر دیتا ہے۔

غم کے مارے زمل کو ہنسی سی آ گئی۔ یہ سین بھی اس بوڑھے برگد کی طرح خاموش تھا۔ بے تاثر سا۔۔۔ یہ خاموش چیزیں اندر ہی اندر انسانوں کا خوب مذاق اڑاتی ہوں گی۔ ان کے صبر کا پورا پورا امتحان لینے کے بعد۔ دکھ سے اس نے سوچا اور ہاتھوں سے چہرہ ڈھانپ کر پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔

✲ ✲ ✲

نگار کو کھانا دینے اس دن بھی وہ خود ہی آیا تھا۔ وہ پہلے بھی یہ کام اکثر کر لیا کرتا تھا' لیکن اب جو حالات گزر چکے تھے۔ اس کے بعد وہ کم از کم رات کا کھانا دینے تو ضرور ہی آتا تھا۔

وہ چھٹی کا دن تھا جب باسل دوپہر میں اس کے پاس

آیا۔ کمرے میں دھوپ پھیلی ہوئی تھی۔ وہ نگار کے قریب ہی تخت پر بیٹھ گیا۔ کھانے کی ٹرے اس نے اپنے اور اس کے درمیان رکھ دی۔

"کھانا کھالیں۔" اس نے نرم آواز سے کہا۔ پھر نجانے اس کے دل میں کیا آیا کہ وہ نوالے میں سے روٹی نکال کر اس کا نوالہ بنانے لگا۔ وہ نگار کو باہر سب کے ساتھ کھانا کھانے پر راضی تو نہیں کر سکتا تھا۔ نجانے کون کون سی مسافتیں تھیں جو نگار کو طے کرنی تھیں۔ اب نہ وہ طے ہوتی تھیں۔ نہ فاصلے مٹتے تھے یا یہ کمرہ ہی آسیب زدہ تھا جو اپنے سائے سے نگار کو باہر جانے ہی نہیں دے رہا تھا۔

لیکن وہ یہاں تو فاصلہ ختم کر سکتا تھا۔ نگار نے باسل کے بڑھے ہوئے ہاتھ کو دیکھا اور اپنے لب کھولے۔۔۔ لیکن کھانے کے لیے نہیں۔

"زمل۔۔۔" وہ ذرا رک رک کر بولی۔ باسل نے اٹھا ہاتھ جھکا لیا۔ اسے زمل کا نام سن کر سخت کوفت ہوئی تھی۔

"زمل کہاں ہے؟" نگار نے اس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے پوچھا۔ باسل نگار کی شکل دیکھتا رہ گیا تھا۔ اتنے ڈھیر سارے سالوں بعد انہوں نے اس کی زندگی میں دخل دیا بھی تھا تو کس نام سے۔۔۔ جسے اب وہ سننے کا بھی روادار نہیں رہا تھا۔۔۔ کہاں اس کے متعلق باتیں کرنے کا۔۔۔

کیا زمل ایسی ہی ساحرہ تھی جس نے چند ماہ میں ہی سب پر اپنا سحر طاری کر دیا تھا۔ وہ جا چکی تھی، لیکن پھر بھی کوئی اس کے سحر سے نکلنے کے لیے تیار نہیں تھا۔ نانو نے اس سے کوئی بات نہیں کی تھی۔ پھر بھی ان کے رویے سے اسے سرد مہری جھلکتی ہوئی نظر آتی تھی۔ وہ ہر وقت انہیں مشکوک نظروں سے دیکھتا رہتا۔ ان کی محبت تولتا۔ اسے ان کا رویہ منافقانہ اور دوغلا لگنے لگا تھا۔ صرف ایک زمل کی وجہ سے۔۔۔

شاید زمل اپنی ذات میں واقعی ساحرہ تھی۔ اس نے پہلی نظر میں باسل کے سارے خیالات کو بھی تو جکڑ لیا تھا اور اب اس کی نظروں کے سامنے اس کی ماں تھی جن کی نظروں کی تپش وہ برداشت نہیں کر پا رہا تھا۔ سب جانتی تو ہیں یہ۔۔۔ پھر آخر کیوں پوچھ رہی ہیں کہ زمل کہاں ہے تاکہ اس سوال کے جواب کے بعد وہ اس موضوع کو شروع کر سکیں۔۔۔ پھر سے۔۔۔ یعنی ایک ماہ گزرنے کے بعد بھی یہ معاملہ جوں کا توں ہی ہے۔ ان سب کے لیے۔۔۔ حالانکہ اس نے تو اس سارے معاملے کو اپنی دانست میں ختم کر دیا تھا۔

"وہ اب کبھی واپس نہیں آئے گی۔" اس نے تیز لہجے میں جواب دیا۔ اس انداز سے کہ اگر وہ اس کی واپسی کی کوئی آس بھی لگائے بیٹھی ہیں تو اسے ختم کر دیں۔ نگار چند لمحے کچھ بول نہ سکی۔ کمرے میں باسل کے غصے کے علاوہ ہر چیز پرسکون تھی۔

"باسل۔۔۔" نگار نے پیار سے اس کا نام پکار کر اس کا ہاتھ تھام لیا۔ وہ جو کہنے والی تھی باسل جانتا تھا۔

"نہیں امی۔۔۔ خدا کے لیے نہیں۔۔۔ کچھ مت کہیے گا۔۔۔ وہ اس آدمی کی بیٹی ہے جس۔۔۔"

"تم میری خاطر۔۔۔"

"آپ میری خاطر پریشان نہ ہوں۔" اس نے نگار کی بات کاٹی۔ نگار خاموش ہو گئی۔

"اور میں جانتا ہوں یہ آپ نہیں بول رہیں۔۔۔ یہ نانو بول رہی ہیں۔ آپ بھی زمل کو بھلا اس گھر میں کیسے برداشت کر سکتی ہیں۔ نانو نے کہا ہے نا آپ سے یہ سب کہنے کو؟" اس نے پوچھا اور نگار کو جواب دینے کی مہلت دیے بغیر پھر شروع ہو گیا۔

"انہوں نے آپ کو اپنی زندگی بھر کی خدمت کا واسطہ دیا ہو گا۔ ہماری پرورش کرنے کا۔۔۔ اس گھر کو چلانے کا۔۔۔ آپ کی دیکھ بھال کرنے کا۔۔۔ اور آپ مان گئیں۔ آپ اپنے دل پر ضبط کر کے مجھے اجازت دے رہی ہیں کہ میں آپ کی خاطر۔۔۔" اس نے توقف کیا۔

"مجھے اس کی ضرورت نہیں ہے امی! زمل سے مجھے محبت نہیں تھی۔۔۔ بس صرف پسندیدگی تھی۔ اب وہ بھی نہیں ہے۔" بڑی نفاست سے اس نے جھوٹ بولا اس ہستی کے آگے جو ہر گد کے ایک ایک رمز سے بھی واقفیت رکھتی تھی۔

باقی کا وقت خاموشی میں گزرا۔ نگار نے مزید کوئی بات نہ کی۔ باسل بھی چپ رہا اور آرام آرام سے اسے اپنے ہاتھوں سے کھانا کھلاتا رہا۔ اس دوران دونوں کی آنکھیں نم رہیں۔

کھانا کھلا کر وہ برتن رکھنے کچن میں آیا۔ جب کچن کے شیلف پر دھرے بیاموں کی جوڑی پر اس کی نظر پڑی۔ جن کے اندر زل کے ہاتھوں سے بنی ہوئی کمچھیاں تھیں۔

"نانو۔۔۔ اس کے ساتھ چاول بوائل کیجیے گا۔۔۔ جب کھائیں گی تو مجھے یاد ہی کریں گی۔ تین ماہ بعد میں تو ہوں گی نہیں آپ کے پاس۔۔۔" اسے زل کی بات یاد آئی۔

"اور اگر تم بھی یہاں ہوئیں تو۔۔۔" اس نے شوخی سے پوچھا تھا۔ زل کوئی جواب نہیں دے سکی تھی۔

یہ سب یاد کر کے وہ مسکرا بھی نہیں سکا۔ حالات بعض اوقات اس طور بدلتے ہیں کہ انسان خوش گوار یادوں پر بھی خوش نہیں ہو سکتا۔ وہ یادیں مرتبانوں میں بند خراب اچار کی طرح تلخ اور بدبودار ہو جاتی ہیں۔

اس نے دونوں بیاموں کو دیکھا۔ نانو شاید آج رات میں یہ ہی ڈش کھلانے کا ارادہ رکھتی تھیں تب ہی وہ کافی خوش تھیں۔ اور باقی ساری تیاری بڑے جی جان سے کر رہی تھیں۔ باسل کو دونوں باتوں پر غصہ آیا۔ ان کی خوشی پر بھی اور ان کی تیاری پر بھی۔

لمحے بھر رک کر سوچے بنا اس نے ہاتھ کے ایک ہی جھٹکے سے دونوں بیاموں کو شیلف سے نیچے گرا دیا چھناکے کی آواز گونجتی ہوئی باہر نکل گئی۔ سفید اور سیاہ ٹکڑے ٹوٹ کر آپس میں مل گئے اور ان کے اندر سے کمچھیاں نکل کر فرش پر پھیل گئیں۔

"کیا ہوا؟" نانو تیز تیز چلتی ہوئی کچن میں آئیں۔ سفید سیاہ ٹکڑے اور کمچھیوں کے بکھرے ہونے کا منظر انہوں نے دیکھا اور وہاں کھڑے باسل کو۔

"ہاتھ لگا اور یہ جار گر گئے۔" اس نے بنا شرمندگی کے کہا۔ "پتا ہی نہیں چلا بس۔۔۔" نانو کچھ لمحے تو بکھرے ہوئے ٹکڑوں کو دیکھتی رہیں۔ پھر پلیٹ چمچ پکڑ کر انہوں نے اوپر اوپر والی کمچھیاں اٹھا لینی چاہی تھیں۔ باسل ان کی اس پھرتی پر اپنے ناگوار تاثرات چھپا نہ سکا۔ یہ اس کی غضب ناک نظروں کی تپش ہی تو تھی شاید جو نانو نے کام ادھورا ۔۔۔۔ ہی چھوڑ دیا۔

"یہ خراب ہو گئی ہیں۔ دیکھو۔۔۔ دیکھو ان میں کیڑے پڑ گئے ہیں۔" انہوں نے پلیٹ باسل کے آگے کی۔ ایک ناگوار بدبو باسل کے ناک میں گھسی۔

"جی۔" اس نے مختصر جواب دیا۔ اور منہ پرے کر لیا۔ وہ نانو کے ساتھ اس نقصان پر ماتم کرنے کے موڈ میں نہیں تھا۔ حالانکہ نانو کی آنکھوں سے چھلکتے آنسو اسے نظر آ گئے تھے۔ پلیٹ ہاتھ میں پکڑے وہ لیس دار گودے کو یوں گھورے جا رہی تھیں جیسے ان کا سب ہی کچھ لٹ گیا ہو اور صرف یہ ہی باقی بچا ہو۔ کیا انہیں بدبو نہیں آ رہی تھی۔

اسے نانو کے اس دکھ کی وجہ سمجھ میں نہ آسکی۔ کیا نانو کے آنسو اس باعث تھے کہ دونوں بیام ٹوٹ گئے تھے جو باسل نے انہیں دیے تھے یا ان آنسوؤں کی وجہ کمچھیوں کا خراب ہو جانا تھا جو زل نے بنائی تھیں۔

✡ ✡ ✡

چھ ماہ بعد

پیرس۔

"ناراض ہو۔۔۔" وہ پیار سے پوچھ رہا تھا۔ زل نے چہرہ اس کی طرف نہ کیا۔ وہ آج آیا تھا۔ پورے سات ماہ بعد۔۔۔ اسے اتنا طویل انتظار کروانے کے بعد۔۔۔ یہ کچھ خدا کا کرم ہی تھا کہ اب تک اس کی موت واقع نہیں ہوئی تھی۔ وہ کھڑکی سے باہر دیکھتی رہی۔ آنکھوں میں شکوے اور آنسو لیے۔

"کیا نہیں ہونا چاہیے۔۔۔؟" الٹا اس نے سوال کیا۔ اس کے انتظار میں اس نے جو اذیت خود کو دی تھی اب اسے وہ رہ رہ کر یاد آ رہی تھی۔ انسان جب خود پر افسوس کرنے لگے تو اس وقت وہ سب سے زیادہ ترس کے قابل ہوتا ہے۔

"ہونا چاہیے۔۔۔ ضرور ہونا چاہیے۔۔۔ میں نے جو

کیا غلط کیا۔ لیکن میری غلطی میری محبت سے بڑی ہرگز نہیں ہے۔" باسل نے کھڑکی کے پٹ پر رکھے اس کے ہاتھ پر اپنا ہاتھ رکھ دیا اور اتنی مضبوطی سے رکھا کہ وہ چاہ کر بھی اپنا ہاتھ نکال نہ پائی اور ساکت کر رہ گئی۔ مہینوں بعد ایک بار پھر سے۔ کیا وہ یہ ہی نہیں چاہتی تھی کہ وہ سمٹے۔ دوبارہ بکھرے اور دوبارہ سمٹے اپنے خیالات پر اسے رونا آیا۔

"میں اس وقت غصے میں تھا۔ یہ سب نہ کرتا تو کیا کرتا؟"

"سب کچھ کرتے مگر میری محبت کو رسوا نہ کرتے۔" اس نے سوچا پر کہہ نہ سکی۔

"لیکن مجھے بعد میں احساس ہوا کہ میں غلط ہوں۔۔۔ تمہارا کوئی قصور نہیں تھا۔ کسی کا بھی قصور نہیں تھا۔۔۔ شاید وقت کا قصور تھا اور پھر جب وہ قصوروار برا وقت گزرا تو مجھے احساس ہوا کہ۔۔۔"

"یہ احساس کس نے دلایا تمہیں باسل۔۔۔" اس نے پوچھا۔ "نانو نے، نگار آنٹی نے یا ایثار بھائی نے۔۔۔؟"

"تنہائی نے۔۔۔" اس نے اسے کندھوں سے تھام کر اس کا رخ اپنی طرف موڑ لیا جیسے پتھر کے مجسمے کو اس نے اپنی طرف موڑا۔

"میری طرف دیکھو زنل۔۔۔" ٹھوڑی کو چھو کر اس نے اس کا چہرہ اوپر اٹھایا۔ زنل کی آنکھیں چھلکیں۔

"سب بھلا دو زنل۔" وہ التجا آمیز محبت بھرے لہجے میں بولا۔ باری باری اس نے اس کی دونوں آنکھیں صاف کیں۔

"وقت لگے گا باسل۔"

"نانو انتظار کر رہی ہیں۔۔۔ امی ایثار اور میں بھی۔"

"میں ابھی تمہارے ساتھ نہیں جا سکتی باسل۔"

"ستا رہی ہو۔۔۔ بدلہ لے رہی ہو نا؟"

"سمجھنے کی کوشش کر رہی ہوں۔"

"مجھے؟"

"نہیں، محبت کو۔"

"میں آگیا ہوں نا واپس۔۔۔ سوری بھی بول دیا ہے پھر اب تم کیوں اتنی سنگ دل بن رہی ہو۔"

"سنگ دلی وراثت میں تھوڑی نا ملتی ہے باسل! جس کے وارث صرف تم ہی ہو سکتے تھے، کچھ جذبوں کے سوداگر زبردستی اسے آپ کو فروخت کر دیتے ہیں۔"

"نانو جیسی باتیں کرنے لگی ہو۔"

"اتنا عرصہ ان کے ساتھ رہی اثر تو لینا ہی تھا۔"

"اور جو اثر اس سے پہلے کے تھے کیا انہیں تم نے بھلا دیا؟"

"وہ مجھ سے کھو گئے۔"

"آؤ انہیں دوبارہ تلاش کرتے ہیں۔" اس نے اس کے دونوں ہاتھ اپنے۔۔۔ ہاتھوں میں تھام لیے اور اس کی آنکھوں میں جھانکنے لگا۔ زنل کا سارا وجود بھربھری مٹی بن گیا۔ بے اختیار ہی باسل کے کندھے پر اپنا سر رکھ کر وہ رونے لگی۔ جیسے میلوں پیدل چل کر آرہی ہو اور یہاں آکر اس نے دم لیا ہو۔

وہ جادوئی خوشبو والے پھولوں کے ان باغات میں گم ہو گئی جہاں سے باہر نکلنے کے راستے انسان ہمیشہ ہی کھو دیتا ہے۔ وہ نظر آبھی جائیں تو انہیں نظرانداز کر دیا جاتا ہے۔ آگے ہی آگے بڑھا جاتا ہے۔ کندھے پر سر رکھے وہ بھی نجانے کتنی دور نکل گئی تھی۔ واپس لانے کے لیے میڈ کو بھرپور قوت سے اسے ہلانا پڑا۔

"مس زنل!" وہ اسے ہلاتے ہوئے مسلسل پکار بھی رہی تھی۔ جھٹکے سے زنل نے اپنی آنکھیں کھولیں۔ اپنے اردگرد دیکھا اور پھولوں سے سجا باغ اس کی آنکھوں کے آگے جل کر خاکستر ہو گیا۔

"مس زنل!" میڈ نے افسردگی سے اسے پکارا۔ وہ چند لمحے بیگانگی سے اسے دیکھتی رہی۔ جیسے پہچان نہ پا رہی ہو۔

کرسی پر جھولتے جھولتے ہی وہ نجانے کب سو گئی تھی۔ ملازمہ نے اس پر کمبل ڈال دیا تھا۔ وہ اب اسی کمبل میں منہ چھپا کر رونے لگی۔ اگر اس نے اسے چھوڑ ہی دیا تھا تو وہ اس کے ساتھ کیوں چلا آیا تھا۔ کیوں اس کی خوشبو گھر میں چاروں طرف پھیلی تھی۔ اس کی

باتیں۔ اس کے قہقہے سب اس کے ساتھ ہی چلے آئے تھے۔ ان سب سے اس کا دامن نہیں چھوٹ رہا تھا۔ وہ کفن میں لپیٹ کر قیامت تک کے لیے دفن کردیتی' اگر یہ بات اس کی سمجھ میں آجاتی کہ وہ کفن میں کس کو لپیٹے۔ یادوں کو یا خود کو۔۔۔؟

میڈ کافی دیر تک اس کے چپ ہوجانے کا انتظار کرتی رہی تھی۔

''وہ نہیں آئیں گے لیکن آپ کو جانا ہے۔'' میڈ نے کہا۔

''کہاں۔۔۔؟'' اس نے باقی ماندہ آنسو بھی کمبل میں جذب کیے۔

''ویسی نار میں۔۔۔ آپ نے ان سے ''ہاں'' کہا تھا۔''

''ہاں۔۔۔ ٹھیک ہے۔ میں جاؤں گی۔'' اپنے اوپر سے کمبل پرے دھکیل کر وہ ایک عزم سے اٹھی۔ ''اگر اس نے مجھے بھلا دیا ہے تو میں بھی اسے بھلا دوں گی۔ میں اب آگے بڑھوں گی۔ یہ ناکام محبت میرا راستہ نہیں روک سکتی۔'' وہ اپنے کمرے میں آئی اور وارڈ روب کھول کر آج کے لیے لباس منتخب کرنے لگی۔ اس کے ہاتھ وہ ڈریس بھی آیا جو نانو نے اس کے بیماری سے صحت یاب ہوجانے کے بعد اسے پہننے کے لیے کہا تھا۔ وہ آج بھی اسے پہن لیتی۔ اگر مکمل صحت یاب ہو چکی ہوتی۔

پاکستان سے آنے کے بعد کافی ہفتوں تک اس کے بیگز ویسے ہی بند پڑے رہے تھے۔ میڈ نے اس سے بارہا ان کے بارے میں پوچھا تھا اور اس نے کبھی کوئی خاطر خواہ جواب نہیں دیا تھا۔ میڈ نے ایک دن وہ کام خود ہی کرلیا تھا۔ اسے اس بات کی پروا بھلا کب تھی کہ اس کی کون سی چیز اس گھر میں رہ گئی تھی۔

لیکن آج بڑے عرصے بعد اپنے وارڈ روب کی جانچ کرتے وقت اسے اندازہ ہوا کہ اس کی ایک ذرہ برابر چیز بھی وہاں نہیں رہ گئی تھی۔

''کیا آپ وہاں سے بہت عجلت میں نکلی تھیں' چیزیں بری طرح بیگز میں ٹھونسی ہوئی تھیں۔'' میڈ نے اس کے بیگز کھولنے کے بعد اسے کہا تھا۔ یہ عجلت اس نے نہیں باسل نے دکھائی تھی اور ایسی عجلت میں بھی اس نے اس کی تمام چیزوں کو اس کے ہمراہ کیا تھا۔ مکمل ایمانداری سے۔ یا پھر وہ اپنے گھر میں اس سے 'جڑی' اس کی یاد دلانے والی کوئی چیز رکھنا ہی نہیں چاہتا تھا۔ لیکن کیسی عجیب بات تھی اس نے سامان میں وہ آرائشی بوتل تو رکھی ہی نہیں تھی جو اس نے خود اسے دی تھی۔ جس کے بادبان پر سنہری تحریر رقم تھی۔ اس کو تاعمر اپنا لینے کی۔ کیا وہ آرائشی بوتل زمل کی نہیں ہوگئی تھی۔ کیا باسل سارے تعلقات ختم کرنے کے بعد بھی اتنا حق رکھتا تھا کہ اس کو دی گئی چیز اپنے قبضے میں واپس رکھ سکے۔

ایک جھوٹی آس سے وہ بوتل۔۔۔ تلاش کرنے لگی' پھر اس نے میڈ کو وہاں بلایا۔

''کیا بیگز کا تمام سامان یہاں موجود ہے؟''

''جی مس زمل۔'' میڈ نے جواب دیا۔ چند لمحوں بعد جیسے اسے کچھ یاد آگیا۔

''کچھ اور بھی تھا۔ وہ باہر ہال کے کیبنٹ میں ہے۔'' دونوں باہر ہال میں نکل آئیں۔ میڈ نے کیبنٹ کھول کر اسے ایک وزنی پارسل تھمایا۔ جسے دیکھ کر وہ دھک سے رہ گئی۔ شطرنج کی وہ پیکنگ کھلی ہوئی تھی جو اس نے خصوصی طور پر تیار کروائی تھی۔

''کیا اسے آپ نے کھولا ہے۔''

''نہیں مس زمل۔۔۔ یہ ایسے ہی تھا۔'' زمل نے ڈبے سے شطرنج نکال لی۔ سلیمانی زردکی بساط کے اندر سنگ سرخ سے لکھے ہوئے تین لفظ۔۔۔ نقوش اور محبت کا جوڑ۔۔۔ زمل کو بے اختیار ہنسی آئی۔ ''یقیناً'' باسل اس کا سامان پیک کرتے وقت اس شطرنج کو دیکھ چکا تھا۔ کارڈ کے اوپر اسی کا نام تو لکھا ہوا تھا۔ اس نے اسے کیسے نہ دیکھا ہوگا۔ اور اس نے جذبوں اور لفظوں دونوں کی لاج نہیں رکھی تھی۔

''ایسی شطرنج پھر کبھی کھیلی نہیں جائے گی۔ اس پر کوئی بازی نہیں لڑی جاسکے گی۔'' کاریگر نے اس سے کیا خوب بات کہی تھی' جس کا اندازہ اسے اب ہو رہا

تھا۔

"ایسی شطرنج صرف محبت کرنے والوں کے لیے ہوگی اور اس پر کون سی بازی لڑی جاتی ہے۔ وہ بخوبی جانتے ہوں گے۔" تب اس نے سوچا تھا۔ خود کو جواب دیا تھا۔ ایک جواب اس سے بھی بڑھ کر باسل نے اسے دیا تھا۔ اس نے واقعی اس پر وہ بازی لڑی تھی جس کی اگلی چال زمل کے پاس نہیں تھی۔ وہ پہلی ہی چال کے بعد ہار گئی تھی۔

اس نے شطرنج کو اپنے سینے سے لگالیا۔

ٹھیک ہے۔ اب وہ بھی باسل سے جڑی۔ اس کی محبت کی یا اس گھر کی یاد دلانے والی ہر چیز اپنی زندگی سے ختم کردے گی۔ وہ شطرنج سینے سے لگائے باہر جانے لگی تو میڈ نے اسے روکا۔

"مس زمل ایک یہ بھی ہے۔" میڈ کو اس کے ارادے کہاں پتا تھے۔ اس نے ایک سلیمانی کا ہی کا ہرن اس کی طرف بڑھایا جو نانو نے اسے دیا تھا۔ پہلی ملاقات پر۔ اس نے اسے بھی پکڑلیا۔

"یہ باسل کی نظروں سے کیسے بچارہ گیا۔ کیا یہ باسل کی فیاضی ہے یا بھول۔ جو بھی تھا اب اسے ان دونوں چیزوں کی ضرورت نہیں تھی۔ دونوں چیزوں کو تھامے گھر سے باہر نکل کر پیدل چلتے ہوئے وہ دریائے سین کے پل تک آئی۔

شطرنج کو اس نے آخری بار دیکھا۔ آنکھیں میچ کر آنسو ضبط کیے اور دریا کی طرف اچھال دیا۔ چھپاکے کی مدھم سی آواز آئی اور پلک جھپکتے میں شطرنج ڈوب کر غائب ہوگئی۔ طمانیت کا سانس اس کے وجود سے برآمد نہ ہوسکا۔ بڑی دیر تک وہ ڈوب چکی شطرنج پر گزرتے پانی کو دیکھتی رہی۔ وہ یہ سب کرکے سب بھلا دے گی۔ اس کی سوچ غلط تھی۔ اسے احساس ہوگیا۔ پھر بھی اس نے اپنی سوچ پر زیادہ دکھ نہ کیا۔ گہرے سبز ہرن کو بھی اس نے ایک آخری بار دیکھا۔

"اس کا رنگ تمہاری آنکھوں سے بھی ملتا ہے۔ کاہی رنگ۔" نانو نے اسے دیکھتے ہوئے کہا تھا۔ یاد کرتے ہوئے اس کے دل کے چاروں وال جیسے بند ہوگئے۔ ہرن کو پانی کی نذر کرنے ہی والی تھی کہ ایک اور آواز آئی۔

"اس کا رنگ نانو کی آنکھوں سے بھی تو ملتا ہے۔"

نجانے کہاں سے اور ایک دم سے وہ بھاری سی آواز سنتے ہی وہ چونکی۔ گھبرا کر اس نے اپنے دائیں بائیں دیکھا۔ وہاں کوئی نہیں تھا پھر یہ آواز کہاں سے آئی تھی۔

سین کے پانی میں جوار بھاٹا قید تھا۔ اس کی لہریں طوفانی ہورہی تھیں۔ ہرن کو اس نے واپس سینے سے لگالیا۔ اس نے اس کو پھینکنے کا ارادہ فی الحال ترک کردیا تھا اور اب وہ کچھ اور سوچنے لگی تھی۔

پل پر کھڑے دریا کی لہروں کو دیکھتے دیکھتے اور سوچتے سوچتے اسے پورا ایک گھنٹہ بیت گیا۔ وہ کسی موی مجسمے کی طرح وہاں بے حس و حرکت کھڑی رہی۔ دن کے خدوخال ڈھلتے وقت کے باعث بدلے تو اسے ہوش آیا۔ تیز تیز قدموں سے چلتی ہوئی وہ گھر واپس آئی۔ اس کا سانس پھولا ہوا تھا۔ خود کو نارمل کرنے کا انتظار کرنا بھی اس نے گوارہ نہ کیا اور نانو کی دکان کا نمبر ملانے لگی۔

☆ ☆ ☆

انارکلی بازار کے اندر داخل ہوکر یشار نے دکان کے سامنے اپنی کار روکی۔ رات کے وقت چونکہ بازار میں رش کم ہوجاتا تھا۔ اس لیے یشار اپنی کار پارکنگ ایریا میں کھڑی کرنے کے بجائے بازار کے اندر ہی لے آتا تھا۔ نانو کو دکان سے لانے اور چھوڑنے کی ڈیوٹی اب وہ نبھانے لگا تھا۔ باسل اور نانو کے درمیان سرد جنگ چل رہی تھی اور یشار گھر کا ماحول خوش گوار رکھنے کی حد درجہ کوششیں کررہا تھا۔ حسب معمول آج بھی وہ نانو کو لینے ہی آیا تھا' لیکن آج کا دن عام ثابت نہیں ہوا تھا۔ کار سے نکلتے اور دکان کے دروازے کے ہینڈل کو تھامنے تک کے وقت کے اندر ہی وہ سخت پریشانی میں گھر چکا تھا۔ اس کی پریشانی کی دو وجوہات تھیں۔ ایک تو

وہ بینر جو دکان کے شٹر کے ساتھ آویزاں تھا دوسرا نانو... جنہیں کار سے نکلتے وقت وہ شیشے کی دیوار سے پرے فون پر کسی سے باتیں کرتے ہوئے اور زار زار روتے ہوئے دیکھ چکا تھا۔ دروازہ کھول کر یشار دکان کے اندر داخل ہوا تو نانو اسے دیکھ کر گھبرا سی گئیں۔ وہ شاید فون بند ہی کرنے والی تھیں۔ یشار کو اپنے سامنے کھڑا پا کر انہوں نے یہ کام جلد ہی کر لیا۔ انتہائی تیزی سے... یشار بغور انہیں دیکھتا رہا۔

"کس کا فون تھا نانو؟" اس نے پوچھا۔

"کسی کا نہیں...؟" نانو نظریں چرا گئیں۔ یشار کی تشویش مزید بڑھی۔

"آپ رو رہی ہیں..." نانو نے کوئی جواب نہ دیا اور دائیں بائیں نجانے کیا تلاش کرنے لگیں۔

"نہیں بتانا چاہتیں؟" اس نے یہ کہہ کر پھر سے پوچھنا چاہا۔

"کہا نا کسی خاص کا نہیں۔" اس کی فکرمندی کو نظرانداز کر کے نانو نے کاؤنٹر کی دراز سے دکان کی چابیاں نکال لیں۔ یشار خاموش ہو گیا۔ وہ زبردستی جواب نہیں مانگ سکتا تھا۔

کاؤنٹر سے باہر نکل کر نانو نے ایک ایک کر کے ساری بتیاں بجھائیں۔ کارخانے کا دروازہ بند کیا۔ پھر دکان سے نکل کر دکان کا دروازہ بھی لاک کرنے لگیں۔

"تم مت آیا کرو یشار مجھے لینے... سارا دن کلینک میں سر کھپاتے ہو پھر یہاں آتے ہو۔ اگر وہ نہیں آنا چاہتا تو کوئی بات نہیں' میں آجایا کروں گی رکشے میں۔"

"پھر سے وہی بات' کہا نا میں کلینک میں اتنا بھی نہیں تھک جاتا کہ آپ کو لینے نہ آسکوں اور رہی بات "اس کی" تو یہ آپ دونوں کا آپس کا معاملہ ہے۔ وہ پہلے بھی آپ سے کئی بار ناراض ہو چکا ہے اور آپ اس سے۔" یشار نے پیار سے کہا۔ اس دوران وہ فون والی بات کو بے معنی خیال کرتے ہوئے یکسر فراموش کر چکا تھا۔

"میں تو نہیں ہوں ناراض اس سے۔ وہ ہی نجانے کیوں دور ہو گیا ہے مجھ سے۔" نانو کی آنکھیں جھلملائیں۔

"اتنی اداس مت ہوں نانو! آپ ہی تو کہتی ہیں کہ باسل پہلے کام خراب کر دیتا ہے۔ بعد میں ہنس کر دکھا دیتا ہے۔ شرمندہ بھی نہیں ہوتا۔"

"زندگی جوٹ کا گلدان نہیں یشار! کہ کام خراب ہو گیا تو درست بھی ہو جائے گا۔ بل کے ابھاروں سے اوپر اگلے بل کے ابھار نہ بھی ہوئے تو سلسلہ چلتا رہے گا۔"

"اچھا تو پھر زندگی کیا ہے؟" اس نے مصنوعی مسکراہٹ سے پوچھا۔ وہ نانو کا دھیان بٹانا چاہتا تھا۔

"شاید مور پنکھ۔" نانو سوچتے ہوئے بولیں۔ "بیک وقت نازک بھی خوشنما بھی اور نظر کا دھوکا بھی۔ جنہیں سمیٹ کر رکھنے کے لیے ہر وقت بڑی احتیاط کی ضرورت رہتی ہے۔" نانو خلا میں دیکھنے لگیں۔

"وہ آپ سے ناراض نہیں ہے' آپ جانتی ہیں۔ صرف غلط فہمی کا شکار ہے۔"

"بے لوث محبت میں غلط فہمیاں بلاوجہ نہیں پنپتیں... دھرتی میں پیوند ہوتا ہے۔ تب ہی غلط فہمی کی فصل اگتی ہے۔" یشار خاموش ہو گیا۔ اس کے پاس نانو کی باتوں کا جواب نہیں تھا۔

"چلتے ہیں نانو"

"ہاں' ٹھیک ہے۔" دونوں کار میں جا بیٹھے۔

"دکان پر یہ بینر کیوں لگا ہے نانو؟" کار اسٹارٹ کرنے سے پہلے یشار نے پوچھا تو نانو کھڑکی سے باہر دیکھنے لگیں۔

"تم نے پڑھ تو لیا ہے اسے یشار۔" نانو نے بے چارگی سے کہا۔

"ہاں... لیکن..." یشار پوچھتے پوچھتے درمیان میں ہی خاموش ہو گیا۔ نانو کے چہرے سے عیاں تھا کہ وہ اس موضوع پر گفتگو ہی نہیں کرنا چاہتیں۔

☼ ☼ ☼

باسل اب وقتاً فوقتاً ہمایوں ماموں سے بات چیت کرتا رہتا تھا۔ گھر میں اتنا سب کچھ ہو گیا تھا۔ ہمایوں

ماموں نہ صرف دور تھے بلکہ ہر چیز سے بے خبر بھی تھے۔ ان کا باخبر ہونا بھی بے کار تھا۔ وہ بھلا کیا کرسکتے تھے۔ انہوں نے باسل کی ساری بات سنی تھی اور وہ پھر بھی خاموش رہے تھے۔ وہ ان تمام حالات پر کسی طرح ردعمل ظاہر کریں ان کی سمجھ سے بالا تھا۔ اس کے باوجود باسل جب جب انہیں فون کرتا وہ بڑی توجہ سے اس کی باتیں سنا کرتے۔ وہ بے شک دور تھے، لیکن انہیں اس بات کا بخوبی اندازہ تھا کہ باسل کے پاس اپنی بات سنانے کے لیے ان کے علاوہ اور کوئی نہیں ہے۔ اس بات چیت کے دوران انہوں نے باسل کو آج یہ مشورہ دیا تھا کہ وہ سب کراچی شفٹ ہوجائیں۔ کلینک اور ہنڈی کرافٹس... دونوں کام کراچی میں بھی کیے جاسکتے ہیں اور دونوں کا اسکوپ یقیناً کراچی میں زیادہ بھی ہے۔

ہمایوں پہلے بھی بارہا یشار اور باسل کو کراچی شفٹ ہوجانے کا کہتے رہے۔ جس پر دونوں نے ہی کبھی سنجیدگی سے غور نہیں کیا تھا، لیکن اس بار ان کا یہ مشورہ جیسے باسل کی ضرورت بن گیا تھا۔ وہ یہاں سے بھاگ جانا چاہتا تھا۔ اس شہر نے اسے بے زار کرکے رکھ دیا تھا یا شاید کسی اور نے۔

اس نے اسی وقت یشار سے اس حوالے سے بات کی۔

"ٹھیک ہے، اگر نانو کو کوئی اعتراض نہ ہو تو میں بھی راضی ہوں۔" یشار نے رضامندی دے دی تھی۔ باسل جس ذہنی کیفیت سے گزر رہا تھا۔ اسے اس کا بخوبی اندازہ تھا۔ وہ ان دنوں کم ہنس رہا تھا۔ کم بول رہا تھا۔ سنجیدہ ہوگیا تھا۔ جیسا یشار اسے کبھی دیکھنا چاہتا تھا۔ وہ کام بھی ذمہ داری سے کرنے لگا تھا۔ کلینک میں وقت کی پابندی سے آتا جاتا تھا۔ پھر بھی نجانے کیوں یشار اسے اپنی مطلوبہ ڈیمانڈ کے مطابق دیکھ کر بھی خوش نہیں ہوسکا تھا۔ وہ خود بھی باسل کی طرح ان دنوں عجیب طرح کے حالات سے گزر رہا تھا۔

باسل نے زل کو گھر سے نکال دیا تھا۔ اس بات کو سات ماہ کا طویل عرصہ گزر چکا تھا اور وہ ابھی تک اس حوالے سے اپنا ردعمل طے ہی نہیں کرپایا تھا۔ کبھی وہ باسل پر غصہ ہونا چاہتا۔ کبھی وہ اس بات کا باسل سے ہی واسطہ سمجھتا۔ وہ زل کے دفاع میں بولنا چاہتا تھا۔ نانو کی نسبت سے اور اپنی نسبت سے بھی۔ کچھ حقیقتیں اگرچہ نئی تھیں لیکن پرانی جڑوں کی طرح بہت مضبوط تھیں۔ وہ چاہتا تھا کہ باسل اس سے بات کرے۔ زل کے حوالے سے... جو کچھ ہوا! اس متعلق باسل نے یشار سے کوئی بات نہیں کی تھی۔ جواباً "باسل کی حالت کے پیش نظر یشار نے بھی اس موضوع پر بات کرنا مناسب نہیں سمجھا تھا۔

"میں آج ہی نانو سے بات کروں گا۔" باسل کہہ کر جانے لگا۔

"ہاں... ویسے بھی نانو نگار خانہ بیچ رہی ہیں۔" یشار نے باسل کو بتایا اور آفس سے باہر نکلتے اس کے قدم رک گئے۔

"کیا... ؟ نانو نگار خانہ بیچ رہی ہیں؟"

"ہاں۔"

"لیکن کیوں؟"

"پتا نہیں، تم نانو سے ہی پوچھ لو۔"

"نانو۔ ایسا کیسے کرسکتی ہیں... نگار خانے کا نام امی کے نام پر ہے اور نانو کو اختیار نہیں کہ وہ اسے بیچ دیں۔" باسل کی بات سن کر یشار کو دھچکا لگا۔ اس نے باسل کو اس لیے آگاہ کیا تھا کہ شاید یہ سن کر وہ نانو کے حوالے سے اپنے رویے میں لچک لے آئے، لیکن باسل کا رویہ اس کی سوچ کے بالکل الٹ ثابت ہوا تھا۔ وہ نانو کے اور خلاف ہوگیا تھا۔ یشار کو اپنی بات پر پچھتاوا ہوا۔ اب نجانے مزید کیا ہونے والا تھا۔

"نگار خانے کا نام نانو نے ہی رکھا ہے... تم نے یا میں نے نہیں..." یشار نے اسے جتایا۔ باسل سر جھٹکتا ہوا باہر نکل گیا۔

گھر آتے وقت اس نے کار کا رخ انار کلی کی طرف موڑ لیا۔ یشار ٹھیک کہہ رہا تھا۔ دکان کے باہر "برائے فروخت" کا بینر لٹک رہا تھا۔ تب ہی نانو بھی باہر نکلی تھیں۔ انہوں نے باسل کی کار کو نہیں دیکھا اور پیدل چلتے

ہوئے بازار کے اختتام تک پہنچ کر رکشہ روکنے لگیں۔ وہ شاید آج گھر جلدی جا رہی تھیں۔ باسل ان کے پیچھے پیچھے تھا، لیکن اس نے انہیں نہیں پکارا۔

تھوڑی دیر بعد جب وہ گھر واپس آیا تو اسے یہ دیکھ کر حیرت ہوئی کہ نانو ابھی تک گھر نہیں آئی تھیں اور اس سے بھی زیادہ حیرت اسے رات میں ہوئی، جب نانو یشار کے ساتھ ہی گھر واپس لوٹیں۔ بات اتنی بڑی نہیں تھی، لیکن باسل کو نانو کی سرگرمیاں مشکوک سی لگی تھیں۔

☆ ☆ ☆

بدلتا موسم سرگم کے راگوں کی طرح آہستہ آہستہ پروان چڑھ رہا تھا۔ دوپہریں لطیف سی گرم تھیں اور راتیں خواب ناک سرد۔ نانو پر موسم کا کوئی اچھا یا برا اثر نہ تھا۔ جو موسم گھر پر اپنے پنجے گاڑے بیٹھا تھا۔ اس نے انہیں باہر کے موسم کو محسوس کرنے کے قابل نہیں چھوڑا تھا۔

اپنے کمرے میں بیٹھی وہ دھلے ہوئے کپڑے تہہ کر رہی تھیں جب کمرے کے دروازے پر کوئی آکر کھڑا ہو گیا۔ نانو نے سر اٹھا کر دیکھا۔ وہ نگار تھی۔

"نگار۔" نانو نے خوشی سے پکارا اور اپنی جگہ سے اٹھیں۔

"اندر آؤ نا۔۔۔ ادھر بیٹھو۔" نگار آہستگی سے چلتی ہوئی اندر آئی۔

"بیٹھو نا یہاں۔۔۔" نانو نے کہا۔ نگار ان کے بیڈ پر بیٹھ گئی اور دائیں بائیں دیکھنے لگی۔

"کچھ کہنا چاہتی ہو؟" نانو خود بھی بیڈ پر اس کے قریب بیٹھ گئیں۔ انہوں نے اس کا ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لے لیا۔

"آپ نگار خانہ بیچ رہی ہیں۔" نگار نے پوچھا۔ نانو ایک لمحے کو گھبرا گئیں۔

"ہاں۔" فرش کو دیکھتے ہوئے انہوں نے سچ بتایا۔ وہ بھلا جھوٹ کیسے بول سکتی تھیں۔

"آپ ایسا کیوں کر رہی ہیں۔"

"میں اب نگار خانے کو نہیں سنبھال سکتی نگار۔"

"آپ خود کو سزا دے رہی ہیں۔"

"خدا کی سزا ختم ہوگی تو خود کو دینا شروع کروں گی۔"

"مت کریں ایسا۔"

"میں تھک چکی ہوں نگار! میری ہمت جواب دے چکی ہے۔ میں نے ہی اسے عروج پر پہنچایا اور اب اس کے زوال کی ذمہ دار بھی میں ہی ہوں گی۔ مجھ سے اب کوئی کام نہیں ہوتا۔ میں نے یہ فیصلہ بہت سوچ سمجھ کر کیا ہے۔ میں سب کچھ بھولنے لگی ہوں اور میں اس سزا کے خلاف اپیل نہیں کر سکتی۔" نانو کہہ کر چپ ہوئیں پھر دھیرے دھیرے آنسو بہانے لگیں۔

نگار کو مزید کچھ کہنا چاہیے تھا۔ کیا کہنا چاہیے تھا، اس کی سمجھ میں نہ آیا۔ وہ روتی ہوئی نانو کو دیکھتی رہی۔ جس کام کو کسی وقت میں انہوں نے بہت لگن سے شروع کیا تھا آج روتے ہوئے اس کا اختتام کر رہی تھیں۔

بعض اوقات ہمارے وجود کا سامنا ان ہواؤں سے ہوتا ہے جن میں برچھیاں، کٹاریاں اور درانتیاں پروئی ہوئی ہوتی ہیں۔ یہ ہوائیں ہمارے وجود کو کوئی گزند نہیں پہنچاتیں، لیکن ہمارے من کو زخمی کر دیتی ہیں۔ وہ چیزیں جن سے کچھ عرصہ پہلے تک ہمیں محبت ہوتی ہے۔ پھر ان ہی سے خوف آنے لگتا ہے۔ نانو کو بھی ایسا ہی خوف لاحق ہو گیا تھا۔ نگار خانہ کی بربادی کا۔۔۔ ان کی نظر میں اب یہ بربادی ہو کر ہی رہنی تھی۔ خواہ ان کے ہاتھوں ہوتی یا نگار خانہ کو بیچ کر۔

لیکن نگار خانہ بکنے سے پہلے ہی ان کے پاس زمل کا فون آگیا۔ جس نے سب کچھ بدل کر رکھ دیا۔

☆ ☆ ☆

اس دن شام کو باسل جلدی ہی گھر آگیا تھا۔ وہ تھکا تھکا سا نظر آرہا تھا۔ اس لیے یشار نے ہی اس سے کہا تھا کہ وہ گھر چلا جائے۔ کلینک سمیت پوری دنیا میں اس کا دل نہیں لگ رہا تھا۔ وہ کولہو کے بیل کی طرح طے شدہ اوقات بسر کر رہا تھا۔ وہ آج نانو سے بھی بات کرنا

چاہتا تھا کہ اب انہیں جلد ہی کراچی شفٹ ہو جانا چاہیے۔ پچھلے ایک ہفتے سے یہ بات کرنے والا معاملہ بھی لٹکا ہوا تھا۔

نانو آج دُکان پر نہیں گئی تھیں۔ انہوں نے چھٹی کی تھی اور شاید اس وقت وہ اپنے کمرے میں تھیں یہ سوچ کر وہ نانو کے کمرے کی طرف بڑھا۔ لیکن ان کے کمرے تک پہنچنے سے پہلے ڈرائنگ روم کے دروازے پر ہی اس کے قدم رک گئے۔ اندر سے آتی دو نسوانی آوازوں نے اس کے قدموں کو جکڑ لیا تھا۔ ایک آواز نانو کی تھی اور دوسری...... وہ اس آواز کو اتنی جلدی فراموش نہیں کر سکتا تھا۔

وہ باہر ہی کھڑا رہ گیا۔ تھوڑی دیر بعد زمل باہر نکلی۔ دروازے پر اسے کھڑا دیکھ کر وہ چونکی اور ساکت رہ گئی۔ باسل نے اپنی نظریں چرانے کی کوشش نہ کی، نہ اس پر سے ہٹانے کی۔

شام جس میں ہلکی آنچ کی رمق تھی اچانک سے اس میں تیز آنچ کا ابال آگیا۔ ان دونوں کے درمیان سے نکل کر اندھیرا باہر سوچھانے لگا۔ غیر ارادی طور پر ہی سہی۔ دونوں ایک دوجے کے اتنے قریب ہو چکے تھے کہ ایک دوجے کی سانسوں کی آواز کو گہرائی سے محسوس کر سکتے تھے۔ وہ لمحہ بڑا طویل تھا۔ اور اس لمحے میں ماضی کے کسی سنہری لمحے کی خوشبو تھی۔

زمل کی آنکھوں میں کوئی سوال نہیں تھا۔ کوئی مطالبہ نہیں تھا۔ وہ ٹھوس مٹی کی طرح بے تاثر تھی۔ پھر بھی اس لمحے کے اختتام تک پہنچتے پہنچتے اس کی آنکھوں کی نمی اندھیرے میں چمکی۔ اور اس سے پہلے کہ وہ اپنی ذات کے مزید بھید باسل پر آشکار کرتی...... بنا کچھ بولے وہ خاموشی سے باہر نکل گئی۔ باسل بہت دیر تک وہیں کھڑا رہا۔

"زمل یہاں کیا کرنے آئی تھی؟" اسے اس سوال کا جواب شدت سے چاہیے تھا۔ اس نے چاہا کہ وہ اس بات کو غصے سے سوچے۔ زمل کے یہاں آنے پر اپنی برہمی کا اظہار کرے۔ لیکن وہ ایسا کر نہ سکا۔ خود کو حد درجہ نارمل رکھتے ہوئے وہ ڈرائنگ روم کے اندر داخل ہوا۔ اور ایک بار پھر سے ٹھٹک کر رہ گیا۔

نانو رو رہی تھیں۔ باسل کو دروازے میں کھڑا دیکھ کر انہوں نے جلدی جلدی چادر سے اپنے آنسو صاف کیے۔ جیسے باسل نے انہیں کوئی چوری کرتے ہوئے پکڑ لیا ہو۔ وہ باسل سے ڈر گئیں۔ دروازے میں کھڑا وہ انہیں غضب ناک نظروں سے دیکھ رہا تھا۔

"آ گئے باسل تم۔" نانو نے بمشکل مسکراتے ہوئے پوچھا۔ باسل کو مزید غصہ آیا۔ پھیکی مسکراہٹ اور ہمیشہ کا رٹا رٹایا جملہ "آ گئے باسل" نانو کے پاس اس کو خوش آمدید کہنے کے لیے صرف یہ ہی بچا تھا۔ فریبی جذبے...... اور اپنے اصل خزانے وہ زمل کی آمد پر خرچ کر رہی تھیں۔

نانو کا اٹھ کر اس کے قریب سے گزرتے ہوئے باہر جانا مشکل ہو گیا۔ نانو جانتی تھیں وہ آج کل ان کی محبت کو خوب تول رہا ہے۔

"ٹھیک ہے۔ وہ نانو کی کچھ لگتی ہے۔ اور نانو کو اس سے کبھی کبھی مل لینے کا حق ہے۔" اپنے کمرے میں آ کر منہ پر پانی کے چھپاکے مارتے ہوئے باسل سوچنے لگا تھا۔

✲ ✲ ✲

"زمل یہاں ہے...... پاکستان میں۔" یہ بات اس کے ذہن سے نکل نہیں پا رہی تھی۔ اس کا کام بھی اس کی طرح انتشار کا شکار ہونے لگا تھا۔ جھنجھلاتے ہوئے وہ اٹھا اور اس نے کھڑکی کے بلائنڈز اٹھا دیے۔ باہر کی تیز دھوپ اندر آ کر اس کی آنکھوں میں چبھی۔

ٹھیک ایک سال پہلے یشار نے یہاں پر ہی اسے اپنا آئی ڈی "ہیک کرتے ہوئے" پکڑ لیا تھا۔ تب اسے زمل تک رسائی حاصل کرنے کی کس قدر چاہ تھی۔ اور کیسا عجیب اتفاق ہوا تھا کہ وہ خود ہی یہاں آ گئی تھی۔

"تم اسے ایئرپورٹ سے پک کر کے کسی اچھے سے ہوٹل میں چھوڑ آنا۔ اس کے لیے یہ جگہ، یہ شہر بالکل نیا ہے۔ اسے کوئی پریشانی نہیں ہونی چاہیے۔" یشار نے اسے تاکید کی تھی۔ اس نے ایسا ہی کیا تھا۔ اس

نے کوئی پریشانی اس کے قریب نہیں آنے دی تھی۔ اور اب خود پریشان ہو کر بیٹھا تھا۔ ایک ایک کر کے اسے سب کچھ یاد آنے لگا۔ یا وہ انہیں خود یاد کرنے لگا۔

"آپ اسے یہاں رکھ لیں نا نانو! ہمارے گھر' وہ ہم سب کے ساتھ رہے گی۔" اور نانو نے اس کی بات مان لی تھی۔ یاد کر کے اسے ہنسی آئی۔ پھر اپنی ہنسی پر غصہ' کاش نانو اس کی بات نہ مانتیں۔ انکار کر دیا ہوتا..... خود بھی تو ٹوٹ گئی ہیں اب۔ وہ کس کو دوش دیتی ہوں گی؟ شاید باسل کو ہی۔

ٹیبل پر پڑا ایشار کا موبائل ایک دم سے بجا تو اس کے خیالات کی دھند خود بخود ہی چھٹی۔ بلائنڈ رز دوبارہ گرا کر وہ ٹیبل تک آیا۔ گھر کے نمبر سے نانو کی کال آ رہی تھی۔ باسل نے ریسیو کرنا چاہی لیکن پھر یہ سوچ کر موبائل واپس رکھ دیا کہ "نانو کو ییشار سے ہی کام ہو گا۔ اگر انہیں مجھ سے کوئی بات کرنی ہو گی تو وہ میرے نمبر پر کال کریں گی۔" پچھلے کافی مہینوں سے جو سرد مہری دونوں کے مابین چلی آ رہی تھی۔ وہ ابھی ختم نہیں ہوئی تھی۔ کم از کم باسل کی طرف سے۔

موبائل بند ہو کر پھر سے بجنے لگا۔ ییشار آفس کے اندر آیا تو اسی نے فون ریسیو کیا۔ "جی نانو!"

"ییشار!" نرمی مگر عجلت سے اس کا نام پکارا گیا۔ اور یہ آواز نانو کی نہیں تھی۔

"گھر آؤ..... جلدی' باسل کو بھی لے آنا۔" ییشار کے چہرے کا رنگ بدل گیا۔

"کیا ہوا؟ کیا کہہ رہی ہیں نانو۔" باسل نے بظاہر غیر دلچسپی سے پوچھا جبکہ حقیقتاً اس کی ساری توجہ ییشار کی ہی طرف تھی۔

"نانو نہیں' امی کی کال تھی۔" اس نے باسل کو بتایا۔ "انہوں نے فوراً بلایا ہے۔" دونوں کے چہرے حیرت اور پریشانی سے سرخ ہو گئے۔

☆ ☆ ☆

نانو کا خط۔

"نگار' میری بیٹی۔ ییشار' باسل میرے بچو! مجھے معاف کر دینا۔ الوداعی ملاقات کرنے کا حوصلہ نہیں تھا۔ اس لیے خط لکھ رہی ہوں۔

یاد کرنے لگوں تو یہ جیسے کل کی ہی بات لگتی ہے۔ لیکن اس بات کو اٹھائیس سال گزر چکے ہیں۔ جب میں اس گھر میں آئی تھی۔ نگار سے معافی مانگنے کے لیے اور پھر یہیں رک گئی کفارہ ادا کرنے کے لیے۔ ایک بیٹے کی تربیت مجھ سے غلط ہو گئی تھی۔ اس کی تربیت میں' میں نے بڑی کوتاہیاں برتی تھیں۔ مجھے اس کا ازالہ کرنا تھا۔ لیکن ازالہ کرنے کے لیے نجانے کتنی زندگیاں درکار تھیں۔ اور میرے پاس وقت کم تھا۔ اس لیے نا ازالہ ہو سکا نہ کفارہ ہی ادا ہو سکا۔

میں نے خدا سے صبر مانگا' مجھے صبر دے دیا گیا۔ ہمت مانگی ہمت دی گئی۔ کاش میں خراج کی قبولیت بھی مانگ لیتی۔ خود پر اتنا زعم نہ کرتی کہ یہ کام خدا کی رضا کے بغیر ممکن ہو جائے گا۔ میں نے سوچا تھا کہ دو بیٹوں کی تربیت کر کے ایک غلطی کو درست کر لوں گی۔ لیکن اس گھر نے' جہاں صغیر ربانی جیسے درویش انسان کا سایہ شفقت تھا' مجھ سے یہ کام بھی نہ لیا۔

یہ ان کی ذات کا وصف ہی تھا جو اس گھرانے نے میرا کوئی احسان لینا گوارہ نہ کیا۔ اور جس نے مجھے بھی بدل دیا۔ میں گلناب عالم سے نانو بن گئی۔ ایک آزاد خیال عورت سے اللہ کی حدود کی پہچان رکھنے والی عورت..... یہ قرض روز قیامت تک ادا نہیں ہونے والا۔

نگار کو میری ضرورت نہ تھی۔ اس کے پاس بے شمار قیمتی اثاثہ تھا۔ صغیر ربانی کی باتیں' ان کی یادیں اور ان کے فلسفے' وہ اس اثاثے کے سہارے جی سکتی تھی۔ پھر بھی اس نے مجھے اس گھر میں رہنے کے لیے جگہ دی۔ ییشار اور باسل کو ایک ملازمہ کی حیثیت سے میں نے گود میں اٹھایا۔ لیکن پھر نجانے کب ان کا خون میری رگوں میں دوڑنے لگا۔ میری جان دونوں میں منتقل ہو گئی۔

رشتے صرف سگے یا خونی نہیں ہوتے۔ میں نے

جاناں رشتے تو نوکیلے پتھروں کی طرح کے ہوتے ہیں۔ جو انھیں تراشتا ہے وہ ان کے ہوجاتے ہیں۔ پھر انھیں خود سے جدا کرکے بھی انسان ان سے جدا نہیں ہوپاتا۔ یہ سب سے اذیت ناک مرحلہ ہوتا ہے۔ آج میں اس اذیت سے گزر رہی ہوں۔

ان اٹھائیس سالوں میں ان گنت پیغام نگار نے باندھے۔ بر لدکی جتاؤں سے شکووں کے اور اتنے ہی پیغام میں نے باندھے۔ خدا کی بارگاہ میں اپنے بیٹے کی مغفرت کے، خدا جانے ان پیغامات کی قبولیت ہوئی یا نہیں۔ میرے گناہوں کی آگ شاید بجھ تو چکی ہے پر اس میں ابھی بھی تپش باقی ہے۔ اس تپش کو ٹھنڈا کرنے کے لیے مجھے مزید ریاضت کی ضرورت ہے۔

اٹھائیس سال میں اپنے خون سے بے خبر رہی۔ اب اس کی موت کے بعد نہیں رہ سکتی۔ اس خون کا ایک ننھا قطرہ تنہا ہے۔ زل۔۔۔ اب اسے میری ضرورت ہے۔ مجھے اس کے پاس جانا ہے۔ مجھے ڈر ہے۔ حادثات اور ان دکھوں کی وجہ سے وہ نگار بن جائے گی یا زیان۔۔۔ میرے لیے دونوں وجود تکلیف دہ رہے۔ ایک نگار غم کی وجہ سے دیوانی ہوئی۔ ایک زیان تنہائیوں کے باعث مرگیا۔ میں زل کے لیے ایسا کچھ نہیں چاہتی۔ اس لیے میں اس کے ساتھ جارہی ہوں۔

اٹھائیس سال پہلے بنا اجازت اس گھر میں آئی تھی۔ آج اٹھائیس سال بعد بنا اجازت جارہی ہوں۔ بغیر معافی لیے، بغیر کفارہ ادا کیے، یہ کام اونٹ کی ہڈی پر نقش ابھارنے جیسا تھا۔ میں اس میں کامیاب نہ ہوسکی۔ اپنی ناکامی پر مجھے آخری سانس تک ملال رہے گا۔

"نگار خانہ شروع سے ہی نگار کے نام تھا۔ یہ گھر یشار اور باسل کے، دکان کی چابیاں خط کے ساتھ پڑی ہیں۔ ایک فائل بھی ہے جس میں تمام ضروری کاغذات ہیں۔ بینک میں موجود رقم اور دکان کے مال کی تفصیل بھی درج ہے۔ رجسٹر میں کاریگروں کی اجرت کا ریکارڈ ہے۔

اس گھر سے کوئی چیز لے کر نہیں جارہی۔ میرے ہاتھ خالی ہیں۔ دل بھرا ہوا ہے تم سب کی یادوں سے۔ نگار میری بیٹی، یشار، باسل میرے بچوں مجھے معاف کردینا۔ سالوں تمہیں اپنا بنائے رکھا اور آخر میں خود غرض ہوگئی۔ اس خود غرضی کو میری مجبوری سمجھ کر مجھے معاف کردینا۔

تمہاری نانو۔

یشار نے اونچی آواز سے خط پڑھا۔ جسے باسل نے آسانی سے سن لیا۔ الفاظ اثر رکھتے ہیں۔ اسے اس چیز کا ادراک تھا۔ لیکن الفاظ سانسیں بند کردینے کی طاقت بھی رکھتے ہیں، یہ جان لیوا سچائی آج اس پر آشکار ہوئی تھی۔ دھپ سے وہ بیڈ پر گرا۔ یشار سارا خط پڑھ لینے کے بعد بھی اسے چھوڑ نہ سکا اور نگار بے تاثر چہرہ لیے سامنے دیکھتی رہی۔ خط کی عبارت اس کے لیے نئی نہیں تھی۔ یشار، باسل کے آنے سے پہلے وہ یہ خط پڑھ چکی تھی۔ تینوں اپنی اپنی جگہ سوچ کے ایک ہی نقطے پر ٹھہر گئے تھے۔ سمندر کے ماہر ماہی گیر بھی چاہ عظیم میں جانے سے ڈرتے ہیں۔ وہ تو پھر عام انسان تھے۔ جس چاہ عظیم میں نانو انہیں چھوڑ کر چلی گئی تھیں وہ اس کے گرداب سے بھلا کیسے نہ ڈرتے۔

کسی کی کچھ سمجھ میں نہ آیا کہ وہ کیا بولے۔۔۔ ایک دوجے سے اور خود سے۔۔۔ سب اپنے بیٹھے رہے جیسے اس گھر میں ابھی ابھی کوئی نقب زنی کی واردات ہوئی ہو۔ اور نقب زن نے نہ تو گھر کے شیشے توڑے ہوں اور نہ ہی کوئی مال اسباب چرایا ہو۔ بلکہ انتہائی مہارت سے دیواروں کی بنیادوں کو کھینچ لیا ہو۔ اور اب دیواروں کی اینٹ کا ہر ذرہ ہوا کے تیز جھونکے سے خوف کھارہا ہو۔

بڑی دیر کی خاموشی کے بعد کمرے میں ایک گھٹی گھٹی سی سسکی کی آواز گونجی یشار نے سر اٹھا کر دیکھا۔ وہ باسل کی آواز تھی۔ اسے اس آواز پر بے ساختہ حیرت ہوئی تھی۔

"اب کیوں رو رہے ہو باسل۔۔۔ یہ سب تمہاری

وجہ سے تو ہوا ہے۔" یشار نے نرم آواز سے باسل کو اس کا جرم بتایا۔ باسل نے گردن موڑ کر یشار کو دیکھا۔

"میری وجہ سے؟" رندھی آواز کے ساتھ اس نے بے یقینی سے پوچھا۔

"جس شخص کی بیٹی تمہارے لیے قابل قبول نہیں تھی، پھر اس کی ماں کے جانے پر افسردگی کیوں؟" وہ یشار کی بات سمجھ گیا۔۔۔ اس سے کوئی جواب نہ دیا گیا۔

اس نے اپنا سر جھکا لیا۔ یشار خود بھی کرسی پر بیٹھ گیا۔ وہ خط کو ایسے دیکھ رہا تھا جیسے اس میں سے نانو کی شکل تلاش کر رہا ہو یا انہیں پکارنا چاہتا ہو۔ اور نگار؟ کیا اس نے آج بھی پورے دن سامنے ہی دیکھتے رہنا تھا؟

"نانو اس طرح کیسے کر سکتی ہیں۔ وہ ہمارے ساتھ ایسا کیسے کر سکتی ہیں۔۔۔ ہمیں چھوڑ کر کیسے جا سکتی ہیں۔" باسل بڑبڑایا۔ اس کے تینوں سوالوں کے جواب دونوں میں سے کسی کے پاس نہیں تھے۔

"نانو کو تلاش کرتے ہیں یشار! وہ زمل کے ساتھ ابھی یہیں کہیں، کسی ہوٹل وغیرہ میں ہی ہوں گی۔" باسل نے تھوڑے وقفے کے بعد کہا۔

"کیا فائدہ انہیں تلاش کرنے کا۔"

"یہ کیا کہہ رہے ہو یشار؟"

"ٹھیک کہہ رہا ہوں۔ وہ مل بھی گئیں تو ہمیں یہ ہی کچھ سننا پڑے گا جو وہ خط میں لکھ کر گئی ہیں۔ بہتر ہے کہ انہیں پریشان نہ کیا جائے۔ وہ فیصلہ کر کے گئی ہیں اس گھر سے، ان کے فیصلے کا احترام کرو، ان کی برسوں کی ریاضت کا کچھ صلہ تو دو انہیں۔" آخری جملے میں طنز تھا۔

"تم یہ سب اس لیے کہہ رہے ہو نا کہ تمہیں مجھ پر غصہ ہے۔"

"ہاں، مجھے تم پر غصہ ہے۔" یشار تیز لہجے میں بولا تھا۔ "اور اب میں تمہارا رویہ سمجھ نہیں پا رہا۔"

"تم مجھے کیوں قصوروار ٹھہرا رہے ہو؟"

"کیا تم نہیں ہو؟"

"میری غلطی صرف اتنی ہے کہ میں نے زمل کو اس گھر سے جانے کے لیے کہا۔"

"چلو تم نے اپنی غلطی تو تسلیم کی۔"

"ہاں، میں غصے میں تھا۔ مجھے جو سمجھ میں آیا میں نے وہ ہی کیا۔" باسل نے چلاتے ہوئے بے چارگی سے کہا۔ مہینوں بعد اس نے آج بات کی تھی۔ اور یشار کو اپنے چھوٹے بھائی پر بے تحاشا پیار آیا تھا۔ وہ ایک دم سے نرم پڑا تھا۔

"میں تمہاری کیفیت سمجھ سکتا ہوں باسل۔۔۔ لیکن جو کچھ ہوا اس میں بیچاری زمل کی تو کوئی غلطی نہیں تھی۔ کاش تم اسے نانو کے احترام میں ہی معاف کر دیتے۔"

"میں نے یہ بھی سوچا تھا، لیکن مجھ سے نہیں ہو سکا۔ میں کیا کرتا پھر۔" وہ پوچھنے لگا۔ یشار کے پاس اس بات کا کوئی جواب نہیں تھا۔ دونوں پھر سے خاموش ہو گئے۔ خاموشی کے اس وقفے کے ۔۔۔ گزر جانے کے بعد نگار کی آواز آئی تھی۔

"نانو کو اس گھر میں واپس لاؤ یشار۔۔۔" یشار نے اپنی ماں کی طرف دیکھا۔

"انہیں اس گھر میں واپس لاؤ۔" نگار نے پھر سے اپنی بات دہرائی۔ وہ خلا میں جیسے کسی غیر مرئی شے کو دیکھ رہی تھی اور اب تو یشار کو یہ کام جیسے ہر صورت کرنا ہی تھا۔

سیل فون نکال کر اس نے باسل سے پوچھ کر اس ہوٹل کا نمبر ملایا جہاں زمل نے پہلی بار پاکستان آنے کے بعد قیام کیا تھا۔ اس کا اندازہ درست تھا۔ زمل نے اس بار بھی وہیں قیام کیا تھا پر اب وہ وہاں موجود نہیں تھی۔

"مس زمل زیان عالم چیک آؤٹ کر کے جا چکی ہیں۔"

"کتنی دیر پہلے؟"

"صبح نو بجے۔" دوسری کال یشار نے ایئرپورٹ انکوائری پر کی۔

"فرانس کے مسافروں کے لیے اگلی فلائٹ چار گھنٹے بعد کی ہے۔" اسے بتایا گیا۔

"کیا اس فلائٹ میں گلناب عالم اور زمل زیان عالم

کے نام کی سیٹیں بھی کنفرم ہیں؟" اس نے پوچھا۔ جواباً" اسے انتظار کرنے کا کہا گیا۔ یشار کو یہ انتظار اپنی زندگی کا سب سے طویل ترین انتظار محسوس ہوا تھا۔

"جی' یہ دونوں نام بھی شامل ہیں۔" چند لمحوں بعد اسی آواز نے کہا۔ اور یشار کے ہاتھ سے موبائل گرتے گرتے بچا۔

☼ ☼ ☼

ائیرپورٹ زیادہ دور نہیں تھا۔ فاصلہ بھی چند ہی منٹ کی مسافت کا تھا۔ پھر بھی یشار بڑی عجلت میں گاڑی چلا رہا تھا۔ اسے خود پر قابو رکھنا بہت مشکل لگ رہا تھا۔ وہ خود کو پرسکون نہیں کر پا رہا تھا۔ وقفے وقفے سے وہ کبھی کبھی بیک ویو مرر سے باسل کو بھی دیکھ لیتا تھا۔ اس کے دیکھنے میں کوئی تاثر واضح نہیں تھا۔ پھر بھی یشار کے اس طرح بار بار دیکھنے نے باسل کو اس ساری صورت حال کا مجرم بنا دیا تھا۔ یہ بات کسی حد تک تو درست تھی۔ لیکن نانو کے اس اقدام پر وہ نہ صرف گنگ رہ گیا تھا۔ بلکہ اسے دکھ بھی ہوا تھا۔ انہوں نے سب سے پوشیدہ رکھا تھا کہ وہ جا رہی ہیں وہ ایسی گپت ایسی پُراسرار تو نہیں تھیں۔ یا وہ ایسی ہی تھیں؟

زمل کے دو دن پہلے اس گھر میں آنے کی وجہ اسے اب پتا چل چکی تھی۔ وہ نانو کو اپنے ساتھ لے جانے کے لیے ہی آئی تھی۔ ممکن ہے یہ سب بہت پہلے ہی طے پا گیا ہو۔ یقیناً" یہ کارروائی پچھلے کئی ہفتوں سے کی جا رہی تھی۔ اور آج آخر کار جانے کا دن آگیا تھا۔

گاڑی ایئرپورٹ کی طرف گامزن تھی اور باسل کے دل کی دھڑکنیں بڑھنے لگی تھیں۔ وہ نانو سے کیا کہے گا کہ وہ رک جائیں' نہ جائیں۔ وہ انہیں کیا کہہ کر روکے گا.... یا ان پر چیخنے گا۔ چلائے گا.... اگر اس نے نانو کے پاس ان کے اس فیصلے کے علاوہ اور کوئی راستہ نہیں چھوڑا تھا تو بدلے میں نانو نے بھی ایسا ہی کیا تھا۔ اس کے ساتھ اور باقی سب کے ساتھ۔

وہ واپسی کے رستے بند کر چکی تھیں۔ ان تک جانے والے تمام راستے سرنگیں بن گئے تھے۔ باسل کو کچھ نظر نہیں آرہا تھا۔

"گاڑی واپس موڑ لو یشار!" ایئرپورٹ کی عمارت نظر آنے لگی تھی جب نگار نے آہستگی سے کہا۔

"کیا؟" یشار نے حیرت سے پوچھا۔ اسے لگا اس سے سننے میں کوئی غلطی ہو گئی ہے۔

"گاڑی واپس موڑ لو قبرستان کی طرف۔" وہ اسی نرمی سے گویا ہوئی۔ اس بار یشار نے مزید کوئی سوال نہ پوچھا اور گاڑی کا رخ قبرستان کی طرف موڑ دیا۔

☼ ☼ ☼

اپنے دونوں نازک ہاتھوں سے ڈیڈ کی قبر کو پھولوں سے ڈھکتے ہوئے زمل رونے لگی تھی۔ سُرخ پھول گیلی مٹی پر پڑے تھے۔ اور اس کی آنکھوں کی نمی اس کے سُرخ گالوں پر بہہ نکلی تھی۔ اس قبر کو وہ آخری بار دیکھ رہی تھی۔ اس قبر کی یاد یا تصور کو وہ اپنے ساتھ لے کر جانے والی نہیں تھی۔ فرانس والے گھر میں ڈیڈ ابھی زندہ تھے۔ وہ وہاں اسے چلتے پھرتے ہوئے نظر آتے۔ غصہ کرتے ہوئے۔ اس پر بگڑتے ہوئے۔ چیزیں توڑتے ہوئے۔ وہ اس کے لاشعور میں جس حال میں زندہ تھے۔ وہ حالت ہر حال میں اس حقیقت سے بہت بہتر تھی۔ یہاں سے ان کی قبر کے تصور کو اس گھر میں لے جا کر وہ انہیں پھر سے مارنا نہیں چاہتی تھی۔

تمام پھول ختم ہو گئے تو وہ نرم گھاس پر نانو کے قریب بیٹھ گئی۔ یہ پچھلے کافی مہینوں کی تھکن تھی یا آنے والے سفر کی۔ وہ نانو کے کندھے پر سر رکھ کر ڈھے سی گئی۔ نانو نے اس کے گال تھپتھپائے۔ خود ان کے گال تھپتھپانے والا کوئی نہیں تھا۔ وہ زمل کے آنسو تو صاف کر رہی تھیں۔ اسے چُپ ہو جانے کی تلقین تو کر رہی تھیں۔ لیکن خود کو نہیں.... انہوں نے اپنے بہتے آنسوؤں کو بہنے دیا۔ ان آنسوؤں میں کہیں فریب بھی تھا۔ نانو جانتی تھیں۔ وہ اپنے بیٹے کے لیے سچے آنسو نہیں بہا رہی تھیں۔ اس احساس نے انہیں زخمی کر دیا۔ وہ کس کی قبر پر بیٹھی رو رہی تھیں؟ بیٹے کی

پرانی یادوں کی، پچھلے اٹھائیس سالوں کی یا اپنے فیصلے کی۔

انہیں علم تھا۔ اندر ہی اندر یہ آنسو نگار، یشار، باسل اور "نگار خانہ" کے لیے بہہ رہے تھے۔

جدائیوں کے فیصلے مشکل سے ہوں یا آسانی سے۔ ان پر عمل یقیناً "انسان کو آدھا مار دیتا ہے۔ وہ جاں کنی کے لمحوں سے گزر رہی تھیں۔

زمل نے انہیں چند ہفتے پہلے فرانس سے کال کی تھی۔ آدھے گھنٹے کی گفتگو میں وہ زیادہ تر وقت روتی رہی تھی۔ اس نے انہیں یاد دلایا تھا۔ یا احساس دلایا تھا کہ وہ ان کے سگے بیٹے کی بیٹی ہے۔ ان کا خون ہے۔

"مجھے اب کسی اپنے کی ضرورت ہے۔" وہ روتے روتے بس یہ ہی کہے جا رہی تھی۔ انہیں زیان کی بات بھی یاد تھی۔ جو اس نے مرنے سے پہلے ان سے کی تھی۔

"وعدہ کریں..... میرے مرنے کے بعد آپ زمل کا خیال رکھیں گی..... بالکل اسی طرح جیسے آپ نے نگار کا رکھا۔ اپنی بیٹی سمجھ کر۔" اس نے ان کا ہاتھ پکڑتے ہوئے کہا تھا۔ لیکن اب مشکل یہ تھی کہ وہ دونوں بیٹیوں کا خیال ایک ساتھ نہیں رکھ سکتی تھیں۔

وہ رات نانو پر بہت بھاری گزری۔ پرانی کھڑکیوں کے رنگین شیشوں والے پٹ ساری رات آپس میں ٹکراتے رہے۔ دروازے بجتے رہے اور بیل بوٹے چنگھاڑتے رہے۔ صبح ہونے تک مطلع صاف تھا۔ نانو فیصلہ کر چکی تھیں کہ وہ اب زمل کے ساتھ رہیں گی۔ وہ باسل سے اس معاملے میں زبردستی نہیں کرنا چاہتی تھیں۔ وہ اپنی زندگی کے اہم فیصلے کسی دباؤ کے زیر اثر نہ کرے، نانو ایسا ہی چاہتی تھیں۔ اور پھر اس سب کے بعد ان کے پاس صرف ایک ہی حل بچتا تھا۔ انہوں نے اسے قسمت کا لکھا سمجھ کر قبول کر لیا۔ وہ زیان کی موت کے بعد بھی اس سے دور نہیں رہنا چاہتی تھیں۔ زمل کی خاطر آج وہ اس گھر سے نکل آئی تھیں۔ جہاں انہوں نے اپنی زندگی کے اٹھائیس سال گزار دیے تھے۔

"اٹھو زمل! ہمیں دیر ہو رہی ہے۔" انہوں نے زمل سے کہا۔ زمل اپنی جگہ سے ہل سکی نہ خود نانو ہی اٹھ سکیں۔ وہ وہاں سے نکل تو آئی تھیں۔ لیکن اب یہاں سے جا نہیں پا رہی تھیں۔ انہیں لگا زیان کے ساتھ ساتھ آج یہاں ایک قبر ان کی بھی بن جائے گی۔

ان کا زندگی بھر کا خوف رائیگاں نہیں گیا تھا کہ جوں ہی ان کا گھونسلہ مکمل ہو گا کوئی دوسرا اس پر قابض ہو جائے گا۔ یا ان کے بچوں کو ان سے چھین لے گا۔ اور اب ایسا ہو گیا تھا۔ لیکن مختلف انداز سے۔ دوسرا کوئی قابض نہیں ہوا تھا۔ نہ ہی ان کے بچوں کو ان سے چھینا گیا تھا۔ اس گھونسلے کو انہوں نے خود ہی ہاتھ مار کر گرا دیا تھا۔ چاندی کی شیٹ کا دس ہزار پتوں والا خاکہ مکمل نہیں ہو سکا تھا۔ شیٹ برباد ہو گئی تھی۔ لیمپ جیسے روشن ہونے سے پہلے ہی بجھ گیا تھا۔ اوزار کی دھار اپنی حدود سے باہر نکل گئی تھی اتنی کہ جڑیں ہی کٹ چکی تھیں۔

یشار اور باسل ان کی روح تھے۔ اور اب وہ بے روح سی ہو کر بیٹھی تھیں۔

"بس کرو زمل..... چلو چلتے ہیں۔" انہوں نے پھر زمل سے کہا یا شاید خود سے۔ زمل نے بہتے آنسو خشک کیے۔ خود پر ضبط کیا۔ اور اٹھ گئی۔ سہارا دے کر اس نے پھر نانو کو اٹھایا۔ جنہیں اٹھانے کے لیے آج ہزاروں ہاتھوں کی ضرورت تھی۔ ایک آخری بار قبر کو دیکھتے ہوئے نانو مڑیں۔ اور پھر ایک قدم بھی مزید آگے نہ بڑھا سکیں۔

وہ یقیناً "یشار تھا۔ جو آہستگی سے چلتا ہوا ان کے نزدیک آ رہا تھا۔ اور اس کی آنکھوں میں آج کیا کچھ نہیں تھا۔ اس کے پیچھے باسل تھا۔ اور سب سے آخر میں نگار۔

تیس سال بعد وہ آج اپنے گھر سے باہر نکلی تھی۔ نانو جانتی تھیں۔ ساری فضا اس کے لیے اجنبی تھی۔ دھوپ کی ایسی تیزی کی اس کے جسم کو عادت نہیں تھی۔ ایسی کھلی ہوا کہیں اس کی سانسوں کا دم ہی نہ گھونٹ دے؟ نانو کو وسوسوں نے آ گھیرا..... وہ چل بھی

ایسے رہی تھیں جیسے قدم قدم پر ٹھوکروں کا سامنا کر رہی ہوں۔ نانو کو بے اختیار رونا آگیا۔ وہ کیا کر رہی تھیں۔ کیوں کر رہی تھیں۔ اللہ اب ان سے کیا چاہتا تھا۔ وہ خود سے کیا چاہتی تھیں؟

پہلے یشار ان تک پہنچا تھا۔ اس کی آنکھوں کے بعد اب اس کے چہرے کی خفگی بھی نانو کو نظر آگئی تھی۔ وہ کیسے نہ گھبراتیں؟

یشار کو نانو سے کیا کہنا تھا۔ اسے زیادہ سوچنا نہیں پڑا تھا۔ قبرستان کے دروازے سے یہاں تک آتے آتے وہ پہلی بات سوچ چکا تھا۔ اس نے اپنی بات کہنے سے پہلے نانو کی حالت پر توجہ دینا بھی ضروری نہ سمجھا۔ نانو نے ان کے ساتھ غلط کیا تھا۔ اس کے ساتھ ساتھ باسل کے ذہن میں بھی یہ ہی بات سمائی ہوئی تھی۔

"بے جان چیزوں کو تراشتے تراشتے..... ان میں جان ڈالتے ڈالتے..... آپ نے جان داروں کی جان نکالنے کا فن کہاں سے سیکھ لیا نانو۔" وہ بولا اور نانو کا دل کٹ کر رہ گیا۔

ایسا بھیانک شکوہ.....؟ زمل نظریں جھکائے کھڑی رہی۔

"اتنا بڑا فیصلہ کرلیا آپ نے اور ہمیں بتانے کے لائق بھی نہ سمجھا۔" وہ پوچھ نہیں رہا تھا۔ شرمندہ کر رہا تھا۔ نانو کے پاس آنسوؤں کے علاوہ اس کی بات کا کوئی جواب نہیں تھا۔ چند لمحوں میں باسل بھی وہیں پہنچ گیا۔ نانو نے خود کو مضبوط کرنے کے سارے حربے آزما لیے۔ اس کے الفاظ یقیناً "یشار کے لفظوں سے کئی گنا زیادہ تیز دھار ثابت ہونے والے تھے۔ نانو کا اندازہ غلط نہ نکلا۔ حالانکہ دل ہی دل میں وہ اس گمان کے غلط ہو جانے کے لیے دعاگو بھی تھیں۔ باسل چند لمحے تو نانو کو دیکھتا رہا۔ پھر بڑے تحمل سے اس نے بات کا آغاز کیا۔

"چھوڑ کر جا ہی رہی تھیں تو خط لکھ کر جانے کی کیا ضرورت تھی نانو! آپ چلی جاتیں۔ بنا بتائے، جیسے اپنے بیٹے کو چھوڑ کر چلی گئی تھیں۔ ہم بھی کچھ عرصہ آپ کو تلاش کرتے پھر صبر سے بیٹھ جاتے۔" اس نے چوٹ کی اور کیا خوب چوٹ کی۔ نانو ٹوٹ کر رہ گئی تھیں۔

"جھوٹ کی روح سے بھی واقفیت رکھتی تھیں نا آپ..... اس سے بھی رشتہ قائم کرلیتی تھیں۔ تو اس رشتے کی آپ کی نظر میں اتنی بھی اہمیت نہیں تھی۔" وہ پوچھ رہا تھا۔ یشار کی طرح نانو اسے صرف آنسوؤں کا جواب نہیں دے سکتی تھیں۔ اور نہ بولتے بولتے وہ آج چپ ہونے والا تھا۔

"دراصل آپ کا سارا پیار ایک دھوکا تھا۔ آپ کی باتیں صرف باتیں تھیں۔ آپ کے فلسفے کھوکھلے تھے۔ تمام عمر آپ اپنے بیٹے کو یاد کرتی رہیں۔ ہم دونوں میں اپنا بیٹا تلاش کرتی رہیں..... اسے سمجھ کر آپ ہمیں پیار کرتی رہیں..... ہمارے چہروں میں اس کا عکس دیکھ کر تخیل باب ہوتی رہی ہیں نہ آپ.....؟" باسل بولتا چلا گیا تھا۔ نانو اس کی سوچ پر تڑپ کر رہ گئی تھیں۔

"ایسی بات نہ کرو باسل..... خدا کے لیے..... میں تمہارے آگے ہاتھ جوڑتی ہوں۔ اتنا بڑا الزام نہ لگاؤ مجھ پر۔ تم دونوں سے میں نے سچا پیار کیا ہے۔ تمہارا خون۔"

"بس کردیں نانو! اگر یہ حقیقت ہے تو آپ اس طرح سے نہ کرتیں، پھر ہمیں چھوڑ کر جانا آپ کے لیے ناممکن ہوتا۔ آپ کو صرف کفارہ ادا کرنا تھا تو اگر ایسا ہی تھا تو ہمیں اپنا کیوں بنایا؟ اور اب اس بات کا کفارہ کون ادا کرے گا؟" اس نے غضب کا سوال پوچھا۔

"اب زمل کو میری ضرورت....." روتے روتے انہوں نے وضاحت کرنی چاہی لیکن ان سے بولا نہ گیا۔ وہ پھر سے رونے لگیں۔ انہیں اس طرح سے روتا دیکھ کر یشار اور باسل کے دل کو..... کچھ ہوا۔ لیکن دونوں کو ہمت نہ ہوئی کہ آگے بڑھ کر نانو کو چپ کرواسکیں۔

نگار بھی ان تک پہنچ چکی تھی۔ اس کا ہاتھ شاید فرشتوں نے تھام رکھا تھا۔ جو اجنبی زمین کے لاتعداد گڑھوں نے اسے نگل نہیں لیا تھا۔ وہ باسل اور نانو کی

گفتگو سن چکی تھی۔ اس کا ستا ہوا چہرہ جڑ کٹے پیڑ کی طرح پژمردہ تھا۔

فضا میں خاموشی چھا گئی۔ ماسوائے ان پرندوں کی آوازوں کے جو دوپہری راگنی الاپ رہے تھے۔

کیا اب نگار بھی کچھ ایسا ہی بولنے والی تھی جو نانو کی باقی ماندہ جان کو سلب کر سکتا تھا۔ نانو نگار کے بولنے کا انتظار کرتی رہیں۔ اٹھائیس سال پہلے بھی ایک روز انہوں نے یہ انتظار کیا تھا۔ تب نگار کی خاموشی نے انہیں انتہا درجے کی تکلیف دی تھی۔ اس کی خاموشی آج بھی ایسا ہی کر رہی تھی۔ لیکن اندر ہی اندر نانو کو اس کے بولنے کا خوف بھی تھا۔ اپنی ذات میں قید ایک لمبا عرصہ گزار کر نگار نے لب کھولے تھے۔

"جس ہستی کو میں نے ایک وقت میں سب کے سامنے برا کہا تھا..... بُرا جانا تھا..... اسی ہستی نے میری زندگی کو خراج تحسین ادا کیا۔" نانو نے سر اٹھا کر نگار کو دیکھا۔ چونک کر، کیا وہ یہ ان ہی سے کہہ رہی تھی، ہاں..... وہ یہ سب ان ہی سے کہہ رہی تھی۔ "آپ اس وقت میری زندگی میں آئیں جب مجھے آپ کی ضرورت نہیں تھی اور اب اس وقت جا رہی ہیں..... جب مجھ سمیت میرے بچوں کو بھی آپ کی ضرورت ہے۔" نانو نگار کی طرف دیکھتی رہ گئی تھیں۔

"آپ نے کہا تھا کہ آپ نگار کی ماں ہیں..... زلیخا بی کی طرح..... پھر اب آپ بھی مجھ سے دور جا رہی ہیں۔"

"اب زمل..... میری مجبوری..... تم تو سمجھو نگار۔"

"آپ کو کہیں جانے کی ضرورت نہیں۔" نگار نے کہا "نہ ہی زمل کو۔" زمل کا ہاتھ نگار نے اپنے ہاتھ میں تھام لیا۔ زمل ان کے قریب ہو گئی۔ باقی سب میں سے کوئی کچھ نہ بولا۔

"صغیر ربانی کہتے تھے کہ انسانوں کی طرف سے دل پتھر کے کر لو تو ایک دن انسان خود بھی پتھر کا ہو جاتا ہے، جیسے میں ہو گئی۔" باسل کا ہاتھ پکڑ کر نگار نے وہ ہاتھ باسل کے ہاتھ میں دے دیا۔ باسل نے ایک نظر انہیں دیکھا تھا۔

"اب میں کسی اور کو نگار بنتے ہوئے نہیں دیکھ سکتی۔" باسل نے گردن جھکا لی۔ پھر وہ نانو کی طرف متوجہ ہوئی۔

"آپ مت جائیں..... ابھی مجھے آپ سے بہت کچھ سیکھنا ہے۔ صبر، برداشت، ایثار، محبت..... اور..... اور..... قربانی۔" نگار کی آنکھ سے آنسو بہہ نکلے۔ نانو نے آگے بڑھ کر والہانہ نگار کو اپنے گلے سے لگا لیا۔

قبرستان کی خاموشی میں دونوں کے رونے کی آواز پھیلنے لگی۔

☼ ☼ ☼

یہ یقین سے نہیں کہا جا سکتا کہ وہ دونوں اتفاقیہ پیچھے رہ گئے تھے یا انہوں نے شعوری کوشش کی تھی۔ سب گھر والے اندر جا چکے تھے۔ دروازے میں سے باسل پہلے اس کے گزرنے کا انتظار کرنے لگا اور وہ باسل کا..... نتیجتاً دونوں ہی آمنے سامنے ٹھہر گئے اور جیسے جامد ہو گئے۔

باسل دیکھ رہا تھا کہ زمل زمین کو دیکھ رہی ہے اور زمل محسوس کر سکتی تھی کہ وہ اسے دیکھ رہا ہے۔ بڑی ہمت کر کے اس نے نظریں اوپر اٹھائیں اور دونوں کی بصارت کے خط ایک ہو گئے۔ ہوا میں موجود ذرہ ذرہ روشن ہو کر چمکنے لگا۔

زمل..... محبت، عظیم سلطنت کے تخت کا تاج ہے۔ میں اس تاج کو تاعمر پہنے رہوں گی۔

باسل..... قدموں تلے پھول کھلاتے موسم کو میں اب بنجر نہیں ہونے دوں گا۔

ایک دوجے کا ہاتھ تھامے دونوں ایک ساتھ اندر داخل ہوئے تھے۔

☼ ☼ ☼

بالآخر کتبہ تیار تھا..... پورے ایک ہفتے کی محنت کے بعد..... سنگ مرمر کا وہ کتبہ سب نے مل کر تیار کیا تھا۔ زمل نے کہا تھا کہ وہ فرانس میں "کھلی کتاب" کی طرز کے کتبے دیکھ چکی ہے۔ سنگ مرمر کے بڑے ٹکڑے پر ڈیزائن اسی نے بنایا تھا..... کھلی کتاب جیسا

ڈیزائن۔۔۔ باسل نے اس ڈیزائن کو مہارت سے کاٹا تھا۔ اس بار اس نے نانو کا کام خراب نہیں کیا تھا۔ نہ ہی اس نے نانو کو اپنا سر کھجا کر اور رقص کر کے دکھایا تھا۔ کھلی کتاب کی مطلوبہ شیپ نکل آئی تو یشار نے خطاطی کر کے اس پر تحریر لکھ دی۔ یشار کی خطاطی بہت اچھی تھی۔ وہ اسکول کے زمانے سے ہی خطاطی کا شوق رکھتا تھا۔ پھر اس تحریر کو اس نے اوزاروں سے کندہ کر دیا۔ نانو نے منقش ہوئی تحریر کے گڑھوں میں سرخ، سیاہ اور سبز روشنائی بھر دی۔ پھر سنگ مرمر کی سطح کو انہوں نے رگڑ رگڑ کے ہموار کر لیا۔ کھلی کتاب والا کتبہ تیار تھا۔

یہ کتبہ زمل کے ڈیڈ کے لیے نہیں تھا۔ یہ کتبہ گلناب عالم کے بیٹے زبان عالم کے لیے بھی نہیں تھا۔ یہ کتبہ نانو کے بیٹے کے لیے تھا جس کی چمکتی سطح کو دیکھتے ہوئے وہ اب اپنے دل کو سنبھالنے کی کوشش کر رہی تھیں۔

"یشار کل جا کر اسے قبر پر لگوا دینا۔۔۔ مائیں زندہ ہوں تو بیٹوں کی قبروں کو زیادہ دن تک بے نشان نہیں رہنا چاہیے۔" نانو نے کہہ کر کتبے پر اپنا سر رکھ لیا۔ اپنے بیٹے کے نام کے حرفوں پہ۔۔۔ انگلی پھیرتے ہوئے بے اختیار ہی ان کی آنکھوں سے آنسو نکل آئے۔ اور تحریر کے گڑھے میں جذب ہونے لگے۔ بھٹکتے تصورات کو اکٹھا کرتے ہوئے وہ خود سے بولی تھیں۔

"انا للہ وانا الیہ راجعون۔"

✲ ✲ ✲

راکھ روکھی ہوئی سب بستیاں
در اندر ان گنت ہستیاں
بے طلب بے وجہ کی یہ فیاضیاں
ایک پیال ساز کی کرم سازیاں

قوس دار کھڑکی کے شیلف پر نگار گلدان رکھ کر ان میں سفید پھول سجا رہی تھی۔ جب اس کے ہاتھ رک گئے۔ نگار کا دل بڑی زوروں سے دھڑکنے لگا۔ پھر اچانک کہیں سے بجلی کے ساتھ ایک طوفانی جھونکا آیا۔ بادل گرجے، آندھی چلی، سب دیکھ کر اس کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے۔ ہوا کا دوسرا جھونکا پہلے سے بھی زیادہ شدید تھا۔ نگار کی سماعت میں جیسے جھکڑ چلنے لگے۔ ایسا شور اٹھا کہ کانوں کو بہرہ کر دے۔ بہت سی آوازیں تھیں۔ زلیخا بی بی کی۔ خدا یار کی۔ صغیر ربانی کی۔۔۔ سب جیسے اس کے پیغاموں کا جواب دے رہے تھے۔ ارض و سما جنہوں نے سیاہ چادر اوڑھ رکھی تھی۔ وہ چادر جیسے اتار دی گئی۔ سب بے نقاب ہو کر پکار رہے تھے۔ اور ان سب آوازوں پر غالب کچھ اور بھی تھا۔ نگار کو وہ سمجھنے کی چاہ تھی۔ پھر یک لخت اس شور پر سکوت طاری ہوا۔ تو کیا وقت آ گیا تھا؟۔۔۔ نگار اپنی جگہ دم بخود رہ گئی۔ گہرے اندھیرے میں جیسے کوئی روشنی کی کرن پھیل گئی۔ جس نے آہستہ آہستہ سارے اندھیرے کو نگل لیا۔ نگار کے دل پر اطمینان چھا گیا۔

ظلم ہوا۔ درجہ بڑھایا
کار جہاں یہ سوال اٹھایا۔
برگد کی طرح صائقہ بھی جھومی۔۔۔ ہوا کے سنگ
آج سارے اہتمام تھے۔
بے صبر، بے قدر پایا
عجب نام سے اس نے بلایا۔

کھڑکی کی سلاخوں پر نگار کی گرفت مضبوط نہ رہ سکی۔ بے جان ہو کر وہ تخت پر بیٹھی۔ اس کے آنسو جو بھر آئے تھے متواتر ہو گئے۔

سرمئی رنگ خود کوٹ کوٹ بھروایا
اگرچہ پیال کو بھی تھا سبز ہی اگایا

امبر خالد

یہ میری داستانِ حسرت ہے

گرمیوں کی قیامت خیز اور جھلسا دینے والی دوپہر میں، میں ایک قدرے پرانی طرز کی ایک منزلہ عمارت کے آگے کھڑا پسینے میں شرابور عمارت کے باہر آویزاں تختی پر کندہ نام کو بہ غور پڑھنے کی ناکام سی کوشش کر رہا تھا۔ ناکام یوں کہ تختی خاصی بلندی پر نصب تھی اور شاید کافی پرانی بھی تھی تب ہی اس کے حروف کچھ مٹے مٹے سے تھے۔ دھوپ کی شدت سے آنکھیں چندھیا رہی تھیں۔ تختی کو بہ غور دیکھنے پر شروع کے "شر" اور آخر کے "سین" نے میرے مطلوبہ ایڈریس یعنی "شرافت حسین N 316 نمبر" کی تصدیق کر دی تھی۔

ایک اطمینان بھرا سانس خارج کرتے ہوئے میں نے پسینے میں بھیگی شرٹ کو چٹکی سے پکڑ کر کمر سے علیحدہ کیا اور گرد آلود بالوں کو ہاتھوں سے سیٹ کرتے ہوئے کال بیل پر انگلی رکھ دی۔ اندر سے چڑیا کی چوں چوں تواتر سے آنے لگی اور میرے انگلی ہٹاتے ہی وہ آواز آنا بند ہو گئی۔ کچھ لمحے انتظار کے بعد ابھی میں دوبارہ کال بیل کی جانب ہاتھ بڑھا ہی رہا تھا کہ اندر سے آتی کڑکتی نسوانی آواز پر میرا ہاتھ ہوا میں ہی معلق رہ گیا۔

"کون ہے؟" اندر سے کڑک لہجے میں پوچھا گیا۔

"جی میں مستقیم۔" بوکھلاہٹ میں میں بس اتنا ہی کہہ سکا۔

"کون مستقیم؟" آواز میں مزید کرختگی آ گئی۔

"جی وہ، مجھے شرافت حسین سے ملنا تھا۔ آپ کا اوپر والا پورشن کرائے پر حاصل کرنے کے لیے۔" میں نے جلدی جلدی اپنے آنے کا مقصد بیان کیا۔

"ابو جی ابھی گھر پر نہیں ہیں۔ آپ ایک گھنٹے بعد آئیے گا۔" اس نسوانی آواز نے مجھے بغیر دروازہ کھولے باہر سے ہی ٹرخایا۔

"ارے بی بی! میں کہاں جاؤں گا، میں ملتان سے آیا ہوں۔ آنے سے قبل میری شرافت حسین صاحب سے بات ہو گئی تھی۔ انہوں نے کہا تھا آپ جس دن بھی آئیں گے آپ کو رہائش مل جائے گی۔" میں سٹپٹا کر بولا۔

یہاں اعصاب کو شل کر دینے والی گرمی میں میرا کھڑے رہنا دشوار ہو رہا تھا کجا کہ ایک گھنٹہ انتظار کرنا۔ میرا تو یہاں کوئی دوست یار رشتے دار بھی نہ تھا جو وہاں چلا جاتا۔

"تو آپ کو کراچی اسٹیشن پر اترنے سے پہلے ابو جی کو کال کرنا تھی نا، آپ نے انہیں یقیناً "انفارم" نہیں کیا ہوگا تب ہی تو وہ کام سے نکل گئے۔ اب یہ آپ کا دردِ سر ہے کہ آپ ایک گھنٹہ کہاں گزاریں گے۔ ابھی گھر میں کوئی نہیں ہے۔ اس لیے میں آپ کو اندر نہیں بلا سکتی۔ سوری۔" بند دروازے کے پیچھے سے مجھے ٹکا سا جواب دے کر شاید وہ اندر کی جانب قدم بڑھا رہی تھی کیونکہ قدموں کی چاپ مجھے دور ہوتی سنائی دے رہی تھی۔

"ہیلو!" میں نے بھنا کر دروازہ پیٹ ڈالا۔ "میرا یہاں کوئی عزیز رشتے دار نہیں ہے، جو کسی کے گھر جا کر بیٹھ جاؤں۔ آپ دروازہ کھولیں میں سیدھا اوپر والے پورشن میں چلا جاؤں گا۔" میرا بس نہیں چل رہا تھا کہ اس بے ہودہ لڑکی کا گلا دبا دوں۔ ایک تو یہ پگھلا دینے والی گرمی اور اوپر سے اس بدتمیز اور بداخلاق لڑکی کا رویہ۔

"آپ مرد ہیں عورت نہیں جو کسی کے گھر بیٹھنا ضروری ہو۔ گلی کے اختتام پر دائیں ہاتھ پر مڑ جائیں، وہاں سامنے آپ کو پارک نظر آجائے گا۔ وہاں چلے جائیں۔ درخت کی ٹھنڈی چھاؤں میں بیٹھ کر انتظار کریں اور ہاں! ایک گھنٹہ گزارنے کے بعد ابو جی سے کانٹیکٹ کرکے ہی یہاں آیئے گا۔" اس کے ساتھ ہی اس کے قدموں کی چاپ دور ہوتی سنائی دی اور میں حق دق اس کے جملوں پر غور کرتا رہ گیا۔

اور جب ہوش آیا تو مانو میرے سر پر لگی اور تلووں پہ بجھی۔ "نیو ایڈیٹ" ایک مکا دروازے کی جانب لہرا کر میں نے بادل نخواستہ اپنا چھوٹا سوٹ کیس اور سفری بیگ اٹھایا اور اس کے بتائے ہوئے پارک کی جانب چل دیا۔

پارک میں پہنچ کر قدرے گھنے درخت کے سائے تلے موجود سنگی بنچ پر بیٹھ کر گھر والوں کے متعلق سوچنے لگا۔ گھر والے کیا ایک عدد چھوٹی بہن اور امی، جب کہ ابو دو سال قبل رضائے الٰہی سے انتقال کرچکے تھے۔ میں کراچی ایک جاب کے سلسلے میں آیا تھا۔ میرے ایک دوست کے توسط سے مجھے یہاں جاب اور اسی کے توسط سے یہ گھر بھی کرائے پر ملا تھا۔ پہلے وہ بھی کراچی میں جاب کرتا تھا اور اسی محلے میں اس کی رہائش تھی۔

شرافت حسین صاحب سے اس کی اچھی سلام دعا ہوگئی تھی۔ پھر چند وجوہات کی بنا پر وہ دوبارہ ملتان شفٹ ہوگیا تھا، مگر شرافت حسین صاحب کا کانٹیکٹ نمبر اس کے پاس موجود تھا سو اس نے ان سے کسی کرائے کے مکان کی بابت دریافت کیا تو انہوں نے اپنے گھر کا اوپر والا پورشن خالی ہونے کی نوید سنائی اور یوں میرا مسئلہ حل ہوگیا۔ مجھے کل سے آفس لازمی جوائن کرنا تھا اور اگلے ماہ میں نمرہ اور امی کو بھی کراچی بلا لیتا تب تک وہ فی الحال ماموں کے گھر قیام پذیر تھیں۔

میں نے اپنا سامان بنچ کے نیچے گھسایا۔ مبادا کوئی مجھے تخریب کار سمجھ کر پارک سے بے دخل نہ کردے۔ پارک میں رش نہیں تھا اور لوگ نہ ہونے کے برابر ہی تھے۔ شام کے پانچ بج چکے تھے، مگر سورج کی شعلہ فشانی ابھی تک جاری وساری تھی۔ شاید یہ ہی وجہ تھی کہ پارک ابھی تک سنسان تھا۔ میں پاؤں پسار کر آرام سے نیم دراز ہوگیا۔ ٹھنڈی ہوا کے فرحت بخش جھونکوں سے میں وقتی طور پر کچھ منٹ قبل کی ساری کلفت بھول گیا۔

☼ ☼ ☼

ابھی پون گھنٹہ ہی گزرا تھا کہ میرا موبائل گنگنا اٹھا۔ موبائل جیب سے برآمد کرکے دیکھا۔ شرافت حسین کا نام جلی حروف میں جگمگا رہا تھا۔ پچھلے ایک گھنٹے سے میں ان سے رابطہ کرنے کی کوشش کررہا تھا، مگر وہ ریسیو نہیں کررہے تھے۔ شاید کہیں مصروف تھے۔

ایک طمانیت بھرے احساس کے ساتھ میں نے کال ریسیو کی۔ معلوم ہوا کہ وہ گھر تشریف لاچکے ہیں یعنی کہ گھر بدری ختم۔ میں نے سامان اٹھایا اور ان کے گھر کی جانب چل دیا۔ اب کی بار پہلی ہی دفعہ گھنٹی بجانے پر شرافت حسین صاحب باہر تشریف لے آئے۔ بہت پرتپاک طریقے سے ملے اور انتظار کی زحمت اٹھانے پر بار بار معذرت خواہ بھی ہوئے۔ بعد ازاں مجھے فوراً" سے پیشترا نے سامان سمیت اوپر پورشن میں جانے کی اجازت بھی مل گئی۔

دو کمروں، ایک کچن اور اٹیچ باتھ پر مشتمل چھوٹا، مگر بہت صاف ستھرا سا پورشن تھا۔ کمروں کی پچھلی سائیڈ پر بالکونی بھی تھی جو گلی کی جانب تھی۔ سامان رکھتے ہی میں نے واش روم کا رخ کیا۔ واش روم میں ضرورت کی ہر چیز مثلاً" صابن، تولیہ اور بالٹی وغیرہ موجود پاکر میں بے ساختہ مسکرایا۔

اور شرافت صاحب کی شرافت کا دل سے قائل ہوگیا۔ وہ اس بات سے باخبر تھے کہ میں فی الحال تنہا ہی ان کے گھر رہائش پذیر ہوں گا اسی لیے انہوں نے بالکل خالی گھر حوالے کرنے کے بجائے ضرورت کا کچھ سامان مہیا کرکے مجھے قبضہ دیا تھا۔

ابھی میں فریش ہوکر سوٹ کیس کھول کے بیٹھا ہی تھا کہ دروازے پر دستک ہونے لگی۔ دروازہ کھولا تو

شرافت حسین صاحب چائے بسکٹ اور سموسوں کی ٹرے ہاتھ میں تھامے کھڑے تھے۔

"ارے انکل! یہ کیا تکلف کیا آپ نے؟" ان کے ہاتھ سے ٹرے تھامتے ہوئے میں حقیقتاً ان کے حسنِ اخلاق سے زیربار ہو کر شرمندہ ہو گیا۔

"ارے بیٹا! تکلف کیسا؟ پہلا پہلا دن ہے اور گھر میں کوئی خاتون خانہ بھی نہیں ہے۔ ایسے میں میں نے سوچا فی الحال ابھی کچھ ہلکا پھلکا لے آؤں۔ کچھ دیر بعد کھانا بن جائے گا تو وہ بھجوا دوں گا۔" انہوں نے میرے کندھے پر ہاتھ رکھ کر رسان سے کہا۔

"نہیں انکل! میں کچھ نہ کچھ کرلوں گا آپ زحمت نہ کیجیے گا پلیز۔"

"زحمت کیسی بیٹا! جب تک آپ کی فیملی نہیں آجاتی، آپ کھانا نیچے ہی کھائیے گا۔ ویسے کب تک آجائے گی آپ کی فیملی؟" شرافت انکل کے اس طرح استفسار کا مطلب میں بخوبی سمجھ سکتا تھا۔

وہ اپنی اکلوتی جواں سال لڑکی کی وجہ سے میرے یہاں تنہا قیام پر متردد تھے اور چونکہ ان کی اہلیہ نہیں تھیں اور اولاد میں صرف ایک بیٹی ہی تھی اسی لیے وہ میرے اکیلے رہنے پر ہچکچاہٹ کا شکار ہو رہے تھے۔ پہلے میرا ایک ماہ بعد امی اور نمرہ کو بلانے کا ارادہ تھا، مگر انکل کا تردد دیکھ کر میں نے انہیں جلد ہی بلانے کا فیصلہ کرلیا۔

"جی جی بس، دس پندرہ دن بعد میں انہیں لے آؤں گا۔"

"چلو ٹھیک ہے۔ کسی چیز کی ضرورت ہو تو بلا تکلف بتا دینا۔" یہ کہہ کر وہ جانے کے لیے مڑ گئے۔

میں نے بھی گرم گرم چائے اور لوازمات سے بھرپور انصاف کرکے کچھ دیر آرام کرنے کی ٹھانی اور سوٹ کیس کھولنے کا ارادہ کل پر موقوف کرکے سفر کی تھکان اتارنے کی غرض سے لیٹ گیا۔

☼ ☼ ☼

صبح خلاف معمول بہت جلد آنکھ کھل گئی۔ شاید نئی جگہ کی وجہ سے ایسا ہوا تھا۔ میں نے نماز فجر ادا کی اور کپڑے نکال کر پریس کرنے لگا۔ پھر کچن میں جا کر ناشتا بنایا اور آفس کے لیے تیار ہونے چل دیا۔ چونکہ آج پہلا دن تھا اور راستوں اور جگہوں سے فی الحال ناواقف تھا تو سوچا تھوڑا جلدی نکلا جائے تاکہ وقت مقررہ پر پہنچ سکوں۔ ویسے تو شرافت انکل نے راستوں کے متعلق کافی راہنمائی کردی تھی مگر پھر بھی میں چاہتا تھا کہ پہلے دن تاخیر کا شکار نہ ہوں۔

تیار ہو کر میں نے جلدی سے رات کے کھانے کے برتن اٹھائے جو انکل رات عشاء کے بعد دے گئے تھے۔ سوچا نیچے اتر رہا ہوں تو دیتا ہوا ہی چلا جاؤں۔ سیڑھیاں اتر کر ایک دروازہ باہر گلی میں کھلتا تھا اور ایک گھر کے اندر، گھر کے اندر والے دروازے پر میں نے ہلکی سی دستک دی۔ جواباً اسی کرخت نسوانی آواز نے خیر مقدم کیا۔

"کون ہے؟" حالانکہ اندرونی حصے کا دروازہ بج رہا تھا تو یہ تو معلوم ہی ہوگا کہ کون ہے۔

"مستقیم۔" میں نے بھی مختصر جواب دینا ضروری سمجھا۔

"فرمایئے۔" الفاظ شائستہ اور لہجہ ناشائستہ (اونہہ! چنگیز خان کی ہمشیرہ)

"فرمانا نہیں ہے، یہ برتن واپس کرنے آیا تھا آپ کے، لے لیجیے۔" جواب میں تھوڑا سا دروازہ وا ہوا اور دوپٹے میں سے بمشکل ہاتھ برآمد ہوئے۔

"لایئے۔" اور برتن ہاتھ میں آتے ہی ہاتھ غڑاپ سے اندر اور دروازہ کھٹاک سے بند۔

"اونہہ! میں کون سا دیکھنے کے لیے مرا جا رہا ہوں ہٹلر کی جانشین۔" میں منہ میں بڑبڑاتا باہر نکل گیا۔

واپسی پر میں مختلف قسم کی سبزیاں اور پھل لے کر شرافت انکل کی خدمت میں حاضر ہو گیا۔ انکل پھل اور سبزیاں لینے میں بہت متامل تھے، مگر میں نے بھی انہیں شاپرز تھما کر ہی دم لیا۔ ساتھ ہی میں نے خرچے کی مد میں تھوڑی رقم بھی ان کے حوالے کرنا چاہی تو وہ خاصے برافروختہ ہوئے اور رقم لینے سے مسلسل انکاری۔ میں نے مجبوراً انہیں ان کے گھر سے کھانا نہ کھانے کی دھمکی دے ڈالی۔ دھمکی کارگر تو ثابت

ہوئی، مگر پوری رقم انہوں نے پھر بھی نہ لی۔

شام میں چائے کا کپ لے کر میں یوں ہی بالکونی میں کھڑا ہو گیا۔ گلی میں سبزی والا بہت سی عورتوں سے بھاؤ تاؤ میں مصروف تھا۔ تب ہی جانی پہچانی سی "دنیا سے بے زار" آواز سنائی دی۔

"آلو کس حساب سے دے رہے ہو؟" انداز ایسا تھا گویا تفتیشی افسر ملزم سے پوچھ رہا ہو۔ "کب سے یہ دھندہ کر رہے ہو؟" اپنی اس خودساختہ تشبیہہ پر میں دل ہی دل میں خوب ہنسا۔

"باجی! چالیس روپے کلو۔" سبزی والا دانت نکوس کر بولا۔

"تیس روپے لگاؤ اور ایک کلو دے دو۔" (لگتا ہے شرافت صاحب کی صاحبزادی میں شرافت نام کو نہیں ہے)

"نہیں باجی... ! کیا کہہ رہی ہو؟ تیس روپے تو ہماری خرید بھی نہیں ہے۔ آپ کو کیسے تیس روپے لگا دوں۔" سبزی والا دروازے کی اوٹ میں چھپی دوشیزہ کو متجسس ہو کر دیکھنے کی کوشش میں مسلسل سر اور دیدے گھما رہا تھا۔

"اچھا! تو پھر یہ برابر والی پڑوسن تمہاری خالہ لگتی ہے جو تم نے ابھی اس کو ساٹھ روپے میں دو کلو آلو دیے ہیں۔" آواز کے ساتھ ساتھ کان بھی بڑے تیز تھے محترمہ کے، میں بالکونی سے نیچے جھانکتے ہوئے بڑی دلچسپی سے ان کی تکرار سن رہا تھا۔

"وہ تو... اچھا چلو لے لو۔" سبزی والا اپنی بغلیں جھانک کر رہ گیا۔

"وہ سامنے بچہ کھڑا ہے نا' اس کے ہاتھ بھیج دو آلو' پیسے میں اس بچے کے ہاتھ بھیج دوں گی۔ ٹھیک ہے؟" دروازہ دھاڑ کی آواز کے ساتھ بند ہوا تو میں بھی مسکراتے ہوئے وہاں سے ہٹ گیا۔

☆ ☆ ☆

آج صبح میں کافی دنوں بعد بہت پرسکون نیند لے کر اٹھا تھا۔ کیونکہ کل رات ہی میں امی اور نمو کو ملتان سے لے آیا تھا۔ سو راوی چین ہی چین لکھ رہا تھا۔

امی اور نمو اگلے دن شام میں ہی اپنے مالک مکان کے ہاں ملنے پہنچ گئیں اور جب وہاں سے ہو کر آئی تھیں مسلسل شرافت حسین صاحب کی صاحبزادی کومل کی شان میں رطب اللسان تھیں۔ مجھے تو یہ جان کر کہ ان موصوفہ کا نام "کومل" ہے بہت ہی عجیب لگا۔ یعنی باپ اسم بامسمیٰ تھے تو بیٹی اپنے نام کی متضاد۔ واہ...

مگر امی تو کوئی اور ہی فسانہ سنا رہی تھیں مثلاً "بڑی خوش گفتار بچی ہے اور انداز تخاطب تو انتہائی شائستہ ہے وغیرہ وغیرہ اور مجھے ان کے ان ریمارکس پر خوب ہی ہنسی آگئی۔

"ارے والدہ محترمہ! آج پہلا پہلا دن ہے نا تو موصوفہ تھوڑی تہذیب کے دائرے میں نظر آرہی ہوں گی۔ کچھ دن اور گزرنے دیں بلی تھیلے سے باہر آہی جائے گی۔" امی میری مبہم سی باتوں پر نافہمی سے میری جانب دیکھ کر بولیں۔

"ارے لڑکے! کیا اول فول بکے جا رہے ہو اس بچی کے بارے میں' تہذیب' تھیلا' بلی اُف!!" امی نے ماتھے پر ہاتھ مارا اور مجھے خشمگیں نگاہوں سے گھورتی ہوئی کچن کی جانب چلی گئیں۔

☆ ☆ ☆

پھر کئی ماہ گزر گئے' مگر نمرہ اور امی کے آنسہ کومل کے بارے میں خیالات رتی بھر بھی ادھر سے ادھر نہ ہوئے اور نہ ہی میرے۔ عجیب بات تھی وہ لڑکی مجھ سے کبھی کبھار ضرور تا" بھی کچھ بات کرتی تو کاٹ کھانے کو دوڑتی اور امی وغیرہ پر جانے کون سا منتر پڑھ کر پھونکا تھا کہ وہ ہر دم اس کی قصیدہ گوئی میں مصروف رہتیں۔

اور ایک دن تو حد ہی ہو گئی۔ امی کومل پر فریفتہ ہیں یہ تو مجھے ان پانچ مہینوں میں انہوں نے اچھی طرح باور کروا دیا تھا مگر اس بری طرح فریفتہ ہیں کہ اسے اپنی بہو بنانے پر تل جائیں گی اس کا مجھے ہرگز اندازہ نہ

ہو سکا تھا۔ جب امی نے اس نادر شاہی خیال کو عملی جامہ پہنانے کی غرض سے مجھ سے رجوع کیا تو میں نے تو سنتے ہی بے ساختہ ”لاحول ولا“ پڑھی اور کانوں کو ہاتھ لگا کر سر کو دائیں بائیں حرکت دیتے ہوئے زبان دانتوں تلے داب لی۔

”ارے لڑکے! باؤلے ہوگئے ہو کیا.....؟ تم تو ایسے کر رہے ہو جیسے میں نے کومل کو تمہاری دلہن بنانے کی بات نہ کردی ہو، کوئی فحش گالی دے دی ہو؟“ امی ناراضی سے بولیں۔

”سمجھ میں نہیں آتا امی! آپ کی سوئی اسی ایک لڑکی پر آکر کیوں اٹک گئی ہے؟ یہ سارے گنس آپ کو اسی میں ہی نظر آتے ہیں؟ ذرا باہر نکلیں ادھر ادھر بھی چھان پھٹک کریں۔“

”اوئی اللہ! باہر کی لڑکی.....؟ اچھا آ آ آ..... تو یہ ماجرہ ہے۔ کون ہے وہ لڑکی؟“ امی اپنے تئیں بات کی تہ تک پہنچیں۔

”لاحول ولا قوۃ“، میرا دل سر پیٹ لینے کو چاہا۔ ”ایسی کوئی بات نہیں ہے۔ میں نے تو بس یوں ہی ایک بات کی تھی۔“

”اچھا تو پھر کیا برائی ہے اس رشتے میں، اتنی حلیم الطبع اور نیک اطوار کی حامل بچی ڈھونڈے سے بھی نہ ملے، تم ہاں کردو تو میں جھٹ شرافت بھائی صاحب کے آگے جھولی پھیلا دوں، مجھے یقین ہے وہ انکار نہیں کریں گے۔ اتنا ہونہار اور برسر روزگار داماد کون نہیں چاہتا اور پھر تم بتا رہے تھے نا کہ تمہارے باس تمہاری محنت اور لگن سے متاثر ہوکر چھ، سات ماہ میں تمہاری ترقی کردیں گے اور تمہیں کمپنی کی طرف سے گھر اور گاڑی بھی مل جائے گی اور.....“

”امی امی..... ریلیکس، اپنی طرف سے ہی سب کچھ فرض کیے بیٹھی ہیں آپ۔ بس میں اس بات کا ذکر بھی دوبارہ نہ سنوں۔“ میرے اس طرح سختی سے کہنے سے امی کو میرے واضح انکار کا اندازہ ہوگیا تھا تب ہی وہ خفا ہوکر چپ ہوگئیں۔ میں بھی وہاں سے فوراً اٹھ گیا۔

اسی ادھیڑ بن میں وہ واقعہ رونما ہوا جس نے میری دنیا ہی بدل دی۔

اس دن میں اپنے ایک آفس کولیگ اور دوست عمار سے ملنے اس کے گھر گیا تھا۔ کافی دنوں سے وہ اصرار کر رہا تھا کہ کسی دن شام کی چائے پر میں اس کے گھر آؤں۔ گھر چونکہ نزدیک ہی تھا سو میں پیدل ہی روانہ ہوگیا۔ عمار کے گھر پہنچ کر میں نے دروازے پر زور سے دستک دی۔ پہلی ہی دستک پر ایک مترنم آواز سنائی دی۔

”کون؟“

”جی میں مستقیم ہوں۔ عمار کا دوست۔“

”اچھا! مگر عمار تو گھر پر نہیں ہے۔“ وہی شیریں اور گنگناتی آواز کانوں میں پڑی تو ایک لحظے کو تو میں کھو سا گیا۔

”کوئی ضروری کام تھا آپ کو؟“ وہی شہد آگیں لہجہ مجھے ہوش کی دنیا میں واپس لایا۔

”جی کام تو کوئی خاص نہ تھا بس وہ کئی دنوں سے اپنے گھر آنے پر اصرار کر رہا تھا تو بس اس سے ملنے ہی آیا تھا۔“ میں نے ٹھہر ٹھہر کر نپے تلے انداز میں کہا۔

”اچھا تو پھر ایسا کیجیے، آپ اندر آجائیے ڈرائنگ روم میں بیٹھ کر ویٹ کرلیں۔ عمار مارکیٹ تک گئے ہیں، سودا سلف لینے کے لیے۔ بس آتے ہی ہوں گے۔“ جی تو چاہا اس آفر پر صدق دل سے آمنا و صدقنا کہہ کر اندر چلا جاؤں، مگر میز بھی کوئی شے ہوتی ہے۔ سو میں ازراہ تکلف بولا۔

”جی نہیں شکریہ۔ میں پھر کسی دن آجاؤں گا۔“

”ارے نہیں، آپ ویٹ کر لیجیے پلیز! عمار کو پتا چلے گا تو وہ بہت خفا ہوں گے۔“ اب تو انکار کی کوئی گنجائش ہی نہ تھی۔

عمار کی بیوی نے دروازہ پورا کھول دیا اور خود دروازے کی اوٹ میں ہوکر بولی۔ ”جی دائیں ہاتھ پر ڈرائنگ روم ہے۔ آپ وہاں تشریف لے جائیے۔“ میں نیچی نگاہ کیے تیزی سے دائیں جانب مڑ گیا۔

ڈرائنگ روم پر ایک ستائشی نظر ڈال کر میں ایک سنگل صوفے پر براجمان ہوگیا۔ ڈرائنگ روم کے دو دروازے تھے۔ ایک وہ جہاں سے میں ابھی داخل ہوا تھا اور دوسرا یقیناً گھر کے اندرونی حصے میں کھلتا تھا۔ جہاں ایک بھاری پردہ لٹک رہا تھا۔ پردہ ہوا کے دوش پر اڑتا تو گھر کا اندرونی حصہ دکھائی دینے لگتا۔ میں گاہے بگاہے اس جانب نگاہ ڈال لیتا کہ شاید وہ خوب صورت آواز کی مالک لڑکی دکھائی دے جائے۔

"ارے... رے... رے... آپ شاید مجھے دل پھینک یا آوارہ مزاج شخص سمجھ رہے ہوں گے۔ پلیز مجھے ایسا ہرگز مت سمجھیں، گو کہ میری تمام حرکات و سکنات مذکورہ صفات پر پوری اترتی دکھائی دے رہی ہیں، مگر یقین جانیے شاید میں اس لڑکی کی مسحور کن آواز کے سحر میں وقتی طور پر گرفتار ہوگیا تھا۔ ورنہ میں اتنا گرا ہوا ہرگز نہ تھا کہ ایک اجنبی لڑکی بالخصوص دوست کی بیوی کے بارے میں اس طرح کے احساسات رکھوں، بہرحال اس وقت میں واقعی خود کو بڑا بے بس محسوس کر رہا تھا۔

عمار کی شادی کو محض چھ ماہ ہی ہوئے تھے اور وہ اپنے گھر والوں سے علیحدہ اپنی بیوی کے ہمراہ اس کرائے کے مکان میں رہائش پذیر تھا۔ وہ دن میں پچھتر مرتبہ مجھے ضرور یہ بتاتا کہ اس کی بیوی دنیا کی حسین ترین عورت ہے اور اس حسین ترین عورت کی حسین ترین آواز کے باعث میں دل ہی دل میں اس کے نادیدہ حسن کا معترف ہوچکا تھا۔

"یہ لے لیجئے پلیز۔" وہ پردے کے اندر سے ہاتھ نکال کر دستک دینے کے ساتھ ساتھ مجھے مخاطب کرکے بولی۔ میں یک دم اپنے خیالوں سے باہر آیا تو دیکھا ایک خوب صورت حنائی ہاتھ، جو درجن بھر چوڑیوں سے بھرا ہوا تھا چائے اور دیگر لوازمات سے بھری ٹرے تھامے ہوا تھا۔

میں نے جلدی سے آگے بڑھ کر ٹرے تھام کر کہا۔

"ارے، اس تکلف کی کیا ضرورت تھی۔ ابھی آپ عمار کو تو آنے دیتیں، ساتھ ہی پی لیتے چائے۔"

جواباً اس کا نقرئی قہقہہ گونجا۔ "چائے سے تو عمار کو خدا واسطے کا بیر ہے، اسی لیے میں نے ان کا انتظار نہیں کیا۔"

"جی جی... درست فرمایا آپ نے۔ میں بھول گیا تھا۔" اب میں کیا کہتا کہ آپ کی آواز کے سحر میں جکڑ کر میں واقعی یہ بات بھول گیا کہ وہ چائے بالکل بھی نہیں پیتا۔ میں نے مڑ کے تھائی تو پردہ ہوا سے ہلکا سا اڑا تو میں نے اس پری وش کی ہلکی سی جھلک دیکھی۔ اور واقعی میں مبہوت رہ گیا۔

اتنا مکمل حسن!! عمار اگر اس پر دل و جان سے فدا تھا تو کچھ غلط نہیں تھا۔ بہرحال میں چائے سے تو کیا خاک لطف اندوز ہوتا۔ الٹا میرے دل کی حالت عجیب دگرگوں ہوگئی۔ شاید ہمارے مذہب میں تنہائی میں دو نامحرم افراد کی موجودگی کو اسی لیے انتہائی ناپسندیدگی کی نگاہ سے دیکھا گیا ہے۔ بہرحال میں اب جلد سے جلد یہاں سے نکل جانا چاہتا تھا ورنہ غالب گمان یہی تھا کہ شیطان مجھ سے کوئی ایسا فعل سرزد نہ کروا دے جس کے باعث میں ساری عمر عمار سے نظریں نہ ملا سکوں۔ میں ایک جھٹکے سے اٹھا اور داخلی دروازے کی جانب بڑھ گیا۔

"ارے رکیے تو... عمار سے مل کر جایئے گا نا، وہ بس..." پیچھے سے عمار کی بیوی کی آواز سنائی دے رہی تھی۔

"جی وہ میری ضروری کال آگئی ہے۔ مجھے فوراً جانا ہوگا، پھر کبھی سہی۔" میں ہنکار کے کہتا ہوا نکلتا چلا گیا۔

"اف خدایا!" باہر نکلا تو خیالات کی یورش کچھ تھمی۔ یوں جیسے میں کسی طلسم کدے سے باہر نکلا ہوں۔ تمام راستے خود کو لعنت ملامت کرتا رہا کہ میں آج جو کرکے آرہا ہوں، وہ کسی شریف النفس انسان کا طرز عمل ہرگز نہیں ہوسکتا۔

☼ ☼ ☼

آج میں آفس سے ذرا جلدی اٹھ آیا تھا۔ طبیعت بھی کچھ بوجھل سی ہو رہی تھی اور آفس میں بھی کوئی خاص کام نہ تھا۔ گھر میں داخل ہو کر جوں ہی میں نے

اپنے کمرے کی جانب قدم بڑھائے تو نمو کی آواز نے میرے قدم جکڑ لیے۔ وہ برابر کمرے میں موجود کسی سے میرا تذکرہ کر رہی تھی۔ میں نے یونہی جھانک کر دیکھا' میرے بالکل سامنے نمو بیٹھی تھی اور نمو کے بالکل سامنے کوئی لڑکی تھی۔

"جانتی ہو' مستقیم بھائی تمہیں ہلاکو خان کی جانشین اور ہٹلر کی پوتی اور بھی نہ جانے کن کن القابات سے نوازتے ہیں۔" نمو کے ساتھ بیٹھی لڑکی یقیناً (القابات کے تناظر میں) کومل ہی تھی جو شاید میرے آفس میں موجودگی کے باعث اوپر آئی تھی۔

"اچھا؟" وہ دھیرے سے ہنسی (کومل اور ہنسی... یا حیرت)

"تم ہنس رہی ہو؟ میں تو سمجھی تھی کہ تم یہ سب سن کر بہت خفا ہوگی۔" نمرہ حیرت سے بولی۔ میں لاؤنج میں پڑی کرسی پر بیٹھ گیا' مگر یہاں بھی ان کی آوازیں واضح طور پر سنائی دے رہی تھیں۔

"خفا میں تب ہوتی جب تمہارا بھائی میرے بارے میں کوئی تعریفی کلمات کہتا۔"

"نہیں...؟" نمرہ کی طرح میں بھی حیرت زدہ رہ گیا۔

"ہاں اور میں خوش ہوں کہ جو تاثر میں نے دینا چاہا تھا' میں اس میں سو فیصد کامیاب رہی۔" کومل کے ان الفاظ نے مجھے بُری طرح الجھا دیا۔

"مگر کیوں...؟" نمرہ نے استفسار کیا۔

"جب میں کالج میں تھی تو ہماری اسلامک ہسٹری کی ٹیچر نے ایک حدیث ڈسکس کی تھی۔ جس کا مفہوم کچھ یوں تھا کہ "غیر مرد سے نرمی مت برتا کرو' ان سے سختی کے ساتھ پیش آیا کرو تاکہ وہ تمہاری جانب ملتفت نہ ہو سکیں۔" ہماری ٹیچر نے ہمیں اس سے متعلق ایسا متاثر کن لیکچر دیا کہ بس میں نے یہ بات گرہ سے باندھ لی اور آج تک میں اس نصیحت پر عمل پیرا ہوں اور واقعی میں نے دیکھا کہ میرے اس طرز عمل سے بہت سے نٹ کھٹ لڑکوں کے قدم پیچھے ہٹ گئے۔

ابو جی کے آفس جانے کے بعد میں —— اور امی اکیلی رہا کرتی تھیں۔ میرے اس طرز عمل نے بہت سے مردوں کے قدم ہمارے دروازے تک پہنچنے سے پہلے ہی متزلزل کر دیے اور اب کم از کم میرے محلے کے مرد مجھ پر جب نگاہ ڈالتے ہیں تو ان نگاہوں میں اشتیاق کے بجائے بے زاری جھلکتی ہے' جو میرے گرد تحفظ کا حصار باندھ دیتی ہے۔" یہ وہ کومل تو نہ تھی جس سے میری پہلی ملاقات ہوئی تھی۔ یہ تو کوئی بہت سلجھی ہوئی اور شائستہ لب و لہجے کی مالک لڑکی تھی۔

پہلی ملاقات یاد آتے ہی میرے لبوں پہ بے ساختہ مسکراہٹ چمکی۔ اس کے بعد —— وہ تمام واقعات میرے سامنے کسی فلم کی مانند گھوم گئے۔

اور وہ واقعہ بھی جو عمار کے گھر پیش آیا۔ اگر عمار کی بیوی مجھ سے یوں شہد آگیں لہجے میں مخاطب نہ ہوتی تو میں اس کے بارے میں یوں گھٹیا خیالات ذہن میں نہ لاتا۔ اگر وہ بھی کومل کی طرح سختی سے پیش آتی تو میری جسارت نہ بڑھتی اور خاص کر کسی غیر مرد کو گھر میں بے دھڑک بلا لینا' یہ بھی عورت کے لیے ایک غلط فعل ہے۔

ہر مرد کی فطرت مختلف ہوتی ہے۔ ضروری نہیں کہ جسے ہم شریف سمجھ رہے ہوں' وہ حقیقت میں بھی ویسا ہی ہو۔

نفس اور شیطان انسان کے ازلی دشمن ہیں لہٰذا عورت ہو یا مرد' دونوں کو ہی اسلامی حدود و قیود کا خیال رکھنا چاہیے۔

میں کومل جیسی باحیا اور باکردار لڑکی کو کیا سمجھے بیٹھا تھا۔ اب ادراک کا در وا ہوا تو دل سے ساری کدورت جاتی رہی اور اسی لمحے میں نے وہ فیصلہ کر لیا۔ جی ہاں... کافی سمجھ دار ہیں آپ لوگ... کومل کو اپنی نصف بہتر بنانے کا فیصلہ۔

مطلع صاف ہوا تو آسمان بھی روشن روشن اور نکھرا نکھرا سا لگنے لگا اور کومل بھی... گو کہ میں نے اب تک اسے دیکھا نہ تھا' مگر مجھے اب اس بات سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ کردار کی مضبوطی ہم سب کے لیے سب سے اہم ہونی چاہیے... کیوں...؟ کیا خیال ہے آپ کا؟

سدرہ حیات

خوشبوؤں کا موسم

"بالکل ساسوں والا سلوک کرتی ہیں امی میرے ساتھ۔۔۔ ابھی رخصت ہو کر پھوپھو کے گھر گئی نہیں اور ٹارچر اپنے ہی گھر سے شروع ہو گیا۔ امی کم ساس زیادہ لگتی ہیں۔"
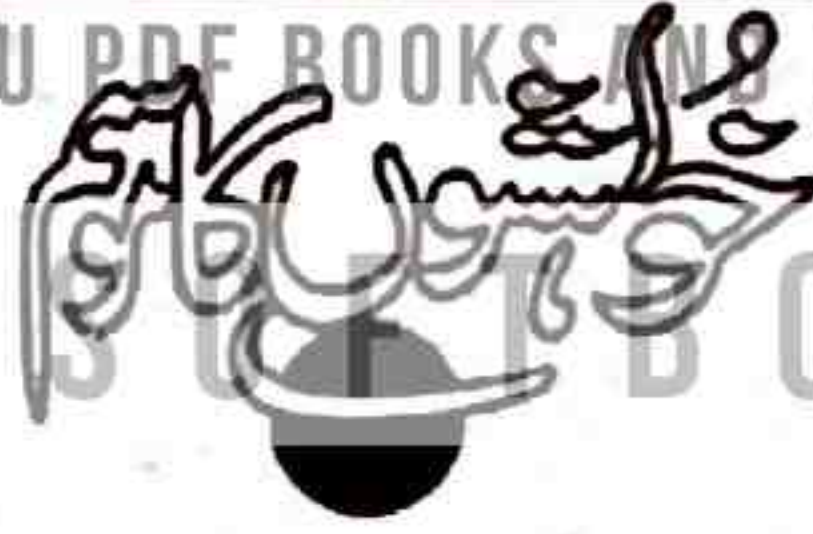
"جب سے آئی ہوں ایشال! تمہارے ہی دکھڑے سن رہی ہوں، کچھ کھانے کو ہی پوچھ لو۔" سحر نے مداخلت کی، اس سے پہلے کہ ایشال کی داستان جبر مزید طویل ہو جاتی۔

ناولٹ

"میرا یہاں دل جل رہا ہے اور تمہیں کھانے کی پڑی ہے۔" ایشال نے صدمے سے اپنی خالہ زاد کو دیکھا جو فریج میں کھانے کو کچھ تلاش کر رہی تھی۔

"کوئی بات نہیں، بس ہانڈی نہ جلا دینا۔۔۔ ویسے بنا کیا رہی ہو؟" سحر اس کے قریب آئی، ہاتھ میں کیک کی پلیٹ تھی جو وہ فریج سے برآمد کر چکی تھی۔

"بریانی۔۔۔" ایشال نے منہ بناتے ہوئے چولہے کی آنچ آہستہ کی۔

"آج کی تاریخ میں بن جائے گی؟" سحر نے اس پھیلاوے کو دیکھا جو ایشال نے سارے کچن میں پھیلا

رکھا تھا۔

کچن میں آنے سے اس کی جان جاتی تھی اور آج تو گرمی سے بری حالت ہو رہی تھی۔

"بریانی بنانے کی اچھی پریکٹس کرلو اب تم... ویسے بھی جبران بھائی کی فیورٹ ہے۔"

"ہر مشکل ڈش ہی جبران کی فیورٹ ہے... لوگوں کو ابلے ہوئے چاول' ابلی دال اور پتا نہیں کیا کیا پسند ہوتا ہے... ایک میرے سسرال والے ہیں' کھانے پینے کے شوقین' چٹورے..." ایشال کے جلے بھنے انداز پر سحر کو ہنسی آئی۔

"شرم کرو پھوپھو ہیں تمہاری..."

"چٹورے ہیں تو چٹورے ہی کہوں گی۔"

"وہ تم بازار چلنے کا کہہ رہی تھیں' کب جانا ہے۔" سحر کو یاد آیا۔

"ہوں کل چلیں گے آج تو میری حالت تمہارے سامنے ہے۔"

"لینا کیا ہے۔" سحر نے برتن دھوتے ہوئے پوچھا۔

"سونیا ٹریٹ دے رہی ہے' اپنی منگنی کی خوشی میں اور میرے پاس کوئی جوڑا نہیں ہے۔ سارے کپڑے پرانے ہو چکے ہیں' ایک اچھا سا جوڑا لینا ہے اور بھی کچھ چیزیں لینی ہیں۔" سحر سر ہلا کر ان برتنوں کی طرف متوجہ ہو گئی جو ایشال گندے کر چکی تھی۔ ایشال نے تیز تیز ہاتھ چلانے شروع کیے۔ امی کے گھر آنے سے پہلے اسے بریانی بنانی تھی۔

☆ ☆ ☆

سورج سوا نیزے پر تھا۔ دھوپ اور گرمی سے بدن جھلس رہے تھے۔ مگر بازاروں میں رش معمول کے مطابق تھا۔ ایشال اور سحر کپڑوں کی دکان میں کھڑی کپڑے دیکھ رہی تھیں۔

"ایشال دیکھو' یہ پرنٹ کتنا خوب صورت ہے۔"

"ہوں' بس ٹھیک ہی ہے۔"

"مجھے تو پسند آیا ہے' تم بھی کوئی پسند کرلو۔" سحر نے اس کا بازو ہلا کر متوجہ کیا جو دوسرے سیکشن کی طرف نظریں گاڑے بیٹھی تھی۔

"نہیں بھئی میں تو کوئی اچھا سا کڑھائی والا برانڈڈ سوٹ لوں گی' کسی اچھے ڈیزائنر کا۔" سحر نے اس کے منہ بنانے پر گہرا سانس لیا۔ جانتی تھی کہ اسے ڈیزائنر جوڑے لینے کا کتنا شوق ہے۔ دکان دار کو جوڑا پیک کرنے کا کہہ کر وہ ایشال کے ساتھ دوسرے سیکشن کی طرف آگئی۔

"سحر یہ دیکھو کتنا خوب صورت ہے۔ کڑھائی بھی پیاری ہے اور یہ کومبنیشن کتنا اچھا لگ رہا ہے۔" سارے میں گھوم پھر کر دیکھنے کے بعد آخر کار ایشال کو ایک سوٹ پسند آ ہی گیا۔

"واقعی پیارا تو لگ رہا ہے۔" سحر نے بھی تائید کی... مگر قیمت جان کر اس کے ہوش اڑ گئے۔

"نو ہزار کا سوٹ... ایشال اتنے پیسے ہیں تمہارے پاس...؟"

"پر یہ سوٹ ہے کتنا خوب صورت... کاش نو ہزار ہوتے... تمہارے پاس کتنے ہیں۔" ایشال نے پرامید ہو کر پوچھا۔

"جی نہیں' اتنے نہیں ہیں اور میں نے سودا بھی خریدنا ہے ابھی..." سحر فوراً بدکی' وہ پہلے ہی شکر ادا کر رہی تھی کہ ایشال کے پاس اتنے پیسے نہیں ہیں' ورنہ اس سے کیا بعید جتنے ہوتے لٹا دیتی۔

"چلو کوئی اور دیکھ لو' مناسب قیمت والا۔" سحر نے اس کا دھیان بٹانا چاہا۔

"یہ دیکھو اچھا لگ رہا ہے۔ یہ بھی دو ہزار کا..."

"میں قیمت دیکھ کر نہیں پسند کرتی اور ویسے بھی اس کا دوپٹا لان کا ہے... مجھے شیفون کے دوپٹے پسند ہیں۔" اس کے نخریلے انداز پر سحر تپ گئی۔

"ہاں جی' ہو تو تم کسی ریاست کی شہزادی جو قیمت دیکھنے سے شان گھٹ جائے گی۔"

"ہوں نہیں تو کیا ہوا۔ اچھا سوٹ پہن کر شہزادی ہی لگوں گی۔" ایشال نے اترا کر کہا۔ اب وہ پھر سے اپنے لیے کوئی سوٹ ڈھونڈ رہی تھی۔ دو گھنٹے بعد وہ

دکان سے باہر نکلیں۔ دونوں اپنی پسند کے سوٹ لے چکی تھیں۔

"ایشال یہ جو چھ ہزار کا تم نے سوٹ لیا ہے نا خیر مناؤ اپنی‘ اب خالہ نے تمہیں گھسنے نہیں دینا گھر میں۔"

"ہائے مجھے تو وہ سوٹ یاد آرہا ہے‘ کیا کمبینیشن تھا۔" ایشال کے حسرت بھرے انداز پر سحر نے اپنا سر پیٹ لیا۔

"باقی چیزیں کیسے لوگی۔۔۔ جو خالہ نے منگوائی تھیں ہوجائیں گے پیسے پورے۔۔۔؟"

"وہ۔۔۔ پتا نہیں دیکھتی ہوں۔۔۔" ایشال فکر مندی سے باقی ماندہ رقم گننے لگی جو باقی اشیا کی خریداری کے لیے خاصی کم تھی۔ اس کے چہرے پر فکر مندی کے تاثرات دیکھ کر سحر نے افسوس سے سرہلایا۔ وہاں دکان کے کاؤنٹر پر بھی ایشال نے اس کی ایک نہ سنی تھی۔

٭ ٭ ٭

"کچھ خدا کا خوف کرو بی بی‘ خزانے نہیں دفن اس گھر میں‘ جو میں نکال نکال کر تمہیں دیتی رہوں اور تم ان اللوں تللوں میں اڑاتی پھرو۔۔۔" ایشال سر جھکائے بیٹھی تھی۔ ساتھ ہی سحر بیٹھی پسینہ سکھا رہی تھی۔ اس کے لیے اب یہ عام سی بات تھی۔ جب بھی ایشال اس قسم کی خریداری کرکے آتی تھی خالہ اسی طرح جلالی روپ اختیار کرلیتی تھیں۔ "میں اب باقی چیزیں کہاں سے پوری کروں۔۔۔

"لو بتاؤ باپ کی محنت کر کر کے ہڈیاں گھس گئیں اور یہ لاٹ صاحب کی اولاد بنی خون پسینے کی کمائی لٹا رہی ہیں۔ سحر بھی تو ہے ہمیشہ مناسب خریداری کرتی ہے‘ کچھ اسی سے سیکھ لو۔" اچھی خاصی کلاس لینے کے بعد وہ کچن میں چلی گئیں۔ ایشال نے سحر کو دیکھا جو خاموش بیٹھی پنکھے کو گھور رہی تھی۔

"تمہاری وجہ سے زیادہ ڈانٹ پڑتی ہے مجھے اور لو سستا سا جوڑا۔"

"بھئی میں تو اپنی حیثیت کے مطابق شاپنگ کرتی ہوں‘ اپنی غلطی میرے کھاتے میں مت ڈالو۔" سحر نے بے نیازی سے کہا۔ ایشال نے کچن کی طرف دیکھا جہاں سے ابھی بھی ساجدہ بیگم کے بولنے کی آوازیں آرہی تھیں۔

"باپ کی کمائی کی قدر نہیں‘ شوہر کی خاک کرے گی۔ میری ہی تربیت پر حرف آئے گا‘ یہ بی بنو تو چلا چکیں سسرال کا نظام۔۔۔" ساتھ ہی زور‘ زور سے برتن رکھنے کی آوازیں بھی آرہی تھیں۔

٭ ٭ ٭

کچن سمیٹ کر اس نے ایک نظر دیکھا‘ کہیں کوئی چیز رہ نہ گئی ہو‘ پھر مطمئن ہو کر اپنا چائے کا کپ اٹھا کر کمرے کی طرف چل پڑی۔ امی اور ابو کو وہ پہلے ہی چائے دے آئی تھی۔ کمرے میں داخل ہوتے ہی اسے مخصوص رنگ ٹون کی آواز سنائی دی جو کافی دیر سے بج رہی تھی۔ ایشال نے مسکراتے ہوئے موبائل اٹھایا۔ دوسری طرف سے جبران کی آواز سنائی دی۔

"ہیلو‘ السلام علیکم! کہاں تھیں بھئی‘ میں تو مایوس

ہو کر فون بند کرنے والا تھا۔"

"کچن میں تھی۔۔۔ آج کھانا لیٹ کھایا' بس اسی لیے کچھ دیر ہو گئی۔۔۔ تم کیسے ہو اور تمہارا ادہی۔۔۔؟"

"ہم دونوں ٹھیک ٹھاک ہیں۔۔۔ پاکستانیوں کو شدت سے یاد کر رہے ہیں۔"

"سفید جھوٹ ہے یہ۔۔۔ بلکہ مجھے بہلانے کا اچھا طریقہ ہے۔ روز فون تو کرتے نہیں ہو۔۔۔ ایک سونیا کا منگیتر ہے دن میں چار چار دفعہ فون کرتا ہے۔" ایشال نے شکوہ کیا' ساتھ ساتھ وہ چائے بھی پی رہی تھی۔

"یقیناً" وہ کچھ کرتا نہیں ہوگا' ورنہ نوکری کرنے والا بندہ اور اس قدر فراغت میں مان ہی نہیں سکتا۔ چلو چھوڑو۔۔۔ اپنی بات کرتے ہیں۔ تم سناؤ کیا ہو رہا ہے آج کل۔۔۔" جبران نے موضوع تبدیل کرنا چاہا۔

"میرے اوپر تو ظلم ہی ہو رہا ہے اور ظلم توڑنے والی تمہاری ساس ہیں۔۔۔ جب سے ہمارا نکاح ہوا ہے تب سے اسی کوشش میں تھیں' کسی طرح مجھے کچن میں گھسیٹیں۔ اب جب سے یونی ورسٹی ختم ہوئی ہے میری تو شامت آگئی ہے۔ صرف تمہاری فیورٹ ڈشز بنوائی ہیں' وہ بھی اتنی مشکل' مشکل۔۔۔" ایشال کے لہجے کی مسکینیت محسوس کر کے جبران ہنس دیا۔

"تم ہنس رہے ہو۔۔۔ میری جگہ ہوتے پھر پوچھتی میں۔۔۔" ایشال خفا ہوئی۔

"سویٹ مامی۔۔۔ کتنا خیال ہے انہیں میرا' تم بھی اچھی طرح سیکھ لو آخر کو مرد کے دل کا راستہ معدے سے ہو کر گزرتا ہے۔" ایشال نے کپ ایک سائڈ پر رکھ کر بالوں کو کیچر سے آزاد کر کے تکیے پر سر رکھا اور آرام دہ انداز میں لیٹ گئی۔ "ہائے میں تو ساری زندگی معدے میں ہی پھنسی رہوں گی۔"

"اتنی ٹینشن کیوں لے رہی ہو' بس بریانی سیکھ لو میرے لیے کافی ہے۔" جبران کو اس کی پتلی حالت کا اندازہ تھا جس کی کچن میں جانے سے جان جاتی تھی۔

"اتنا تو میں تمہارے لیے کر ہی سکتی ہوں' بریانی اچھے سے سیکھ لی ہے۔" ایشال مسکرائی۔ "آج بازار گئی تھی۔۔۔ اف کیا بتاؤں اتنا پیارا جوڑا پسند کیا' مگر لے نہیں سکی۔" ایشال کو وہ جوڑا یاد آیا جو وہ لے نہیں سکی تھی۔

"کیوں بک گیا تھا؟"

"نہیں نو ہزار کا تھا۔" ایشال نے افسردگی سے بتایا۔

"نو ہزار کا! اتنا مہنگا' کیا شادی کا جوڑا پسند کیا تھا۔" جبران کے لہجے میں حیرت تھی۔

"نہیں لان کا جوڑا تھا۔ شادی کے جوڑے خاصے مہنگے ہوتے ہیں تو ہزار تو کچھ بھی نہیں ہے۔"

"لان کا جوڑا نو ہزار کا۔۔۔؟"

"ہائی کوالٹی لان تھی' اتنا پیارا کمبینیشن اور کڑھائی تھی کہ کیا بتاؤں' میری تو نظروں کے سامنے سے ہٹ ہی نہیں رہا۔ اوور آل تو ساری کلیکشن ہی اچھی تھی' گل احمد' ثناء سفیناز' ماریہ بی' کھاڈی سب ہی کے پرنٹ اچھے تھے۔" ایشال پرجوش انداز میں بتا رہی تھی دوسری طرف جبران کے پلے ایک لفظ بھی نہیں پڑا تھا۔ اس معاملے میں وہ بالکل کورا تھا۔ اوپر سے ایشال کی تفصیلات' ایشال کو ہر بات اس سے کرنے کی عادت تھی اور اس کا اس وقت تھکن سے برا حال تھا۔ اس نے جمائی روکتے ہوئے پوچھا۔

"اب یہ سب کون ہیں؟"

"بڑے بڑے ڈیزائنرز ہیں' جن کے برانڈڈ جوڑوں کا میں ذکر کر رہی ہوں۔" ایشال نے اپنا سر پیٹ لیا۔ یعنی موصوف کو ڈیزائنرز کا بھی نہیں پتا۔

"اوہ۔۔۔ اچھا ہوں گے۔۔۔ مجھے کیا پتا میں کوئی ان کے ساتھ بچپن میں کھیلا ہوں۔" ایشال نے سرد آہ بھری۔ چند ادھر ادھر کی باتیں کر کے اس نے فون رکھ دیا۔

☼ ☼ ☼

موسم خوش گوار تھا۔ ہلکی ہلکی ہوا چل رہی تھی۔ ایشال خالہ کی طرف آئی ہوئی تھی۔ سحر چائے کے ساتھ پکوڑے بنا لائی تھی۔ اب دونوں بیٹھی موسم کا مزا لے رہی تھیں۔

"کیسی رہی سونیا کی دعوت..."

"بہت اچھی... اس کی منگنی کے بعد اب جا کر ملاقات ہوئی۔ خوب گپیں لگائیں۔" ایشال نے مزے سے پکوڑے کھاتے ہوئے بتایا' اس کے سیاہ لمبے بال ہوا سے اڑ رہے تھے جن کو اس نے آدھا باندھا ہوا تھا۔

"شادی کب ہے اس کی...؟" سحر نے چائے کا کپ لبوں سے لگاتے ہوئے پوچھا۔

"سات مہینوں بعد ہے... اتنے اچھے نئی کلیکشن کے جوڑے لے کر آئی تھی' ہر برانڈ کا جوڑا تھا... اور وہ یاد ہے گل احمد کا نو ہزار کا جوڑا جو مجھے اس دن پسند آیا تھا' وہ بھی تھا اس کے پاس... میری نظریں تو اس جوڑے پر سے ہی نہیں ہٹ رہی تھیں۔" ایشال نے ٹھنڈی آہ بھری' اسے پھر سے وہ جوڑا یاد آ گیا تھا۔

"وہ افورڈ کر سکتی ہو گی' اتنے مہنگے ڈیزائنر سوٹ... ہمارے پاس تو اتنے فالتو پیسے نہیں ہیں جو صرف کپڑوں پر لگا دیں۔ تمہاری دوستوں نے ہی خراب کیا ہے تمہیں... ان کے ساتھ چار سال گزار کر تم اتنی برانڈ کونشسس ہو گئی ہو' ورنہ پہلے تو تمہیں ایسا کوئی شوق نہیں تھا۔" سحر نے اس کے لتّے لیے۔ ایشال نے منہ بنایا۔

"اب تم امی کا رول ادا نہ کرنے لگ جانا... تمہیں کیا پتا برانڈڈ چیز کا اپنا ہی مزا ہے۔ میرا تو دل چاہتا ہے ہر چیز برانڈڈ لوں۔"

"کچھ نہیں ہو سکتا تمہارا..." سحر نے افسوس سے سر ہلایا۔

"اچھا چھوڑو... میں سوچ رہی ہوں جاب کر لیتے ہیں' فارغ ہی تو ہوتے ہیں۔" ایشال کو نیا خیال آیا۔

"جاب..."

"ہوں' کسی اکیڈمی میں جاب کر لیتے ہیں... ادھر قریب ہی ایک نئی اکیڈمی کھلی ہے' وہاں پڑھا کرتے ہیں۔ ویسے بھی شام کی کلاسز ہوں گی۔ کیا خیال ہے۔" ایشال نے سوالیہ انداز میں پوچھا۔

"آئیڈیا تو اچھا ہے۔ امی ابو سے پوچھ کر ہی کچھ کہہ سکوں گی۔" سحر نے چائے کے خالی کپ اٹھا لیے۔ ایشال بھی خالی پلیٹ اٹھا کر اس کے ساتھ اندر کی طرف چل پڑی۔

☼ ☼ ☼

دوپہر کا کھانا تیار کر کے وہ سلاد بنانے کے لیے لاؤنج میں آ کر بیٹھ گئی۔ ابو کے آنے سے پہلے وہ ساری تیاری مکمل کر لیتی تھی۔ کھانا کھا کر انہیں پھر دفتر جانا ہوتا تھا۔ وہ پیاز کاٹ رہی تھی جب احمر داخلی دروازہ ہلکا سا بجا کر اندر آیا۔ ایشال نے چونک کر اسے دیکھا۔

"کمال ہے گیٹ کھلا چھوڑ رکھا ہے۔ میرے جیسے شریف انسان کے بجائے اگر کوئی چور گھس آتا پھر۔"

"پھر وہ دوپہر کا کھانا کھا کر جاتا... وہ بھی بینگن کا سالن..." ایشال نے منہ بنایا' اسے سبزیاں کچھ خاص پسند نہ تھیں۔

"خیر' بتاؤ کیا بنا میرے کام کا...؟"

"مبارک ہو فیاض صاحب کی اکیڈمی میں ٹیچرز کی اشد ضرورت ہے۔ میں ان سے خود مل کر آیا ہوں۔" احمر نے سلاد کی پلیٹ سے ٹماٹر اٹھا کر کھاتے ہوئے اطلاع دی۔

"ملنا کب ہے ان سے؟" ایشال پُرجوش ہوئی۔

"کل چلی جانا کلاسز سے پہلے۔ پانچ بجے پہلی کلاس شروع ہوتی ہے۔ چار ساڑھے چار بجے تک چلی جانا۔" احمر بات کرتے ہوئے نظریں دوڑا رہا تھا۔ بار بار نظر بھٹک کر کچن کی طرف جا رہی تھی۔ ایشال نے اس کی یہ حرکت نوٹ کر لی۔

"واپس آ جاؤ' نہیں آئی وہ..." ایشال کے کہنے پر وہ بوکھلایا۔

"نہیں وہ میں... تو مامی کو دیکھ رہا تھا' نظر نہیں آ رہیں۔"

"معلوم ہے مجھے کس کو دیکھ رہے تھے' بنو نہیں اب... آخر ہو کن چکروں میں... پتا بھی ہے پھوپھو اور خالہ کی آپس میں کبھی نہیں بنی... ایسے میں تم کسی

خیال کو دل میں جگہ نہ ہی دو تو بہتر ہے۔" ایشال نے وارن کرنے والے انداز میں کہا۔ احمر بد مزا ہوا۔

"ایک تو میری سمجھ میں نہیں آتا تمہاری خالہ نے اگر میرے چچا کے رشتے سے انکار کر دیا تھا تو اس میں اتنی لمبی ناراضی پالنے والی کون سی بات ہے۔ مسرت آنٹی کو نعیم انکل پسند تھے اس میں بھی کوئی بری بات نہیں تھی۔"

"ہوں ہمہ تو صحیح رہے ہو۔" ایشال نے سر ہلایا۔ پھر احمر کو گھورتے پا کر ٹھٹکی۔ "ایسے کیا دیکھ رہے ہو اور اگر تم وہ سوچ رہے ہو جو میں سمجھ رہی ہوں تو بھئی میری طرف سے صاف انکار ہے۔"

"کچھ تو خیال کرو، بھابھی ہو میری.... تم نہیں چاہتیں تمہاری دوست دیورانی بن کر ہمیشہ تمہارے ساتھ رہے۔" احمر نے میٹھے لہجے میں جذباتی وار کرنے کی کوشش کی، مگر سامنے بھی ایشال تھی۔

"بھابھی ہونے کا ہرگز یہ مطلب نہیں کہ میں تم پر قربان ہو جاؤں۔ کم از کم میں تو پھوپھو کو نہیں سمجھا سکتی۔ میرے اپنے تعلقات خطرے میں پڑ سکتے ہیں۔"

"خود غرضی کی حد ہے، صرف اپنی فکر ہے۔" احمر نے افسوس سے سر ہلایا۔

"تم واقعی سحر کے لیے سنجیدہ ہو؟"

"تمہیں کیا لگتا ہے۔"

"بس پھر خود جا کر پھوپھو سے بات کرو اپنی جنگ خود ہی لڑو۔" ایشال نے ہمت دلانے والے انداز میں کہا۔ احمر چڑ کر جانے کے لیے مڑ گیا۔

"کھانا تو کھا کر جاؤ۔" ایشال نے آواز دی۔

"مجھے نہیں کھانا۔" یہ کہتے ہوئے احمر وہاں سے نکل گیا۔

☆ ☆ ☆

وہ اکیڈمی سے واپس آئی تو پھوپھو آئی بیٹھی تھیں۔ اسے دیکھتے ہی خوش ہو گئیں۔

"کیسی ہے میری بیٹی۔" پھوپھو نے اسے پیار کرتے ہوئے اپنے پاس بٹھا لیا۔

"بالکل ٹھیک۔ آپ کیسی ہیں؟" ایشال مسکراتے ہوئے آرام دہ انداز میں بیٹھ گئی۔

"اللہ کا شکر ہے۔ جب سے آئی ہوں تمہارا ہی انتظار کر رہی تھی۔ کتنے دن ہو گئے ملے ہوئے۔ تمہارے انکل بھی یاد کر رہے تھے کہ ایشال بیٹی نے چکر نہیں لگایا۔"

"پھوپھو میں ضرور آؤں گی۔ اکیڈمی میں جاب شروع کر دی ہے تو شام میں گھر پر نہیں ہوتی، کسی دن صبح کے وقت آؤں گی۔"

"روز اسی وقت آتی ہے آپا۔ یہ قریب ہی اکیڈمی ہے۔" ساجدہ بیگم نے بتایا۔

"احمر بتا رہا تھا.... چلو اچھا ہے فارغ وقت کو کچھ کام میں لاؤ۔"

"احمر کی نوکری کا کیا بنا....؟" ساجدہ بیگم نے پوچھا۔

"دو جگہ انٹرویو دے کر آیا ہے، دیکھو اب کیا بنتا ہے۔ کوئی اچھی نوکری ملے تو یہ جو چار چار جگہ ٹیوشن پڑھاتا ہے، اس سے جان چھوٹے۔" پھوپھو نے گہرا سانس لیا۔

"اللہ نیک سبب کرے گا۔ آپ پریشان نہ ہوں۔" ساجدہ بیگم نے تسلی دی۔

"لاپروا سا ہے، فکر ہی لگی رہتی ہے اس کی طرف سے....."

"بڑا سمجھ دار بچہ ہے آپا.... ٹھیک ہے، مزاج میں شوخی ہے، مگر باپ کا ہاتھ بٹانے کی کوشش تو کر رہا ہے.... بس اس کی نوکری ہو جائے تو اس کے لیے کوئی اچھی سی لڑکی دیکھ لیں۔"

"ہوں، ارادہ تو یہی ہے جبران اور اس کی شادی ساتھ ہی کر دوں۔ مگر کوئی لڑکی ملے تب نا۔" پھوپھو نے سرد آہ بھری۔ ایشال کی نظر کافی دیر سے اس شاپر پر تھی جو پھوپھو کے قریب پڑا تھا۔ ان دونوں کی بات لمبی ہوتے دیکھ کر اس نے بے صبری سے پوچھ ہی لیا۔

"پھوپھو اس شاپر میں کیا ہے۔" ایشال کے پوچھنے پر ساجدہ بیگم کے چہرے کے تاثرات بگڑے۔ "آ ے

"ہاں مجھے تو یاد ہی نہیں رہا۔" پھوپھو نے مسکراتے ہوئے شاپر اس کی طرف بڑھایا۔ "میری بیٹی کی سالگرہ آرہی ہے اس لیے میں نے سوچا کوئی تحفہ لے جاؤں۔"

"تھینک یو پھوپھو۔" ایشال نے امی کی گھوری کی پروانہ کرتے ہوئے پرجوش انداز میں جلدی سے شاپر کھولا۔ اندر سے دو جوڑے برآمد ہوئے جو شیٹ میں پیک تھے۔

"ایک میری طرف سے، دوسرا تمہارے انکل کی طرف سے۔" پھوپھو نے مسکراتے ہوئے بتایا۔

جوڑے دیکھ کر ایشال کی خوشی ماند پڑ چکی تھی۔ وہ عام سے لان کے پرنٹڈ تھری پیس سوٹ تھے۔

"اس کی کیا ضرورت تھی آپا۔" ساجدہ بیگم نے جلدی سے کہا۔ ایشال کے مایوس کن تاثرات پہلے ہی دیکھ چکی تھیں۔ اس سے پہلے کہ آپا بھی نوٹ کرتیں انہیں اپنی طرف متوجہ کرلیا۔ ایشال سے کچھ بعید نہ تھا کہ کچھ الٹا سیدھا بول دیتی۔ ویسے بھی بیٹی کے بے دھڑک انداز انہیں ناپسند تھے۔

"تم بیچ میں نہ بولو۔ اپنی خوشی سے لائی ہوں۔" پھوپھو خوش دلی سے مسکرائیں۔

"جیسی آپ کی خوشی آپا، بہت اچھے پرنٹ ہیں۔ جب پہنے گی تو آپ دیکھیے گا۔ جاؤ ایشال کپڑے تبدیل کرو اور انہیں بھی سنبھال کر رکھو۔" انہوں نے کہنے کے ساتھ آنکھوں سے تنبیہہ بھی کی۔ ایشال خاموشی سے جوڑے اٹھا کر چلی گئی۔

"نمرہ اور بچوں کا کیا حال ہے؟" پھوپھو اب ایشال کی بڑی بہن کا پوچھ رہی تھیں جو شادی شدہ تھی اور دوسرے شہر میں رہتی تھی۔

☆ ☆ ☆

"ہائے میری قسمت، میری ساس نے یہ جوڑے دیے ہیں اور ایک سونیا کی ساس ہیں، منگنی پہ ماریہ بی کے جوڑے لائی تھیں۔" ایشال اس وقت سحر کے سامنے غمگین صورت بنائے بیٹھی تھی اور سرد آہیں بھرتے ہوئے پھوپھو کی طرف سے ملے کپڑے دکھا رہی تھی۔

"بہت ناشکری ہو تم۔ اچھے خاصے تو ہیں، مسئلہ کیا ہے۔ پرنٹ اور رنگ دونوں ہی اچھے ہیں۔"

"اتنے ہی اچھے لگ رہے ہیں تو تم رکھ لو۔" ایشال نے فٹ سے پیش کش کی، پہلے ہی وہ جلی بیٹھی تھی، اوپر سے سحر کی تعریفیں۔

"ضرور لے لیتی، اگر تمہاری ساس نے نہ دیے ہوتے۔ شرم کرو پھوپھو بھی ہیں تمہاری، کتنی محبت اور خلوص سے لائی ہوں گی۔" سحر نے شرم دلانا چاہی۔

"اب تم مت شروع ہوجانا۔ امی سے لمبا لیکچر سن چکی ہوں۔" ایشال کے انداز میں اکتاہٹ تھی۔

"پتا ہے تمہارا مسئلہ کیا ہے ایشال۔ تم برانڈ کونشیس ہو۔ یہی جوڑے اگر کسی مشہور برانڈ کی پیکنگ میں ہوتے تو تم بخوشی لے لیتیں۔ مگر اس صورت میں یہ تمہارے لیے ناقابل قبول ہیں۔" سحر نے آئینہ دکھانا چاہا۔

"اف بس کرو۔ لعنت ہے مجھ پر جو جبران کو اور خاص طور پر تمہیں کچھ بتائے بغیر نہیں رہ سکتی۔" ایشال نے اپنا سر پیٹ لیا۔

"جبران بھائی سے بھی ایسا کہا۔ مطلب یہ سب۔" سحر کو پریشانی ہوئی۔

"نہیں۔" سحر نے شکر ادا کیا۔

"ویسے یہ سارا خناس تمہاری دوستوں کا بھرا ہوا ہے۔ وہی دماغ خراب کرتی ہیں تمہارا۔"

"جیسے کہ تم۔ کب سے دماغ کھا رہی ہو۔ کھانے کے لیے ہی کچھ لے آؤ۔ جوس ہی لادو۔" ایشال نے منت کرتے ہوئے اسے کچن کی طرف دھکیلا۔

☆ ☆ ☆

"آپ لاؤنج میں جاکر بیٹھیں، خالہ آرہی ہیں۔" سحر نے دوسری مرتبہ اس سے کہا۔ جب سے آیا تھا کچن میں کھڑا تھا۔

"ایشال کہاں ہے۔"

"وہ نہا رہی ہے۔" سحر نے رخ موڑا۔ سالن دم پر

رکھا تھا جو ایشال اس کے ذمے لگا گئی تھی۔

"آپ کو کچھ چاہیے۔" احمر کو وہیں جما دیکھ کر سحر نے ضبط سے کہا۔ اس کی نظروں سے وہ ڈسٹرب ہو رہی تھی۔

"جی وہ... پانی مل جائے گا۔" احمر کہنا کچھ چاہتا تھا' زبان سے کچھ اور نکل گیا۔ سحر نے چپ چاپ گلاس بھر کر اس کے سامنے رکھا' تاکہ کسی طرح تو ٹلے۔ پانی پی کر احمر نے بولنے کے لیے منہ کھولا ہی تھا کہ سحر بول پڑی۔

"میں چائے لاتی ہوں۔ آپ لاؤنج میں تشریف رکھیں۔"

"وہ... میری جاب لگ گئی ہے۔"

"مبارک ہو آپ کو..." سحر نے تحمل سے کہا۔

"مٹھائی لایا تو تھا..." احمر نے بوکھلاہٹ میں ارد گرد دیکھا۔

"جی یہ شاید آپ کے ہاتھ میں ہے۔" سحر نے اس کے ہاتھ میں پکڑے شاپر کی طرف اشارہ کیا۔ احمر کی پیشانی پسینے سے چمکی۔ اس وقت شرم سے ڈوب مرنے کا دل کر رہا تھا۔ سحر سے کچھ خاص کہنے کا ارادہ تھا' مگر بوکھلاہٹ میں کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔ لاؤنج سے ماں کی آواز سن کر جلدی سے شاپر میز پر رکھ کر کچن سے باہر آ گیا۔ سحر نے شکر ادا کرتے ہوئے چائے کا پانی رکھا۔

"مبارک ہو بیٹا... اللہ کامیابیاں اور خوشیاں عطا فرمائے۔" ساجدہ بیگم نے خوش ہوتے ہوئے احمر کو دعا دی۔

"کیوں دیور جی! مٹھائی بھی لائے یا خالی خولی مبارک وصول کرنے آ گئے۔" ایشال بھی کمرے سے نکلتے ہوئے یہ خبر سن چکی تھی' پٹ سے بولی۔

"توبہ کرو جس کی تمہارے جیسی بھابھی ہو وہ خالی ہاتھ آ سکتا ہے' فکر نہ کرو مٹھائی لایا ہوں۔"

"جم جم آؤ بیٹا' اپنا گھر ہے تمہارا... اسے تو تم رہنے ہی دو' ایسی الٹی سیدھی باتیں کرتی رہتی ہے۔" انہوں نے ایشال کو تنبیہی نظروں سے دیکھا۔ "آپا کو بڑی فکر تھی تمہاری... اب خیر سے جاب لگ گئی ہے۔ اچھا ہے' کوئی اچھی لڑکی مل جائے تو جبران اور تمہاری اکٹھے ہی شادی ہو جائے۔"

"بس ماں! پھر تو آپ بھی امی کے ساتھ اس مہم میں جت جائیں... اور میرے لیے کوئی پری وش ڈھونڈ نکالیں۔" احمر نے زیر لب مسکراتے ہوئے شرارتی انداز میں کہا۔ نظریں ٹرے لاتی سحر پر تھیں۔

"پری وش... امی ذرا پوچھیں تو یہ پری وش کون ہے۔" ایشال نے پری وش پر زور دیا۔ سحر جو احمر کے اس طرح دیکھنے پر نئے سرے سے تلملائی تھی' جھٹ سے بولی۔

"خالہ کہیں یہ اس پری وش کی بات تو نہیں کر رہے جو تیسری لین میں رہتی ہے' انکل نعیم کی بیٹی۔" وہ احمر کی بات کو صرف اس کے شوخ مزاج کے تحت مذاق میں لے رہی تھیں۔ سحر کی بات سن کر چونکیں۔

"نہیں... نہیں... ماں میں تو ایسے ہی مذاق کر رہا تھا۔" احمر گھبرا گیا۔ کہیں وہ سچ سچ کراچی سے ہی نہ کہہ دیں۔ ایشال نے ہنسی دبائی۔ سحر چائے رکھ کر اپنے گھر جانے کے لیے اٹھ گئی۔ احمر کے ہوتے ہوئے اس کا مزید رکنے کا ارادہ نہیں تھا۔ ایشال مزے سے گلاب جامن کھا رہی تھی۔

☆ ☆ ☆

"تمہارے کزن کے ساتھ آخر مسئلہ کیا ہے۔" سحر کے اچانک سوال پر ایشال چونکی۔ آج ایشال کی سالگرہ تھی اور اسی خوشی میں دونوں کچھ خاص بنانے کے چکر میں کچن میں گھسی ہوئی تھیں۔ سحر چاکلیٹ کیک بنا رہی تھی اور ایشال پاستا۔

"کون... احمر کی بات کر رہی ہو؟"

"ظاہر ہے... اس کے علاوہ میرا معصوم بھائی ہے' اس کو تو کہنے سے رہی۔"

"ساری لڑکیوں کو اپنے بھائی معصوم ہی نظر آتے ہیں۔" ایشال نے مسکراتے ہوئے سحر کو دیکھا جو کیک کے آمیزے کو پین میں ڈالنے کے بعد اوون میں رکھ

رہی تھی۔

"یہ مذاق کی بات نہیں ہے ایشال۔۔۔ اپنے کزن کو سمجھالو ورنہ کسی دن میں اس سے بہت بری طرح پیش آؤں گی۔" سحر کیک رکھنے کے بعد اب ہاتھ باندھے شیلف سے ٹیک لگا کر کھڑی تھی۔

"کم آن سحر' اتنا جذباتی ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔ اس بے چارے نے کیا' کیا ہے۔ تمہارے سامنے اس کی بولتی ویسے ہی بند ہو جاتی ہے۔"

"اور وہ جو گھور گھور کر عجیب نظروں سے مجھے دیکھتا ہے وہ کیا ہے۔۔۔ وہ تو میں بات ہی ایسے کرتی ہوں کہ اس کی ہمت نہیں ہوتی' کوئی ایسی ویسی بات کرنے کی۔" ایشال نے ہنسی دبائی۔

"عجیب نظروں سے نہیں محبت بھری نظروں سے دیکھتا ہے وہ معصوم تو۔۔۔"

"اس سے کہو اپنی ان محبت بھری نظروں سے کسی اور لڑکی کو پٹائے۔۔۔ میں تو اس کا دماغ درست کر دوں گی۔" سحر تپ اٹھی تھی۔

"احمر کوئی فلرٹ کرنے والا لڑکا نہیں ہے۔۔۔ تم پہلی لڑکی ہو جسے وہ پسند کر بیٹھا ہے اور بہت سنجیدہ ہے تمہارے لیے۔۔۔ شادی کرنا چاہتا ہے۔" ایشال نے احمر کا دفاع کرنے کی کوشش کی۔

"میرا اور اس کا ساتھ ممکن نہیں ہے۔ پہلی بات تمہاری پھوپھو ہمارے گھر رشتہ لانا ہی نہیں چاہیں گی اور دوسری۔۔۔ مجھے اس سے شادی نہیں کرنی۔۔۔ لہٰذا اپنے اس چھچھورے کزن سے کہو اپنی ان فضول حرکتوں سے باز آجائے۔"

"دیکھو۔۔۔" ایشال بات کرتے ہوئے مڑی' مگر کچن کے دروازے کے ساتھ احمر کو کھڑا دیکھ کر چپ ہو گئی۔ زبان گویا تالو سے چپک گئی۔ سحر اس کے اس طرح خاموش ہونے پر مڑی۔ احمر کو دیکھ کر اسے بھی شاک لگا۔ احمر کے چہرے کے تاثرات بتا رہے تھے کہ وہ بہت کچھ سن چکا تھا۔ اس سے پہلے کہ ایشال اسے روکتی' کچھ کہتی' وہ خاموشی سے وہاں سے چلا گیا۔

"احمر' رکو تو۔۔۔" ایشال کو جیسے ہی ہوش آیا بیرونی دروازے کی طرف بھاگی' مگر وہ کچھ سنے بغیر چلا گیا۔

"تمہاری باتیں سن لی ہوں گی؟" سحر نے سوالیہ انداز میں ایشال سے پوچھا جو پریشانی سے ہونٹ کاٹ رہی تھی۔

"لگ تو یہی رہا ہے۔۔۔ تم بھی تو ہاتھ دھو کر اس کے پیچھے پڑ گئی ہو۔"

"اب مجھے سنانے کی ضرورت نہیں ہے۔۔۔ میں تم سے ڈسکس کر رہی تھی' اسے کس نے کہا تھا ہیرو بن کر کان لگا کے سنے۔۔۔ اور میں نے کوئی غلط بات نہیں کی۔ اچھا ہے' سن لیا' اسے بھی کچھ شرم تو آئے اپنی حرکتوں پر۔۔۔" جو تھوڑی بہت شرمندگی سحر کے چہرے پر آئی تھی فوراً" غائب ہو گئی۔

"وہ بہت ہرٹ ہوا ہو گا۔ تمہارے منہ سے اپنے لیے ایسے الفاظ سن کر۔۔۔" اس سے پہلے کہ سحر کچھ بولتی ساجدہ بیگم لاؤنج میں آئیں۔

"احمر کہاں گیا؟"

"چلا گیا امی۔۔۔" ایشال نے گہرا سانس لیا۔

"کیوں۔۔۔ کیک کھائے بغیر ہی چلا گیا اور تم نے جانے دیا روکتیں تو اسے۔۔۔ اتنے شوق سے کیک اور آئس کریم لایا تھا تمہارے لیے۔۔۔" ایشال نے پہلے ٹیبل پر رکھے کیک کے ڈبے اور آئس کریم کو دیکھا' پھر ملامتی نظروں سے سحر کو دیکھا۔ سحر بے نیازی سے کندھے اچکا کر کچن میں چلی گئی۔ اسے اپنا کیک چیک کرنا تھا۔

"اب کھڑی کیا ہو۔۔۔ جاؤ جا کر رکھو فریج میں۔۔۔ اتنا نہیں ہوا کہ بچے کو روک ہی لیتیں۔۔۔ مگر اتنی عقل کہاں ہے۔۔۔" وہ غصے سے کہہ رہی تھیں۔ ایشال نے گہرا سانس لیتے ہوئے دونوں چیزیں اٹھا لیں۔

✡ ✡ ✡

"گفٹ کیسا لگا؟" دوسری طرف سے آتی جبران کی آواز پر ایشال کو اس کے بھیجے ہوئے ہینڈ بیگ اور پرفیومز یاد آ گئے۔

"جبران تم سے کم از کم مجھے یہ امید نہیں تھی۔"

"کیوں بھئی ایسا کیا کر دیا میں نے۔" جبران حیران ہوا۔

"گفٹ کی بات کر رہی ہوں، مجھے نہیں معلوم تھا تمہاری چوائس ایسی ہے۔" ایشال نے "ایسی" پر زور دیا تھا۔ "کہنا تو فضول چاہتی تھی مگر لحاظ کر گئی۔"

"سنا تھا بیویاں کسی حال میں خوش نہیں ہوتیں، آج یقین بھی آگیا۔ نا صرف تمہاری برتھ ڈے یاد رکھی بلکہ اپنی طرف سے اچھا سا گفٹ بھی بھیجا۔ بجائے اس بات پر خوش ہونے کے تم الٹا خفا ہو رہی ہو۔"

"ہاں تو بندہ گفٹ دیتے ہوئے دوسرے کی پسند ہی پوچھ لیتا ہے۔" ایشال کو مزید تاؤ آیا۔

"اور دوسرے کو وہ محبت کیوں نہیں نظر آتی جس محبت و پیار سے گفٹ دیا گیا ہے۔ کم از کم اس کے بونس مارکس تو ملنے چاہئیں مجھے۔" جبران کے مسکراتے لہجے پر ایشال کے لبوں پر بھی مسکراہٹ بکھر گئی۔

"مکھن لگانے پر نمبر کٹ بھی سکتے ہیں۔"

"یہ ممکن نہیں مسز جبران! یہ محبت ہے۔ چلو ایسا کرتے ہیں تم اپنی پسند بتا دو، اگلی مرتبہ تمہاری پسند کا پورا خیال رکھوں گا۔" جبران نے اسے راضی کرنے کے لیے مصلحت کی راہ اپنائی۔ اس کے پوچھنے پر ایشال خوش ہو گئی۔

"ہوں... ہینڈ بیگ ایم کے اور نیکسٹ کے اچھے ہوتے ہیں اور پرفیومز میں ہوپ اور آبسیشن نائٹ مجھے بہت پسند ہے۔"

"آبسیشن نائٹ ہے تمہارے پاس..." جبران کے سوال پر ایشال کا منہ بن گیا۔

"ہے تو نہیں، مگر پسند ہے بہت... سونیا استعمال کرتی ہے، اُف کیا خوشبو ہے اس کی..." جبران نے گہرا سانس لیا۔ اب اس کی سمجھ میں آیا تھا۔ وہ واحد خرابی جو اس کے گفٹس میں تھی، وہ ان کا برانڈڈ نہ ہونا تھا۔ جس کے باعث ایشال کو بے کار اور لو اسٹینڈرڈ لگ رہے تھے۔

"بس سب کے لیے پانچ چھ سال انتظار کر لو۔ تب بھی اگر تمہارا شوہر لینڈ لارڈ بن گیا، پھر ہی ممکن ہو سکتا ہے کہ گھر میں پانی تک برانڈڈ آئے گا۔" جبران نے شرارتی انداز میں کہا۔

"تم مذاق ہی اڑانا ہے تو میں فون بند کر رہی ہوں۔"

"مذاق کب اڑا رہا ہوں۔ الٹا میں تو معلومات حاصل کرنا چاہ رہا تھا۔ مستقبل میں کام آسکتی ہیں۔ کیا پتا حالات کا پانی بھی برانڈڈ ہونا صحت کے لیے مفید ثابت ہو۔ کیا نام تھا تمہارے ان برانڈز کا وہ گل خان ٹائپ کے۔" جبران پر اس کی فون بند کرنے والی دھمکی کا بھی اثر نہیں ہوا تھا۔ تب ہی اس کے چڑنے سے حظ اٹھا رہا تھا۔

"بہت فضول ہو تم۔ مجھے بات ہی نہیں کرنی تم سے..." ایشال نے کال کاٹ کر موبائل بیڈ پر پٹخا تھا۔ دوسری طرف جبران آوازیں دیتا رہ گیا تھا۔ اب جبران پھر سے نمبر ملا رہا تھا۔ تھکن سے اس کا برا حال تھا۔ مگر ایشال کو ناراض کر کے وہ سونا نہیں چاہتا تھا۔

☆ ☆ ☆

"آئے کیوں نہیں اتنے دنوں سے۔" ہفتے بعد احمر کی شکل دیکھنے کو ملی تو ایشال بے اختیار پوچھ بیٹھی۔ آج بھی وہ پھوپھو کے کام سے آیا تھا۔

"بس مصروف تھا۔" احمر سامنے صوفے پر بیٹھا قالین پہ بنے نقش و نگار کو دیکھ رہا تھا۔

"احمر اس دن کے لیے ایم سوری۔ میں جانتی ہوں تمہیں برا لگا ہے، مگر سحر کا یہ مطلب نہیں تھا وہ تو..." ایشال نے بات تو شروع کر دی، لیکن سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ کیسے بات سنبھالے۔

"وہ مجھے پسند نہیں کرتی۔" احمر نے اس کی بات کاٹی۔ احمر کا انداز ہی ایسا تھا کہ ایشال گڑبڑائی اور تھوک نگلتے ہوئے بولی۔ "ایسی بات نہیں ہے... اس نے تمہیں نہیں تمہاری حرکت کو ناپسند کیا ہے، بلکہ وہ تو بڑی شرمندہ ہو رہی تھی تمہارے اس طرح سے جانے

پر۔" احمر تھوڑا آگے ہوا چہرے پر چمک آگئی تھی۔ پہلے والی بجھی بجھی سی کیفیت ماند پڑی تھی۔

"کیا کہہ رہی تھی؟" ایشال مزید ہچکچائی۔ "شرمندہ ہو رہی تھی اپنے الفاظ پر کہہ رہی تھی کتنا ہرٹ ہوا ہو گا احمر۔"

"اور۔" احمر کے پرشوق تاثرات دیکھ کر ایشال نے خود کو مزید جھوٹ بولنے سے روکا۔

"اسے چھوڑو، تم اسے تاڑنے کے بجائے ہمت کر کے پھوپھو سے بات کرو۔ ویسے بھی سحر کو تمہارا یوں جذبے لٹاتی نظروں سے دیکھنا سخت ناپسند ہے۔ اس لیے اس سے ہرگز کچھ مت کہنا پروپوز کر بھی دو گے تب بھی وہ یہی کہے گی کہ رشتہ بھیجو۔" ایشال کے لتاڑنے پر احمر شرمندہ ہوا۔

"پتا نہیں امی کیسے ری ایکٹ کریں۔۔۔ جبران سے بات ہوئی تھی، وہی بات کرے گا امی سے۔۔۔"

"ہاں جی ہیرو کا رول وہی تو ادا کریں گے۔" ایشال نے دل میں سوچا، پھر احمر کی طرف دیکھ کر مسکرائی۔

"اچھی بات ہے، چلو میں ذرا سالن دیکھ لوں، دم پر رکھ کر آئی تھی۔" ایشال اپنی جگہ سے کھڑی ہوئی۔

"امی کدھر رہ گئیں۔"

"وہ کڑھائی والی چادر ہی ڈھونڈ رہی ہوں گی جو پھوپھو کو چاہیے تھی۔ دیکھ لو کمرے میں جا کر۔" ایشال کچن میں چلی گئی۔ احمر بھی سر ہلاتا کمرے کی طرف بڑھ گیا۔

☆ ☆ ☆

"بڑے اچھے وقت پر آئی ہیں پھوپھو آپ۔۔۔ شاپنگ دکھاتی ہوں، آج ہی کر کے آئی ہوں۔" ایشال پھوپھو سے کہہ کر کمرے سے شاپرز اٹھا لائی۔ سحر بھی اس کی مدد کی خاطر ساتھ ہولی تھی۔ کچھ شاپر اس نے لا کر میز پر رکھے۔

"ارے کیا کیا لے آئیں۔" شاپرز کا ڈھیر دیکھ کر پھوپھو نے پوچھا۔

"بہت سی چیزیں لائی ہوں۔ تنخواہ ملی تھی تو میں نے سوچا کچھ چیزیں لے لوں۔ کپڑے، جوتے، بیگ، پرفیومز اور چھوٹی موٹی چیزیں ضرورت کی۔" ایشال نے کپڑوں والے شاپر کھولتے ہوئے کہا۔

"ایشال پہلے چائے بناؤ۔ پھر دکھاتی رہنا، ابھی تو آئی ہیں آپا۔" ساجدہ بیگم نے مداخلت کی، انہیں پہلے ہی ایشال کی لاپروائی پر تاؤ آ رہا تھا۔

"سحر پلیز۔۔۔ تم چائے بنا دو۔ میں پھوپھو کو شاپنگ دکھاتی ہوں۔" ایشال نے جھٹ سے سحر کو آگے کر دیا۔ ایشال کے بہانے بازیوں سے وہ اچھی طرح واقف تھی۔ لہٰذا چپ چاپ چائے بنانے کے لیے اٹھ گئی۔ جب تک سحر چائے کے ساتھ لوازمات لے کر آئی۔ ایشال سب چیزیں دکھانے کے ساتھ ساتھ ان کی قیمتیں بھی پھوپھو کے گوش گزار کر چکی تھی۔ اس کی اتنی مہنگی شاپنگ پر پھوپھو کے چہرے کے زاویے بگڑے ہوئے تھے۔ جبکہ ساجدہ بیگم لاؤنج میں نہیں تھیں۔

"بیٹا! اتنی مہنگی خریداری کرنے کی کیا ضرورت تھی۔"

"تھوڑی مہنگی ہیں، مگر دیکھیں ساری چیزیں برانڈڈ ہیں۔۔۔ اچھی کوالٹی کی۔۔۔" ایشال نے کہتے ہوئے پرفیوم کو کوئی چوتھی بار سونگھا۔ پہلی مرتبہ وہ یہ پرفیوم خرید کر لائی تھی۔

"کچھ بچایا بھی ہے یا ساری تنخواہ لگا دی۔"

"آنٹی چائے لیں۔" سحر نے ان کے بگڑے موڈ کو دیکھ کر چائے کی طرف متوجہ کرنا چاہا۔ ساتھ ہی بسکٹ اور باقی لوازمات بھی ان کے آگے رکھے۔

"کہاں۔۔۔ یہی تو افسوس ہے وہ آٹھ ہزار والا سوٹ پہلے نظر آ جاتا تو لے لیتی، آخر میں پیسے ہی نہیں بچے۔" ایشال کے بے نیازی سے کہنے پر پھوپھو کا چائے کی طرف جاتا ہاتھ رک گیا۔ ایشال کی ساری توجہ چیزیں سمیٹنے میں تھی۔ سحر نے ایک بار پھر انہیں چائے کی طرف متوجہ کیا۔ پھوپھو گہرا سانس لیتے ہوئے اس کی طرف مڑیں۔

"بس رہنے دو۔۔۔ کسی چیز کا دل نہیں چاہ رہا۔ چائے

ہی کافی ہے۔" ہاتھ سے باقی چیزیں پیچھے کھسکائیں۔

"خالہ آئیں چائے پی لیں۔" کمرے سے ساجدہ بیگم کو نکلتا دیکھ کر سحر نے فوراً کہا۔ پھوپھو کے بگڑے موڈ سے وہ پریشان ہو گئی تھی۔ "سحر تم نے بھی کچھ لیا۔" ساجدہ بیگم نے صوفے پر بیٹھتے ہوئے چائے کا کپ اٹھایا۔

"جی خالہ، امی ابو کے لیے سوٹ لیے ہیں اور اپنے لیے ہینڈ بیگ۔" سحر نے قریبی صوفے پر رکھے شاپر کھول کر دکھائے۔

"میں نے اتنا کہا کوئی جوڑا لے لو... اتنی اچھی کلیکشن آئی ہوئی ہے آج کل... مگر یہ انتہائی کنجوس ہے۔" ایشال کمرے میں سامان رکھ کر آئی تھی اور آتے ہی شروع ہو گئی۔

"کنجوسی کی بات نہیں ہے، ابھی تو امی نے سیزن کے سوٹ بنوا کر دیے تھے۔ جب ضرورت ہو گی لے لوں گی۔" سحر نے سادگی سے وضاحت کی۔

"کیا ہی اچھا ہو ایشال کی عقل میں بھی یہ بات آجائے۔" ساجدہ بیگم نے گہرا سانس لیتے ہوئے ایشال کو دیکھا جو مزے سے نمکو کھانے میں مصروف تھی۔ انہیں اب پھوپھو کے جانے کا انتظار تھا۔ تاکہ ایشال کی کلاس لے سکیں۔ نند کے تیور بھی انہیں کچھ اچھے محسوس نہیں ہو رہے تھے۔

✡ ✡ ✡

آج پھوپھو کے ہاں انکل کے دوست اور ان کی فیملی دعوت پر مدعو تھے۔ صبح سے پھوپھو کی طبیعت ناساز تھی۔ دعوت بھی کینسل نہیں کی جا سکتی تھی۔ ساجدہ بیگم کو جیسے ہی پھوپھو کا فون آیا فوراً" ایشال کو بھیجنے کا کہہ دیا۔ ایشال نے بہانے بنانے کی بہت کوشش کی، مگر وہ کچھ سننے کے موڈ میں نہیں تھیں۔ مجبوراً" ایشال پھوپھو کی طرف آ گئی۔ ساتھ سحر کو بھی گھسیٹ لائی۔ یہاں آ کر اس کے ہاتھ پاؤں پھول گئے۔ وہ ابھی اتنی ماہر نہیں ہوئی تھی کہ بیس افراد کا کھانا تیار کر سکتی۔ ساتھ ہی تاؤ آ رہا تھا۔ اچھا بھلا پھوپھو کسی اچھے سے ریسٹورنٹ کا پوچھ رہی تھیں۔ کھانا منگوانے کے لیے، مگر امی نے زبردستی اسے بھیج دیا کہ زیادہ سے زیادہ چھ سات لوگ ہوں گے۔ باہر سے کیا منگوانا۔ اصل تعداد تو یہاں پہنچ کر معلوم ہوئی تھی۔

سحر کا ساتھ غنیمت تھا۔ وہ کھانا بھی اچھا بنا لیتی تھی، اور اپنے گھر کی دعوتوں میں سارا اہتمام وہ اور خالہ مل کر کرتی تھیں۔

"جلدی ہاتھ چلاؤ، کہیں وہ لوگ آ ہی نہ جائیں، انہیں اٹینڈ بھی تو کرنا پڑے گا۔ کولڈ ڈرنکس سرو کرنی ہوں گی۔" سحر نے مصروف انداز میں ایشال سے کہا، وہ خود سلاد بنا رہی تھی۔ ساتھ آہستہ آنچ پر رکھی کھیر میں چمچہ بھی چلا رہی تھی۔

"کر تو رہی ہوں... اتنا زیادہ بنانے کا پہلا تجربہ ہے میرا، پتا نہیں کیسا بنے۔" ایشال کے لہجے میں بے چارگی تھی۔

"خیر سے مٹن کڑاہی بن رہی ہے یا پائے پک رہے ہیں۔" سحر نے دائیں طرف والی شیلف پر جھانکا، جہاں ایشال اپنی عادت کے مطابق چیزیں پھیلا چکی تھی۔ سحر نے گہرا سانس لیا، جانتی تھی وہ پھیلاوا بھی اسے ہی سمیٹنا تھا۔

"مٹن کڑاہی بنانے کی کیا تک بنتی ہے۔ اس سے اچھا تھا چکن کڑاہی بنا لیتی، جلدی تو بنتی۔" ایشال کو رہ رہ کر غصہ آ رہا تھا۔ بس نہیں چل رہا تھا کچن سے بھاگ جائے۔ اتنی گرمی میں کچن میں کھڑے ہونا امتحان سے کم نہیں تھا۔

"چکن کا مغلائی قورمہ جو بنایا ہے۔" ایشال کچھ اور بھی کہنے والی تھی، مگر پھوپھو کو آتے دیکھ کر خاموش ہی رہی۔

"بیٹا کتنا کام رہ گیا۔"

"ارے آنٹی آپ کیوں آ گئیں، آپ آرام کریں، سب ہو جائے گا۔ بس کچھ دیر میں تیار ہو گا سب۔" سحر بھی انہیں دیکھ چکی تھی، فوراً" بولی۔

"بس بیٹا! اب جا کر جسم کا درد کم ہوا ہے... جوڑ جوڑ دکھ رہا تھا۔ اٹھنے کی بھی ہمت نہیں ہو رہی تھی۔ اب

دوا کا کچھ اثر ہوا ہے۔" پھوپھو نے بولتے ہوئے ایک طائرانہ نظر کچن پر ڈالی۔ سحر چونکہ ان کے سامنے والی شیلف کے پاس کام کر رہی تھی' اس لیے پہلی نظر اس پر پڑی تھی۔ مگر ایشال کے پھیلاوے پر ان کی نظر ابھی پڑی تھی۔

"پھوپھو مٹن کڑاہی تیار ہونے والی ہے۔" پھوپھو کو اپنی طرف دیکھتا پا کر ایشال نے انہیں مطمئن کرنا چاہا۔

"کیا' کیا بنالیا۔" ایشال نے گڑبڑا کر سحر کو دیکھا' کیونکہ باقی چیزیں تو اسی نے بنائی تھیں۔ ایشال کو تو مٹن کے ساتھ ہی اتنا ٹائم لگ گیا تھا۔

"آنٹی مغلائی قورمہ اور پلاؤ تیار ہے۔ سلاد اور کھیر بھی بس تیار ہونے والے ہیں۔ ٹرائفل شروع میں بنا کر فریج میں رکھ دیا تھا۔ اب کباب فرائی کرنے ہیں اور ٹیبل سیٹ کرنا ہے۔" سحر کی بات سن کر پھوپھو کچھ مطمئن ہوئیں۔ ورنہ ایشال کو کام کرتا دیکھ کر وہ خاصی فکرمند ہو گئی تھیں۔ کچھ دیر وہ دونوں کو ناقدانہ نگاہوں سے دیکھتی رہیں۔ سحر کافی سلیقے سے کام کر رہی تھی۔ جبکہ اس کے مقابلے میں ایشال نے ہر چیز الٹ پلٹ کر کے رکھ دی تھی۔

☼ ☼ ☼

"آنٹی کیا حال ہے آپ کا۔" سحر نے ان کا حال چال پوچھا۔ خریداری کرتے ہوئے اچانک ہی اس کی نظر ان پر پڑی تھی۔

"اللہ کا شکر ہے۔ تم اکیلی آئی ہو۔" پھوپھو نے اسے تنہا دیکھ کر دریافت کیا۔

"امی ساتھ ہیں' گھر کا سودا خرید رہی ہیں۔" سحر کے کہتے ہی بائیں طرف سے مسرت ان کی طرف آئیں۔ بہن کی نند کو دیکھ کر ہمیشہ کی طرح خوش اخلاقی سے ملیں۔ سحر کو حیرت ہوئی' آج تو پھوپھو بھی خوش دلی کا مظاہرہ کر رہی تھیں۔ جبکہ پہلے تو صرف سلام دعا کی حد تک تعلق تھا۔ سحر خاموشی سے دونوں کو باتیں کرتا دیکھ رہی تھی۔ بات گھوم پھر کر اس دن کی دعوت پر آ گئی۔

"سحر کے ہاتھ میں بہت ذائقہ ہے۔ سب ہی تعریف کر رہے تھے کھانے کی۔ تمہارے انکل کو مغلائی قورمہ بے حد پسند آیا۔" پھوپھو کے ستائشی انداز پر سحر مسکرائی۔

"شکریہ آنٹی۔ میں انکل کے لیے ضرور بنا کر بھیجوں گی۔"

"کوکنگ کا سحر کو ہمیشہ سے شوق ہے بس اسی لیے ہر وقت گھسی رہتی ہے نئی سے نئی چیزیں بنانے کے لیے۔" مسرت کی بات پر پھوپھو مسکرائیں۔ "ماشاء اللہ۔"

"امی! میں جیم اور انڈے لے کر آتی ہوں۔" سحر انہیں بتا کر دوسرے سیکشن کی طرف چلی گئی۔

"بیٹیوں سے ہی گھر میں رونق ہوتی ہے۔ بڑا سہارا ہوتا ہے بیٹی کا۔" انہیں ہمیشہ بیٹی نہ ہونے کا ملال رہا تھا۔ مسرت نے تائید میں سر ہلایا۔

"صحیح کہہ رہی ہیں۔ اللہ کا شکر ہے ایک ہی بیٹی دی' مگر نیک اور احساس کرنے والی۔ پھر آج کل بیٹا' بیٹی ایک برابر ہیں۔ فرحان تو ابھی چھوٹا' پھر ہاسٹل میں ہوتا ہے۔ دوسرے شہر سے آنا جانا بھی کم ہی ہوتا ہے۔ ایسے میں سحر ہی ہے' جو ہر بات کا احساس کرتی ہے۔ جب سے نوکری کی ہے' تنخواہ لا کر میرے ہاتھ پر رکھ دیتی ہے کہ آپ کا اور ابو کا اس پر سب سے زیادہ حق ہے۔ پر نعیم کہتے ہیں اپنے پاس رکھو' کل کو ہمارے یا تمہارے ہی کام آئیں گے۔" مسرت کے لہجے میں بیٹی کے لیے فخر تھا۔

"اللہ سب کو نیک اور فرماں بردار اولاد دے۔ میں چلتی ہوں' احمر آ گیا ہو گا۔ تم چکر لگانا کسی دن۔۔۔" پھوپھو نے گھڑی دیکھتے ہوئے کہا۔

"جی ضرور آپ بھی آئیے گا۔" دونوں الوداعی کلمات کہتی اپنے اپنے راستے چل دیں۔

☼ ☼ ☼

ایشال کافی دیر سے کسی گہری سوچ میں گم تھی۔ ساجدہ بیگم نے سبزی کاٹتے ہوئے حیرت سے اپنی

چھوٹی اولاد کو دیکھا جو اتنی دیر سے خاموش بیٹھی تھی۔ کچھ دیر اس کے بولنے کا انتظار کیا، جب رہا نہ گیا تو پوچھ بیٹھیں۔

"خیر تو ہے، کیا سوچ رہی ہو۔" ان کے پوچھنے پر ایشال چونک کر سیدھی ہوئی۔

"امی! کل رات شادی کے فنکشن میں پھوپھو کچھ اکھڑی اکھڑی سی لگیں۔ آخر میں بھی لے بغیر ہی چلی گئیں۔ ایسا کبھی ہوا نہیں پہلے۔" ایشال الجھن کا شکار تھی۔

"ہوں... محسوس تو مجھے بھی ہوا کھنچی کھنچی سی تھیں۔"

"پر وجہ کیا ہو سکتی ہے۔"

"کتنی بار تم سے کہا کہ اپنے آپ کو بدلو، یہ بچپنا، بے ڈھنگا انداز، ہر چیز کے لیے مچل جانا، یہ سب ٹھیک نہیں، پر نہ جی ماں کی بات ماننی ہی نہیں ہے۔ یہی وجوہات ہوں گی آپا کی ناراضی کی۔ اس دن جب گھر آئی تھیں تمہاری وہ فضول خرچی دیکھ کر خوش ہو کر نہیں گئی تھیں۔ مگر تم اپنی ہی دھن میں رہتی ہو۔ آگے پیچھے دیکھو تب نا۔" امی نے اسے ٹھیک ٹھاک سنا دیں۔

"میری تنخواہ تھی، میری مرضی، جہاں چاہے خرچ کروں۔" ایشال چیخی تھی۔

"خرچ کرنے کا بھی سلیقہ ہوتا ہے۔ یہ نہیں کہ جہاں مرضی اڑا دیے۔ اپنی حیثیت کے مطابق ہی خرچ کرنا چاہیے۔" ساجدہ بیگم نے افسوس سے ایشال کو دیکھا جو خفا سی اٹھ گئی تھی۔ وہ گہرا سانس لیتی پھر سے سبزی کی طرف متوجہ ہوئیں۔ جانتی تھیں ایشال کو سمجھانا مشکل تھا جو دل میں آتا وہی کرتی۔

اتوار کی چھٹی کا فائدہ اٹھاتے ہوئے ایشال پھوپھو کی طرف آ گئی تھی۔ احمر سے دروازے پر ہی ملاقات ہو گئی۔ اس کا دوستوں کے ساتھ آؤٹنگ کا پروگرام تھا۔ پھوپھو کو ڈھونڈتی ہوئی وہ اندرونی حصے کی طرف آ گئی۔ لاؤنج میں خاموشی تھی۔ کچن سے ہوتی ہوئی وہ کمروں کی طرف بڑھی۔ انکل اور پھوپھو کی باتوں کی آوازیں آ رہی تھیں۔ یقیناً دونوں وہیں تھے۔ ایشال نے دروازے پر دستک دینے کے لیے ہاتھ بڑھایا، لیکن اپنا نام سن کر ٹھٹک گئی۔

"کچھ پوچھیں تو میں ایشال کو بہو بنا کر پچھتا رہی ہوں۔ بچپنا نہیں گیا اس کا اور سلیقہ تو کسی چیز کا ہی نہیں۔ دعوت والے دن بھی ایک سالن بنانے میں اتنا وقت لگا دیا۔ چیزیں الگ پھیلا دیں۔" پھوپھو کی آواز میں ناگواری تھی جو ایشال کو ان کی شکل دیکھے بغیر بھی محسوس ہوئی۔

"چلیں خیر ہے، ابھی تو سیکھ رہی ہے، آہستہ آہستہ کر لے گی سب۔" انکل نے جواب دیا۔

"اتنے مہینوں سے سن رہے ہیں، سیکھ رہی ہے اور پھر کام کرنے کا کوئی طریقہ ہوتا ہے۔ یہ نہیں کہ سر سے اتار پھینکا۔ بنایا بھی گزارے لائق ہی تھا۔ دوسری بچی بھی تو تھی۔ اتنے سلیقے سے سب کر رہی تھی۔ وہ نہ ہوتی تو کچھ بھی تیار نہ ہو پاتا۔ کھانا تھا بھی بہت مزے دار، سب ہی تعریف کر رہے تھے اور پھر صرف یہی وجہ نہیں ہے ایشال سے متنفر ہونے کی۔ مجھے نہیں لگتا وہ سمجھ داری سے گھر چلا پائے گی۔ انتہا کی فضول خرچ ہے۔ اپنی تنخواہ ایک دن میں اڑا آئی۔ میاں کی کمائی کا پتا نہیں۔ کیا حال کرے گی۔

سحر مجھے بہت اچھی لگی۔ خاصی سمجھ دار ہے ایشال کے مقابلے میں۔ میں صحیح معنوں میں اس سے متاثر ہوئی ہوں۔ مسرت نے بڑی اچھی تربیت کی ہے بیٹی کی۔" پھوپھو، سحر کی تعریف میں کچھ اور بھی کہہ رہی تھیں۔ ایشال اتنا کچھ سن چکی تھی کہ اور سننے کا حوصلہ نہیں تھا۔ بجھے چہرے کے ساتھ وہ واپس مڑ گئی۔

"کیا ہو گیا ہے بیگم... مت بھولیں کہ ایشال آپ کی بھتیجی پہلے ہے، باقی رشتے بعد میں آتے ہیں۔ کل تک یہی بچپنا آپ کو بھاتا تھا جو آج آپ کی نظروں میں کھٹک رہا ہے۔ سب سے بڑی بات یہ رشتہ جبران کی پسند سے جوڑا گیا ہے۔ اس طرح کی باتیں کر کے اپنا اور بیٹے کا دل میلا نہ کریں۔ ساری زندگی بھائی بھابھی نے

میکے کا مان دیا ہے آپ کو۔ ایشال کو بہو نہیں، بیٹی سمجھیں۔" شوہر کے تحمل سے سمجھانے پر وہ شرمندہ ہوئیں۔ بیٹے کی خواہش پر بڑے مان سے انہوں نے بھائی کے سامنے دست سوال دراز کیا تھا۔ ایشال کو بیٹی بنانے کا دعویٰ کیا تھا۔ کل تک ایشال انہیں بے حد عزیز بھی تھی، مگر اس کی چند خامیوں نے انہیں سماس بننے پر مجبور کر دیا تھا۔

"ہوں، ٹھیک کہہ رہے ہیں آپ۔" ان کے لہجے میں شرمساری تھی۔

"اور یہ اتنی بڑی بات نہیں ہے۔ آپ سے سب سیکھ لے گی۔ وقت کے ساتھ سمجھ بھی آجاتی ہے اور پھر ماشاءاللہ جبران بہت سمجھ دار ہے۔ آپ خواہ مخواہ فکر مند ہو رہی ہیں۔" وہ ہلکے پھلکے انداز میں کہہ کر مسکرائے تھے۔

"میں چاہ رہی ہوں احمر کا رشتہ لے جاؤں سحر کے لیے۔ آپ کی کیا رائے ہے؟"

"نیک کام میں دیر کیسی، گھر کی بچی ہے۔ احمر سے پوچھ لیں۔ راضی ہوتا ہے تو بخوشی لے جایئے۔" انہیں اخبار اٹھاتا دیکھ کر پھوپھو چائے کے خالی کپ اٹھا کر کمرے سے چلی گئیں۔ ابھی کھانے کی تیاری کرنی تھی۔

☆ ☆ ☆

"زبردست خبر لایا ہوں تمہارے لیے۔" ایشال نے سوالیہ نظروں سے احمر کو دیکھا۔ "امی کہاں ہیں۔" احمر نے کچن میں جھانکا۔

"نماز پڑھ رہی ہیں۔ تم بتاؤ خبر کیا ہے۔"

"گیس کرو۔؟" احمر کے لبوں پر خوب صورت مسکراہٹ تھی۔

"رہنے دو پہلے ہی ڈھنگ سے کچھ ہوتا نہیں۔ گیس کیا لگاؤں گی۔ تم بتاؤ۔" اپنی خوشی میں احمر اس کے لہجے میں چھپی افسردگی محسوس نہ کر سکا۔

"امی! سحر کے لیے میرا رشتہ لے کر جانا چاہتی ہیں۔" خوشی سے احمر کا چہرہ چمک رہا تھا۔ ایشال کو خاموش دیکھ کر بولا۔

"حیرت ہو رہی ہے نا۔ مجھے بھی ہوئی تھی، بلکہ سمجھو سکتہ ہی ہو گیا تھا۔ امی نے خود مجھ سے کہا۔ تعریفیں کیے جا رہی تھیں سحر کی۔ میری خاموشی پر سمجھیں شاید میں منع کرنا چاہتا ہوں۔ انہیں کیا معلوم میں تو تیار بیٹھا ہوں۔ دلی خواہش پوری ہو رہی ہے۔ سوچ لیا تھا اگر سحر نہیں تو کوئی اور بھی میری زندگی میں شامل نہیں ہو سکتی۔ ارادہ کر لیا تھا اس کے لیے جنگ بھی لڑنی پڑی تو لڑ لوں گا۔"

"سحر مجھے بہت اچھی لگی۔ خاصی سمجھ دار ہے ایشال کے مقابلے میں، صحیح معنوں میں اس سے متاثر ہوئی ہوں۔ اتنے سلیقے سے سب کر رہی تھی وہ نہ ہوتی تو کچھ بھی تیار نہ ہوتا۔" پھوپھو کی آواز اس کے کانوں میں گونج رہی تھی۔

"سکتہ تو نہیں ہو گیا۔ کچھ بولو۔" احمر نے اسے خاموش دیکھ کر اس کی آنکھوں کے آگے ہاتھ ہلایا۔

"احمر تم انکار کر دو۔ منع کر دو پھوپھو کو رشتہ لے جانے سے۔" احمر نے حیرت سے ایشال کو دیکھا۔ وہ اس کی طرف نہیں دیکھ رہی تھی۔ اس کی نظریں نیچے تھیں۔

"کیوں۔" احمر نے تھوک نگلا۔

"سحر کسی اور کو پسند کرتی ہے۔ وہ رشتہ لانے والا ہے، جلد ہی ان کی منگنی ہو جائے گی۔ تم سحر کا خیال اپنے دل سے نکال دو۔"

"تم مذاق کر رہی ہو نا؟" بمشکل احمر کے منہ سے الفاظ نکلے۔

"نہیں، یہ مذاق نہیں ہے، حقیقت ہے۔"

"ایسا کیسے ہو سکتا ہے۔ پہلے تو ایسی کوئی بات نہیں کی تم نے۔" احمر کے لیے یقین کرنا مشکل تھا کچھ دیر پہلے جو چہرہ خوشی سے چمک رہا تھا وہ اب تاریک ہو چکا تھا۔

"مجھے بھی چند دن پہلے ہی پتا چلا ہے۔ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ کیسے بتاؤں۔" ایشال گڑبڑائی۔ احمر نے ہونٹ سختی سے بھینچ لیے جیسے کچھ کہنا چاہتا ہو، پھر لمبے

لمبے ڈگ بھرتا وہاں سے نکلتا چلا گیا۔ ایشال ابھی تک اسی جگہ نظریں مرکوز کیے بیٹھی تھی جہاں سے وہ گیا تھا۔

☆ ☆ ☆

"کہاں ہوتی ہو۔ اتنے سارے دن ہوگئے بات ہی نہیں ہوپائی۔ کل بھی کال کررہا تھا.... تم نے پک نہیں کی، میسج ہی کردیتیں۔" جبران نے شکوہ کیا۔

"ہوں، بس ایسے ہی مصروف تھی۔" ایشال نے تکیے سے ٹیک لگاتے ہوئے جواب دیا۔

"واہ جی! اس قدر بے نیازی.... مسز صاحبہ میں ادھر آپ کی آواز سننے کو بے تاب و بے قرار اپنے دل پر جبر کرتے ہوئے انتظار کررہا تھا اور یہاں کوئی پروا ہی نہیں، صحیح کہتے ہیں آج کے دور میں محبت بھرے دلوں کی کوئی قدر ہی نہیں رہی۔" جبران نے شرارتی لہجے میں اسے چھیڑا تھا۔

"قدر تو واقعی نہیں ہے، نہ چیزوں کی، نہ انسانوں کی۔" ایشال نے گہرا سانس لیا۔

"کیا ہوا، تم اداس ہو.... سب ٹھیک ہے نا، کوئی بات ہے تو بتاؤ مجھے۔" جبران کے لہجے میں تشویش تھی۔ وہ اس کے مزاج کے سب ہی موسموں سے واقف تھا۔ یہی وجہ تھی کہ اس کی آواز میں چھپی افسردگی کو اس نے فوراً بھانپ لیا۔ ایشال گڑبڑائی۔

"نہیں، بس ایسے ہی دل خفا سا ہے۔ کبھی کبھی ایسا ہوتا ہے کہ آپ کا دل افسردگی کی لپیٹ میں آجاتا ہے۔ کچھ بھی کرنے کو دل نہیں چاہتا۔ بس آج یہی کیفیت ہے۔" ایشال کے سنجیدگی سے کہے گئے الفاظ پر جبران ٹھٹکا۔

"خیریت.... ایسی کیا بات ہوئی ہے، جو اس قدر ثقیل گفتگو کرنے کی نوبت آگئی۔ کوئی بات ہوئی ہے....؟"

"بتایا تو ہے دو تین دنوں سے دل اداس ہے اور کچھ نہیں۔ ایک بات پوچھوں جبران....؟"

"پل پل حیران کررہی ہو آج بھلا تمہیں اجازت کی ضرورت کب سے پڑی، وہ بھی مجھ سے بات کرنے کے لیے۔" جبران حیران ہوا۔

"تم کبھی مجھ سے بدگمان تو نہیں ہوگے، وجہ کوئی بھی ہو۔" ایشال نے جھجکتے ہوئے پوچھا تھا۔

"تم آج ایشال کیا ہوگیا ہے۔ ہوں اب سمجھا۔ ضرور کوئی ٹریجک ڈراما دیکھ لیا ہے۔ تب ہی ایسی بہکی بہکی باتیں کررہی ہو۔"

"جو پوچھا ہے اس کا جواب دو۔" ایشال بگڑی۔

"تم میری پہلی اور آخری محبت ہو.... تم نے سوچ بھی کیسے لیا کہ میں تم سے کبھی بدگمان ہوسکتا ہوں۔ یہ سب ڈائیلاگز ڈرامے کی ہیروئن سننا چاہ رہی ہوگی۔ ویسے ہیرو نے یہ بولے یا نہیں۔" جبران نے شرارتی انداز میں کہا۔

"ظاہر ہے تمہارے جیسا بدذوق نہیں ہوتا ہر کوئی۔"

"کاش کہ اس وقت میں تمہیں دیکھ سکتا تپے ہوئے چہرے کے ساتھ تو اور بھی حسین لگتی ہو۔" جبران کے خوب صورت انداز پر ایشال کے لبوں پر دھیمی مسکراہٹ آگئی۔

"تم چاہتے ہو میرا موڈ خراب رہے۔ غصے سے جلی بھنی رہوں۔" ایشال اب خود کو فریش محسوس کررہی تھی۔ اتنے دنوں کی افسردگی ختم ہوگئی تھی۔

"بھئی اب خوب صورت مناظر دیکھنے کے لیے تو ایسی حرکتیں کرنی پڑتی ہیں۔" جبران محظوظ ہوا۔

"ابو سے بات ہوئی، وہ پوچھ رہے تھے۔" ایشال کو یاد آیا۔

"ہوں ہوئی تھی۔ اچھا وہ احمر آیا تھا۔ میں اسے کب سے ٹرائی کررہا ہوں، فون بند ہے اس کا۔ امی سے بات ہوئی تو کہہ رہی تھیں صبح سے غائب ہے، بس ایک میسج کردیا تھا کہ لیٹ آؤں گا۔" جبران کی بات سن کر ایشال کے چہرے کے تاثرات تیزی سے بدلے تھے۔ بولی تو آواز پست تھی۔

"صبح آیا تھا تھوڑی دیر کے لیے....." جبران شاید کچھ اور بھی کہہ رہا تھا، مگر ایشال کی آنکھوں کے سامنے صبح والا منظر تازہ ہوگیا تھا۔ احمر کے چہرے کی چمک اس

کی خوشی سے جگر جگر کرتی آنکھیں' بدلتے تاثرات' چہرے کی تازگی۔ ایشال نے اپنی سوچوں کو جھٹک کر جبران کو سننے کی کوشش کی۔

☼ ☼ ☼

جب سے آئی تھی پھوپھو کا خراب موڈ نوٹ کر رہی تھی۔ "خیریت کیا ہوا پھوپھو کوئی بات ہوئی ہے۔ آپ پریشان سی لگ رہی ہیں۔" ایشال نے جھجکتے ہوئے پوچھ ہی لیا۔ پھوپھو گہرا سانس لیتے ہوئے بولیں۔

"بس کیا بتاؤں۔ احمر نے پریشان کر رکھا ہے۔ رشتہ لے کر جا رہی تھی سحر کے لیے' مان بھی گیا تھا۔ پھر اللہ جانے دل میں کیا سمائی صاف منع کر دیا کہ نہ جائیں کہیں پر بھی' کوئی شادی وادی نہیں کرنی مجھے۔ مان لی اس کی بات' نہیں لے کر گئی رشتہ' پھر بھی منہ پھلائے پھر رہا ہے' اتنے دنوں سے گھر میں بھی نہیں ٹکتا۔ عجیب اولاد ہے آج کل کی' کسی حال میں خوش نہیں ہوتی۔" پھوپھو اپنے دل کی بھڑاس نکال کر ہنڈیا دیکھنے کے لیے اٹھ گئیں۔ ایشال انہیں اپنے جانے کا بتا کر بوجھل دل لیے واپس چلی آئی۔

☼ ☼ ☼

وہ کافی دیر سے دیکھ رہی تھی امی کسی گہری سوچ میں تھیں۔ چہرے پر تفکرات کا جال سا تھا۔

"امی کیا سوچ رہی ہیں۔" بالآخر ایشال نے پوچھ ہی لیا۔ امی اس کی طرف مڑیں۔

"تمہارے ابو کو کچھ رقم کی ضرورت ـــــ ہے۔ بس یہی سوچ سوچ کر پریشان ہوں کہ آخر رقم کا انتظام ہو گا کیسے۔ جو کمیٹی ڈالی تھی وہ بھی اس بار کسی اور کو مل گئی۔ مہینے کا آخر آنے والا ہے اور اس سے پہلے رقم کی ادائیگی کرنی ہے۔" ایشال کو بھی پریشانی ہوئی۔ رات سے ابو بھی کچھ پریشان سے تھے۔ ان کی پریشانی کی وجہ اب سمجھ میں آ رہی تھی۔ رات جب وہ چائے دینے گئی تب وہ کسی رقم کی ادائیگی کی بات کر رہے تھے۔

"تمہارے پاس کتنی رقم ہوگی۔ کچھ ہی کم ہے۔ باقی کا انتظام تو تمہارے ابو نے کر لیا تھا۔ سیونگز کام آ گئیں۔" انہوں نے خیال آنے پر پوچھا۔

"میرے پاس۔"

"ہاں وہ تمہاری تنخواہ جو آئی تھی۔" امی کے چہرے پر امید بھی۔

"تنخواہ... جی وہ تو شاپنگ کر لی تھی میں نے' اب تو ایک ہزار ہی بچا ہے۔" ایشال کو شرمندگی محسوس ہوئی۔ آج اگر اس کے پاس پیسے ہوتے تو وہ امی ابو کی پریشانی کو دور کر پاتی' مگر اس نے تو ایک ہی دن میں اپنی ساری تنخواہ شاپنگ میں لگا دی تھی۔

"اچھا! میں مسرت سے معلوم کرتی ہوں' اگر وہ مدد کر سکے۔ بیس تیس ہزار تو شاید دے ہی سکے۔ اللہ مالک ہے' کچھ نہ کچھ ہو ہی جائے گا۔" ساجدہ بیگم ٹھنڈی سانس بھرتی اٹھ گئیں۔

☼ ☼ ☼

"کیسا رہا ماموں کے گھر کا ٹرپ۔" ایشال نے ابلتے ہوئے پانی میں پتی ڈالتے ہوئے پوچھا۔ سحر فریش سی کاؤنٹر پر بیٹھی بسکٹ کھا رہی تھی۔ ایشال کے پوچھنے پر تفصیل بتانے لگی۔

"بہت ہی اچھا۔ فرح اور فاریہ بھی آئی ہوئی تھیں ہوسٹل سے... خوب گپیں لگائیں۔ روز رات کو ہم تینوں واک پر نکلتے تھے۔ ایک دن تو مامی بھی گئی تھیں۔ آئس کریم کھانے کے شوق میں... اور فاریہ کی برتھ ڈے بھی تھی نا تو بڑے شان دار طریقے سے سیلیبریٹ کی ہم نے... میں تو تمہیں بھی کہہ رہی تھی ساتھ چلو' سب پوچھ رہے تھے ایشال کیوں نہیں آئی۔"

"ہم دونوں ایک ساتھ اکیڈمی سے چھٹی بھی تو نہیں کر سکتے تھے۔ بس اسی لیے...."

"اور یہ تمہیں ہوا کیا ہے۔" سحر نے جانچتی نظروں سے اسے دیکھا۔

"کچھ نہیں' کیا ہونا ہے۔" ایشال نے چائے کپ میں انڈیلی۔

"عجیب سی لگ رہی ہو۔ نہ آنکھوں میں چمک' نہ

چہرے پر رونق اور اس قدر سنجیدگی۔ خیر تو ہے، کہیں جبران بھائی سے جھگڑا تو نہیں ہوا۔" سحر کے لہجے میں شرارت تھی۔

"نہیں تو۔۔۔" ایشال سٹپٹائی۔

"کوئی بات تو ہے۔" سحر الجھی۔

"کہہ تو رہی ہوں ایسی کوئی بات نہیں۔ وہم ہے تمہارا۔" ایشال چائے کے کپ اٹھا کر لاؤنج کی طرف چل پڑی۔

سحر بھی کندھے اچکاتی اس کے پیچھے ہولی۔

"اور تمہارے اس کزن کو کیا ہوا ہے۔ جب سے اس نے ہماری باتیں سنی تھیں نظریں جھکائے سلام کرتا ہوا چلا جاتا تھا، مگر آج راستے میں آمنا سامنا ہوا تو عجیب سا ہی لگا۔ بارہ بجے ہوئے تھے۔ پہلے کی طرح سلام بھی نہیں کیا۔ اجنبی نظروں سے دیکھ کر چلا گیا۔"

"پتا نہیں۔" ایشال نے نظریں چرائیں۔

"ایشال اس دن میں کچھ زیادہ تو نہیں بول گئی تھی۔ دکھی سا لگا مجھے وہ عجیب الزام دیتی ہوئی سی نظریں تھیں یا شاید کچھ اور۔۔۔ اداس تھا شاید۔" سحر نے پرسوچ انداز میں کہا۔

"تمہیں اس کی فکر کیوں ہو رہی ہے۔" ایشال نے چائے کا کپ لبوں سے لگاتے ہوئے غور سے اسے دیکھا۔

"فکر نہیں ہو رہی، بس ایسے ہی خیال سا آیا کہ شاید میں کچھ زیادہ بول گئی تھی۔ چلو چھوڑو، امی نے تمہارے لیے گفٹ بھیجے ہیں وہ دکھاتی ہوں۔" سحر سر جھٹکتی ہوئی ایشال کے کمرے میں گئی جہاں وہ شاپر رکھ کر آئی تھی۔

✲ ✲ ✲

"امی! اسمرہ آپی کا فون تھا کہہ رہی تھیں جلد چکر لگائیں گی۔" ساجدہ بیگم نے محض سر ہلایا۔ وہ سالن کے لیے بھنڈی کاٹ رہی تھیں۔ ایشال نے ادھر ادھر دیکھا۔

"خالہ چلی گئیں؟"

"ہوں پریشان تھی۔ بس کیا کریں پریشانی تو ہر بندے کے ساتھ لگی رہتی ہے۔ مسئلے زندگی کے ساتھ ہی چلتے ہیں۔"

"کیسا مسئلہ؟" ایشال چونکی۔

"سحر کے رشتے کے لیے فکر مند ہے۔ کوئی مناسب رشتہ نہیں آرہا۔ ایک دو آئے ہیں مگر کوئی بھی تسلی بخش نہیں لگا۔ اللہ مقدر اچھے کرے اتنی اچھی بچی ہے کوئی نیک سبب ہو۔" ایشال چپ چاپ قریبی صوفے پر بیٹھ گئی۔

"میرا بڑا دل تھا تمہاری پھپھو، احمر کے لیے مانگ لیتیں۔ گھر کا دیکھا بھالا بچہ ہے۔ اب تو خیر سے اچھی نوکری کر رہا ہے۔ اچھا جوڑ ہوتا۔ لیکن آپا اتنی پرانی بات دل سے لگا کر بیٹھی ہیں۔ مسرت کے ہاں تو کبھی نہیں کریں گی۔" ایشال کو دل کا بوجھ بڑھتا محسوس ہوا

"کیا کہہ سکتے ہیں۔ بس اللہ بہتر کرے۔" ساجدہ بیگم کی بات جاری تھی۔

✲ ✲ ✲

وہ چکر لگاتے ہوئے مختلف شیلف کو دیکھتی اپنی مطلوبہ چیز تلاش کر رہی تھی۔ وہ پہلی بار اتنے بڑے سپر اسٹور میں آئی تھی۔ یہاں کھانے پینے کی چیزوں سے لے کر برتنوں اور ڈیکوریشن پیسز جیسی اشیاء کی بھی بہت زیادہ ورائٹی موجود تھی۔ نیا کھلا تھا اس لیے پہلے چکر نہ لگا تھا۔ آج بھی وہ درزی کو کپڑے دے کر آرہی تھی جب راستے میں بورڈ دیکھ کر اندر چلی آئی۔

دو مرتبہ گھوم پھر کر ایک ہی جگہ پہنچ گئی۔ ابھی وہ مڑی ہی تھی کہ بائیں طرف سے آتی آواز پر رک گئی۔ پیچھے ایک درمیانی عمر کی خاتون ــــــــ نے اسے مخاطب کیا تھا۔

"آپ کچھ ڈھونڈ رہی ہیں، کیا میں آپ کی مدد کر سکتی ہوں۔ اصل میں آپ دوسری دفعہ اس طرف آئیں تو لگا شاید آپ کو اپنا مطلوبہ کارنر ڈھونڈنے میں دشواری ہو رہی ہو۔" اس نے مسکراتے ہوئے وضاحت کی۔

”جی مجھے بڑا ساس چاہیے وہی تلاش کر رہی ہوں۔ آپ بتا سکتی ہیں وہ کارنر کس طرف ہے۔“ سحر نے بھی جلدی سے اپنا مسئلہ بتایا پہلے ہی دیر ہو رہی تھی مغرب ہو چکی تھی اور اندھیرا بڑھتا جا رہا تھا۔ ایشال کی طبیعت ٹھیک نہیں تھی اس لیے اسے اکیلے ہی آنا پڑا۔

”آیئے میں لے چلتی ہوں۔“ وہ خوش اخلاقی سے کہتی اپنی ٹرالی دھکیلنے لگی۔ سحر بھی اس کے پیچھے ہولی۔ سحر اس کے ساتھ چلتی رہی۔ اس کی تیز رفتاری سے تو یہی لگ رہا تھا کہ وہ یہاں آتی رہتی ہے۔ کافی آگے جا کر وہ رکی تھی۔

”یہاں پر بڑا ساس بھی مل جائے گا اور دوسری ساسز، مایونیز، چٹنیاں وغیرہ بھی۔“

”آپ کا بہت شکریہ۔“ سحر اس کی مشکور ہوئی۔

”کوئی بات نہیں۔ یہاں پہلی بار آئی ہو۔“

”جی گزر رہی تھی تو سوچا بڑا ساس بھی لے لوں اور اندر سے دیکھ بھی لوں۔“ سحر کو وہ خوش اخلاق سی خاتون بہت اچھی لگی تھیں۔ وہ سحر کے ساتھ مختلف سوسز دیکھتی رہیں پھر موبائل پر کسی سے بات کرنے لگیں۔ تو سحر تھوڑا آگے چلی گئی۔ بات ختم کر کے وہ سحر کے قریب آئیں۔

”سحر آپ ایک فیور دو گی مجھے۔“ سحر نے سوالیہ نظروں سے انہیں دیکھا۔ ”میں بل پے کر کے چیزیں وہاں رکھوا جاتی ہوں۔ تم آدھے گھنٹے بعد لے کر باہر آ جانا میں تم سے دکان کے باہر سے لے لوں گی۔“

”مجھے پہلے ہی دیر ہو رہی ہے۔ آپ رکھوا دیں کاؤنٹر کے پاس۔“ سحر نے معذرت کی وہ لیٹ ہو چکی تھی اور تھی بھی اکیلی۔

”دراصل میں میرے شوہر ساتھ والی دکان میں بلا رہے ہیں وہاں سے ضروری کچھ لینا ہے دیر بھی ہو رہی ہے۔ بیس منٹ تو میرے کاؤنٹر پر ہی لگ جائیں گے پھر وقت بھی کم ہے میں باہر تم سے لے لوں گی۔ ٹھیک آدھے گھنٹے بعد تم لے کر باہر آ جانا۔ پلیز یہ چھوٹا سا فیور دے دو ہم تمہیں بھی ڈراپ کر دیں گے۔“ اس کے اسرار پر سحر نہ چاہتے ہوئے بھی رضا مند ہو گئی۔

”اوکے بس لیٹ نہ کیجئے گا۔“

”فکر نہ کرو میں لیٹ نہیں ہوں گی تھینک یو سحر۔ وہ سامنے ہی کاؤنٹر ہے۔ میں تمہارا انہیں بتا دیتی ہوں۔“ وہ خوش ہوتی ہوئی کاؤنٹر کی طرف چلی گئی جہاں بل ادا کرنا تھا۔ سحر بڑا ساس تو لے چکی تھی۔ اب مجبوراً چٹنیاں وغیرہ دیکھنے لگی۔ ساتھ زوبیہ پر نظر ڈال لیتی جو کاؤنٹر پر کھڑی تھی اور مسکرا کر اس پر بھی نظر ڈال لیتی تھی۔ پھر وہ کاؤنٹر والے بندے سے بات کرتی رہی پھر اس کی طرف اشارہ بھی کیا۔ کاؤنٹر والے کے دیکھنے پر سحر نے بھی زوبیہ کو اوکے کا اشارہ کیا۔ کچھ دیر بعد سیلز گرل اس کے پاس آئی۔

”میم اپنا آئی ڈی کارڈ مجھے دے دیں میں کاؤنٹر پر رکھوا دیتی ہوں۔ آپ جاتے ہوئے لے لیجئے گا۔“

”آئی ڈی کارڈ۔“ سحر حیران ہوئی۔

”دیکھیں میم ایسا ہوتا نہیں ہے مگر آپ کو فیور دے رہے ہیں۔ آپ آئی ڈی کارڈ رکھوا دیں گی تو ہمیں تسلی رہے گی۔“ سحر نے ایک نظر زوبیہ کو دیکھا جو ابھی تک وہیں کھڑی تھی پھر آئی ڈی کارڈ نکال کر سیلز گرل کو تھما دیا۔ سحر کلائی پر بندھی گھڑی دیکھ کر ایک بار پھر شاپ کی طرف متوجہ ہو گئی۔ آخر وقت بھی تو گزارنا تھا۔ سحر نے موبائل نکال کر دیکھا مگر بیٹری ختم ہونے کی وجہ سے موبائل بند ہو چکا تھا۔ امی ابو کا سوچ کر اسے پریشانی ہو رہی تھی۔ پتا نہیں ان کا پریشانی سے کیا حال ہو گا۔ درزی کے ہاں سے نکلے اسے بہت دیر ہو چکی تھی۔ اب تو وہ یہاں آنے پر ہی پچھتا رہی تھی۔ ٹائم پورا ہوتے ہی وہ کاؤنٹر کی طرف آئی۔

”وہ سامان اور آئی ڈی کارڈ دے دیں۔“ اپنا بل پے کر کے سحر نے کہا۔ کاؤنٹر پر بیٹھے شخص نے غور سے اسے دیکھا۔ ”آئی ڈی کارڈ آپ کو اسی صورت میں ملے گا جب آپ پہلے والا بل پے کریں گی۔“

”کون سا بل۔“ سحر چونکی اس نے سحر کو بل تھمایا۔

”میں اپنا بل پے کر چکی ہوں۔ میں مس زوبیہ کے

سامان کی بات کر رہی ہوں جو وہ چھوڑ کر گئی تھیں۔"
"سامان وہ ساتھ لے گئی ہیں اسی لیے تو آپ کا آئی ڈی کارڈ رکھنا پڑا، وہ کہہ رہی تھیں ان کے پاس رقم کم ہے اور سامان کسی کو پہنچانا ہے۔ میری بہن کا آئی ڈی کارڈ رکھ لیں آپ دونوں بہنیں ہیں۔ آپ اپنی بہن کو فون کریں وہ کسی بندے کے ہاتھ پیسے بھجوانے کا کہہ رہی تھیں۔" اس کی بات سنتے ہی سحر کا اطمینان رخصت ہو گیا۔ اس کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ کیا کرے۔ یہ سب کیا ہو گیا تھا۔ تھوک نگلتے ہوئے اس نے ہاتھ میں پکڑا بل دیکھا۔ چالیس ہزار کا بل دیکھ کر اس کے رہے سہے اوسان بھی خطا ہو گئے۔

"دیکھیں یہ میرا بل نہیں ہے ان خاتون کا ہے اور میں ان کی بہن نہیں ہوں وہ یہیں مجھے ملی تھیں اور انہوں نے کہا تھا کہ میں ان کا سامان پیک کر لوں۔" سحر نے بمشکل انہیں سمجھانے کی کوشش کی۔ اب بولے بنا کوئی چارہ بھی نہیں تھا۔ بے وقوفی تو وہ کر ہی چکی تھی۔ اس شخص کے تاثرات لمحے میں بدلے۔

"مس یہ ہمارا مسئلہ نہیں آپ اپنا بل ادا کریں بات ختم۔ بھلا ہم کیسے مان لیں۔ بغیر کسی جان پہچان کے آپ نے اپنا آئی ڈی کارڈ رکھوا دیا۔ یہ فاؤل گیم ہمارے ساتھ نہ کھیلیں۔"

"میں سچ بول رہی ہوں میں انہیں نہیں جانتی۔"
"آپ کیا سمجھ رہی ہیں ان ڈراموں سے ہم اپنے پیسے چھوڑ دیں گے آپ یا تو بل ادا کریں یا ہمارا سامان واپس کریں ورنہ ہم ابھی پولیس کو بلا لیں گے۔"
"میرا کوئی قصور نہیں ہے۔" سحر روہانسی ہوئی۔ پولیس کا نام سن کر رنگ اڑ گیا تھا۔
"بل ادا کریں اور جائیں۔" اس کے چہرے پر سختی آگئی۔ پریشانی سے اس کا دماغ مفلوج ہو کر رہ گیا تھا۔ موبائل پہلے ہی بند تھا۔ کسی اور کا موبائل نمبر یاد نہیں تھا۔ ایک گھر کا لینڈ لائن نمبر یاد تھا جس کا کوئی فائدہ نہیں تھا کیونکہ وہ آج کل خراب تھا۔
"یہ فون پڑا ہے اگر آپ رقم منگوانا چاہتی ہیں تو کر لیں۔" قریب کھڑی سیلز گرل نے اسے مخاطب

کیا۔ سحر نے پریشانی سے ارد گرد کا جائزہ لیا۔ سب لوگ اپنی اپنی خریداری میں مصروف تھے۔ بچے خوشی سے چکر لگا رہے تھے۔ اجنبی چہروں کو دیکھ کر اسے رونا آنے لگا۔ دل ہی دل میں اللہ سے فریاد کی کہ وہ اس مشکل کو ٹال دے اور بے شک اللہ مدد کرنے والا مہربان ہے۔ ایک شناسا چہرے کو دیکھ کر اس کی جان میں جان آئی۔

"احمر۔" سحر بے اختیار اسے پکاری مگر فاصلہ ہونے کی وجہ سے آواز اس تک پہنچ نہیں سکی تھی۔ "وہ میرے رشتہ دار ہیں انہیں بلا دیں پلیز!" سحر نے سیلز گرل کو اشارے سے احمر کا بتایا۔ اسے پتا تھا کہ کاؤنٹر والا بندہ تو اسے یہاں سے ہلنے بھی نہیں دے گا۔ سیلز گرل سر ہلاتی جلدی سے احمر کے پیچھے گئی جو آگے جا رہا تھا۔ وہ اب احمر کو روک چکی تھی۔ اس نے کچھ کہا تھا۔ جس پر احمر نے چونک کر اس طرف دیکھا پھر وہ لمبے لمبے ڈگ بھرتا سحر کی طرف آرہا تھا۔ اسے اپنی طرف آتے دیکھ کر سحر کو حوصلہ ہوا۔

"سحر آپ یہاں کیا کر رہی ہیں؟" احمر نے حیرت سے اسے دیکھا جو رات کے اس وقت یہاں اکیلی کھڑی تھی۔ چہرے پر پریشانی بھی صاف دکھائی دے رہی تھی۔

"وہ میں اکیلی ہوں یہاں ایک مسئلہ ہو گیا ہے۔"
"کیا ہوا ہے کھل کر بتائیں۔" احمر اس کی حالت دیکھ کر پریشان ہوا۔ اس کے چہرے پر ہوائیاں اڑ رہی تھیں۔ سحر نے جلدی جلدی اسے ساری بات بتائی۔ احمر سنجیدگی سے سنتا رہا۔

"اچھا! میں بات کرتا ہوں آپ پریشان نہ ہوں۔" اسے تسلی دیتا وہ کاؤنٹر والے شخص سے بات کرنے کے لیے آگے بڑھا۔

"احمر۔" اپنے پیچھے آواز سن کر مڑا۔ "کہاں رہ گئے ہو میں آگے جا رہا تھا مڑا تو تم غائب تھے۔"

"طاہر یار ایک مسئلہ ہو گیا ہے۔" احمر نے مختصراً اسے ساری صورت حال سمجھائی۔ ساری بات سن کر وہ احمر کے ساتھ کاؤنٹر والے شخص کے پاس آیا۔ دونوں نے اسے بات سمجھانے کی کوشش کی۔ سحر

خاموشی سے ان کی باتیں سن رہی تھی۔ احمر کے آنے سے اسے کافی ڈھارس ملی تھی۔

"اگر یہ سچ ہے تب بھی ہمارا نقصان کون بھرے گا۔ ہم بھی آگے جواب دہ ہیں۔"

"آپ ٹھیک کہہ رہے ہیں لیکن اس وقت ان صاحبہ کو بیچ میں ڈالنے کا کیا فائدہ۔ میرا کارڈ رکھ لیں آپ۔۔۔ میں اے ایس پی آفیسر ہوں۔ میں خود اس کیس کی انویسٹگیشن کرواؤں گا۔" طاہر کے بات مکمل کرتے ہی احمر بولا۔

"ورنہ ہم آپ کا نقصان ادا کریں گے آپ فکر نہ کریں۔" دونوں بات مکمل کر کے سحر کی طرف آئے تھے۔ احمر نے آئی ڈی کارڈ اس کی طرف بڑھایا جسے اس نے خاموشی سے تھام لیا۔ "مس آج تو آپ خوش قسمتی سے بچ گئیں مگر آئندہ ایسی غلطی مت کیجئے گا۔" طاہر کے کہنے پر سحر شرمندہ ہوئی۔ احمر نے اپنی مسکراہٹ دبائی۔ وہ اسے مزید شرمندہ نہیں کرنا چاہتا تھا۔ سحر نے محض سر ہلانے پر ہی اکتفا کیا ورنہ دل تو چاہ رہا تھا فوراً "غائب" ہو جائے۔

"احمر چلو تم اپنی کزن کو لے جاؤ پھر ملتے ہیں۔" طاہر الوداعی کلمات کہہ کر چلا گیا۔ وہ دونوں بھی خاموشی سے چلتے ہوئے دکان سے باہر نکل آئے۔

☆☆☆

رات کے نو بج رہے تھے۔ سڑک پر ٹریفک معمول کے مطابق رواں دواں تھی۔ چاروں طرف جگمگاتی روشنیاں تاریکی کو مات دے رہی تھیں۔ سحر کو فٹ پاتھ پر رکتے دیکھ کر احمر اس کی طرف مڑا۔

"تھینک یو آپ نے میری بہت مدد کی۔ آپ نہ آتے تو پتا نہیں میں اس مشکل سے کیسے نکل پاتی۔" سحر حقیقتاً اس کی مشکور تھی۔ احمر اس کی بات سنتے ہوئے خاموش کھڑا تھا۔ جیبوں میں ہاتھ ڈالے نظریں جھکائے سنجیدہ چہرے کے ساتھ، سحر کے چپ ہونے پر اس نے لب کشائی کی۔

"آپ کی منگنی کب ہے؟" اتنے غیر متوقع سوال پر سحر نے حیرت سے اسے دیکھا جواب سنجیدگی سے اس کی آنکھوں میں دیکھ رہا تھا۔

"جی!" اسے لگا شاید سننے میں کوئی غلطی ہوئی ہے۔

"سنا ہے آپ کی منگنی ہو رہی ہے، جس کو آپ پسند کرتی ہیں اس کے ساتھ۔"

"ایسی کوئی بات نہیں، میری کوئی منگنی وگنی نہیں ہو رہی۔" سحر کو کہنا ہی پڑا۔ وہ تو اس کے سوال پر ہی حیران تھی۔

"سیریسلی۔ آپ مذاق تو نہیں کر رہیں؟" اب حیران ہونے کی باری احمر کی تھی۔ مگر اس حیرانی میں بے یقینی بھی تھی۔

"میں آپ سے مذاق کیوں کروں گی؟"

"آپ کسی کو پسند نہیں کرتیں؟" احمر نے کنفرم کر لینا چاہا۔

"جی نہیں۔" سحر نے بے چینی سے ارد گرد دیکھا بھلا احمر اس سے ایسے سوال کیوں کر رہا تھا۔

"آپ مجھ سے منگنی کریں گی؟" بے اختیاری میں اس کے منہ سے نکلا تھا۔ سحر نے بے یقینی سے اسے دیکھا، خوشی سے اس کا چہرہ چمک رہا تھا۔ احمر کو اپنے فقرے کے غلط ہونے کا احساس ہوا۔

"میرا مطلب ہے۔ شادی کریں گی مجھ سے؟ امی کو آپ کے گھر بھیجوں۔" سحر نے غور سے اسے دیکھا۔ اچھا خاصا ہینڈسم تھا وہ۔ اور اس کے ساتھ کا خواہش مند بھی۔ اپنی خوب صورت آنکھوں میں محبت سموئے وہ اسے منتظر نظروں سے دیکھ رہا تھا۔ سحر کی رضامندی اس کے لیے اتنی اہمیت رکھتی تھی۔ سحر کے دل کی دھڑکن مس ہوئی۔

"سحر آپ کچھ کہیں گی نہیں۔۔۔ کیا میں آپ کو پسند نہیں۔" اس کے چہرے کا ماند پڑنا سحر کو اچھا نہیں لگا تھا۔

"کیا سڑک پر کھڑے کھڑے ہی پروپوز کریں گے؟" سحر کے لبوں پر دھیمی مسکراہٹ دیکھ کر وہ حیرت و خوشی کی ملی جلی کیفیت کا شکار ہوا تھا۔

"آپ اجازت دیں گی تو کہیں پہ بھی پروپوز کر دوں

گا۔ بات تو آپ کے ماننے کی ہے۔" اب کی بار احمر بھرپور انداز میں مسکرایا تھا۔

"ویسے ایک بات کہوں۔" سحر نے سوالیہ نظروں سے اسے دیکھا۔ "میں نے سنا تھا بلکہ میرا ذاتی خیال بھی یہی تھا کہ آپ کافی سمجھدار ہیں مگر آج آپ نے خاصی معصومیت کا ثبوت دیا ہے۔" احمر کے لہجے میں چھپی شرارت دیکھ کر سحر شرمندگی سے سرخ ہوئی۔ احمر نے بڑے شوق سے اس کے رنگ بدلتے چہرے کو دیکھا سحر نے گلا صاف کیا۔

"آپ نے بتایا نہیں کس نے بتایا میری منگنی کا۔" سحر کو بروقت یاد آیا۔

"ایشال نے کہا تھا۔ مگر وہ ایسے کیوں کہے گی؟ مطلب غلط بیانی کیوں کی اس نے؟ جبکہ وہ تو میرے جذبات سے بھی واقف تھی۔" سحر ٹھٹکی۔

"ایشال نے۔" احمر کے حیرت سے دیکھنے پر گڑبڑائی۔

"اچھا! —— میں سمجھ گئی۔ اصل میں میں نے مذاق کیا تھا اس سے اور وہ سچ سمجھ بیٹھی اور کوئی بات نہیں ہے۔" سحر بمشکل مسکرائی۔

"تھینک گاڈ! یہ خبر سننے کے بعد سے میرا موڈ آف تھا۔" احمر مطمئن ہوا۔ "چلیں میں آپ کو گھر چھوڑ دوں۔" سحر سر ہلاتی اس کے ساتھ ہولی۔ احمر اسے اپنی گاڑی کے متعلق بتا رہا تھا جو حال میں ہی کمپنی کی طرف سے ملی تھی۔ مگر سحر کا دھیان ابھی تک ایشال کے جھوٹ میں ہی اٹکا ہوا تھا۔ ایشال کو جھوٹ بولنے کی کیا ضرورت تھی؟

✡ ✡ ✡

احمر اور سحر کا رشتہ طے ہو گیا ہے۔ یہ خبر جب سے امی نے سنی تھی۔ خوشی سے پھولی نہیں سما رہی تھیں اور ایشال شاک کی کیفیت سے نکل نہیں پا رہی تھی۔ کل تک اسے اپنا جھوٹ سینے میں اٹکے بوجھ کی طرح محسوس ہو رہا تھا۔ جبکہ اب یہ سوچ سوچ کر دماغ کی رگیں پھٹ رہی تھیں کہ آخر یہ سب ہو کیسے گیا۔

یقیناً" احمر کو اس کے جھوٹ کا پتا چل گیا ہوگا۔ شاید سحر کو بھی۔ رات کو دعائے خیر تھی اور ایشال جانے کا کوئی بہانہ بھی نہیں کر سکتی تھی۔ ان دونوں کا سامنا کرنے کے خیال سے ہی اس کے احساسات عجیب سے ہو رہے تھے۔

✡ ✡ ✡

نہ چاہتے ہوئے بھی اسے آنا پڑا تھا' یہاں آ کر وہ خالہ اور امی کے ساتھ ہی بیٹھ گئی۔ مگر کچھ دیر بعد ہی سحر آ گئی۔ ساجدہ بیگم سے مل کر اس کا ہاتھ پکڑ کر اپنے کمرے میں لے گئی۔ ایشال مجبوراً" آ گئی اور کوئی چارہ بھی نہیں تھا۔ سحر کے چہرے پر کسی قسم کی خفگی کا شائبہ تک نہیں تھا۔ وہ خوش تھی یہ کوئی بھی اسے دیکھ کر بتا سکتا تھا۔

"ایسے کیا دیکھ رہی ہو؟" سحر نے اسے اپنی طرف دیکھتے پا کر پوچھا۔

"نہیں حیران ہو رہی ہوں اتنی جلدی یہ سب ہوا کیسے۔" سحر کے ہونٹوں پر مسکراہٹ آ گئی۔

"بس مجھے بھی پتا نہیں چلا چٹکی بجاتے ہو گیا ہو۔ جیسے —— ہمارا نصیب ایک ساتھ تھا تب ہی تو اچانک سے فیصلہ ہو گیا۔" پھر سحر اسے اس دن کا سارا واقعہ سناتی چلی گئی کہ کس طرح احمر نے اس کی مدد کی۔ ایشال کے جھوٹ اور احمر کے منگنی والے سوال کو گول کر گئی۔

"احمر نے مجھے پروپوز کیا تو میں نے سوچا بندہ برا نہیں ہے۔ یہ سمجھو کہ اچانک سے دل کو اچھا لگ گیا۔" سحر جھینپ کر بولی۔ اس کے چہرے پر بڑے خوب صورت رنگ تھے۔ ایشال نے نظریں چرائیں۔ شرمندگی سے اس کا چہرہ سرخ ہو رہا تھا۔ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ کیا کہے۔ سحر کو بھلے سے احمر نے کچھ نہ بتایا ہو مگر وہ خود تو اس کے جھوٹ تک پہنچ گیا ہوگا۔ تب ہی تو بات یہاں تک پہنچی تھی۔ کچھ دیر میں پھپھو لوگ آ گئے' کھانے کے بعد بڑوں نے دعا کرنے کے ساتھ ہی نکاح کی تاریخ بھی مقرر کر دی۔ ایشال

چائے بنا رہی تھی۔ سحر پھپھو کے پاس بیٹھی تھی۔ ٹرے میں کپ سیٹ کر کے وہ مڑی احمر کو کچن میں آتے دیکھ کر اس کے ہاتھ ساکن ہوئے۔ آج تو اس کی چھب ہی نرالی تھی۔ آنکھوں میں چمک اور چہرے کی مسکراہٹ اس کی خوشی صاف ظاہر تھی۔

"تم کہاں چھپی بیٹھی ہو۔ تمہیں تو سب سے پہلے مجھے مبارک باد دینی چاہیے تھی۔ میں فون کا ہی انتظار کرتا رہا۔ جانتا تھا سب سے زیادہ تم اور جبران خوش ہو گے۔ آخر میرے ہم راز جو ہو۔" احمر نے مزے سے گلاب جامن پلیٹ سے اٹھایا جو ابھی ایشال نے نکالے تھے۔ اس کے لہجے میں کسی قسم کا طنز نہیں تھا۔ ایشال کو حیرت ہوئی۔

"بہت مبارک ہو۔ میں مل کر ہی وش کرنا چاہتی تھی۔" ایشال بڑی مشکل سے مسکراہٹ چہرے پر لائی ورنہ تو شرمندگی کے مارے اس کا سامنا کرنا ہی سب سے مشکل لگ رہا تھا۔

"دیکھ لو! پھر میرے سچے جذبے رنگ لے آئے ورنہ تم نے تو ڈرا ہی دیا تھا۔ شکر ہے اس دن سحر سے ملاقات ہو گئی۔ اور میں نے خود ہی اس کی منگنی کا پوچھ لیا۔ مگر اس نے کہا وہ بات تو مذاق میں کہہ دی تھی تم سے..... میں بھی حیران تھا بھلا تم میرے ساتھ ایسا مذاق کیوں کرو گی۔"

"سحر نے تم سے کہا کہ وہ مذاق کر رہی تھی۔" ایشال بے یقین تھی۔

"ہوں..... تمہیں بتایا ہی ہو گا اس نے۔"

"ہاں پوچھا تھا میں نے اس سے۔ یہ فرحان کہاں رہ گیا ٹرے لے جاتا۔"

"باہر گیا تھا کوئی بات نہیں میں لے جاتا ہوں۔" ایشال نے ٹرے اسے تھمائی۔ اس کے چہرے کے تاثرات عجیب سے ہو رہے تھے۔ لیکن احمر کچھ محسوس نہ کر سکا وہ اپنی خوشی میں مست تھا۔ اسی وقت فرحان کچن میں آیا۔

"احمر بھائی آپ رہنے دیں میں لے کر جاتا ہوں۔" فرحان نے احمر کے ہاتھ سے ٹرے لے لی۔

"کوئی مسئلہ نہیں یار۔" احمر نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھا۔ دونوں باتیں کرتے کچن سے چلے گئے۔

☆☆☆

وہ اپنے آپ کو شرمندگی کی اتھاہ گہرائیوں میں گرا محسوس کر رہی تھی۔ جب سے واپس آئی تھی کسی پل چین نہیں تھا۔ آنکھیں آنسوؤں سے بھرتی جا رہی تھیں۔ جنہیں وہ بے دردی سے ہاتھ کی پشت سے صاف کرتی جاتی۔

"یہ میں نے کیا کر دیا۔" کمرے میں چکر لگا لگا کر تھک گئی تو بستر پر بیٹھ کر سر ہاتھوں میں تھام لیا۔ سحر میرے بارے میں کیا سوچتی ہو گی۔ وہ تو میری بچپن کی دوست ہے میری بہن ہے، پھر اپنی سب سے پیاری دوست کے ساتھ کیوں کیا میں نے ایسا۔ اور اس نے کوئی شکوہ تک نہیں کیا۔ کچھ تو کہتی برا بھلا ہی کہہ دیتی۔ لڑائی کرتی، سوال کرتی۔ الٹا اس نے کچھ جتایا تک نہیں، یہ سب سوچیں اس کا دماغ ماؤف کر رہی تھیں۔ مسلسل بجتے موبائل نے اسے سوچوں سے نکالا۔ اسکرین پر جبران کا نام جگمگا رہا تھا۔ ایشال نے نہ چاہتے ہوئے بھی فون اٹھا لیا۔

"کیا ہو رہا تھا۔ جناب! اکیلے اکیلے ہی تم لوگ دعائے خیر کر آئے۔" جبران کی فریش سی آواز آئی تھی۔

"اچانک ہو گیا سب۔" ایشال نے لب کھولے۔

"احمر سے بات ہوئی، بہت خوش تھا۔ نکاح بھی طے کر دیا امی ابو نے..... بہت فاسٹ جا رہے ہو سب۔"

"ہوں۔"

"ایک میں بے چارہ دور بیٹھا ہوں۔ تم لوگوں کی تصویروں کا انتظار کر رہا تھا۔ احمر نے تو بس ابو لوگوں کی بھیج دی ہیں۔ میں اسے کہہ رہا تھا ایشال کی اور امی کی بھی بھیج دیتے۔" جبران اپنی کہے جا رہا تھا۔ ایشال محض ہوں ہاں کرتی رہی۔ "اپنی تصویریں ہی بھیج دو۔" جبران نے فرمائش کی۔

"نہیں لی۔ خیال ہی نہیں آیا۔" ایشال نے دکھتے

ہے۔" فون بند ہوچکا تھا۔ ایشال فون ہاتھ میں لیے

"یہ کیسے ہوگیا۔ تم نے اور تصویر نہیں لی۔ خیریت تو ہے۔" جبران نے اسے چھیڑا۔ "احمر نے تو اپنی بھی چار بھیجی ہیں۔"

"ہوں۔" ایشال اتنا ہی کہہ سکی۔

"کیا بات ہے ایشال... تمہاری آواز بھی عجیب سی ہو رہی ہے پہلے تو میں اپنا وہم سمجھا تھا، پر اب لگ رہا ہے کوئی بات ہے ضرور۔"

"کوئی بات نہیں ہے۔" ایشال کی آواز میں نمی گھلی۔

"تم رو رہی ہو۔ کیا ہوا ہے۔" جبران کو تشویش ہوئی۔ ایشال پہلے ہی اپ سیٹ تھی۔ جبران کی ہمدردی پا کر سب کچھ بتاتی چلی گئی۔ سب کہہ دینے کے بعد اسے اپنا دل ہلکا ہوتا محسوس ہوا تھا۔ اپنی غلطی کا اعتراف بھی کبھی کبھی انسان کے دل کے بوجھ کو کم کر دیتا ہے۔ دوسری طرف جبران بالکل خاموش تھا۔

"جبران۔" ایشال نے دھیرے سے پکارا۔

"تم اتنی خود غرض کیسے ہو سکتی ہو۔ سحر تمہاری بچپن کی دوست ہے۔ تم کیسے اس سے عناد پال سکتی ہو۔ تم تو کہتی تھیں تمہاری بہن ہے سحر... اور امی کو اگر اس کی خوبیاں پسند آگئیں تو اس میں برا لگنے والی کیا بات ہے اور احمر... تم اچھی طرح جانتی تھیں۔ وہ کتنا سنجیدہ تھا۔ سحر کے لیے پھر بھی... وہ کس قدر اپ سیٹ رہا ہے۔ میں جانتا ہوں۔ وہ میرا بھائی ہے ایشال... یہی سوچ لیا ہوتا۔" جبران بگڑا تھا۔

"میں نے پلاننگ سے نہیں کیا کچھ بھی پتا ہی نہیں چلا سب غلط ہوگیا۔" ایشال نے بمشکل اپنی صفائی دینے کی کوشش کی۔

"خود سے کچھ نہیں ہوتا کیا جاتا ہے۔ تم نے ٹھیک کرنے کی کوشش بھی تو نہیں کی۔ اس دن اگر احمر سحر سے نہ ملتا تو تم کبھی یہ اعتراف نہ کرتیں۔ اور احمر وہ تمام عمر نامراد ہی رہتا۔" ایشال خاموش ہی رہی، کہنے کے لیے کچھ بچا نہیں تھا جیسے۔ "بہت مایوس کیا تم نے مجھے لگتا تھا مجھ سے جڑا ہر رشتہ تمہیں عزیز

ہوئے سر پر ہاتھ رکھا۔ پھوٹ پھوٹ کر رو رہی تھی۔ اپنی خود غرضی کی بدولت اس نے جبران کو بھی خود سے دور کر دیا تھا۔

☆ ☆ ☆

"تم یہاں بیٹھی ہو تیار کیوں نہیں ہوئیں۔ صبح سے سحر کے کئی فون آچکے ہیں۔ کل اس کا نکاح ہے اور تم یہاں بیٹھی ہو۔ ناراض ہو رہی تھی سحر۔ شام تک فرح اور فاریہ بھی پہنچ جائیں گی۔" نمرہ آپی اسے بستر پر لیٹے دیکھ کر بولیں، دو دن ہوگئے تھے انہیں میکے آئے ہوئے۔

"تھوڑی دیر میں اٹھتی ہوں۔" ایشال تکیے سے ٹیک لگا کر بیٹھ گئی۔

"امی بتا رہی ہیں تم نے کوئی جوڑا بھی نہیں لیا نکاح کے لیے۔ امی نے پیسے دیے ہیں کہ شام کو جا کر لے آؤ۔" نمرہ آپی اس کے قریب ہی بیٹھ گئی تھیں۔

"واپس کر دیں امی کو۔"

"کیوں...؟ اچھا اب سمجھی کل تنخواہ جو آئی ہے تمہاری۔"

"نہیں ایسی بات نہیں ہے، پہلے ہی اتنے سوٹ پڑے ہیں۔ میرے اپنے نکاح کا جوڑا ہے۔ ابھی گلشن آنٹی کی بیٹی کی شادی میں بنوایا تھا۔ وہ سوٹ بھی ہے اور بھی ہیں بہت سے۔" ایشال نے عام سے لہجے میں جواب دیا۔ نمرہ آپی نے حیرت سے اپنی چھوٹی بہن کو دیکھا جو شاپنگ کی شوقین تھی۔ بچپن سے شوق تھا اسے۔ ہر فنکشن پر نئے کپڑے جوتے چاہیے ہوتے تھے۔ جس پر امی سے ہمیشہ ڈانٹ پڑا کرتی تھی۔

"سورج کہاں سے نکلا ہے آج... خیر تو ہے کیا ہوا۔ کل سے دیکھ رہی ہوں منہ پھلا رکھا ہے۔ چلو شاباش بتاؤ جلدی سے کیا بات ہے۔" نمرہ آپی حیران تھیں۔ اسی لیے اسے اکسایا تاکہ وہ اپنی پریشانی بتائے۔

"بات تو کوئی نہیں ہے بس مجھے لگتا ہے میں بہت فضول خرچ ہو گئی ہوں۔"

"اور یہ کس نے کہا؟" وہ ٹھٹکیں۔

"کسی نے نہیں بس احساس ہوا ہے کہ امی ٹھیک کہتی ہیں' پیسہ بڑی محنت سے کمایا جاتا ہے اس کی قدر کرنی چاہیے۔ اپنی پہلی تنخواہ میں ایک ہی دن میں خرچ کر آئی تھی۔ پھر جب امی کو ضرورت پڑی تو میرے پاس انہیں دینے کے لیے پیسے نہیں تھے۔ اس دن بڑی شرمندگی ہوئی مجھے۔ یہ احساس بھی ہوا کہ اتنی محنت سے کمائے پیسے ایسے ہی اڑا دیے۔ ابو بھی تو کتنی محنت سے کماتے ہیں آپی۔

میں تو صرف تین گھنٹے پڑھاتی ہوں' وہ تو سارا سارا دن ہمارے لیے محنت کرتے ہیں اور میں اتنے مہنگے ڈیزائنر سوٹ لیتی رہی۔ امی کتنی مشکل سے بجٹ چلاتی ہیں وہ بھی میری وجہ سے۔ میں ہمیشہ برانڈڈ چیزوں کے شوق میں زیادہ پیسے مانگا کرتی تھی۔" ایشال اداس ہوئی۔

"اچھا اتنی اداس مت ہو دیر سے ہی سہی سمجھ تو آگئی نا۔ ویسے بھی اللہ تعالیٰ کو فضول خرچی پسند نہیں۔" نمرہ آپی نے مسکراتے ہوئے اسے اپنے ساتھ لگایا۔

"اب میں نے فیصلہ کیا ہے کوئی برانڈڈ جوڑا نہیں لوں گی۔" ایشال کی سوئی وہیں اٹکے دیکھ کر نمرہ آپی کو ہنسی آئی۔

"اچھا اب قسم کھانے کی بھی ضرورت نہیں ہے کبھی عام کپڑے لیتے ہیں کبھی ڈیزائنر لیکن اس کا مطلب یہ نہیں کہ آٹھ دس ہزار والے جوڑے لینا شروع کردو' اپنی حیثیت کے مطابق لینے میں کوئی حرج نہیں ہے۔ میں بھی ایسے ہی کرتی ہوں۔ بس برانڈ کونشیس نہیں ہونا چاہیے کہ یہ نہیں تو کوئی نہیں۔ میرا سوٹ دیکھو یہ عام سا ہے مگر میں نے خود ایسے ڈیزائن کیا ہے کہ اچھا لگ رہا ہے۔" ایشال نے ان کے سوٹ کا جائزہ لیا۔

"واقعی آپی! بہت اچھا لگ رہا ہے۔ آپ نے خود ڈیزائن کیا ہے۔"

"بالکل۔ چلو اب موڈ ٹھیک کرو۔ اور ہاں! جبران سے بات ہوئی تمہاری۔ پھپھو کہہ رہی تھیں! ان کا آنا کنفرم نہیں ہے۔" ایشال نے نفی میں سرہلایا۔

"میری بات نہیں ہوئی۔" اب وہ کیا بتاتی کہ یہ ایک اور ہی کہانی تھی۔

✡ ✡ ✡

"فرح اور فاریہ خود بھی کھانے بیٹھ گئی ہوں گی۔ اتنا نہیں ہوا کہ ہمیں بھی پوچھ لیتیں۔"

"بھوک لگی ہے تو میں لے آتی ہوں۔" ایشال نے دلہن بنی سحر سے پوچھا۔ سحر نے ڈل گولڈ کے ساتھ ریڈ کے خوب صورت کامبینیشن کا غرارا پہنا ہوا تھا۔ میک اپ نے خوب صورت نقوش کو اور بھی نکھار دیا تھا۔

"نہیں رہنے دو' بعد میں ہم دونوں چینج کرکے کھائیں گے اور یہ تم مجھے گھور کیوں رہی ہو۔ میک اپ زیادہ تو نہیں ہوگیا۔ منع بھی کیا تھا ہیوی میک اپ نہ کرے۔" ایشال کو اپنی طرف دیکھتے پاکر سحر کو تشویش ہوئی۔ اسے میک اپ کی ہی فکر لگی ہوئی تھی۔ نکاح سے پہلے تک مسلسل یہی پوچھتی رہی کہ کہیں اوور تو نہیں لگ رہی۔ نکاح کی تقریب گھر میں منعقد کی گئی تھی۔ چند قریبی لوگ ہی مدعو تھے۔ نکاح کی رسم فوراً ہی ادا کردی گئی تھی۔ پھر سحر اور احمر کو بٹھا کر تصاویر لی گئیں اور اب کھانا کھلایا جارہا تھا۔

"گھور نہیں رہی' دیکھ رہی ہوں۔ تم بہت پیاری لگ رہی ہو ماشاءاللہ۔" ایشال نے اپنی ٹھوڑی کے نیچے ہاتھ رکھ کر بغور اسے دیکھا سحر جھینپی۔

"تم بھی کم نہیں لگ رہیں اور جبران بھائی بھی تو آئے ہیں' ان کی نظریں تو تمہارا ہی طواف کررہی ہوں گی۔" سحر نے بھی اسے چھیڑا۔ ایشال نے لب بھینچ لیے نکاح سے ایک دن پہلے رات کی فلائٹ سے جبران پہنچا تھا۔ ایشال کی اس سے کوئی بات نہیں ہوئی تھی۔ بلکہ آج محض اسے دور سے دیکھا تھا —— نہ اس نے ایشال سے کوئی بات کرنے کی کوشش کی تھی۔ ایک بار سنجیدہ سی نظر ڈال کر نگاہ پھیر لی تھی۔ ایشال اس کے رویے سے بہت ہرٹ ہوئی تھی اور اس سے بات نہ

کرنے کا ارادہ بھی کر لیا تھا۔ ایشال نے سر جھکا۔

"کیا ہوا؟" سحر نے اس کے سنجیدہ تاثرات نوٹ کیے۔ ایشال اٹھ کر سحر کے قریب آئی۔

"سحر آئی ایم سوری۔"

"ایسے کیوں کہہ رہی ہو؟" سحر نے اس کا ہاتھ پکڑ کر اپنے ساتھ بٹھایا۔

"تمہیں معلوم ہے۔ میں نے احمر سے جھوٹ بولا تمہارے متعلق۔" ایشال نے نظریں جھکاتے ہوئے کہا۔ آج وہ فیصلہ کر کے آئی تھی کہ سحر کو سب بتا دے گی۔ اس کے بے چین دل کو اسی طرح قرار آسکتا تھا۔ سحر نے گہرا سانس لیا بولی کچھ نہیں، وہ ایشال کو سننا چاہتی تھی۔

"سچ تو یہ ہے کہ پھپھو کے منہ سے اپنی برائیاں اور تمہاری خوبیاں سن کر میں تم سے جیلس ہو گئی تھی۔ پھپھو ہمیشہ مجھ سے پیار اور لاڈ سے ملتی تھیں۔ مگر اچانک سے ان کے رویے کا بدلنا وہ بھی اس لیے کہ وہ تم سے متاثر ہوئی تھیں۔ مجھ سے برداشت نہیں ہوا۔ ایسے میں احمر نے پھپھو کے رشتہ لے کر جانے کا بتایا تو بس میرے منہ سے نکل گیا اور میں نے ایک کہانی بنا کر اسے سنا دی۔ بعد میں بہت پچھتائی... دل پر بوجھ سا آپڑا تھا۔

پھر جب مجھے پتا چلا تم سب جانتی ہو اور مجھ سے نہ لڑیں نہ کوئی بات کی بلکہ یہ احساس بھی نہیں ہونے دیا کہ تم سب جانتی ہو تو میں اس قدر شرمندہ ہوئی۔ دل چاہتا تھا زمین پھٹے اور میں اس میں سما جاؤں اور تو اور تم نے احمر کو بھی سچائی نہیں بتائی۔" اس کی آنکھوں میں نمی جھلملاتے دیکھ کر سحر بول پڑی۔

"اچھا بس کرو نا۔ اتنی پیاری لگ رہی ہو، سارا میک اپ خراب کر لو گی۔ مجھے پتا تھا جو بھی بات ہو گی تم خود بتا دو گی بھلا مجھ سے چھپا سکتی ہو کچھ۔ جہاں تک احمر کی بات ہے اسے کیوں بتاتی میں۔ ہمارا ساتھ کوئی دو دن کا تھوڑی ہے بچپن کی دوستی ہے۔ پھر میں کیوں نہ پردہ رکھتی۔ بات تو ہمارے درمیان ہی ہونی چاہیے تھی۔"

"تم ناراض تو نہیں ہو نا۔" ایشال نے اپنی انگلی سے آنکھوں کی نمی صاف کرتے ہوئے پوچھا۔

"دوستی میں کیسا سوری۔ ایک بات تھی ختم ہو گئی۔" سحر مسکرا کر اس کے ساتھ لگی۔ "اچھا جاؤ میک اپ اچھا لگ رہا ہے۔ پہلی بار ایسا میک اپ کرایا ہے عجیب ہی لگ رہا ہے۔" سحر کو پھر سے فکر ہوئی۔

"میرا خیال ہے احمر کو جچتی ہوں، وہی بتائے گا۔" سحر کی میک اپ کی تکرار سن سن کر تینوں کزنز ہی اکتا چکی تھیں۔

"یہ مطلب نہیں تھا میرا۔ تم لوگ جو بار بار گھورتے ہو اسی لیے کونشس ہو رہی ہوں۔" سحر تلملائی۔

"ارے واہ ہم کوئی احمر ہیں جو گھوریں گے۔ اسی کی نظر تم پر سے نہیں ہٹ رہی تھی۔ اتنا چھیڑا ہم نے اسے مگر وہ بھی اپنے نام کا ایک ہی ہے۔" ایشال محظوظ ہوئی۔

"ہاں تو کیوں نہ دیکھیں۔ اب میرے علاوہ کسی اور کو دیکھنا بھی نہیں چاہیے۔" ایشال نے خوشی سے اتراتی سحر کو دیکھا اس روپ میں دھیمی سی مسکراہٹ کے ساتھ وہ اور بھی پیاری لگ رہی تھی۔

"جبران بھائی بھی تو تمہیں ہی دیکھ رہے ہوں گے۔" ایشال کے چہرے سے مسکراہٹ غائب ہوئی۔ "جبران بھائی کے ذکر پر سنجیدہ کیوں ہو جاتی ہو۔ لڑائی ہوئی ہے؟" سحر نے کریدا۔ ایشال نے مختصر لفظوں میں اپنی اور جبران کی گفتگو کے بارے میں بتایا۔ سحر نے اپنا سر پیٹ لیا۔

"ان کو بتانے کی کیا ضرورت تھی۔ ہماری آپس کی بات تھی انہیں کیوں بتایا۔"

"میں اپ سیٹ تھی پھر تم سے بھی تو کچھ نہیں کہہ سکی تھی۔ ایسے میں فون آگیا بس کہہ دیا میں نے۔ چھوڑو تم ہمیں بھی مری نہیں جا رہی اس سے بات کرنے کو نہ کرے میری بلا سے۔"

"میں بات کروں گی جبران بھائی سے۔"

"بالکل نہیں... چھوڑو اس قصے کو۔ میں ذرا

دیکھوں یہ فرح اور فاریہ وہیں ٹک گئی ہیں۔ لگتا ہے ساری دیگوں کا خاتمہ کر کے ہی آئیں گی۔" ایشال اٹھ کھڑی ہوئی۔

"ہاں پتا کرو یہ لوگ کھانا کھا کر کب جائیں گے اب تو بھوک سے حالت خراب ہو رہی ہے۔ بی بی جی تو ہو سکتا ہے جلدی آنا۔" سحر نے التجا کی۔ صبح اس نے ٹھیک سے ناشتا بھی نہیں کیا تھا۔ اب بھوک اور تھکن دونوں ہی حملہ آور ہو چکی تھیں۔ ایشال تسلی دیتی کمرے سے نکل گئی۔

☼ ☼ ☼

سامنے سے آتے جبران کو دیکھ کر اس نے بے نیازی سے گزر جانا چاہا۔ جبران اس کے سامنے جم کر کھڑا ہو گیا۔ ایشال نے سائیڈ سے نکلنا چاہا مگر وہ راستہ دیتا تب نا۔ تنگ آ کر وہ اس سے مخاطب ہوئی۔

"راستہ چھوڑیں میرا۔"

"اگر نہ چھوڑوں؟" جبران نے اپنے سینے کے گرد ہاتھ باندھتے ہوئے پُرشوق نظروں سے خفا سی ایشال کو دیکھا۔ بلیک اور سلور امتزاج کے سوٹ میں ہلکے میک اپ کے ساتھ وہ نظر لگ جانے کی حد تک خوب صورت لگ رہی تھی۔ اس کی خفگی بھری آنکھوں میں دیکھتے جبران کو اپنا دل ڈوب کر ابھرتا محسوس ہوا تھا۔

"مجھے کوئی بات نہیں کرنی۔ جائیں یہاں سے۔" ایشال یہاں سے غائب ہونے کے لیے پر تول رہی تھی لیکن وہ اس کے راستے میں حائل تھا۔

"مجھے تو کرنی ہے۔" جبران کے چہرے پر مسکراہٹ آ گئی۔

"ٹھیک ہے پھر میں ہی چلی جاتی ہوں۔" ایشال جانے کے لیے مڑی تھی۔ مگر اس سے پہلے کہ وہ واپس جاتی جبران نے فوراً اس کی کلائی تھام لی۔ ایشال جھٹکے سے مڑی اس نے چھڑانے کی کوشش کی پر دوسری طرف گرفت سخت تھی۔

"آپ میرے ساتھ زبردستی نہیں کر سکتے۔ کوئی بات نہیں سننی مجھے۔" ایشال تنگ آ کر بولی۔ جبران محظوظ ہوا۔ ناراضی میں وہ آپ جناب پر آ گئی تھی۔

"کیوں نہیں کر سکتا بالکل کر سکتا ہوں۔ بات تو سننی ہی پڑے گی۔ ایسے تو یہاں سے ہلنے نہیں دوں گا۔" ایشال نے ناگواری سے اسے گھورا۔

"کیا مسئلہ ہے؟" جبران نے شکر کیا آخر وہ بات کرنے پر راضی تو ہوئی چاہے ناراضی سے ہی سہی۔

"آئی ایم سوری۔ مجھے احساس ہے تمہاری ناراضی کا۔ تم ہرٹ ہوئی ہو۔ اس دن میں واقعی بہت روڈ ہو گیا تھا۔"

"کوئی بات نہیں کرنی مجھے اس دن کی۔ میری طرف سے ناراض ہی رہیں مجھے کوئی فرق نہیں پڑتا۔" ایشال نے منہ پھیرا۔

"میری طرف دیکھ کر کہو کہ فرق نہیں پڑتا۔" جبران نے نرمی سے اس کی ٹھوڑی پکڑ کر چہرہ اپنی طرف موڑا۔ ایشال زیادہ دیر اس کی طرف دیکھ نہیں سکی۔ نظریں جھکا گئی۔

"یہ کیا شرافت ہے دن دھاڑے میری بھابھی کو چھیڑ رہے ہو۔" پیچھے سے آتی احمر کی آواز پر جبران نے اپنا ہاتھ ہٹایا۔ وہ تیزی سے مڑا۔ دوسرے ہاتھ میں ابھی بھی ایشال کی کلائی تھام رکھی تھی۔ ایشال کا چہرہ شرم کے احساس سے سرخ ہو گیا۔ اس نے کلائی کھینچنے کی کوشش کی مگر جبران کا ایسا کوئی ارادہ نہیں تھا۔ ایشال دل مسوس کر رہ گئی۔ نظریں مزید جھک گئیں۔

"زیادہ اوور ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔ وہ سامنے والے کمرے میں تمہاری بیوی موجود ہے، جا کر ملاقات کر لو۔" جبران نے اسے یہاں سے بھیجنے کے لیے کہا۔ احمر کی باچھیں کھل گئیں۔

"اچھا.... میں ایشال سے یہی کہنے آ رہا تھا۔ کوئی ملاقات ہی کرا دے۔"

"ٹھیک بیٹا... شکریہ بعد میں ادا کرنا۔ فی الحال یہاں سے کٹو۔" احمر خوش ہوتا چلا گیا۔

"یہ کیا کیا سحر ناراض ہوگی۔" ایشال نے احمر کو جاتے دیکھ کر پریشانی سے کہا۔ احمر دستک دے رہا تھا۔

"بہت خوش ہوگی اچھا ہے چند باتیں ہی کرے گی

تم ان کی فکر چھوڑو اپنی اور میری بات کرو۔ اب مان بھی جاؤ۔ تمہیں پتا تو ہے احمر مجھے کس قدر عزیز ہے۔ اور پھر بات بھی اس کے دل کی خوشی کی تھی۔ غصہ آگیا تھا اسی لیے۔"

"بس بھائی کی پروا ہے اور کسی کی نہیں۔" ایشال کے لبوں پر شکوہ مچلا۔ جبران بھرپور انداز میں مسکرایا اور گہری نظروں سے اسے دیکھا۔

"پروا ہے تب ہی تو اتنی دیر سے کھڑا منانے کی کوشش کررہا ہوں۔" اسی وقت فرح اور فاریہ کھنکھارتی ہوئی آئی تھیں۔

"یہاں کیا راز و نیاز چل رہے ہیں۔"

"یار مسئلہ کیا ہے؟ ہر تھوڑی دیر بعد کوئی نہ کوئی نازل ہوجاتا ہے۔" جبران نے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے آہستہ آواز میں کہا۔ جو صرف ایشال ہی سن پائی۔ وہ مسکراہٹ دبائی دونوں کی طرف متوجہ ہوئی۔

"تم لوگوں کو کسی نے بتایا نہیں جب میاں بیوی بات کررہے ہوں تو بیچ میں نہیں بولتے۔ پھر ہم تو پرانے ہوگئے ہیں۔ تم دونوں سامنے والے کمرے میں چھاپا مارو۔ وہاں نیولی میرڈ کپل تم لوگوں کی ناک کے نیچے ملاقات کررہا ہے۔ جاؤ جاکر بھاری سانیگ لو اپنے احمر بھائی سے۔" جبران نے مزے سے مشورہ دیا۔

"مشورہ تو آپ کا بہت اچھا ہے۔ چلیں آپ انجوائے کریں ہم ذرا دھاوا بولتے ہیں جاکر۔" دونوں محظوظ ہوتی ہوئی چلی گئیں۔

"اب احمر کی شامت آنے والی ہے۔" ایشال بھی جبران کے ساتھ ہنسی تھی۔

"سچ میں ہنستی ہوئی تم اور بھی خوب صورت لگتی ہو۔" جبران نے دھیمے لہجے میں کہا۔

"اور جو غصہ دلاتے ہو وہ۔" ایشال بھی مسکرائی تھی۔

"میرا کیا قصور تم ہر روپ میں ہی پیاری لگتی ہو۔ ہر بار دل کے زیادہ قریب محسوس ہوتی ہو۔" جبران کے محبت سے کہنے پر ایشال جھینپ کر پیچھے ہوئی۔

"دیکھ لو پھر مانتی ہو نا کتنی محبت سے منایا ہے تمہیں۔ وہ تمہاری دوست کا منگیتر وہ بھی اسے ایسے نہیں منا سکتا۔" جبران شرارتی انداز میں اس کی طرف جھکا۔ ایشال نے اسے پیچھے دھکیلا۔

"زیادہ اپنی تعریفیں کرنے کی ضرورت نہیں ہے میں ہوں ہی اتنی اچھی جو اتنی جلدی مان گئی بغیر کوئی فرمائش کیے۔"

"اچھی تو تم ہو اس بات سے تو میں انکاری ہو ہی نہیں سکتا۔ پر منانا مجھے بھی آتا ہے۔ اگر ایسے نہیں مانتیں تو میں وہ کیا نام ہے تمہارے ڈیزائنر زکا۔ ہاں وہ میرا جی گل خان سفینہ ہٹنا وغیرہ۔ ان کے سوٹ لاتا میں۔ بس پرفیکٹ سے مان جانا تھا تم نے۔" جبران کے بولنے پر ایشال کھلکھلا کر ہنسی تھی۔ بمشکل ہنسی روک کر بولی۔

"نام تو پہلے ٹھیک سے یاد کرلو۔"

"نہیں! اسیر ہسلی یہ نام نہیں تھے؟" جبران کے سنجیدگی سے کہنے پر ایشال کو ہنسی آرہی تھی۔ "جو بھی ہوں۔ تم بس ایسے ہنستی رہو اور میں تمام عمر تمہیں یوں ہی دیکھتا رہوں۔" جبران کا خوبصورت لہجہ ایشال کے دل میں بہت سے پھول کھلا گیا تھا۔ زندگی اس کے سنگ یوں ہی ہنستے مسکراتے گزرنے والی تھی۔

ثناعمران

اک دیا انتظار

کوئل کی سریلی کوکو۔۔۔
چڑیوں کی چہچہاہٹ۔۔۔
صحن میں لگے جامن کے پیڑ کے نیچے بچھا تخت۔۔۔
اور اس پر لیٹی پیڑ کی ڈالیوں کو دیکھتی شاہ بخت۔۔۔

نام تو نصیبوں والا اور قسمت۔۔۔ ہک ہاہ۔۔۔ اس نے ٹھنڈی سانس بھری۔۔۔ نصیب پر شاید گہرے رنگ کی سیاہی پھر گئی ہے۔۔۔ جامن کے رنگ کی طرح پکے رنگ کی لڑکی ہو تو قسمت "شاہ" نہیں۔۔۔ "سیاہ" ہو جاتی ہے۔

وہ "رانی نہیں نوکرانی ہو جاتی ہے۔" ایسی رانی جس پر دنیا اور لوگوں کی تیز دھار زبانوں کی نوکیں، چبھتی رہتی ہیں اسے زخم زخم کرتی ہیں۔ داغ دار کرتی ہیں۔ چرکے لگاتی ہیں۔۔۔ طعنے دیتی ہیں۔۔۔ مذاق اڑاتی ہیں۔

کو۔۔۔ کو۔۔۔ کوئل کی دلکش آواز نے اسے سوچوں کی دنیا سے نکالا۔

"یہ کوئل بھی تو کالی ہے۔۔۔ لیکن سب اس کی خوب صورت آواز کو پسند کرتے ہیں۔ آواز تو میری بھی اچھی ہے۔۔۔ لیکن سب مجھے رنگت کے سبب ناپسند کرتے ہیں۔" خود ترسی اور حسرت سے کوئل کو دیکھ کر سوچا۔

ہوا چلی۔۔۔ پتے سرسرائے۔۔۔ یہ جامن کا درخت بھی بغیر جامنوں کے کیسے آدھا ادھورا، بے رونق اور نامکمل لگتا ہے، کب اس پر تازہ، رسیلی، مزے دار جامنیں آئیں گی۔ میرے دل کی طرح ویران لگتا ہے۔ سوچیں بھٹک رہی تھیں۔

"بے موسم، پھل نہیں لگتا۔۔۔ وقت آئے گا تو کونپلیں پھوٹیں گی، خوشبو بکھرے گی۔۔۔ پھل لگے گا۔" اس کے دل نے سرگوشی کی۔ وہ روز جامن کے نیچے بچھے تخت پر لیٹ کر پیڑ کو دیکھتی، سوچتی۔۔۔ اسے موسم کا انتظار تھا جب جامن کے پھل سے لطف اندوز ہوگی۔

"اری او شاہ بخت! میں بازار جا رہی ہوں، کچھ سودا سلف لینا ہے۔ کل کے مہمانوں کے لیے کچھ اسپیشل بنا لینا۔۔۔ کیا پتا اس دفعہ تیری قسمت کھل جائے۔" اماں نے چادر سر پر ڈالتے ہوئے اسے سوچوں کے دریا سے نکالا۔

"اسپیشل بنا لینے سے۔۔۔ میں خود اسپیشل نہیں ہو جاؤں گی۔" اماں نے اسے گھورا۔

"دودھ دلاری بنا کر رکھ لینا۔۔۔ ساتھ میں شامی کباب، ویجیٹبل رول، آلو کے سموسے۔۔۔" انہوں نے جاتے جاتے اپنا مینیو بتایا۔

"ایک تو ہماری اماں۔۔۔ ان کی خاطر داریاں اور امیدیں۔۔۔ بھلا بتاؤ! دودھ دلاری بنانے سے میں مہمانوں کی راج دلاری بن جاؤں گی۔ بھلا رہوں گی تو وہی سیاہ بخت!" اس نے صحن میں لگے آئینے میں اپنا چہرہ دیکھ کر خود ہی مذاق اڑایا۔ پھر اچانک نظر پڑوس میں منڈیر سے جھانکتے چہرے پر پڑی تو حلق تک میں کڑواہٹ گھل گئی۔

جب سے اس مکان میں نئے لوگ شفٹ ہوئے تھے اور اس کی عزیز از جان اکلوتی سہیلی نے یہاں سے ہجرت کی تھی۔ اس کا مزاج برہم رہتا تھا۔ جیسے قصور ان نئے لوگوں کا ہو۔ اس نے ایک کٹیلی نگاہ اس چہرے پر ڈالی۔ جو دن میں چار بار صحن میں جھانکنا اپنا فرض سمجھتا تھا۔

"ہوتا نا میرا کوئی بھائی۔ تو اب تک ٹانگیں توڑ چکا ہوتا تمہاری۔" وہ بڑبڑاتی ہوئی کچن کی طرف بڑھ گئی۔ اس سے بڑی دو بہنیں اور اس سے چھوٹی ایک بہن کی شادی ہو چکی تھی۔ تینوں بہنوں کی رنگت صاف تھی سوائے اس کے۔ اور بیسیوں رشتے صرف اس کی رنگت کی وجہ سے اسے مسترد کر چکے تھے۔ یہ رشتے، رشتہ کرانے والی کے توسط سے آئے تھے اور اب بھی آ رہے تھے اور اماں "پیوستہ رہ شجر سے امید بہار رکھ" کے مصداق ان رشتے کے لیے آنے والوں کی خوب خاطر تواضع کرتی تھیں۔ جبکہ وہ بار بار ٹھکرائے جانے کی وجہ سے بے پناہ حساس اور تلخ مزاج ہو گئی تھی۔ اب تو اسے اپنا نام بھی برا لگنے لگا تھا۔

"اماں! کیا ضرورت تھی یہ لڑکوں والا نام رکھنے کی، اور اوپر سے مطلب تو دیکھو، بادشاہوں والا نصیب۔ میرا مقدر تو کھوٹے سکے کی طرح ہے۔" ایک دن اس نے اماں سے کہا۔

"شاہ بخت! شکر ادا کیا کر۔ جوان، صحت مند ہے۔ خدانخواستہ معذور نہیں ہے۔ کوئی بیماری نہیں ہے۔ رنگت اور نصیب اللہ کی دین ہے۔ مقدر تیرا اب بھی اچھا ہے، آگے بھی اچھا ہوگا، اس بات پر یقین رکھ، مایوس، بدگمان مت ہو اور ناشکری کے کلمات منہ سے مت نکال اور نام تیرا ہم نے پہلے سے سوچا ہوا تھا۔ تمہارے ابو کو بیٹے کی چاہت تھی۔ اب اللہ نے نعمت دی یا رحمت، اس کی مرضی۔ نام جو سوچا تھا تمہارے ابا نے، وہی رکھ لیا! کیا برائی ہے نام میں۔۔۔؟"

"اُفوہ۔۔۔ اماں کا لیکچر۔۔۔" اس کی نظریں جامن کے پیڑ پر بھٹک رہی تھیں۔

اور پھر موسم سرما گزرا۔ پیڑ کے خزاں رسیدہ سوکھے پتے صحن میں گرتے، وہ انہیں صاف کرتی اور اسے اپنا آپ ان خزاں رسیدہ سوکھے پتوں کی طرح لگتا جنہیں لوگ اپنے پیروں تلے کچل کر چلے جاتے تھے۔ آمد بہار۔۔۔ پیڑ پر لگے نئے پتے۔۔۔ چھوٹی کونپلیں، کھلے پھول، مگر اس کا نصیب سویا ہوا تھا۔ بہار بھی گزر گئی۔۔۔ رشتے والے آتے رہے۔۔۔ جاتے رہے۔

☼ ☼ ☼

آگ برساتا سورج۔۔۔ جھلتے پتے۔۔۔ کچا پھل۔۔۔

شام کو وہ صحن میں پانی کا چھڑکاؤ کرتی۔ اپنے ننگی ساتھی، دوست جامن کے پیڑ کے نیچے بچھے تخت پر بیٹھ کر ٹھنڈی سکنجبین سے لطف اندوز ہوتی تو کبھی ٹھنڈی ٹھار لسی۔۔۔ کبھی تربوز کا شربت تو کبھی فالسے کا کھٹا میٹھا شربت۔۔۔ بہنیں اس کے لیے مختلف ڈائجسٹ لاتیں۔۔۔ جن کے آخر میں بیوٹی گائیڈ، رنگت نکھارنے کے طریقے ہوتے۔۔۔ کھانا پکانے کی نت نئی تراکیب۔۔۔ پہلے پہل دلچسپی سے سب پر عمل کرتی تھی۔ اب ان کے مشوروں سے بےزار ہو جاتی۔

"کوئی فائدہ نہیں۔" وہ بہنوں سے کہتی۔ نقوش میں جاذبیت تھی اور جب کوئی ترکیب رسالے سے پڑھ کر چہرے پر لگاتی تو رنگت میں نکھار بھی پیدا ہو جاتا۔۔۔ لیکن کچھ دنوں بعد چھوڑ دیتی۔ اب اکثر شام کو وہ تخت پر نیم دراز ان رسالوں کی ورق گردانی کرتی رہتی۔ گریجویشن کر چکی تھی۔۔۔ اور کافی عرصے سے گھرداری میں مصروف تھی کیونکہ اماں کی صحت ان کو کام کی اجازت نہیں دیتی تھی۔

کچھ عرصے سے وہ شناسا اجنبی چہرہ بھی غائب ہو چکا تھا۔ کچھ خلا سا پیدا ہو گیا تھا کیونکہ عادت ہو گئی تھی۔ اس چہرے کو دیکھنے کی؟ ارے نہیں۔۔۔ اس چہرے کو کوسنے کی۔۔۔

"اللہ رے تیری شان! اس مرد کو گوری رنگت دے دی اور جو مجھ کم نصیب کو ذرا سی صاف رنگت دے دیتا تو دنیا والوں کی تمسخرانہ نگاہوں سے تو بچ جاتی۔ پھیکا شلجم! جب وہ جامن کے پتوں سے چھیڑ چھاڑ کرتا جوان کی چھت تک جاتے تھے تو وہ جل کر خاک ہو جاتی۔۔۔ جیسے پیڑ، پتوں، جامنوں پر صرف اس کا حق ہے۔۔۔ ایسا لگتا تھا وہ اس کی غصے بھری نگاہوں سے لطف اندوز ہوتا ہے اور رشتے کے لیے آنے جانے والے مہمانوں کو تو ضرور ایک دفعہ جھانک کر دیکھتا۔۔۔"

"میری کم مائیگی۔۔۔ کم نصیبی کا مذاق اڑاتا ہے۔۔۔ پھیکا شلجم! اپنے آپ کو پتا نہیں کیا سمجھتا ہے جیسے کسی فلم کا ہیرو ہو۔ ان لڑکوں کی فرمائشوں کی وجہ سے تو کم صورت لڑکیوں کے رشتے نہیں ہو رہے۔۔۔ ذرا سی موٹی۔۔۔ ذرا سی چھوٹی۔۔۔ ذرا سی سانولی ہو تو ان کی اماں بہنیں ریجیکٹ کرکے چلی جاتی ہیں۔ انہیں بیوی چاہیے تو کترینہ کیف جیسی۔۔۔" سارا غصہ اس لڑکے کی رنگت کی وجہ سے 'اس پر نکلتا' جیسے سب چیزوں کا قصوروار وہی ہو۔۔۔ شاہ بخت کو لگتا وہ نظروں ہی نظروں میں اس کا مذاق اڑاتا ہے۔ اس کا تماشا دیکھتا ہے۔

"اللہ کرے اسے موٹی' بھدی' سانولی بیوی ملے۔۔۔" ایک دن اس نے جامن کے پیڑ کی ڈال ہلائی تو بہت ساری جامنیں اس کی گود میں آگریں۔۔۔ تب اس نے یہ بددعا بہت جل کر' کلس کر دی تھی۔

ہاں بعد میں ان رسیلی جامنوں کو مزے لے لے کر کھایا تھا۔۔۔ بھلا جامنوں سے کیسی دشمنی۔۔۔ اچھا خاصا ہینڈسم لڑکا تھا۔ اب کافی عرصے بعد وہ چہرہ دوبارہ نظر آیا تھا۔۔۔ کچھ بجھا بجھا' پریشان سا۔۔۔

"اماں! یہ پڑوس کا لڑکا چھت سے جھانکتا ہے' آپ نے ڈانٹا نہیں اسے۔۔۔" ایک دن اماں سے کہا۔

"ہائیں۔۔۔ بے چارہ شریف لڑکا۔۔۔ چھت پر طوطے رکھے ہوئے ہیں' انہیں دانہ پانی ڈالنے آتا ہے۔ ان ہی کو دیکھتا ہے۔۔۔ اسے کیا ضرورت پڑی ہے ہمارے گھر جھانکنے کی؟"

"اف! اماں کی سادہ دلی۔

"شریف لوگ ہیں' اکلوتا بیٹا ہے۔۔۔ لیکن بے چارے کا کہیں رشتہ نہیں ہو رہا۔۔۔ تھوڑا سا ہکلا کر بولتا ہے۔۔۔ زیادہ نہیں۔۔۔ ایک' دو لفظ دہرا کر بولتا ہے۔۔۔ بس یہ کسی لڑکی والوں کو ہضم نہیں ہوتی۔۔۔ سو ہر جگہ سے انکار ہو جاتا ہے۔" وہ بہت افسوس سے بتا رہی تھیں۔

"اس کی والدہ بیمار تھیں۔ خیریت پوچھنے گئی تھی' تب انہوں نے مجھے یہ سب باتیں بتائیں۔"

"ایکسیڈنٹ ہوا تھا اس کا۔۔۔ دماغ پر چوٹ آئی تھی۔ جب سے یہ حالت ہے۔" اماں بولیں۔۔۔

"ہائیں۔۔۔ میں تو سوچ رہی تھی ایک میں ہی ہوں جس پر یہ سب بیت رہا ہے۔ یہ لڑکا بھی۔۔۔ اچھی شکل و صورت اور بار بار انکار۔۔۔" شاہ بخت کو اپنی سوچ پر افسوس ہوا۔ جو وہ اس لڑکے کے بارے میں اندازے لگاتی تھی۔

"یہ بھی میری طرح بے چارہ ہے۔۔۔" ہمدردی امڈ آئی۔

☼ ☼ ☼

گرمیوں کی طویل گرم دوپہریں اور سہانی شامیں' پھل پک کر تیار ہو چکا تھا۔۔۔ رسیلی' میٹھی' مزے دار جامنیں۔۔۔ کبھی ساون تو کبھی ابر تو کبھی گرم سورج۔۔۔ تخت پر بیٹھی وہ رسالے میں گم تھی۔ خوب صورت' طرح دار۔۔۔ نازک اندام دودھ اور گلابوں جیسی رنگت والی ہیروئنیں۔۔۔ اس کا دل جل کر خاک ہونے لگا۔۔۔ اچانک بہت سی جامنیں اس کی گود میں آ گریں۔۔۔ اس نے نظر اٹھائی۔۔۔ پھیکا شلجم کھڑا تھا۔ اس کو اس دفعہ غصہ نہیں آیا۔

"بے چارہ۔۔۔"

"س۔۔۔ سوری۔۔۔ میں بب بلی کو بھگا رہا تھا۔ وہ طوطوں کو تنگ کر رہی تھی۔ اسی چکر میں اسے کنکر مارا تو اس کے کودنے سے آپ پر جج جامنیں آگریں۔۔۔" اس نے معذرت کی۔

"کوئی بات نہیں۔۔۔" اس نے بے نیازی دکھائی۔

"آپ کو کھانی ہیں تو پیڑ پر سے جامنیں اتار لیجیے گا۔" ایک اور نوازش۔۔۔ وہ ہکا بکا کھڑا تھا۔ اس نے اس کے ہکلا کر بولنے پر نہ تو ہنسی اڑائی تھی' استہزائیہ ہنسی جو اکثر اس کے بولنے پر لوگوں کے چہروں پر آجاتی تھی۔ نہ حیرت کا اظہار کیا تھا۔

کچھ دن بعد پڑوس سے اس کا رشتہ آیا تھا۔ اسی لڑکے حارث کا۔۔۔ اس کی والدہ آئی تھیں۔ وہ حیران ہوئی' اس کی حیرانی دیکھ کر اماں نے کہا۔

”بیٹا جہاں بیری ہو وہاں پتھر تو آتے ہی ہیں۔“

”لیکن ہمارے گھر جامن کا پیڑ ہے۔ اور پتھر مارنے سے رسیلی‘ پکی‘ تازہ‘ مزے دار جامنیں گرتی ہیں۔“ وہ سوچ کر مسکرائی۔

”مجھے حارث پسند ہے۔ اپنا جنرل اسٹور ہے‘ اچھا کماتا ہے۔ تھوڑی سی کمی خدا کی دین ہے‘ ایسی نہیں کہ اسے انکار کردیا جائے۔“ اماں نے اپنا خیال ظاہر کیا۔

”اور کمی تو مجھ میں بھی ہے۔“ اس نے سوچا۔ یہ کمی زمانے والوں کی نظر میں تھی۔ ورنہ اللہ نے مکمل بنایا تھا اور ہر انسان کو بہترین صورت سے نوازا ہے۔ مختلف صلاحیتوں کے ساتھ۔

✲ ✲ ✲

شاہ بخت نے ہاں کردی۔ جامنیں پک چکی تھیں۔ اس کے انتظار کا موسم ختم ہوگیا تھا۔ وقت مقررہ سے پہلے پھل نہیں پکتا۔ وقت آیا تو کونپلیں پھوٹیں۔ پھول کھلے۔ خوشبو بکھری۔ تازہ رس بھرا پھل آیا۔

”وقت سے پہلے اور نصیب سے زیادہ کسی کو نہیں ملتا۔“ اب چاہے تو اس وقت‘ اس انتظار کو صبرو شکر سے گزارا جائے‘ چاہے تو شکوہ‘ شکایت‘ مایوس ہو کر۔ یہ انسان پر منحصر ہے۔

منگنی کے فنکشن میں دونوں کے چہروں پر الوہی چمک اور خوشی تھی۔ اور دونوں کا کپل بے حد خوب صورت لگ رہا تھا۔ اپنے آپ کو جامن کے رنگ کی طرح کہنے والی لڑکی کا بخت۔ ”شاہ“ ہی تھا۔ ”حارث“ کی ہمراہی میں۔ یہ بات مقدر بنانے والے نے بہت پہلے لکھ دی تھی کیونکہ ایک کمی کے سوا وہ ہر لحاظ سے ایک آئیڈیل لڑکا تھا۔

”م م مجھے نہیں پتا تھا کہ تت تم میرے رشتے پر ہاں کردو گی۔ م م مجھے یقین تھا کہ تت تم انکار کردو گی۔“

حارث نے آہستہ سے شاہ بخت سے کہا۔ شاہ بخت نے ساتھ بیٹھے اس وجیہہ اور ہینڈسم لڑکے کو دیکھا‘ جسے دیکھ کر کوئی سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ وہ ہکلا کر بولتا ہے۔

”مجھے بھی کچھ ایسا ہی گمان تھا کہ کہاں تم اور کہاں میں۔“ شاہ بخت نے سوچا‘ لیکن بولی نہیں صرف مسکرادی۔

”دغ غصیلی لڑکی۔ مسکراتے ہوئے تو اور بھی اچھی لگتی ہے۔“ حارث بولا۔

”اور مجھے تو بہت پہلے سے اچھی لگتی تھی۔“ اپنا ایک راز کھولا۔

شاہ بخت کو بے حد حیرانی ہوئی۔ ”کیا کوئی اسے پسند بھی کرسکتا ہے؟“ لیکن حارث کی نگاہوں سے چھلکتے جذبوں نے مہر ثبت کردی کہ وہ سچ کہہ رہا ہے۔

دونوں کے چہروں پر خوشی تھی۔ اطمینان تھا۔

حارث نے اسے بتایا کہ وہ اسپیچ تھراپی کے ذریعے بڑی حد تک اپنی خامی پر جلد ہی قابو پالے گا۔ اس کے سیشن جاری ہیں۔

جامنوں سے محبت کرنے والی۔ تھوڑی کھٹی‘ تھوڑی میٹھی‘ تھوڑی نمکین لڑکی۔ جو اپنے آپ کو جامن جیسی رنگت کا کہتی تھی۔ اسے حارث نے بتایا کہ جامنی رنگت قوت‘ بادشاہت‘ شاہی مرتبہ اور دولت کی علامت ہے اور شاہ بخت ان شاءاللہ اس کے لیے لکی ثابت ہوگی۔ شاہ بخت‘ حارث کی مثبت سوچ‘ اچھی امید اور اپنے نصیب پر حیران تھی اور خدا کے حضور اس کا دل سجدہ ریز تھا اور اپنی ناشکری پر توبہ بھی کررہی تھی۔

”زندگی کے درخت پر نصیب کا پھل اپنے وقت مقررہ پر لگتا ہے۔ بس اک ذرا انتظار‘ صبر‘ شکر‘ یقین کامل‘ دعاؤں کا سرمایہ ہم سفر ہونا چاہیے۔ راستہ سہل ہوجاتا ہے اور دل مطمئن و شاکر۔!“

یہ رمز دیر سے سہی۔ شاہ بخت کی سمجھ میں آگیا تھا۔

نبیلہ عزیز

رات کے بارہ بجے کا وقت تھا۔

ولید' ماورا کے سامنے والے صوفے پہ گم صم اور ساکت سا بیٹھا ماورا سے سنی ہوئی داستان پر یقین کرنے اور نہ کرنے کے بیچ ڈول رہا تھا۔

کیوں کہ جو کچھ وہ بتا چکی تھی' وہ قابل فراموش تو نہیں تھا۔

رضا حیدر... علی مرتضیٰ کے قاتل تھے... عافیہ بیگم اور ماورا مرتضیٰ کے مجرم تھے اور قاتل اور مقتول کی اولادیں محبت میں گرفتار تھیں۔

معاملہ کہاں سے شروع ہوا تھا اور کہاں پہنچا تھا اور آگے کیا ہونے والا تھا' سب عقل اور سمجھ سے باہر کی باتیں تھیں۔ ولید کی پُرسوچ آنکھیں پینپنا رہی تھیں۔

"بتاؤ ولید! میرا ساتھ دوگے؟ مجھے تیمور حیدر واپس چاہیے... ہر حال میں..." ماورا التجا بھی کر رہی تھی تو! یک ضد' ایک ہٹ دھرمی کے ساتھ۔

چونتیسویں قسط

اس کا ذہن بڑی تیزی سے حرکت میں آچکا تھا۔

"اب کیا کیا جائے...؟" اس کی سوچ اور اس کے خیال منتشر ہونے لگے تھے...

وہ کبھی کسی کے بارے میں سوچ رہا تھا اور کبھی کسی کے بارے میں... اور یونہی سوچتے سوچتے اس کی سوچ تیمور
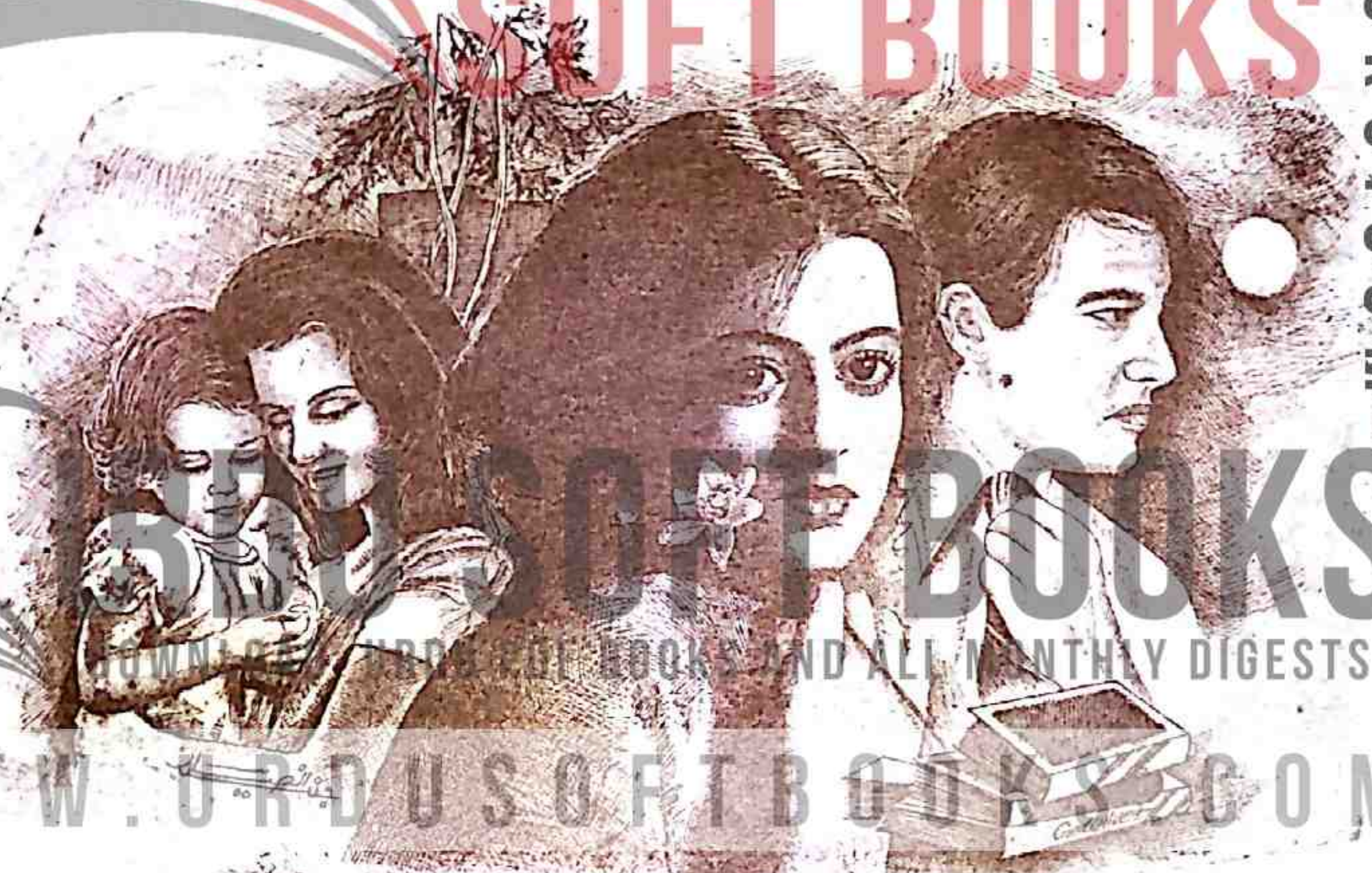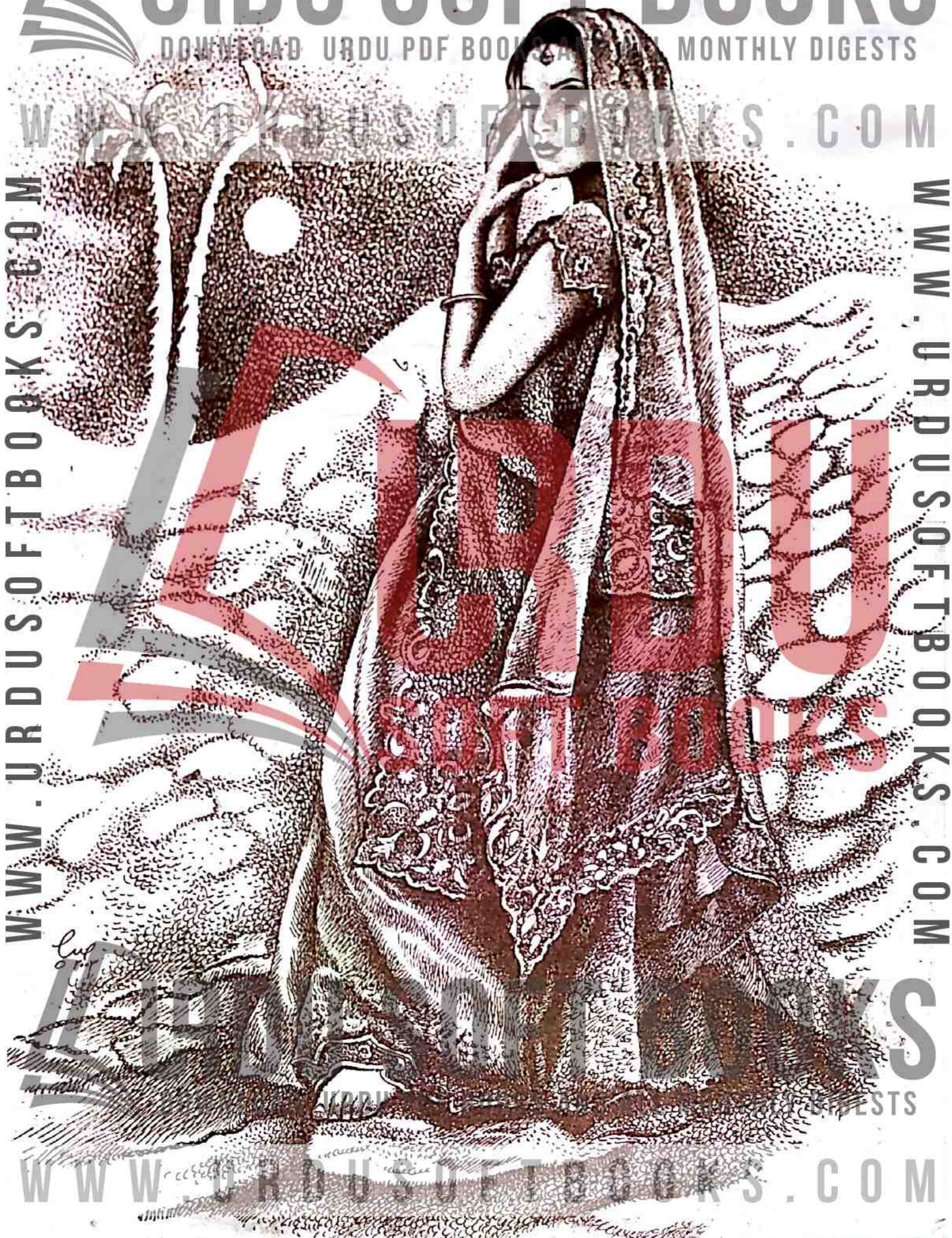
حیدر کی طرف جانکلی تھی۔
"ہونہہ۔۔۔! لیلیٰ دشمنوں کے شکنجے میں گھری ہے اور مجنوں میاں پتا نہیں کس کس جہان کی خاک چھانتے پھر رہے ہیں۔۔۔؟" وہ یمور کا سوچتے ہوئے خفگی سے بڑبڑایا تھا۔
"خیر۔! یہ تو ایک الگ مسئلہ ہے۔۔۔ ابھی تو ان لوگوں کے بارے میں کچھ سوچنا پڑے گا جو خود بھی بے خبر ہیں۔۔۔"
وہ خود کلامی کے سے انداز میں کہتا اپنی جگہ سے اٹھ کھڑا ہوا اور میز سے اپنی چابیاں اٹھا کر باہر نکل آیا تھا۔
لیکن اپنی موٹر سائیکل تک آتے آتے اس کے ذہن میں ایک اور سوچ وارد ہو چکی تھی۔
"ارے۔۔۔! یہ تو پتا ہی نہیں کہ آخر وہ لوگ کرنا کیا چاہتے ہیں۔۔۔؟ ان لوگوں کی پلاننگ کیا ہے؟" وہ بائیک پہ سوار ہوتے ہوتے رُک گیا تھا اور اپنا موبائل نکال کر عزت کے نئے اور خفیہ نمبر کو ملایا تھا۔
"جی فرمایئے۔۔۔؟" کال ریسیو ہوتے ہی لٹھ مار قسم کا جواب موصول ہوا تھا۔۔۔
"میں نے ایک آئیڈیا سوچا ہے۔۔۔" اس کے لہجے اور انداز پہ ولید کا موڈ ایک پل میں سنجیدگی سے شگفتگی میں بدل گیا تھا۔
"بتایئے۔۔۔؟" لہجہ اور انداز ہنوز تھے' وہ اس کی باتوں پہ تپی ہوئی تھی۔
"میں نے سوچا ہے کہ میں صحافت چھوڑ دیتا ہوں۔" اس نے بڑے پر سکون لہجے میں جواب دیا۔
"کیوں۔۔۔؟" عزت کا کیوں بڑا بے ساختہ تھا۔
"کیوں کہ یہ کام اب میری بیوی کرے گی۔۔۔ آج کل ایسے کام وہی کر رہی ہے۔۔۔ لوگوں کی سن گن لینا۔۔۔ ان کی حرکتوں پہ نظر رکھنا اور پھر آگے انفارم کرنا۔۔۔ کرائم پہ دھیان۔۔۔ واہ۔" ولید نے باتوں باتوں میں اسے سب بتا دیا تھا اور نہ چاہتے ہوئے بھی عزت کے ہونٹوں پہ مسکراہٹ بکھر گئی تھی۔
"مجھے بس یہ بتایئے کہ فون کس لیے کیا؟" وہ مسکراہٹ دبا چکی تھی۔ اور لہجے کو سابقہ انداز میں بدل لیا تھا۔
"تم سے فون پہ رومانس کرنے کے لیے۔۔۔" ولید کا مزاج بھی مکمل شرارت میں بدل چکا تھا۔
"وہاٹ۔۔۔؟" عزت اس کے جواب پہ ایک دم بدک گئی تھی۔
"ظاہر ہے۔ صحافت نہیں کروں گا تو رومانس ہی کروں گا ناں۔۔۔؟ آخر فارغ انسان اور کر بھی کیا سکتا ہے۔۔۔؟" ولید نے بڑی لاپروائی سے جواب دیا تھا اور عزت اپنے دھڑکتے اعصاب کے ساتھ دانت کچکچا کے رہ گئی تھی۔
"اوہ۔۔۔!" تو سیدھا سیدھا بولیں ناں۔ آپ مذاق اڑا رہے ہیں۔۔۔؟ وہ بھی میرا۔۔۔" وہ لفظ چبا چبا کر بولی تھی۔
"اف توبہ۔۔۔! میں مذاق اڑاؤں۔۔۔؟ وہ بھی عزت کا؟ توبہ توبہ میری اتنی مجال کہاں۔۔۔؟" ولید نے تو جیسے کانوں کو ہاتھ لگائے تھے۔
"ولید۔۔۔!" وہ زچ ہو کر بولی۔
"جی میری جان۔۔۔؟" اب کی بار وہ بڑے پیار سے مخاطب ہوا تھا۔
"کیوں کر رہے ہیں ایسا۔۔۔؟" وہ روٹھے پن سے بولی۔
"ایسا۔۔۔ مطلب؟" ولید نا سمجھی سے پوچھ رہا تھا۔
"مذاق۔۔۔!" وہ اس کے رومانوی انداز کی طرف اشارہ کر رہی تھی۔
"ارے میری جان! میرا کب دل چاہتا ہے کہ میں مذاق کروں۔۔۔ بلکہ میرا تو دل چاہتا ہے جو بھی مذاق کروں اسے پورا کروں۔۔۔ سب کچھ حقیقت میں کروں۔۔۔ ایسے مذاق پہ تو میرا بھی دل جلتا ہے۔۔۔ خون کے آنسو روتا ہوں۔۔۔

ملنے کے لیے شارٹ کٹ لیا تھا۔ لیکن پھر بھی ابھی تک منزل نصیب نہیں ہوئی۔"
وہ تو جیسے روہانسا ہوا تھا اور عزت اس کے ایسے جذباتی اور روہانسے لہجے پہ مچل گئی تھی۔
"ان شاء اللہ سب اچھا ہی ہوگا۔" اس نے اپنی طرف سے اسے دلاسا دیا۔
"کب ہوگا۔۔۔؟" وہ چڑ کر بولا۔
"جب سب ٹھیک ہو جائے گا۔" وہ اسے تسلیاں دے رہی تھی۔
"اور سب ٹھیک تب ہی ہوگا جب ہم میں سے کوئی ایک گزر جائے گا۔" وہ طنزیہ بولا۔
"پلیز۔۔۔!" عزت نے بے ساختہ اسے ٹوکا۔
"خیر چھوڑو۔۔۔! جو بھی ہوگا دیکھا جائے گا۔۔۔ آپ لوگوں کو فکر نہیں تو مجھے ٹینشن لینے کی کیا ضرورت ہے؟! ابھی تم مجھے یہ کنفرم کرو کہ وہ لوگ کرنا کیا چاہتے ہیں؟ ان کی پلاننگ کیا ہے؟ تاکہ ان کو اسی طریقے سے ہینڈل کیا جائے۔"

ولید ساری بات ذہن سے جھٹکتے ہوئے اصل مقصد کی طرف آگیا تھا جس کے لیے اس نے فون کیا تھا۔
"اب کیسے کنفرم کروں۔۔۔؟" وہ الجھی۔
"جیسے پہلے کیا تھا۔۔۔" ولید نے اسے اشارہ دیا۔
"اچھا۔۔۔ کوشش کرتی ہوں۔" اس نے سمجھتے ہی اثبات میں جواب دیا تھا۔
"اوکے۔۔۔ میں تب تک ان لوگوں کے پاس پہنچتا ہوں۔" ولید نے کہہ کر فون رکھنا چاہا۔
"ولید۔۔۔!" وہ اب کی بار بھی بے ساختہ بولی تھی۔
"ہوں۔۔۔؟" وہ فون بند کرتے کرتے رک گیا۔
"آئی مس یو۔۔۔" لہجہ انتہائی مدھم تھا۔
ولید چند ثانیے اس کے اس اظہار کے زیر اثر چپ سا رہ گیا تھا۔
"سنو۔۔۔!" وہ فون بند کرنے ہی والی تھی کہ ولید یکدم بول پڑا۔
"ہوں۔۔۔؟" عزت کا لہجہ ہنوز مدھم تھا۔
"آئی لو یو۔۔۔" ولید کا اظہار عزت کی روح کو سرشار کرنے کے لیے بہت تھا۔
اور دونوں نے مسکراتے ہوئے فون بند کر دیا تھا۔

☆ ☆ ☆

عزت دبے پاؤں وہیں آکھڑی ہوئی تھی جہاں سے وہ گئی تھی۔ اندر خبیث لوگوں کی خبیث میٹنگ ہو رہی تھی۔
"لیکن حیدر انکل۔۔۔! ان بوڑھی عورتوں کو کڈنیپ کرنے سے ہمیں کیا حاصل؟ اگر کرنا ہی ہے تو پھر۔۔۔"
مونس مرزا نے اپنے آخری لفظ "تو پھر" کو کافی لمبا۔ کھینچا تھا اور وہ بھی کافی ذو معنی انداز میں۔ جس کو باہر کھڑی عزت بھی بخوبی سمجھ چکی تھی کہ اس کا اشارہ ماورا کی طرف ہے۔
"نہیں۔۔۔! اس پہ ہاتھ ڈالنے سے معاملہ اور ٹیڑھا ہو جائے گا۔۔۔ تیمور کے دل میں اس کا درد اٹھے گا اور وہ الٹا ہمارا دشمن ہو جائے گا۔۔۔ اور وہ لڑکی خود بھی بہت چالاک ہے۔ اس طرح ہاتھ نہیں آئے گی اور نہ ہی پیپرز پہ سائن کرے گی۔" رضا حیدر کی پلاننگ کچھ اور تھی۔
"تو پھر کرنا کیا ہے۔۔۔؟" مونس مرزا نے الجھ کر پوچھا۔

"ظاہر ہے جب وہ دونوں عورتیں ہمارے قبضے میں ہوں گی تو ماورا مرتضیٰ ان کو بچانے کے لیے کچھ بھی کر گزرے گی۔۔۔ ہر تاوان بھرنے کے لیے تیار ہو گی۔۔۔ اور اسے ہر حال میں پراپرٹی کے تمام کاغذات پہ سائن کرنا ہوں گے۔۔۔ پھر وہ بھی خوش اور ہم بھی خوش۔" رضا حیدر اپنی پلاننگ سوچ کر خود ہی مسکرائے تھے۔

"لیکن اگر معاملہ پولیس یا میڈیا تک پہنچ گیا تو۔۔۔؟" مونس مرزا کوئی بھی قدم اٹھانے سے پہلے احتیاطاً ساری معلومات لینا چاہ رہا تھا کہ آخر ان کے ذہن میں کیا چل رہا ہے۔۔۔؟

"پولیس تک بھی نہیں پہنچے گا۔۔۔ وہاں ایک خاص آدمی ہے میرا۔۔۔ اور رہی بات میڈیا کی تو میڈیا تک پہنچانے والا صرف ایک ہی آدمی ہے اور وہ ہے ولید رحمان۔۔۔ اور ولید رحمان نے اگر میرے کسی معاملے میں ٹانگ اڑانے کی کوشش کی تو اسے سیدھا سیدھا گولی کھانا پڑے گی۔۔۔ اس کے لیے تو ذرا بھی گنجائش نہیں ہے۔"

رضا حیدر کے زہر خند لہجے پہ عزت کے دل پہ ہاتھ پڑا تھا اور ماتھے پہ ایک دم سے پسینہ آگیا تھا اب اس سے وہاں ٹھہرنا مشکل ہو چکا تھا۔

وہ بمشکل خود کو سنبھالتی ہوئی وہاں سے ہٹ گئی تھی اور اپنے کمرے میں آکر سانس بحال کی تھی۔۔۔ اور ساتھ ہی ولید کو مطلع کرنے کا سوچا تھا۔۔۔!

☆ ☆ ☆

ڈاکٹر شاہنواز کے گیسٹ روم میں مکمل خاموشی کا راج تھا۔

تیمور بیڈ پہ بے سدھ پڑا تھا اور وہ تینوں اس کے لیے خاموش اور متفکر بیٹھے تھے۔۔۔ اور اس "خاموشی" کے سلسلے میں آفاق کے فون کی گھنٹی نے دراڑ ڈالی تھی۔۔۔ اور سب نے بے ساختہ چونک کر دیکھا تھا۔

آفاق نے موبائل نکالا۔۔۔ فارہ کی کال تھی۔

"وہ پریشان ہو رہی ہو گی۔۔۔؟" آفاق نے دل ہی دل میں سوچتے ہوئے فوراً کال ریسیو کی۔

"ہیلو۔۔۔!" اس نے کافی ٹھہرے ہوئے انداز میں کہا۔

"کہاں ہیں آپ؟ میں کب سے انتظار کر رہی ہوں۔۔۔؟" فارہ کی پریشانی عروج پہ تھی۔۔۔

"تیمور کے پاس ہوں۔۔۔" اس کا لہجہ اور انداز ہنوز تھے۔

"واٹ؟ تیمور بھائی کے پاس؟ لیکن وہ کہاں ہیں؟" فارہ کو اب اگلا سوال سوجھا۔

"ڈاکٹر شاہنواز کے گھر۔۔۔" آفاق کی زبان سے بے ساختہ پھسلا تھا۔

اور اس کی اس بے ساختگی پہ زوبیہ اور ڈاکٹر شاہنواز نے بھی ایک دم اس کی طرف دیکھا تھا۔ آفاق دل ہی دل میں پچھتایا تھا کیونکہ فارہ کا اگلا سوال حاضر ہو چکا تھا۔

"ڈاکٹر شاہنواز کون۔۔۔؟" اب وہ اس کون کا جواب کیا دیتا۔۔۔؟

"دیکھو فارہ۔۔۔ میں تمہیں گھر آکر سب بتاؤں گا۔۔۔ ابھی فون بند کرو۔" وہ بے حد نرمی سے اسے سمجھاتے ہوئے بولا۔

"لیکن آفاق سب ٹھیک تو ہے ناں؟ خیریت ہے ناں؟ تیمور بھائی کسی ڈاکٹر کے گھر پہ کیوں ہیں؟ وہ ٹھیک تو ہیں؟" فارہ کو ایک الگ پریشانی لاحق ہو چکی تھی۔

"ہاں۔۔۔ اللہ کا کرم ہے سب ٹھیک ہے ڈونٹ وری۔۔۔ اگر میں لیٹ ہو جاؤں تو انتظار مت کرنا۔۔۔ سو جانا۔۔۔" آفاق نے اسے نرمی سے سمجھا کر فون بند کر دیا تھا۔

✡ ✡ ✡

"کس کا فون تھا۔۔۔؟" فارہ فون بند کر کے پلٹی ہی تھی کہ ثمینہ یزدانی قریب آگئیں۔

"میں نے فون کیا تھا آفاق کو۔۔۔" وہ آہستہ سے بولی۔

"اچھا۔۔۔! کہاں ہے وہ؟ کیا کہتا ہے؟" ثمینہ یزدانی بھی آفاق کے لیے فوراً ہی پریشان ہو جاتی تھیں۔

"کسی ڈاکٹر کے گھر پہ ہیں۔۔۔ تیمور بھائی بھی وہیں ہیں۔۔۔" فارہ کے انداز میں ذرا سی لاپروائی تھی۔۔۔ جبکہ ثمینہ یزدانی ڈاکٹر کے نام پہ ہی متفکر ہو گئی تھیں۔

"کیا مطلب۔۔۔؟ کس ڈاکٹر کے گھر پہ ہے وہ۔۔۔"

"شاید ان کے کوئی جاننے والے ہوں گے' ڈاکٹر شاہ نواز' ان ہی کے گھر پہ ہیں وہ۔۔۔" اس کی لاپروائی ہنوز تھی اور ثمینہ یزدانی کا جیسے پل میں جسم کا سارا خون نچڑ گیا تھا۔ ان کی رنگت زرد پڑ گئی تھی۔

"ڈاکٹر شاہ نواز۔۔۔؟" ان کے ہونٹ پھڑپھڑائے تھے۔ اور ان کا رد عمل دیکھ کر فارہ بھی چونک گئی تھی۔

"آنٹی۔۔۔ کیا بات ہے۔ کیا ہوا۔۔۔ ڈاکٹر شاہ نواز کون ہیں؟" فارہ کافی الجھن لیے ان سے پوچھ رہی تھی۔

"ڈاکٹر شاہ نواز ہارٹ اسپیشلسٹ ہیں۔۔۔ وہ۔۔۔ وہ۔۔۔ انیق کے ڈاکٹر تھے۔ انیق کا ٹریٹمنٹ انہوں نے ہی کیا تھا۔۔۔ اور۔۔۔ اب ان کی بیٹی زوبیہ شاہ نواز بھی ہارٹ اسپیشلسٹ ہی ہے۔۔۔ مم مگر آفاق وہاں کیوں؟"

ثمینہ یزدانی کے الفاظ بے ربط سے ہو رہے تھے اور آواز کپکپا رہی تھی ان کے دل میں خوف پوری طرح سے سر ابھار چکا تھا۔

اور خطرے کی گھنٹی ان کے کانوں میں شور مچانے لگی تھی۔

فارہ اب بھی ان کی ذہنی حالت کو سمجھ نہیں پا رہی تھی۔

"شاید تیمور بھائی کے ساتھ ہیں۔"

"اگر تیمور وہاں ہے تو کیوں ہے؟ اور اگر آفاق وہاں ہے تو کیوں ہے؟ کیا وجہ ہے؟ کیا ہوا ہے؟" ثمینہ یزدانی کا دماغ چند لمحوں میں ہی ماؤف ہو چکا تھا۔

"آپ اتنی پریشان کیوں ہو رہی ہیں؟" فارہ کی الجھن سلجھ ہی نہیں رہی تھی۔

"فارہ۔۔۔ کیا کبھی تم نے آفاق کو دیکھا۔۔۔ اس کے سینے میں پین ہوا ہو کبھی۔۔۔؟"

ثمینہ یزدانی آخر ماں تھیں اور پہلے بھی اس صدمے سے گزر چکی تھیں۔ اس لیے وہ بہت پریشان تھیں۔

"پین کا تو مجھے نہیں پتا۔ لیکن میں نے کئی بار ان کو اپنا سینہ سہلاتے ہوئے دیکھا ہے۔"

فارہ نے اثبات میں سر ہلایا اور ثمینہ یزدانی کی تو جیسے ریڑھ کی ہڈی میں اک سنسنی سی دوڑ گئی تھی اور وہ صوفے پہ ڈھے گئی تھیں۔

"آنٹی۔۔۔ کیا ہوا۔۔۔ سب ٹھیک تو ہے نا؟" فارہ یک دم ان کی طرف لپکی۔ اور انہوں نے اک نظر فارہ کو دیکھا' پھر اپنے اندر کے ابال کو بمشکل اندر ہی ضبط کرنے کی کوشش کی تھی۔۔۔ لیکن آنسو بار بار امڈے آ رہے تھے۔

"فارہ۔۔۔" انہوں نے فارہ کو قریب بٹھا کر اپنے ساتھ لپٹا لیا تھا اور بے اختیار رو پڑی تھیں اور فارہ پوچھتی ہی رہ گئی کہ کیا ہوا ہے' مگر انہوں نے کوئی جواب نہیں دیا تھا۔

✡ ✡ ✡

"آپ لوگوں کو یہاں سے جانا ہی ہوگا۔ یہاں رہنا سراسر خطرہ ہے۔" ولید نے کافی تحمل سے کہتے ہوئے ان تینوں پہ نظر ڈالی تھی۔

عافیہ بیگم وہاں سے جانے کو تیار نہیں تھیں۔
"کہاں چلنا ہوگا؟ کہاں جائیں؟" انہوں نے تلخی سے پوچھا۔
"اپنے گھر اور کہاں۔" ولید نے کافی لاپروائی کا مظاہرہ کیا تھا۔
"ہمارا کوئی گھر نہیں ہے۔ پچھلے چھبیس سالوں سے ہمارا کوئی گھر نہیں ہے۔ ہم گھر سے بے گھر پھر رہے ہیں۔ لاوارث۔" عافیہ بیگم کے لہجے کی تلخی عروج پر تھی۔
"پلیز آنٹی! ایسا تو مت کہیں۔ آپ جانتی ہیں سب کا وارث تو صرف اللہ ہے۔ سب کا مالک اور سب کا مختار۔" ولید نے انہیں سمجھانے کی کوشش کی تھی۔
"جانتی ہوں۔ سب جانتی ہوں۔ لیکن میں اس گھر میں کیسے۔"
"آنٹی! وہ گھر آپ کا ہے۔ آپ کے شوہر کا ہے اور اب آپ کی بیٹی کا ہے وہاں جانا آپ کا حق بنتا ہے' آپ مالک ہیں اس گھر کی۔ آپ کو بلا کسی جھجک۔"
وہ انہیں۔ "حیدر ولا" جانے پہ اکسا رہا تھا کیونکہ ماورا انہیں منانے میں ناکام ہو چکی تھی۔
"کیسے جاؤں۔ کس حوصلے سے جاؤں؟ وہاں کیا رکھا ہے اب۔"
عافیہ بیگم نے کبھی بھی واپس اس گھر میں جانے کا نہیں سوچا تھا کیونکہ جب اس گھر میں اس گھر کو بنانے والا نہیں تھا۔ ان کا گھر والا نہیں تھا تو پھر وہاں جانے سے بھی کیا حاصل۔
"وہاں بے شک کچھ بھی نہیں ہے۔ لیکن وہ گھر تو آپ کا ہے نا؟ آپ کے شوہر کا۔ جو انہوں نے آپ کے لیے بنایا تھا۔ آپ کے رہنے کے لیے۔" ولید ہر ممکن طریقے سے انہیں قائل کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔
"مجھے وہ گھر نہیں چاہیے۔ کیونکہ وہ گھر مجھ سے کب کا چھن چکا ہے۔ وہ میرے نصیب میں ہی نہیں تھا۔"
عافیہ بیگم وہاں جانے کے لیے ہرگز تیار نہیں تھیں۔
"دیکھیں آنٹی! آپ کو کچھ ہوگیا تو کس کو پریشانی ہوگی صرف آپ کی بیٹی کو۔ آپ اپنے لیے نہ سہی' لیکن اس کے لیے ہی مان جائیں۔ یہاں رہنا ٹھیک نہیں ہے۔ پلیز کچھ خیال کریں۔" ولید انہیں سمجھا سمجھا کر تھک گیا تھا اور بی گل اس سارے سلسلے میں خاموش تماشائی کی طرح بیٹھی تھیں۔
لیکن ولید اور ماورا کی پریشانی دیکھ کر بالآخر انہیں بولنا ہی پڑا تھا۔
اور ان کا بولنا کبھی کبھی بہت سخت بھی ہوتا تھا۔

☼ ☼ ☼

"حیدر ولا۔" میں قدم رکھتے ہوئے عافیہ بیگم اور بی گل کا دل خون کے آنسو رویا تھا۔ انہوں نے گاڑی سے اترتے ہی سر اٹھا کر "حیدر ولا" کی بلند اور وسیع عمارت کو دیکھا تھا اور دل پہ اک گھونسا سا پڑا تھا۔
ماورا ان کی کیفیت سمجھ چکی تھی۔ اسی لیے ان کا ہاتھ کافی مضبوطی سے اپنے ہاتھ میں لے لیا تھا اور عافیہ بیگم نے اس کے ہاتھ تھامنے پر بے ساختہ گردن موڑ کر اسے دیکھا تھا۔
ماورا کی آنکھوں میں ایک تسلی تھی' ہمت تھی' حوصلہ تھا۔ جس کو دیکھ کر چند ثانیے کے لیے عافیہ بیگم کا دل بھی مضبوط ہوگیا تھا۔ اور پھر اس کے ساتھ قدم آگے بڑھا دیے تھے۔
"سیکیورٹی۔" ماورا نے سیکیورٹی کو طلب کیا تھا اور پھر ولید کی موجودگی میں ہی تمام گارڈز کو سمجھایا تھا اور حفاظتی اقدامات سخت کر دیے تھے۔
ولید اور ماورا حفاظتی اقدام میں مصروف تھے اور عافیہ بیگم پورے گھر میں بولائی پھر رہی تھیں۔

”میڈم کی اجازت کے بغیر باہر کا گیٹ ہرگز نہیں کھلے گا۔ چاہے گیٹ پہ رضا حیدر ہو یا تیمور حیدر ہی کیوں نہ ہوں؟“ ولید نے چوکیدار کو آخری ہدایت سے نوازا تھا اور واچ مین نے اثبات میں سر ہلایا تھا۔

اور ابھی وہ ماورا سے کچھ کہنے ہی والا تھا کہ اس کے نمبر پہ کال آ گئی۔

”ہیلو۔“ اس نے کال اٹینڈ کی۔

”آفاق بات کر رہا ہوں۔“ دوسری طرف عجلت تھی۔

”او اچھا۔ کیسے ہیں آفاق صاحب۔“ آفاق کے نام پہ ماورا نے بھی ٹھٹک کر دیکھا تھا۔

”میں ٹھیک ہوں، لیکن تیمور کی طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔ وہ ڈاکٹر شاہ نواز کے گھر پہ ہے۔ اگر ہو سکے تو تم ابھی پہنچو۔“

آفاق کو واپس گھر جانے کی جلدی تھی، کیونکہ فارہ نے بتایا تھا کہ ثمینہ یزدانی کی حالت کافی خراب ہے، اچانک پتا نہیں کیا ہوا ہے؟

”ڈاکٹر شاہ نواز کے گھر۔“ اس نے زیر لب دہرایا۔

”ہاں۔“

”ٹھیک ہے۔ میں آتا ہوں۔“ اس نے کہہ کر فون بند کر دیا تھا۔

”کیا ہوا۔ تیمور تو ٹھیک ہے نا؟“ ماورا کا پہلا سوال ہی تیمور کے لیے تھا۔

”نہیں۔ وہ ٹھیک نہیں ہے۔“ ولید نے صاف بتا دیا۔

”کیا ہوا ہے اسے؟“ ماورا کی پریشانی دیدنی تھی۔

”یہ تو وہاں جا کر ہی پتا چلے گا۔“ ولید اب جانے کے لیے پر تول رہا تھا۔

”میں بھی ساتھ چلوں گی۔“ وہ بھی تیار تھی۔

”پھر وہی تماشا ہو گا؟“ ولید نے اسے روکنا چاہا۔

”تماشا تو اب ہر روز ہوتا ہے۔ پلیز مجھے روکو مت۔ ڈرائیور سے کہو گاڑی نکالے۔ میں تب تک امی اور بی گل کو بتا دوں۔“ ماورا کہہ کر اندر کی طرف لپکی تھی۔

☆ ☆ ☆

ماورا کو گیسٹ روم کی طرف بھیج کر ولید ڈاکٹر شاہ نواز کے پاس باہر ہی رک گیا تھا اور وہ اکیلی اندر آ گئی تھی۔

تیمور سامنے ہی جہازی سائز بیڈ پہ بے سدھ پڑا تھا اور اس کی حالت دیکھ کر ماورا سے رہا نہیں گیا تھا۔ وہ بے اختیار بھاگ کر بیڈ کے قریب آئی تھی اور بے سدھ پڑے تیمور سے لپٹ کر پھوٹ پھوٹ کے رو پڑی تھی۔

اس نے ایسی بے اختیاری کا کبھی سوچا بھی نہیں تھا، لیکن تیمور کو اس حال میں دیکھ کر وہ خود کو روک نہیں پائی تھی۔

اس کے آنسو تیمور کے سینے میں جذب ہو رہے تھے اور اس کی قمیص بھیگتی جا رہی تھی۔

”مم۔ ما۔ ورا۔“ تیمور غنودگی میں کسمسایا تھا۔

”تیمور پلیز۔ اٹھو۔ آنکھیں کھولو۔ پلیز ٹھیک ہو جاؤ۔ میں۔ میں بہت پریشان ہوں مجھے ضرورت ہے آپ کی۔ میں بہت اکیلی ہوں۔ تیمور میں بہت اکیلی ہوں۔ مجھے تنہا مت چھوڑو۔ پلیز۔“

وہ اس سے لپٹ کر روتی ہوئی اپنی تکلیف اور اپنی تنہائی کا اظہار کر رہی تھی۔ کیوں کر اس کی بے بسی کوئی سمجھ ہی نہیں پا رہا تھا۔

”ما۔۔۔ ورا۔۔۔!“ تیمور کے ہونٹ ذرا سا پھڑپھڑائے تھے اور ماورا نے اس کے سینے سے سر اٹھا کر اس کے چہرے کو دونوں ہاتھوں سے تھاما تھا۔

اس کے چہرے پہ اتنے دنوں کی بڑھی ہوئی شیو تھی اور آنکھوں کے گرد حلقے نظر آ رہے تھے۔ ورنہ یہی چہرہ ہمیشہ اتنا تروتازہ نظر آتا تھا کہ ماورا نظر اٹھا کر دیکھتے ہوئے بھی گھبرا جاتی تھی۔۔۔ اور آج۔۔۔

”تیمور۔۔۔“ ماورا اس کی پیشانی پہ اپنی پیشانی ٹکا کر پھر سے رو پڑی تھی اور اس کی آنکھوں سے گرنے والے آنسو تیمور کی پلکیں بھگونے لگے تھے۔

”تیمور پلیز۔۔۔ ٹھیک ہو جاؤ۔۔۔ اٹھ جاؤ اس بستر سے۔۔۔ معاف کر دو مجھے۔۔۔ میں تمہاری ہوں۔۔۔ میرا سب کچھ تمہارا ہے۔ تم نہیں ہو تو۔۔۔ کچھ بھی نہیں ہے۔۔۔ تمہارے سوا کچھ بھی نہیں چاہیے۔۔۔ کچھ بھی نہیں۔۔۔“

ماورا کی مدھم آواز میں سرگوشیاں تیمور کی سماعتوں میں اتر رہی تھیں، مگر وہ مکمل ہوش میں نہیں تھا۔ البتہ اتنا احساس ضرور تھا کہ ماورا اس کے پاس ہے۔۔۔ اس کے قریب ہے۔ اس کے سینے سے لگی ہے۔ اس کو چھو رہی ہے۔ اس کے قرب کی خوشبو تیمور بے ہوشی میں بھی محسوس کر رہا تھا۔

”ماورا۔۔۔ مم۔۔۔ میں۔۔۔ بہت۔۔۔ محبت۔۔۔ تم۔۔۔ سے۔۔۔“

اس کے الفاظ بہت بے ربط سے ہو رہے تھے اور اس کے اوپر جھکی ماورا نے یک دم سر اٹھا کر تیمور کے چہرے کو دیکھا تھا اس کی آنکھیں بند تھیں۔

”ہاں۔۔۔ مجھے پتا ہے۔۔۔ آپ مجھ سے بہت محبت کرتے ہیں۔۔۔ اور مجھے اسی محبت کی ضرورت ہے۔۔۔ مجھے وہی محبت دوبارہ چاہیے۔۔۔ ہمیشہ چاہیے۔۔۔ ہمیشہ ہمیشہ کے لیے چاہیے۔“

وہ اس کے چہرے کو سہلا رہی تھی اور تیمور نے اس کے ہاتھوں پہ اپنا ہاتھ رکھ دیا تھا، وہ مکمل غنودگی میں تھا۔ جبکہ ماورا کے دل پہ ایک تسلی آمیز سا ہاتھ پڑا تھا۔ اس نے تیمور کے سینے پہ سر رکھ دیا تھا۔

✲ ✲ ✲

آفاق کے گھر پہنچنے سے پہلے ہی ثمینہ یزدانی نے اس کے کمرے کا چپہ چپہ کھنگال ڈالا تھا۔ اور اس کے اسٹڈی روم کی الماری سے انہیں وہ فائل مل ہی گئی تھی جسے آفاق یزدانی نے ہمیشہ چھپا کر رکھا تھا۔

فائل پہ ڈاکٹر شاہ نواز کا نام جگمگا رہا تھا۔۔۔ اور ثمینہ یزدانی کے ہاتھ تھر تھر کانپ رہے تھے۔ انہوں نے کانپتے ہاتھوں سے فائل کا صفحہ پلٹا۔

”پیشنٹ۔۔۔ آفاق یزدانی۔“ وہ اس کا نام پڑھتے ہی کرسی پہ ڈھے گئی تھیں۔

”آنٹی۔۔۔“ فارہ نے یک دم لپک کے انہیں سنبھالنے کی کوشش کی تھی، لیکن سامنے ہی میز پہ رکھی فائل پر نظر پڑتے ہی اس کے قدم ٹھٹک گئے تھے۔ اس نے کسی انہونی کے خیال سے لرزتے ہوئے فائل اٹھا کر دیکھی اور اس کی آنکھوں کے سامنے زمین و آسمان گھوم گئے تھے۔ قدموں سے جان ختم ہو گئی تھی اور کھڑے رہنا بس سے باہر تھا۔

”آفاق۔۔۔“ اس کی چیخ بہت بلند تھی۔

وہ تیورا کے نیچے گری تھی اور تب تک آفاق بھی اندر داخل ہو چکا تھا۔

”فارہ۔۔۔!“ وہ یک دم اس کی طرف بھاگا اور ثمینہ یزدانی بھی چیخ کر اس کی طرف لپکی تھیں۔

(باقی آئندہ)

نایاب جیلانی

شہر خدا

بیہ، عنایہ کے کمرے میں گئی تو اس نے دیکھا، عنایہ نزع کے عالم میں تھی۔ اس کی سانسیں اکھڑ رہی تھیں۔ اس نے بیہ سے کہا کہ تمہاری خاموشی اور صبر جیت گیا اور میری فرماں برداری ناکام ہوئی۔ میرا دل اور ہاتھ دونوں خالی ہیں۔ مجھے اس سے محبت تھی۔ وہ میرے اندر بستا تھا۔ میں جان ہی نہ سکی۔ تم اسے بتا دینا کہ مجھے اس سے کتنی محبت تھی۔ بیہ کے پوچھنے پر اس نے بتایا کہ اسے "فاتح" سے عشق تھا، بیہ ساکت رہ گئی۔ اسے اپنے کانوں پر یقین نہ آیا۔ وہ دیا کو عنایہ کی موت کے بارے میں بتانے گئی۔

دیا کا کمرہ خاص تہ خانے میں تھا۔ جہاں وہ عبادت کرتی تھی۔ وہاں کسی کو جانے کی اجازت نہ تھی۔ بیہ پہلی بار وہاں گئی۔ کمرے میں داخل ہو کر وہ پتھر ہو گئی۔

دیا بھی مرنے کے قریب تھی۔ وہ بری طرح چلا رہی تھی۔ بیہ جو اس سے گزرے برسوں کا حساب لینے آئی تھی۔ کچھ نہ کہہ سکی۔ دیا نے دم توڑ دیا تھا۔ وہاں کچھ تصویریں تھیں ایک ہی بندے کی تصویریں اور دیا کی ڈائریاں۔ ان ڈائریوں کے ساتھ ایک رقعہ تھا جس پر لکھا تھا۔ "انہیں پڑھ لینا۔ تمہارا تجسس دور ہو جائے گا۔"

بیہ نے کچھ قریبی لوگوں کو ان دونوں اموات کی اطلاع دی تھی اور فاتح کو بھی فون کر کے عنایہ کی موت کے بارے میں بتایا تھا۔ فاتح نے سرد لہجے میں کہا تھا کہ تم یہ اطلاع رافع کو دے دو۔ بیہ کے جتانے پر کہ رافع اس کا شوہر ہے اس نے سرد مہری سے کہا کہ وہ اب اس کا شوہر نہیں ہے۔

بیہ نے رافع کو اطلاع نہیں دی تھی۔ افسون مشہدی ایک بزنس ٹائیکون کی اکلوتی بیٹی تھی رافع ابراہیم ایک مزدور تھا۔

ناولٹ
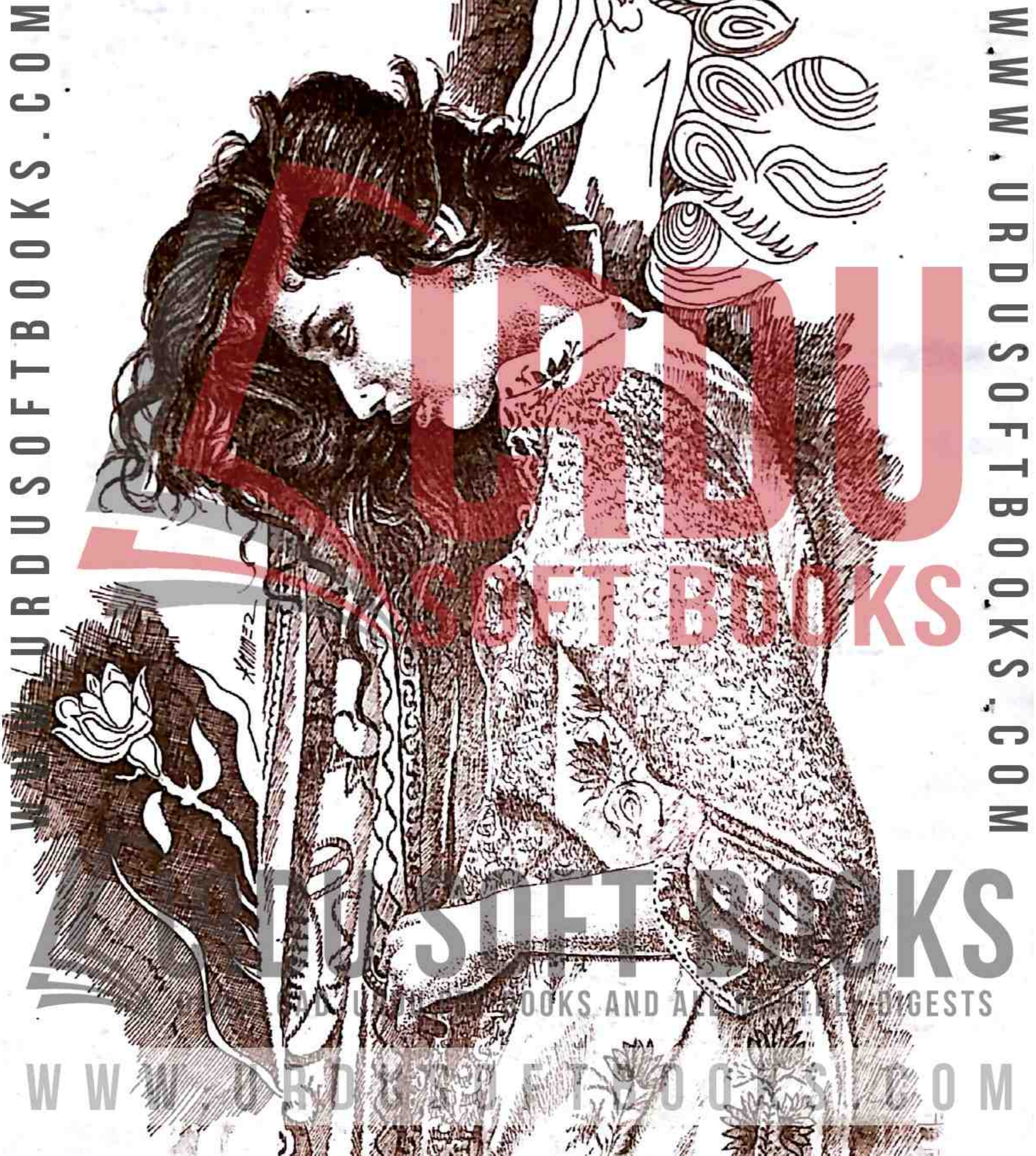
افسون مشہدی نے اس کو دیکھا اور اس کی اسیر ہو گئی۔ لیکن رافع ابراہیم نے اس پر توجہ نہ دی۔ افسون نے اسے اپنے باپ کی آئل کمپنی میں ملازمت دے دی۔ وہ اسے چھوڑ کر جا رہا تھا۔ تب ہی ایئرپورٹ پر افسون پہنچ گئی تھی اور اس نے اسے روکنے کی کوشش کی تھی۔ لیکن جب رافع ابراہیم نہ مانا تو اس نے اسے روکنے کے لیے انتہائی قدم اٹھالیا تھا۔

مدید نے اپنے دوست حریر کو اپنی منگنی میں آنے کی دعوت دی تھی اور کہا اپنے ساتھ ایک اور "دوست" کو بھی لے آنا۔ مدید کا یہ دوست پائلٹ ہے۔ وہ انتہائی وجیہہ ہے لیکن ساتھ ساتھ بد دماغ اور غصیلی بھی ہے۔ اناویہ بہت حسین دل کش تھی۔ اس کی کلاس فیلو روبا اس کے لیے اپنے بھائی کا رشتہ لے آئی۔ اناویہ نے اس کو ناراضی سے منع کردیا اور کہا اس رشتہ سے انکار کی وجہ خود روبا ہے۔

روبا جب اناویہ کے گھر گئی تو اس نے انادیا کے تایا زاد افراہیم کو دیکھا۔ اس کی گہری محبت بھری نظریں روبا کو ڈسٹرب کر گئی تھیں۔

فوزان مشہدی کے آئل پلانٹ پر کام ہو رہا تھا۔ فوزان مشہدی اپنے ایک ایک ورکر سے بخوبی واقف تھے۔ پچھلے چھ ماہ سے ان کے پلانٹ پر ایک ورکر کام کر رہا تھا۔ اسے افسوں کی سفارش پر رکھا گیا تھا۔ یہ ورکر بہت غیر ذمہ دار اور لاپروا تھا۔ یہ لڑکا رافع افراہیم تھا۔ فوزان مشہدی کو بتایا گیا کہ وہ معاہدہ توڑ کر ظہران سے فرار ہو رہا ہے تو فوزان مشہدی کو غصہ آگیا اور اس نے خروج لکھوا کر اسے جیل بھجوا دیا۔

افسوں مشہدی کی اپنی سوتیلی ماں آبگینے سے بہت اچھی دوستی تھی۔ اس کے سوتیلے بھائی حمیر اور عمیر بھی اس سے بہت پیار کرتے تھے۔ افسوں کا اپنا سگا بھائی ناراض ہو کر گھر چھوڑ گیا تھا۔

رافع افراہیم کے جیل جانے سے افسون بہت پریشان تھی۔ وہ اسے باہر نکالنا چاہتی تھی۔ وہ اسے چھڑانے کے لیے جیل چلی گئی، جس کی وجہ سے اس کا باپ بہت پریشان ہو گیا۔

حریر اپنے پائلٹ دوست کے ساتھ ڈین ہیگ پہنچا تو مدید قاضی انہیں لینے نہیں آیا تھا۔ حریر نے اسے بتایا کہ مدید نے اپنی منگنی میں شرکت کے لیے بلایا ہے۔ یہ سن کر اس کا پائلٹ دوست سیخ پا ہو گیا تھا۔ وہ مدید کی منگنی میں شریک نہیں ہونا چاہتا تھا۔ اس نے واپس جانے کا فیصلہ کر لیا، لیکن مدید نے اسے زبردستی روک لیا۔

مدید نے زندگی میں بہت برے دن دیکھے تھے۔ امید اس کی خالہ زاد تھی جس سے اس کی منگنی ہونے والی تھی۔ اس کے خالو خوش حال تھے۔ رانیہ کی شکل میں مدید کی لاٹری نکلی تھی۔

افسون نے پہلی بار جب رافع افراہیم کو دیکھا تھا تو وہ ایک معمولی مزدور تھا۔ اس کی تباہ حالی کے باوجود افسون اسے دل دے بیٹھی، وہ اس کی منت سماجت کر کے اسے اپنی کمپنی میں لے آئی۔ رافع افراہیم ماضی کے کسی واقعہ کی وجہ سے شدید پشیمانی اور اذیت کا شکار تھا۔ اس نے افسون کی محبت قبول کرنے سے انکار کر دیا۔ اس کی ہر ممکن مزاحمت اور انکار کے باوجود افسون نے ہار نہیں مانی تھی اور بالآخر رافع نے ہتھیار ڈال دیے، لیکن اس کا کمزور دل یہ برداشت نہ کر سکا اور اس کی سانس بند ہونے لگی۔ افسون یہ منظر نہیں دیکھ سکی اور خوف زدہ ہو کر بھاگ نکلی تھی، لیکن وہ بچ گیا تھا۔

فوزان مشہدی کو پتا چلا کہ وہ جیل سے رافع کو نکال لائی ہے تو انہوں نے افسون کو بتایا کہ وہ رافع کے متعلق ساری معلومات کرا چکے ہیں۔ وہ اپنے خاندان کا دھتکارا ہوا ہے۔ اس نے اپنے بھائی کی بیوی پر بری نیت رکھنے کا گناہ کیا تھا۔

تیسری قسط

باہر نیم اندھیرا تھا۔ کالے سفوف میں — نقرہ کا پاؤڈر گھول دیا ہو۔ آسمان
پو پھٹنے میں ابھی بہت وقت تھا۔ آسمان پہ سفید چودھویں کے چاند کی سفید ملمع والی رنگت کے باعث
رنگ کی دھاریاں کہیں کہیں دکھائی دیتی تھیں۔ جیسے روشن اور سفید تھا۔ البتہ زمین تاریک تھی۔ اور برقی

بلبوں اور گلوبوں کی وجہ سے روشنیاں بنائی گئی تھیں پورے ماحول پہ سکوت طاری تھا۔ بس ماربل کے چکنے فرش پہ عنایہ کے دادا کی لاٹھی ٹیکنے کی آواز سنائی دیتی تھی۔ وہ مضطرب سے جھکے کندھوں اور جھکے سر کے ساتھ عزہ کے ڈاکٹر شوہر کو ہدایات دے رہے تھے۔ ارسل اور رمیز کے علاوہ مرگ والے گھر میں فوتگی کے انتظامات سنبھالنے والا کوئی نہیں تھا۔

ابھی فجر کی اذانیں نہیں ہوئی تھیں اور دکانیں بھی ساری بند تھیں۔

عنایہ کے دادا رمیز کو دھیمی آواز میں کچھ سمجھا رہے تھے۔

"ابھی فجر کی اذان نہیں ہوئی۔ لوگ گھروں میں ہیں۔ مسجدوں میں نہیں گئے۔ تھوڑی دیر بعد تک مسجد سے اعلان کروا دینا۔ اور شریف کو فون کرلو کہ اس کے گھر کسی کو بھیج کے اطلاع کردو۔ دن چڑھنے سے پہلے قنات اور شامیانے لگا جائے۔ دریاں بچھا جائے۔ نائی، قصائی اور دیگوں کا انتظام بھی کرلو۔ اور ہاں گورکن سے کہنا میرے بیٹے کے برابر جو جگہ ہے۔ وہ اس کی ماں اور میرے لیے مختص تھی۔ اس جگہ ہی میری پوتی اور بہو کے لیے لحد کا انتظام کرو۔ میرے بیٹے کے دائیں اور بائیں۔" ان کی بوڑھی گدلی آنکھ سے آنسو بہتے تھے اور ان کی سفید ریش کو نم آلود کر جاتے۔

اس کم آمدورفت والے تاریک اور سنسان کونے میں دیوار سے لگی بیبہ کانپتی تھی اور گھٹنوں میں منہ چھپا کر روتی تھی۔ اور اس کے کان مکھیوں کی سی بھنبھناہٹ کو سنتے تھے۔

"دیا اور عنایہ کی اچانک موت تو ایک "معمہ" ہے۔ انتہائی پُراسرار، ابھی گزری ہوئی شام کو میں نے عنایہ کو ٹیرس پہ بیٹھا دیکھا تھا۔ وہ بالکل ٹھیک تھی۔ مجھے گمان بھی نہ تھا کہ اگلے تین چار گھنٹوں میں وہ ختم بھی ہو جائے گی۔" یہ ثوبیہ آنٹی کی ساس تھیں۔ واصف تایا کی والدہ، ارسل کی دادی۔

"اور دونوں ایک ساتھ۔ کچھ تو ہے نا پُراسرار، واصف کہہ رہے تھے یہ تو پولیس کیس ہے۔" ثوبیہ آنٹی کی آواز آئی تھی۔ وہ میتوں کے قریب بیٹھی تھیں۔ لیکن اتنا بھی قریب نہیں، ہاں عزہ وہیں تھی۔ عنایہ کے سرہانے اور ایک وہی تھی۔ ان چار کی چنی خواتین میں بس رونے کا فریضہ ادا کرنے والی۔

وہ عنایہ کی ٹھنڈی پیشانی پہ اپنا ہاتھ رکھتی اس کے سر سے ماتھا ٹکراتی، رو رہی تھی۔ ہاں اس کا رونا تو بنتا تھا۔ عنایہ کے ساتھ ایک اسی کا خونی رشتہ تھا۔ وہ عنایہ کی پھوپھی زاد بہن تھی۔ اکلوتی پھوپھی زاد۔

اور اس تاریک گوشے میں عزہ کے بین سنتی اور خوف زدہ نظروں سے عنایہ کی بند آنکھوں والے چہرے کو دیکھتی بیبہ کانوں پہ ہاتھ رکھ کر کرب کی ننگی تلوار پہ چل رہی تھی۔

اس تاریک اور سنسان گوشے میں باتوں کی بھنبھناہٹ کے ساتھ ساتھ عنایہ کا چہرہ بھی اس کے سامنے تھا۔ اور اس کی سفید رنگت میں زعفرانی سورج کا عکس جھلکتا دکھائی دیتا تھا۔

یوں لگتا تھا وہ اپنے شہزادیوں والے تخت پہ بڑی چین کی نیند میں گم ہے۔ ہر آواز، ہر پکار، ہر آزار سے قطعی طور پہ آزاد خوش، اور ہلکی پھلکی کسی تنکے کی مانند، جو سبک خرام ندیوں کی ابلق سطح پہ شان سے تیرتا ہو۔

اور اس کے برابر یعنی اس سوئی ہوئی شہزادی کے برابر اس مغرور ملکہ کا بھی تخت موجود تھا۔

وہ ملکہ جو "سلطنت شخصی" کی پوری سلطنت پہ اپنا حکم چلاتی تھی۔ اس کا شفاف چہرہ عمر رواں کی کسی بھی شکن سے بے نیاز تھا۔ وہ آج بھی مغرور اور خوبصورت تھی، لیکن وہ ایسی بدقسمت ملکہ تھی جس کے حسن کو خراج تحسین پیش کرنے والا کوئی نہیں تھا۔

وہ خود کو "دیوی" سمجھتی تھی۔ قابل ستائش ہستی، جس کے حسن کے چرچے کیے جاتے، آج یہ ملکہ اپنے اس "دیوان خاص" میں بالکل تنہا اور بے بس تھی۔

اس کا کوئی پرستار نہیں تھا۔ اور وہ اپنے تمام تر کروفر غرور خشونت اور تاب ناک حسن کے ساتھ ایک "سانحہ" میں دفن ہونے جارہی تھی۔ بیبہ نے کرب سے آنکھیں بند کرلیں۔ وہ آج بھی اس عورت کے چہرے کی طرف نگاہ بھر کے دیکھنے کی تاب نہیں لاسکتی تھی۔ اس کے کان ابھی تک باتوں کی ہلکی بھنبھناہٹوں کو سنتے تھے۔

"مغنائیہ کے دادا چپ تو نہیں رہیں گے۔ کچھ نہ کچھ تو کریں گے۔ ڈاکٹری رپورٹ اور پوسٹ مارٹم تو ضرور ہونا چاہیے۔ آخر پتا تو چلے 'یہ' طبعی موت ہے یا۔" خوبیہ کی آواز غراتی ہوئی تھی۔ پھر اس غراہٹ میں کئی اور آوازیں بھی شامل ہوگئیں۔ کورس میں گاتی اور مگرمچھ کے آنسو بہاتی' یہ بھی سوگ کا انداز تھا۔

"مجھے تو صاف صاف قتل کی واردات لگتی ہے۔ نہ چور نہ مور نہ کوئی ہور۔" ارسل کی دادی نے اپنے موٹے ہاتھوں میں چاندی کے منکوں والی تسبیح گھماتے ہوئے تاریک گوشے میں بیٹھی بیبہ کے بکھرے 'ملگجے' ویران سراپے پہ نگاہ جمائی تھی۔

"قاتل گھر میں ہے 'یہیں کہیں' آس پاس۔" وہ جیسے اپنی مکار آنکھوں کو گھماتی قاتل کی خوشبو سونگھ رہی تھیں۔ اور ان کی نیزے جیسے نگاہوں کا مرکز بیبہ کا نحیف وجود تھا۔

"یہ دھن دولت' کروڑوں کی مالیت کا بنگلہ' گاڑی اور دیا کے ہیرے موتی کا زیور' ان دونوں کے بعد اس ساری وراثت کا مالک کون ہے' یہی نا۔ یہ ساری عمر اس گھر میں رہتی آئی ہے' جس تھالی میں کھایا' اس میں چھید کیا۔ لکھوالو مجھ سے' اسی نے کام تمام کیا ہے۔" انہوں نے فرد جرم عائد کردی تھی۔ انہوں نے ٹھیک ہی کیا۔ بیبہ اسی قابل تھی۔ اور وہ واقعی اسی قابل تھی۔ ڈھیر ساری آوازوں میں ایک اور آواز کا اضافہ ہوا تھا۔ عزہ تھی' جو اپنے آنسو پونچھتی دادا سے کہہ رہی تھی۔

"کیا بیبہ نے یہ کیا؟" اس کے سرسراتے لہجے میں نوکیلی ہوا کی سی کاٹ تھی۔

✿ ✿ ✿

اور اتوار کے روز ابا کچھ ـــــ آم لے آئے تھے۔ پیلے پیلے تازہ لیموں اور ہری مرچیں' اماں اچار ڈالنے کے لیے برآمدے میں بیٹھ گئی تھیں۔ روبی ان کے ساتھ تھی' اور مرچوں کے بیچ میں کٹ لگارہی تھی' جس کے اندر اماں مسالا بھر رہی تھیں۔ اماں کے چہرے پہ گہری سنجیدگی تھی' ماتھے تک ململ کا دوپٹا کیے۔ لبوں پہ کوئی تسبیح پڑھتی ہوئی' ان کے چہرے پہ پریشانی تھی۔ روبی گاہے بگاہے نگاہ ڈالتی اور جھکالیتی۔

"رات تمہارے ابا پوچھ رہے تھے۔ یہ روبا کا آخری سال ہے۔ میں نے کہا' ہاں تو کہنے لگے' اب پڑھائی کا سلسلہ ختم کرواؤ۔" اماں کی سنجیدہ سی آواز کانوں میں اتری تو وہ چونک گئی۔

"پھر آپ نے کیا کہا؟"

"میں نے کہا۔ آپ بسم اللہ کریں۔ کوئی ڈھنگ کا رشتہ ملتا ہے تو کاشف کے ساتھ ہی تمہارا ابھی۔" اماں بولتے بولتے چپ ہوگئی تھیں۔ روبا کے حواس گم ہوئے۔

"اماں! اتنی جلدی بھی کیا ہے۔" وہ ٹھنک کر بولی تھی۔

"جلدی کا ہے کی۔ کاشف کے ساتھ ہی کروں گی۔ پرائی لڑکیاں کہاں برداشت کرتی ہیں۔ نندوں کا وجود تو کھٹکتا ہے۔"

اماں دھیمی آواز میں کہہ رہی تھیں۔ روبی نے گہرا سانس بھرا۔ اگر اماں نے طے کررکھا تھا تو پھر انہیں کون روک سکتا تھا۔ وہ چپ چاپ مرتبان بھرتی رہی۔ لیموں' مرچیں اور آم اور اس کی آنکھوں میں بھی عجیب سی مرچیں گھس رہی تھیں۔ اور آنکھوں کے پار ایک عکس تھا۔ دھندلا اور مٹیالا سا۔ اس کا دل جیسے بند ہونے لگا۔ وہ آنکھوں کی تپش اسے اس وقت

بھی گھبرانے پہ مجبور کررہی تھی۔
معاً گیٹ پہ کسی گاڑی کے رکنے کی آواز سنائی دی اماں کے ساتھ ساتھ روبا بھی چونکی۔ بھائی تو اس وقت آتے نہیں تھے۔ تو پھر کون آیا تھا؟
کچھ ہی دیر بعد دروازے پہ دستک ہوئی۔ اماں اپنی جگہ سے اٹھیں، نلکی پہ ہاتھ دھونے اور "اللہ خیر کرے" کہتی گیٹ پہ پہنچیں، دوسری طرف کاشف بھائی تھے۔ کچھ لدے پھندے سے اماں حیران تھیں تو روبی سخت پریشان، بھائی تو اس وقت گھر آتے ہی نہیں تھے۔
اماں بھائی کے ساتھ ساتھ چلتی برآمدے تک آئی تھیں۔ ان کا چہرہ لال سا تھا۔ جیسے بھائی نے کچھ بتایا ہو۔ جبکہ بھائی نے سارے تھیلے اس کے ہاتھ میں تھمائے۔
"روبا! اچھا سا کھانا بنالو۔ اور دیکھو، کسی اور چیز کی ضرورت تو نہیں؟" بھائی کا انداز مصروف سا تھا۔ اماں پُرسوچ تھیں جبکہ روبی گھبرائی گھبرائی۔
"کون آرہا ہے بھائی؟" اس نے ایسے ہی پوچھ لیا تھا۔ اماں نے چونک کر اسے دیکھا اور پھر خفگی سے بولیں۔
"تمہیں اس سے کیا۔ جاؤ، جو بھائی نے کہا ہے کرو۔" اماں کے ڈانٹنے پہ وہ سامان سمیٹ کر اندر چلی گئی تھی۔ اندر یعنی کچن میں، جس کی کھڑکی برآمدے میں کھلتی تھی، جہاں پہ بھائی اور اماں بیٹھے تھے۔ اور ان کی دھیمی آوازیں کچن میں بہ آسانی دے رہی تھیں۔
"ابا سے ان لوگوں کی چند دن پہلے بات تو ہوگئی تھی، آج اچانک ہی آنے کا پروگرام بن گیا۔ ابا نے مجھے کارخانے میں بلوایا۔" بھائی اماں کو آنے والے مہمانوں کے بارے میں تفصیلات فراہم کررہے تھے۔
روبی کے کان خود بخود کھڑے ہوئے۔
"یہی بات تو سمجھ میں نہیں آرہی کہ اس کے توسط سے آرہے ہیں؟" اماں کی الجھی الجھی آواز نے روبی کو چونکا دیا تھا۔ اس نے گوشت کے شاپر کو سلیب پہ رکھا۔ اب وہ ادھر اُدھر پیاز کاٹ رہی تھی۔
"یہ ابا کو پتا ہے۔" کاشف نے کہا تھا۔
"ابا ہی بلا سبب کچھ طے کرلیا، حتیٰ کہ کھانے پہ بلالیا۔ اور مجھے بتایا تک نہیں، بس سرسری سا ذکر کیا تھا۔" اماں سنجیدہ تھیں۔ اور ابا سے کچھ خفا بھی، بھائی انہیں سمجھا رہا تھا۔
"ابا نے ساری چھان بین کروائی ہے۔ تب ہی انہیں گھر پہ بلایا ہے۔"
"لیکن وہ رسمی سی کارروائی، انہوں نے ہماری بچی تو دیکھی ہی نہیں۔" اماں وہی پرانے خیالوں والی عورت۔ روبا کا دل دھک سے رہ گیا تھا۔ تو کوئی اسے دیکھنے کے لیے آرہا تھا۔
"انہوں نے روبا کو دیکھ رکھا ہے تب ہی تو آرہے ہیں۔" بھائی کی اطلاع نے اماں کے ساتھ ساتھ روبا کو بھی حواس باختہ کردیا تھا۔
"اور وہ رشتہ ڈالیں گے۔ رسم کرنے آئیں گے۔" بھائی نے انہیں ششدر کیا اور اٹھ کر نہانے چلے گئے تھے۔ اماں برآمدے میں اکیلی بیٹھی رہ گئی تھیں۔ سوچوں میں گم اور حیران۔
"یہ کاشف کے ابا بھی نا، بیٹیوں کے رشتے بھلا ایسے طے کیے جاتے ہیں۔"
اماں کی بڑبڑاہٹ روبی کو کچن میں سنائی دیتی تھی، اور اس کا دل جلتے ہوئے چولہے کی تپش جیسی آنچ دیتا تھا۔ وہ گہری بولتی آنکھیں اس کے گرد حصار کھینچتی تھیں۔
راہ چلتے اس مسافر کی گہری آنکھوں کا قیام اس کے دل میں بس گھڑی بھر کے لیے ہی تھا۔
وہ اس حقیقت کو چند ساعتوں میں ہی سمجھ گئی تھی۔ اس نے تسلیم کرلیا کہ دل میں اٹھتی یہ ہلکی ہلکی تپش ابا کے کیے گئے فیصلوں کے سامنے کوئی معنی نہیں رکھتی۔
وہ ہنڈیا میں چمچہ ہلاتی بے آواز بڑبڑائی تھی۔ "جو ابا چاہیں، جو ابا چاہیں۔"

☆ ☆ ☆

سورج اور گرمی کا میل چل رہا تھا۔ دن کا دوسرا پہر تخت پہ گرمی جسم کا لہو نچوڑتی تھی۔

درخت تک ساکت 'خاموش اور خشک دکھائی دیتے۔ پرندے ڈالیوں اور شاخوں میں منہ چھپائے اونگھتے تھے۔ آب خورے خشک تھے۔ اور چڑیوں کی کٹوریاں خالی۔

"جانے روبا کیسے بھول گئی۔" وہ برآمدے کے تخت سے اٹھیں' پیروں میں چپل اڑسی اور ٹھنڈا پانی گھڑے سے نکال کر دھلے ہوئے آب خوروں میں پانی ڈالا۔ پھر باجرے سے مٹی کی کٹوریاں بھر دیں۔

معاً" انہیں باورچی خانے سے سسکی کی آواز آئی۔ ہلکی سی سسکی۔ جیسے رونے کی کوشش میں ہونٹوں کو زبردستی ایک دوسرے میں پیوست کیا گیا ہو۔

روبا کی ماں کا دل کپکپا سا گیا تھا۔ وہ تیزی سے باورچی خانے کی طرف بڑھنے لگیں۔ دل میں وہم سا آیا تھا کہیں روبا نے خود کو جلا نہ لیا ہو' بے دھیان بھی تو بہت تھی۔

وہ کچن کی دہلیز پہ آکر کھڑی ہوئیں تو روبا کی آواز نے انہیں ساکت کر دیا تھا۔

"جیسے ابا چاہیں۔" وہ بار بار ایک ہی جملے کو دہراتی تھی۔ اور اس کی سسکیاں؟ اماں کا دل پہلو میں تڑپ اٹھا۔ انہیں آن کی آن میں معاملہ سمجھ میں آگیا تھا۔ روبا نے ان کی باتیں سن لی تھیں' اور اب اسی تناظر میں رو رہی تھی۔ کتنا چھوٹا سا دل تھا ان کی بیٹی کا۔ ان کا دل ممتا کے احساس سے لبالب بھر گیا۔

"روبا! کیسی نادان ہو بیٹی! کوئی ایسے بھی روتا ہے' ابا یہ تو نہیں چاہیں گے کہ ابھی کے ابھی تمہارا ہاتھ آنے والے مہمانوں کے ہاتھ میں دے کر چلتا کر دیں۔ ابھی تو صرف بات چلے گی بیٹی! تم نے دل ہی چھوڑ دیا؟" اماں کی نرم آواز پہ اس کا دل اچھل کر حلق میں آگیا تھا۔ اماں جانے کب وہاں آئی تھیں۔

اس نے سر جھکا لیا۔ اور ہنڈیا میں ڈوئی گھماتی رہی۔

"سکون سے کھانا پکاؤ بیٹی! اور دھیان رہے بھائی گھر پہ ہے' تمہارے آنسو اسے چونکا دیں گے۔" اماں کی نرم سی محتاط تنبیہہ' اس کی زمانہ ساز' معاملہ فہم اور ذہین ماں۔

"جوان بھائیوں کی عقل کا پردہ پتلا ہوتا ہے بلاوجہ بھی پھٹنے میں دیر نہیں کرتا۔"

عام سے لہجے میں اتنا گہرا سبق' روبی کا سر جھک کر گھٹنے سے جا لگا تھا۔ اس نے ماں کا دیا گیا سبق سمجھ لیا تھا۔ اور پلو سے باندھ لیا۔ اور اماں تو اسے وقتاً" فوقتاً" ٹوکتی اور سمجھاتی رہتی تھیں۔ اوائل عمری سے لے کر اب تک ایک ہی سبق تھا۔ ان کا ٹوکنا اور ممانعت سر شام چھت پہ نہ جانے دیتیں۔

"بھوت پریت کا وقت ہوتا ہے۔ خلائی مخلوق سفر میں ہوتی ہے چھت پہ نہیں جانا۔"

وہ گرمی کی شدت اور حبس سے گھبرا کر اکثر سہ پہر کے بعد چھت پہ جانے کے لیے مچلتی تو اماں کی نرم سی تنبیہہ اس کے قدم روک لیتی تھی۔ کبھی وہ مان لیتی اور کبھی اندر ہی اندر جھنجلا جاتی تھی۔ تاہم ظاہر نہ کرتی۔

"جانے یہ کون سی خلائی مخلوق ہے' جو مجھے نظر نہیں آتی؟ اماں کو دکھائی دیتی ہے۔ ہونہہ' سارے لوگ تو چھتوں پہ چڑھتے ہیں اس وقت اور لوگوں کی جوان بیٹیاں بھی' یہ خورشید خالہ کی شہنا' یہ رہتی ہے پورا دن چھت کے اوپر۔ گلی میں لٹک رہی ہوتی ہے۔ اس کو آج تک کوئی بھوت نہ لے اڑا۔" وہ اندر ہی اندر بل کھاتی تھی اور کبھی منمناتے ہوئے کہہ بھی دیتی۔

"اماں! شہنا لوگ بھی تو چھت پہ چڑھتی ہیں۔ سارا وقت وہ ریلنگ پہ ٹنگی رہتی ہے۔"

اماں اس کی دلیل پہ عینک کے اوپر سے گھور کر دیکھتیں اور سلائی مشین کے پرزوں کی صفائی میں مگن ہو جاتیں۔

"شہنا کے بھائی تو اسے نہیں ٹوکتے۔" وہ مشین کا تیل

سوراخوں کے اندر ڈالتی بڑی مصروف نظر آتی تھیں۔

"اور تمہارا بھائی پسند نہیں کرتا۔ تمہارا چھت پہ چڑھنا۔" اماں کے انداز میں نرمی ہوتی تھی۔ وہ بہت کم روبا کو ڈانٹتی تھیں۔ بلکہ ڈانٹتی ہی نہیں تھیں، دراصل روبا نے کبھی ڈانٹ کھانے والا کام ہی نہیں کیا تھا۔

اگر بھائی پسند نہیں کرتے تو اسے بھائی کی پسند کا خیال رکھنا چاہیے۔

دل میں خوف سا بیٹھ گیا تھا۔ اور وہ دن کے وقت بھی چھت پہ نہیں جاتی تھی۔ پھر دو ہفتے بعد محلے سے اڑتی اڑتی ایک خبر روبا کے کانوں سے ٹکرائی تھی۔

"شہنا پہ بھوت آ گئے تھے۔"

روبا نے سنا تو دھک سے رہ گئی۔ یعنی اماں کا کہا جھوٹ نہیں تھا۔ اماں نے سچ بولا تھا۔ اور اماں کا تجربہ غلط نہیں ہو سکتا تھا۔ اس دن اماں تکیوں سے روئی نکال کر صحن میں رکھے چرخے پہ روئی کات رہی تھیں۔ روبی سہمی سہمی سی اماں کے قریب رکھی دری پہ بیٹھی سر ہلا ہلا کر سبق یاد کرتی تھی مگر اس کا سارا دھیان خالہ خورشید کی آہ و بکا کی طرف تھا۔ وہ اماں کے پاس بیٹھی رو رہی تھیں۔

ہائے میری جوان بچی، اتنے پیروں فقیروں کو دکھایا پر کوئی افاقہ نہیں۔ بال نوچتی ہے اپنے، بازوؤں میں دانت کھبوتی ہے۔ اپنی بوٹیاں نوچتی ہے۔ چلاتی ہے، دیواروں سے ٹکریں مارتی ہے۔ میں کدھر جاؤں آپا جی! اسے کس کو دکھاؤں۔

اماں نے چرخے سے نگاہ ہٹا کر اک نظر روبا کو دیکھا اور آنکھ کی پتلی سے اشارہ دیا۔

"خالہ کے لیے شربت بنا لاؤ۔"

یہ واضح اسے وہاں سے ہٹنے کا اشارہ تھا۔ اماں نہیں چاہتی تھیں کہ روبا خالہ خورشید کا واویلا سنے۔ وہ بھرے دل کے ساتھ کتاب دری پہ رکھ کر باورچی خانے میں آ گئی تھی۔ لیکن اس نے شربت کے لیے پانی میں چینی گھولنے سے پہلے صحن میں کھلنے والی کھڑکی کا ایک پٹ ضرور کھول دیا تھا۔

اسے اماں کا جواب سننے کی بے چینی تھی اور اماں دھیمی آواز میں کاتی ہوئی روئی کو گانٹھ میں باندھتی آہستگی سے بولیں۔

"وہاں ہوتا ہے؟ تو وہاں طبیب، حکیم، فقیر، پیر سب کچھ خود ہی ہوتی ہیں۔ اس کا "مرض" اکیلے میں پوچھو۔ سارے "بھوت" اتر جائیں گے۔"

اماں کے جواب نے زمانہ ساز خالہ خورشید کے بند دماغ کی کھڑکی کھول دی تھی۔ اور اس دن خالہ خورشید شربت پیے بغیر ہی اٹھ کر چپل گھسیٹتی اوڑھنی کی بکل مارے نکل گئی تھیں۔

اور اسی رات خالہ خورشید نے سارا پیار دلار بھلا کر ڈنڈے کے زور پہ اس "جن" کا پتا لگا لیا تھا۔ پھر اس سے اگلے دن ایک عجیب واقعہ ہو گیا۔ شہنا اسی "جن" کے ساتھ رات کی تاریکی میں خالہ خورشید کا "رانی ہار" تجوری سے چرا کر گھر سے بھاگ گئی تھی۔

اس شب روبا کی اماں کا چہرہ بڑا ہی تاریک رہا۔ وہ تسبیح کے منکے گراتیں اور روبا کے چہرے پہ پھونک مار دیتیں۔ اسی رات روبا پہ بھی ایک عجیب انکشاف ہوا تھا۔

اور اسے بھوت پریت کی حقیقت کا پتا چل گیا۔ یہ خلائی مخلوق کیا تھی؟ اور کس طرح آنگن کی سیدھی سادی پریوں کو ورغلا کر اپنے قبضے میں کرتی، پھر ان کے سنہرے پر کترتی اور انہیں زمین کے اندر دھنسا دیتی۔ ٹھیک ایک مہینے بعد شہر کے گندے نالے سے شہنا کی مسخ شدہ لاش کو اس کے لاپروا بھائی اٹھانے کے لیے نکل گئے تھے اور اماں نے اس دن زیر لب بڑبڑا کر کہا۔

"جوان ہوتی بہنوں کے بھائیوں کو ایسا لاپروا نہیں ہونا چاہیے۔" اماں کی آنکھ سے آنسو کا ایک قطرہ گرا اور ان کے ململ دوپٹے کی نمی میں جذب ہو گیا۔ وہ تخت پوش پہ کھڑی تھیں۔ پاؤں کے نیچے جا نماز تھی۔

"کہ بہنوں کی ڈولی اٹھانے کے بجائے ان کے جنازوں کو کندھا دینا پڑے۔" انہوں نے بات مکمل

کر کے نماز کی نیت باندھ لی۔

☼ ☼ ☼

ہنڈیا میں ڈوئی گھماتی روبا نہ جانے سوچوں کے کس سفر پہ نکل گئی تھی۔ چونکی تو تب تھی جب خوشبو کا ایک تیز جھونکا اس کے آس پاس بکھر آیا۔

روبا ہڑبڑا کر جیسے نیند سے جاگی تھی۔ پھر اس نے باورچی خانے کے چوکھٹے میں کھڑے نکھرے ستھرے ترو تازہ سے بھائی کو دیکھا۔ اس کا بانکا سجیلا بھائی اپنی متانت اور سنجیدگی کے ساتھ بڑا ہی خوبرو لگتا تھا۔ روبا کی آنکھوں میں ستائش سی بھر گئی تھی۔

"کس سوچ میں گم تھیں روبا! دیکھو تو کڑاہی پیندے سے جلنے لگی۔ کچھ "بو" بھی محسوس ہوئی ہے۔" بھائی کے احساس دلانے پر روبی نے جلدی سے آنچ دھیمی کی تھی اور کڑاہی میں پانی کا چھڑکاؤ بھی دیا۔ پھر کھانا بھی تیار ہو گیا تھا اور ابا بھی کارخانے سے واپس آگئے تھے۔ اب نہا دھو کر نماز ظہر ادا کر رہے تھے۔ پھر مہمانوں کی آمد کا وقت ہو جاتا۔

اماں نے روبا کو بھی ترو تازہ ہونے کا اشارہ دیا تھا۔ اور وہ شاور لے کر پنکھے کے نیچے اپنے لانبے بال سکھا رہی تھی۔ جب ایک نئی نکور گاڑی ان کے گیٹ پہ آ رکی۔

بھائی' ابا کے اشارہ کرنے پہ مہمانوں کو ریسیو کرنے چلے گئے تھے۔ ان کے پیچھے ابا بھی..... آنے والے مہمانوں کو بیٹھک میں بٹھایا گیا تھا۔ اور پھر مشروبات سے ان کی تواضع کی گئی۔ بھائی' اماں کو بتا رہے تھے۔

"مہمان خاتون صرف ایک ہیں اور ساتھ ان کا بیٹا بھی ہے۔ مجھے اچھا نہیں لگا کہ وہ گاڑی میں ہاں کا انتظار کرتا۔ میں اسے بیٹھک میں لے آیا ہوں۔ اسی بہانے آپ کی ملاقات بھی ہو جائے گی۔ اور وہ روبا کو بھی دیکھ لیں گے۔" اس کا تنک مزاج بھائی اس لمحے بڑا حلیم اور بردبار نظر آ رہا تھا۔

اماں سنجیدگی سے سر ہلاتی بھائی کے ہمراہ بیٹھک میں چلی گئی تھیں۔ اور روبا وہیں تخت پہ خاموشی سے ڈھے گئی۔ اس کی ساری ہمت دھیرے دھیرے جواب دے رہی تھی اور وہ آنے والے وقت کی تکلیف کو اپنی رگوں میں اترتا محسوس کر رہی تھی۔ معاً اماں بیٹھک سے دھیمی چال چلتی باہر کو آئیں۔ اس حال میں کہ ان کا چہرہ جذبات کی سرخی سے تمتما رہا تھا۔ پھر انہوں نے بے دم بیٹھی روبا کا کندھا نرمی سے ہلایا۔ وہ چونک کر ماں کی طرف دیکھنے لگی تھی۔ اماں نے اس کی موہنی سی صورت دل میں اتارتے ہوئے پیشانی پہ والہانہ سا بوسا دیا۔ وہ اماں کے پیار کی وجہ سمجھنے سے قاصر تھی۔

"میری بیٹی نے بڑا اعلا نصیب پایا ہے۔ آؤ' میرے ساتھ بیٹھک میں..... تمہاری ہونے والی ساس شگن کی رسم ادا کرنا چاہتی ہیں۔"

"اماں!" وہ رو دینے کو تھی اور اماں اس کی گھبراہٹ کو شرم پہ محمول کر رہی تھیں۔

"میں تمہارے ساتھ ہوں۔ پھر پریشان کیوں ہوتی ہو۔ اطمینان رکھو روبا! تمہارے والدین بہتر فیصلہ کریں گے۔" اماں نے شاید اس کے تذبذب کی وجہ جان لی تھی۔ یا انہوں نے بے ارادہ ہی بات کی تھی۔ تاہم روبا کا سر نہ جانے کیوں جھک گیا تھا۔ شاید اس خیال سے کہ اماں نہ جانے کیا سمجھتی ہوں۔

اور جب وہ بیٹھک میں آ رہی تھی تو اسے اماں کی کہی بات کا یقین ہو گیا تھا۔ اماں نے کبھی اس کے لیے غلط فیصلہ نہیں کیا تھا اور اماں جو کہتی تھیں ٹھیک ہی کہتی تھیں۔ افراہیم کی ماں جب اس کی ملیح پیشانی چومتے ہوئے انگوٹھی پہنا رہی تھیں تو روبا کو اپنی قسمت پہ رشک آیا تھا۔

جن نگاہوں کی تپش اسے تنہائی میں بھی گرمی کا تاپ چڑھا دیتی تھی۔ وہ نگاہیں مسلسل اس کا طواف کر رہی تھیں۔ وہ افراہیم کی مدھ بھری خوب صورت آنکھیں۔ شہد سے بھری۔ بلوریں کانچ سی اور اس کی شہابی رنگت اور ہونٹوں کا تل' پیشانی پہ بکھرے لہریے دار بال۔ اس کے پاس حسن کا خزانہ تھا جو کسی عورت کے پاس ہوتا تو جانے کیا ہوتا؟ روبی کو اپنا دل سنبھالنا مشکل تھا۔ دشوار تھا۔ ناممکن تھا۔

اور پھر اناد یہ کے اس چچازاد سے اس رسمی دعوت میں روبا صداقت کی منگنی ہو گئی تھی اور دو مہینے بعد شادی ہونا قرار پائی تھی۔

☆ ☆ ☆

جون کی طویل دوپہروں میں کالج سے ہونے والی موسم گرما کی چھٹیاں ایک عذاب بن کر اس پہ نازل ہوئی تھیں۔ کالج نہ جانے کا مطلب تھا۔ پورا دن گھر میں رہنا اور آنٹی فرزانہ کی چاکری کرنا۔ گھر کے ان گنت کام' عذاب اور ایک وبال۔ ابا کام پہ نکل جاتے تھے اور ناصر عشق لڑانے۔ آوارہ گلیوں میں گھومنے' بے کار وقت ضائع کرنے۔ آنٹی فرزانہ ان دنوں بے زار بوجھل اور شدید بیمار دکھائی دیتیں۔

اس دن اناد یہ تیسری سیڑھی کے قدمچے پہ بیٹھی طشتری میں ڈالے چاول چنتی انتہائی بے زاری اور تلخی سے بولی تھی۔

"کیا ضرورت تھی۔ اس عمر میں عذاب ڈالنے کی۔ خود بھی مصیبت میں ہیں اور دوسرے بھی۔۔۔"

اس کا لہجہ بے زار' روکھا اور کسی قدر نفرت سے لبریز تھا۔ آنے والا وجود ابھی سے ہی اناد یہ کی نفرت کے نشانے پہ تھا۔ فرزانہ نے آنکھوں میں اتری نمی کو پی لیا۔ لیکن ایک لفظ بھی جواب میں نہ کہا۔ تاہم برابر والے گھر کے صحن میں بیٹھی افراہیم کی ماں نے اناد یہ کی بات پہ "استغفار" کے کلمات ضرور کہے تھے۔ وہ افراہیم کے سفید کرتوں کو کلف لگا رہی تھیں اور ساتھ اناد یہ کی گل افشانی سے مستفید بھی ہو رہی تھیں۔ ساتھ والے گھر سے آوازیں ان کے صحن' برآمدے اور کچن میں بنا رکے چلی آتی تھیں۔ کیونکہ ساتھ والے گھر کے دونوں "نافرمان" بچوں کو آہستہ بولنے اور اپنے بزرگوں سے نرم لہجے میں بات کرنے کی کوئی تمیز نہیں تھی۔

"ویسے فرزانہ آنٹی! آپ کو خود سے خیال کرنا چاہیے تھا۔ مردوں کو ان باتوں کی کیا سمجھ۔۔۔ آپ کو خود احتیاط کرنی تھی۔ کل ناصر بھی کہہ رہا تھا۔ اس عمر میں اسے ایک منے سے بچے کا بھائی بنناذرا بھی اچھا نہیں لگے گا۔" اناد یہ کے اگلے الفاظ نے جہاں آنٹی فرزانہ کو بت بنایا تھا۔ وہیں افراہیم کی امی کا چہرہ لال سرخ ہو گیا۔

"ایسی بے حیائی کی بات۔۔۔ وہ بھی کنواری بچی کے منہ سے۔"

انہوں نے ناگواری کی شدید لہر دل میں اٹھتی محسوس کی تھی اور اس کی مزید بکواس سے مستفید ہوئے بغیر اٹھ کر اندر چلی گئیں۔

وہ پچھلے دو دن سے تذبذب کا شکار تھیں۔ ایک فیصلہ تھا جو عمل سے کوسوں دور لگتا تھا۔ لیکن لمحوں میں ہو گیا۔ افراہیم کے لیے انہوں نے بارہا اناد یہ کا سوچا تھا۔ اس کا تابناک حسن کسی اور لڑکی کی طرف دھیان جانے ہی نہیں دیتا تھا۔ پھر رشتہ داری بھی تھی۔ انہیں جیٹھ کے بوجھ کا بھی خیال آتا۔ "وہ کیا سوچیں گے۔ گھر کی بیٹی چھوڑ کر باہر سے بہو اٹھا لائی۔" وہ اپنے خدشات افراہیم کے سامنے بیان کرتیں تو وہ آرام سے انہیں مشورہ دیتا تھا۔

"اپنوں کے بوجھ بانٹنے کے چکر میں اپنے بیٹے کا کچومر مت نکل دیجئے گا۔ سنیں امی! اناد یہ کے پاس کچھ نہ ہوتا اور ایک اچھی زبان اور اخلاق ہوتا تو میں تایا کے اس بوجھ کو بخوشی اٹھا لیتا' لیکن اب ممکن نہیں ہے۔"

افراہیم کا اناد یہ کے لیے ہمیشہ سے انکار تھا۔ اور سب سے بڑی بات یہ تھی کہ بیٹے نے خوبیوں کے ترازو میں کبھی حسن اور خوب صورتی کو نہیں تولا تھا۔ اگر ایسی بات ہوتی تو روبا پہ اس کی نگاہ کبھی نہ ٹھہرتی۔ روبا' اناد یہ کی سہیلی تھی۔ جو اپنی ماں کے ساتھ اناد یہ کا رشتہ لینے آئی تھی۔ جسے دروازے پہ افراہیم نے دیکھا اور پسند کر لیا تھا۔

امی کو سانولی سلونی' سادہ نقوش' نرم مزاج اور میٹھی طبیعت کی روبا بھا گئی تھی۔ سب سے بڑھ کر اس کی نیک ماں اور شریف باپ۔۔۔ چھوٹا سا خاندان۔ انہیں اور کیا چاہیے تھا۔ پھر افراہیم کی خواہش بھی تھی۔

انہوں نے اللہ کا نام لے کر بسم اللہ کی۔ ان کے بیٹے کو انکار کسی طور بھی نہیں ہو سکتا تھا۔

وہ اس وقت اپنے خاندان کا پہلا، اپنے محلے کا پہلا پڑھا لکھا لائق فائق قابل ترین کمشنر تھا۔ ڈپٹی کمشنر۔ سب سے بڑھ کر شریف اور اکلوتا۔

روبا کے ابا نے اپنی تسلی کر کے "ہاں" کر دی تھی۔

وہ شگن کے طور پر انگوٹھی بھی پہنا آئی تھیں۔ اور ابھی کچھ دیر پہلے چم چم کا ڈبا دیوار پار فرزانہ کو پکڑایا تھا۔ جس ابھی تک شاید انادیہ کی نگاہ نہیں پڑی تھی۔ ورنہ یہ ممکن نہ تھا کہ وہ افراہیم سے دو دو ہاتھ کرنے نہ آتی؟

انادیہ کی لمبی زبان کے جوہر دیکھتی، وہ خدا کا شکر ادا کر رہی تھیں کہ ایک بروقت فیصلہ ان سے ہو سکا۔

دھوپ دیواروں پہ سمٹ رہی تھی۔

اس نے چاولوں سے بھری طشتری اٹھائی اور سیڑھیاں اتر کر نیچے آگئی۔ کنکر تھالی میں پڑے تھے۔ جو اس کا پیر لگنے سے فرش پر بکھر گئے تھے۔ انادیہ نے مڑ کر سمیٹنے کی کوشش گوارا نہ کی تھی اور جلتی بھنتی کچن میں آگئی۔ آج کل باورچی خانے کا سارا "بار" اس کے ناتواں کندھوں پہ دھرا تھا۔

"ہونہہ... جیسے اٹھارہ سال کی دوشیزہ ہو۔" انادیہ نے غصے میں سر جھٹکا اور فریج سے دودھ نکالنے لگی۔

"پہلے شیک پیوں گی۔ پھر ہانڈی کا سیاپا کروں گی۔ ارے یہ آم کدھر گئے؟ روز ابا لاتے ہیں اور روز ختم... ہونہہ... لاڈو رانی کچھ چھوڑے گی تو بچے گا نا۔ دنیا سے نرالا بچہ پیدا کرے گی۔" اس کی بڑبڑاہٹ اتنی اونچی تو تھی جو فرزانہ تک بہ آسانی پہنچ گئی۔ ان دنوں تو وہ اس قدر شرمندہ ہوتی تھی کہ کم ہی کمرے سے باہر آتی۔ اوپر سے انادیہ اسے شرمندہ کرنے کا کوئی موقع نہ چھوڑتی۔

انادیہ کی زبان دن بہ دن خنجر کی دھار جیسی ہوتی جا رہی تھی۔ یا شاید یہ کہنا مناسب تھا کہ زبان خنجر ہی تھی۔ اس کی دھار دن بہ دن تیز ہوتی جا رہی تھی۔

"مجھ سے یہ "گھرداری" کے سیاپے نہیں ہوتے۔ ابا سے کہتی ہوں۔ کسی نوکر کا بندوبست کریں۔ میں اس "چاکری" سے ریٹائر ہوں۔" آم نہ ملنے کا سارا غصہ فریج کے دروازے پہ نکالا تھا۔

معاً" دھیرے دھیرے چلتی فرزانہ کچن میں آگئی تھی۔ اسے دیکھ کر انادیہ نے دانتوں تلے بے ساختہ زبان دبائی۔ پیٹھ پیچھے بھڑاس نکالنا اور بات تھی اور سامنے اور...

"تم جاؤ... آرام کرو۔ صبح سے لگی ہو۔ کھانا میں بنا لیتی ہوں۔" فرزانہ نے اس کا ترش انداز دیکھتے ہوئے بھی نرمی کا مظاہرہ کیا تھا۔ انادیہ کی خوب صورت پیشانی شکن آلود ہو گئی۔

"تاکہ ابا آپ کو کچن میں کام کرتا دیکھ لیں۔ اور سارا نزلہ مجھ پہ آگرے۔" انادیہ کے تلخ الفاظ پہ فرزانہ ہکا بکا رہ گئی تھی۔ وہ کہاں تک سوچوں میں نکل جاتی تھی؟ خدا کی پناہ... فرزانہ نے یہ سوچا بھی نہیں تھا۔

"میں ان سے کہہ دوں گی۔ تم فکر نہ کرو۔" فرزانہ کا وہی پرُتحمل نرم لہجہ...

"آپ کیا کہہ دیں گی؟ یہی نا" آپ کی بیٹی سارا دن پلنگ توڑتی ہے۔" انادیہ غصے سے چیخی۔

"یہ تم کیا فضول باتیں سوچتی ہو گڑیا۔ میرا ہرگز یہ مقصد نہیں۔" فرزانہ کو اسے سمجھانا ہمیشہ مشکل لگتا تھا۔ وہ بچپن سے ایسی ہی تھی۔ ضدی، ہٹ دھرم، بدتمیز اور منہ پھٹ بھی۔ کچھ باپ کے بے جا لاڈ نے اسے خود سر بنا دیا تھا۔ بھائی بھی ایسا ہی تھا۔ جس کا کوئی رعب ہی نہیں اور انادیہ کسی سے ڈرتی بھی نہیں تھی۔ فرزانہ جب بھی سمجھانے کی کوشش کرتی۔ قاضی صاحب کی پدرانہ شفقت آڑے آجاتی تھی۔

"بچی ہی تو ہے۔ سمجھ جائے گی۔ ماں کا پیار نہیں دیکھا نا... بس اسی کمی نے ضدی بنا دیا۔" وہ انادیہ کے معاملے میں حد سے زیادہ نرم تھے اور اس کی چھوٹی چھوٹی بدتمیزیوں کو نظر انداز کر دیتے تھے۔ حالانکہ فرزانہ دیکھ رہی تھی۔ انادیہ دن بہ دن کتنی بدمزاج، موڈی اور نخریلی ہوتی جا رہی تھی۔ فرزانہ سختی بھی نہیں کر سکتی تھی۔ ورنہ سوتیلے پن کا لیبل لگ جاتا۔

فرزانہ کا چاول پکانے کا ارادہ دیکھ کر انادیہ گول

کمرے میں آ گئی، وہاں تپائی کے اوپر چم چم کا ڈبا رکھا تھا۔ اس کی آنکھوں میں الجھن کے ساتھ بھوک بھی چمک گئی۔ چم چم اس کی پسندیدہ مٹھائی تھی۔ ایک پیس اٹھا کر منہ میں رکھا۔

پھر وہ کچن کی طرف آئی تھی۔ جہاں پہ فرزانہ اپنی نازک حالت کے ساتھ پسینے میں تر تڑکا دال بنا رہی تھی۔ انادیہ نے کچن سے باہر کھڑے کھڑے ہی دریافت کیا۔

"یہ مٹھائی کہاں سے آئی ہے۔ بڑے مزے کی ہے۔"

فرزانہ نے ماتھے پہ آیا پسینہ پونچھ کر انادیہ کا چہرہ دیکھا۔ وہ مگن سی ڈبے میں سے چم چم نکال کر کھا رہی تھی۔

"تمہیں نہیں پتا؟" فرزانہ الجھی نظروں سے اسے دیکھتی رہی۔ اسے کیوں نہیں پتا تھا؟ افراہیم کی منگیتر انادیہ کی سہیلی تو تھی۔

"کیا نہیں پتا؟" انادیہ نے چونک کر پوچھا۔ فرزانہ کے انداز میں کچھ غیر معمولی پن تھا۔ جو اسے بری طرح سے کھٹکا تھا۔

"تمہاری چچی نے افراہیم کی بات طے کر دی ہے۔ یہ اسی کی مٹھائی...." اس کا سانس سینے میں اٹک گیا تھا۔

"کس سے بات طے ہوئی؟" کچھ دیر بعد وہ اپنا سرخ چہرہ دوپٹے سے تھپتھپاتی کچن میں تھی۔ فرزانہ کو بتانا پڑا۔

"تمہاری سہیلی روبا سے...." فرزانہ نے تو آرام سے بتایا تھا۔ لیکن انادیہ کے سر پہ دھماکا ہوا۔ وہ ہکا بکا رہ گئی۔ منہ حیرت سے کھل گیا۔ اتنی بڑی بات؟ اتنی اچانک۔۔۔

اتنا کچھ ہو گیا اور اسے پتا ہی نہ چلا۔ اس گھنی میسنی روبا نے پورا میدان مار لیا۔

وہ چم چم کا ڈبا اٹھائے عجیب و غریب تیور لیے چھت پہ چڑھنے لگی تھی۔ ادھر فرزانہ ہکا بکا۔ وہ کیا کرنے جا رہی تھی؟ کیا مٹھائی واپس؟

نیچے فرزانہ کچن میں کھڑی ہولتی رہی۔

اور اوپر انادیہ مٹھائی کا ڈبا کھولے ساری مٹھائی کو ہاتھ میں چور چور کر کے ملیدہ کرتی عجیب ہیجانی غصے کا شکار تھی۔ پھر اس نے برابر والی چھت پہ جھانکا۔ چھت سنسان تھی۔ نیچے افراہیم کی سرکاری جیپ بھی نہیں تھی۔

اس نے سوچ کر ڈبا ہوا میں اچھالا اور ساری مٹھائی کو ان کی چھت پہ پھینک کر ہاتھ جھاڑتی نیچے چلی آئی۔

ابھی وہ تیز قدموں سے نیچے آ ہی رہی تھی، جب اچانک عجیب سے شور نے اسے گھبرانے پہ مجبور کر دیا۔ اس نے تیزی سے بنیرے کے اوپر سے نیچے جھانکا۔ سیڑھیوں کے پاس فرزانہ گری ہوئی تھی۔ اور اب پوری شدت کے ساتھ کراہ رہی تھی۔ انادیہ ہکا بکا رہ گئی۔ فرزانہ کیسے گری؟ اور اس کا گرنا کچھ ٹھیک بھی نہیں تھا اور اس حالت کے پیش نظر؟

اسے کچھ نہ سوجھا اور وہ وہیں کھڑے کھڑے سوچنے لگی۔ پھر اس کی نظر فرش پہ بکھرے کنکروں پہ پڑی تھی۔ جنہیں انادیہ نے اپنی لاپروائی کی وجہ سے اٹھانا ضروری نہیں سمجھا تھا اور ان ہی کنکروں سے فرزانہ کا پاؤں پھسلا تھا اور وہ منہ کے بل اوندھی گر پڑی تھی۔

وہ سوچوں میں اس قدر گم تھی کہ اسے برابر والے گھر سے چچی کے آنے کا پتا ہی نہ چلا۔ چچی شاید فرزانہ کی تکلیف دہ کراہوں کو سن کر بھاگی بھاگی آئی تھیں۔ اور ان کے پیچھے افراہیم بھی تھا۔ جس کی سرکاری جیپ گلی میں کھڑی تھی۔ وہ ابھی ابھی اپنے دفتر سے آیا تھا۔ آتے ساتھ ماں کی بھاگ دوڑ پہ پریشان سا ہوا۔ امی کے بتانے پہ اس نے جیپ اسٹارٹ کی اور پھر ان کے پیچھے ہی اندر چلا آیا۔

"ان کو تو اسپتال لے جانا ہوگا۔" فرزانہ کی حالت کے پیش نظر افراہیم نے ماں سے کہا۔ جو فرزانہ کو سہارا دے کر پانی پلا رہی تھیں۔ افراہیم نے حیرت سے منجمد کھڑی انادیہ کو دیکھا۔ وہ چھت کے اوپر سے پورا تماشا دیکھ رہی تھی۔ مگر اس نے نیچے آنے کی زحمت گوارا

نہیں کی تھی۔ افراہیم کو وہ ہر گزرے دن سے بڑھ کر "بے حس" لگی۔ کوئی اتنا سنگ دل نہیں ہوتا کہ جو کسی کو تکلیف میں تڑپتا دیکھ کر خاموشی سے تماشا دیکھے۔ مگر انادیہ اپنی طرز کا سب سے منفرد عجوبہ تھی۔

افراہیم نے ماں کے ساتھ سہارا دے کر فرزانہ کو جیپ میں بٹھایا اور سخت نظر چھت کے اوپر منہ کیے پہ کہنیاں ٹکائے کھڑی انادیہ پہ ڈالی اور جیپ کو تیزی سے بھگاتا نظروں سے اوجھل ہو گیا تھا۔ اور جیسے ہی وہ نظروں سے اوجھل ہوا۔ انادیہ کو جیسے ہوش آگیا۔ وہ طرح طرح کے منہ بناتی سیڑھیاں اتر کر نیچے آگئی تھی۔

پہلے جھاڑو پکڑ کر کنکریاں اٹھائیں، پھر کچن میں آکر ادھورے کھانے کو پکانے کے مرحلے سے گزارنے لگی۔

"اب کوئی نئی مصیبت نہ بن جائے۔" انادیہ کو یہی فکر کھائے جا رہی تھی۔ فرزانہ کے خدانخواستہ مستقل بستر پہ پڑنے کی وجہ سے کہیں اس کا کالج جانا نہ بند ہو جاتا؟ اسے بس یہی غم کھائے جا رہا تھا اور فرزانہ کی حالت؟ یا اس کی تکلیف؟ تو وہ جائے بھاڑ میں......

رات بہت دیر بعد ان کی واپسی ہوئی تھی اور فرزانہ کو اپنے پیروں پہ چل کے آتے دیکھ کر انادیہ کی جان میں جان آئی۔ ابا بھی ہمراہ تھے۔ کچھ پریشان اور غم زدہ۔

اس رات ابا کے اصرار پہ افراہیم اور چچی نے ان کے گھر ہی رات کا کھانا تناول کیا تھا اور افراہیم چاولوں کے اس "ملغوبے" کو دیکھ کر سوچ رہا تھا کہ اسے سب کھا کیسے رہے ہیں؟

اس رات افراہیم پہ انادیہ کے "پھوہڑپن" کا بھی انکشاف ہوا تھا۔

اور وہ سوچ رہا تھا کہ اپنی آنے والی زندگی میں انادیہ کہاں تک "اچھی صورت" کا مارجن لے گی؟ بہرحال گھر گرہستی کے بغیر کوئی بھی عورت نامکمل اور ادھوری ہوتی ہے۔ گھر سنبھالنا، عورت کی اولین ذمہ داری ہوتی ہے۔ جس سے انادیہ قطعاً "نابلد" تھی۔

جاتے سے چچی نے بہت بلند آواز میں انادیہ کو سناتے ہوئے کہا تھا۔

"زندگی تھی تو بچ گئی۔ ڈاکٹر نے کہا ہے۔ فرزانہ میں شدید خون کی کمی ہے۔ بچہ بھی کمزور ہے اور ماں بھی۔ اس کی خوراک اور آرام کا خیال رکھیں۔"

چچی کی چبھتی نگاہوں پہ وہ پاؤں پٹختی اندر چلی گئی تھی۔ افراہیم تو کب کا جا چکا تھا۔ چچی بی بی فرزانہ کو ڈھیروں نصیحتیں کر کے چلی گئی تھیں اور انادیہ کو چچی کے خلاف بھڑاس نکالنے کا موقع مل گیا۔

وہ ابا کے پاس باہر چارپائی پہ بیٹھ گئی تھی اور ان کے کانوں میں ہولے ہولے پھونکتی رہی۔

"ویسے بڑی ہمدرد بنتی ہیں۔ اتنا نہیں ہو سکا کہ افراہیم کی بات طے کرتے ہوئے آپ کو ساتھ لے جاتیں۔ آپ افراہیم کے اکلوتے تایا ہیں۔ ابا! ان لوگوں نے اچھا نہیں کیا۔ ویسے تو بڑا "بھائی جی" "بھائی جی" کرتی ہیں۔ اتنے اہم موقع پہ آپ سے مشورہ تک نہیں کیا۔"

ابا نے سر ہلاتے ہوئے اس کی ہر بات تحمل سے سنی تھی۔ پھر دھیمی نرم آواز میں بولے۔

"مشورہ تو کیا تھا۔ اور ساتھ چلنے کے لیے بھی کہا تھا۔ اس دن مجھے کسی ضروری کام سے جانا تھا۔ میں نے معذرت کر لی تھی۔" ابا کے جواب پہ انادیہ کی چتونوں میں تیکھاپن آگیا تھا۔

"اچھا! تو سب کو ہی پتا تھا سوائے میرے۔" اسے بڑا ہی غصہ آیا۔

"ایسی بھی کیا پردہ پوشی۔ میں نے کیا رشتے میں ٹانگ اڑانی تھی؟" وہ جلتی بھنتی اٹھ کر کمرے میں بند ہو گئی تھی اور ابا بے چارے ہکا بکا رہ گئے۔ اس میں غصہ کرنے والی کیا بات تھی۔

اپنے قابل بیٹے کے لیے انہوں نے کسی قابل لڑکی کا انتخاب کر لیا تھا تو اس میں غصہ کرنے والی کیا بات تھی؟

جو بھی تھا۔ وہ اپنی بیٹی کے "گنوں" سے ناواقف نہیں تھے۔

اور اب انادیہ کے مزاج کا تیکھاپن انہیں بھی تشویش میں مبتلا کرنے لگا تھا۔ وہ دن بہ دن غصہ ور، بدزبان اور تلخ ہوتی جا رہی تھی۔ ایسا کیوں تھا؟ یہ انہوں نے تب نہیں سوچا تھا۔ جب وہ لاڈ پیار میں اپنی ہر بات منوا کر فخر سے سب کو دیکھتی تھی۔ تب اس کے انداز میں ایک نخوت ہوتی تھی۔ جیسے کہہ رہی ہو۔ "دیکھا میں سب کچھ کر سکتی ہوں۔"

☼ ☼ ☼

اور یہ اس سے اگلے دن کی بات تھی۔

اس دن سورج میں بھی اتنی تپش نہیں تھی۔ موسم خوش گوار تھا۔ فضا میں نمی کا احساس تھا۔ جیسے کہیں دور پہاڑوں پہ ٹوٹ کے مینہ برسا ہو۔

انادیہ نے سارے "پھیلاوے" سے نگاہ چرائی اور محلے کے آخری کونے میں رہنے والی ناجو سے ملاقات کے بہانے گھر سے نکل گئی۔ ناجو اس کی کوئی بہت گہری سہیلی نہیں تھی۔ بس "ضرورتاً" سہیلی بنی تھی۔ جو وقتاً "فوقتاً" کام بھی آجاتی۔ اکثر انادیہ اسے تب بلاتی تھی جب اس نے کپڑے دھونے کے لیے مشین لگوانی ہوتی یا پھر گندم کی صفائی کا ناپسندیدہ کام کرنا ہوتا۔ ناجو اسے کام کے وقت یاد آتی تھی اور مطلب حاصل کرنے میں انادیہ کو کمال حاصل تھا۔ ناصر اور ابا کے نکل جانے کے بعد انادیہ بھی ناجو کی طرف نکل گئی۔

فرزانہ اس کے چلے جانے کے بعد خود ہی مشین لگا کر کپڑے دھونے لگی۔ انادیہ سے کچھ کہنا سننا بے کار تھا۔ وہ موڈ کے تابع تھی۔ موڈ ہوتا تو کام کرتی، ورنہ جواب دے دیتی۔ جواب دینے کا بھی موڈ نہ ہوتا تو گھر سے نکل جاتی۔ جیسا کہ اس وقت نکل چکی تھی۔

فرزانہ گہری سانس بھرتی اپنے کام میں جت گئی تھی۔ جب پریشان پریشان سی افراہیم کی امی نے دیوار کے پار سے جھانکا۔ بیچ والی دیوار کے دونوں اطراف پہ سیڑھیاں تھیں۔ ایک طرف ان کی سیڑھیاں اور دوسری طرف افراہیم کے گھر کی سیڑھیاں۔ یوں دونوں خواتین آرام سے گفتگو بھی کر لیتی تھیں۔ اور چیزوں کے "لین دین" کا تبادلہ بھی ہو جاتا تھا۔ اچانک افراہیم کی امی کا سر دیوار کے پیچھے سے نمودار ہوا تھا۔ فرزانہ کپڑے الگنی پہ ڈالتی ہوئی قریب آگئی۔

"خیریت بھابھی!" ان کے چہرے پہ اڑتی ہوائیاں دیکھ کر فرزانہ بھی پریشان ہو گئی تھی۔

"ایسی خیریت بھی نہیں۔ بھئی میرا تو دماغ گھوم گیا ہے۔" وہ لال بھبھوکا چہرہ لیے صحن کے آگے تک جھانک رہی تھیں۔

"وہ نواب زادی کہاں ہے؟" ان کا اشارہ انادیہ کی طرف تھا۔

"گھر پہ نہیں ہے۔" فرزانہ نے الجھن آمیز نظروں سے انہیں دیکھا تھا۔ معاً انہوں نے ہاتھ میں پکڑا ڈبا فرزانہ کے سامنے کیا۔

"یہ دیکھو۔"

"کیا ہے یہ؟" فرزانہ کا دل وہم میں پڑ گیا۔ کہیں یہ وہی تو نہیں؟

"افراہیم رات سونے کے لیے چھت پہ گیا تو یہ چم چم کا ڈبا چھت پہ گرا پڑا تھا اور اندر موجود ساری مٹھائی۔ جگہ جگہ چیونٹے اور کیڑے لائنیں بنائے مٹھائی کو چمٹے تھے۔ کچھ ہوائی پرندے لے گئے۔ پورے دو کلو کا ڈبا تھا۔ چیونٹوں سے کہاں ختم ہوتا؟" بھابھی نے مارے غصے اور اہانت کے احساس تلے دب کر ڈبا دیوار کے اوپر پٹخ دیا۔

"یہ لینا نہیں تھا تو اسی وقت میرے منہ پہ دے مارتیں۔ میرے بچے کے شگن کی مٹھائی کی ایسی ناقدری؟" ان کا غصہ اور قلق بجا تھا۔ فرزانہ کا سر شرمندگی کے مارے جھک گیا تھا۔ یہ سب کیا دھرا انادیہ کا تھا؟ مگر وہ انادیہ کے خلاف کوئی بات نہیں کر سکتی تھی۔ بھابھی تو ویسے بھی آج کل انادیہ سے سخت کبیدہ خاطر تھیں۔

"بھابھی! شاید کوئی بلی اٹھا کر۔ کچن کا دروازہ کھلا رہ گیا ہو گا۔" فرزانہ کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ وہ اپنی صفائی کیسے پیش کرے؟ تاکہ بھابھی کو یقین بھی

آجائے۔"

"رہنے دو فرزانہ!" انہوں نے ہاتھ اٹھا کر تلخی سے کہا تھا۔ "جیسے میں جانتی ہی نہیں۔"

"بھابھی! مجھ سے لاپروائی ہو گئی۔ میں نے دھیان نہیں دیا۔" فرزانہ کی منمناتی آواز نے انہیں اور بھی برہم کر دیا۔

"فرزانہ! اس کی غلطیوں پہ پردے ڈالنے کا کوئی فائدہ نہیں۔ میں جانتی ہوں یہ انادیہ نے کیا ہے۔ اسے کس بات پہ غصہ تھا؟ مجھے ابھی تک یہ ہی بات سمجھ میں نہیں آئی۔" وہ کھولتے ہوئے مسلسل متفکر نظر آتی تھیں۔

"شاید آپ نے اسے آگاہ نہیں کیا۔ بلکہ افراہیم نے۔ دونوں میں دوستی بھی تو بہت تھی۔ افراہیم نے اپنی زندگی میں ہونے والی خوش گوار تبدیلی کے بارے میں اسے بتایا نہیں تو۔ شاید یہ اسی بات کا ردعمل تھا۔" فرزانہ نے دھیمی آواز میں اپنے حساب سے وجہ بیان کی تھی۔ جس پہ وہ کچھ دیر کے لیے سوچ میں گم ہو گئیں۔ انہیں لگتا تھا' افراہیم کی خوشی میں یہ بدشگونی اچھی بات نہیں۔

☼ ☼ ☼

"میرے اندر آگ سی لگی ہے۔ دل چاہتا ہے ہر چیز کو بھسم کر دوں۔" وہ غصے میں بل کھاتی ناجو کی ڈیوڑھی میں ادھر سے ادھر چکر لگا رہی تھی۔ ناجو بڑی بھابھی کے فریج سے چوری شدہ آموں پہ ہاتھ صاف کرتی خواہ مخواہ کھانسنے لگی۔

"دھیان رہے... کہیں محبت کی آگ تو نہیں۔" وہ آموں کو اس طرح چوس رہی تھی جیسے زندگی میں پہلی مرتبہ نصیب ہوئے ہوں۔ ایک چھوڑتی' دوسرا پکڑتی۔ البتہ انادیہ نے کٹے ہوئے آم کی ایک قاش بھی نہیں اٹھائی تھی۔

"محبت کرتی ہے میری جوتی... وہ بھی افراہیم سے' ہونہہ... مجھے تو ایک آنکھ اچھا نہیں لگتا۔ اپنی نوکری کا بڑا مان ہے اسے... کہیں کا لاٹ صاحب...." وہ زہرخند ہوئی۔

"تو پھر یہ جلن کیوں؟" ناجو کو اچنبھا ہوا تھا۔ وہ اس کے پھیریاں لیتے وجود کو حیرانی سے دیکھ رہی تھی۔

"اس روبا کی وجہ سے۔ کالی کلوٹی نے کیسی چمکتی قسمت پائی ہے۔ رشتہ میرا لے کر آئی تھی۔ نصیب اپنے چمکا گئی۔" انادیہ نے اپنے شعلے اگلتے دل کی جلن کے اصل سبب کو ظاہر کیا۔

"اس کمینی نے ہوا تک نہیں لگنے دی۔ اور بالا ہی بالا افراہیم سے چکر چلا لیا۔" انادیہ کا جلن کے مارے برا حال تھا۔

"تمہیں اس "چکر" پر جلن ہے؟ روبا کے نہ بتانے پر؟ یا اس رشتے کی وجہ سے؟"

"تینوں پہ۔"

"اس کا مطلب ہے۔ تم افراہیم کے ساتھ کی خواہش رکھتی تھیں؟" ناجو نے اپنی سطحی سی سوچ کے مطابق نتیجہ اخذ کیا۔

"ہرگز نہیں... مجھے وہ ماں بیٹا کسی صورت پسند نہیں۔" وہ ناگواری سے بولی۔

"اگر بات بن جاتی تو پسند آجاتا۔" ناجو نے جیسے مزہ لیا تھا۔

"کبھی بھی نہیں۔" انادیہ نے تنفر سے سر جھٹکا۔

"اس کی ماں کے ساتھ میری ایک دن نہ بنتی۔ اور وہ ماں کا پوچھ بچہ ہے۔ مجھے ایسے مرد پسند نہیں۔ جو ماؤں کی انگلی کسی عمر میں بھی نہیں چھوڑتے۔"

"تو پھر یہ کھولن کیوں؟ روبا کو تمہیں آگاہ کرنے کا کوئی ذریعہ میسر نہ آیا ہوگا۔ کالج کی بھی تو چھٹیاں ہیں۔" ناجو نے پہلی مرتبہ کوئی ڈھنگ کی بات "کھوپڑی" سے نکالی تھی۔ ورنہ اس بیکار مغز میں سوائے شیطانی خیالات کے اور کچھ بھی نہ تھا۔

"ہونہہ' وہ دو ٹکے کی لڑکی۔ میرے افسر کزن کے ساتھ عیش کرے گی' بیگم صاحبہ بن کر۔" وہ تڑخی تھی۔

"اور اس بات سے بھی درگزر کر دوں کہ اس نے اپنی اچھی قسمت سے افراہیم کو حاصل کر لیا تو یہ بات میں ہرگز نہیں بھول سکتی۔ چچی نے میرے منہ پر جوتی

ماری ہے۔" انادیہ کا چہرہ نفرت و غصے کی زیادتی سے بگڑنے لگا تھا۔

ناجو ایک دم اچھل پڑی۔ "افراہیم کی ماں نے؟ کیا واقعی؟ کیسے ماری؟" ناجو کی حیرت سے چنی آنکھیں اور اندر کو دھنس گئی تھیں۔ انادیہ کا چمکیلا چاندی جیسا رنگ لال پڑ گیا۔

"لو کی دم۔۔۔ چچی کی ایسی جرات بھی نہیں کہ حقیقت میں مجھ پہ ہاتھ اٹھائیں۔ میں نے محاورتاً" کہا ہے!!"

"اچھا۔۔۔ اچھا' سمجھ گئی۔ روبا کو تم پر فوقیت دے کر۔" ناجو نے اپنا دومن کا سر ہلایا۔ جیسے ساری بات اس کی سمجھ میں آگئی ہو۔

"اور مجھے چچی کو مزہ چکھانا ہے۔ یہ جتا کر کہ ان کا انتخاب بھی اچھا نہیں۔۔۔ اور مجھے ریجیکٹ کر کے تو بالکل اچھا نہیں۔" اس کی مغلئی آنکھوں میں بھیڑیے کی سی چمک تھی۔ ناجو کو بھی پہلی مرتبہ جھرجھری سی آئی۔

"اس کا مطلب ہوا۔ تمہاری دشمنی چچی سے ہے۔۔۔ افراہیم اور روبا سے نہیں۔"

"ہاں۔۔۔" اس نے سر ہلا دیا۔ جیسے تیزی سے کچھ سوچ رہی ہو۔ کچھ پلان کر رہی ہو۔ حالانکہ پلاننگ تو وہ کر ہی چکی تھی۔ اب تو بس عمل کرنا باقی تھا۔

"لیکن جب آگ لگتی ہے تو شعلوں سے بچتا کوئی بھی نہیں۔" اس کی آواز پھنکار سے مشابہ تھی۔ جیسے کوئی نیلی آنکھوں والی ناگن شوک رہی ہو۔

ناجو اسے دیکھ کر ٹھٹک گئی تھی۔ پھر اس کے اندر تجسس نے انگڑائیاں لیں۔ انادیہ کیا کرنا چاہتی تھی؟ کوئی لڑائی؟ کوئی ڈراما؟ کوئی دھماکہ؟ اسے بڑا ہی مزہ آیا۔ کچھ لوگ ایسے بھی ہوتے ہیں۔ جو "شر" کو پھلتا پھولتا دیکھ کر لطف اندوز ہوتے ہیں۔۔۔ مزہ لیتے ہیں۔۔۔ اور دوسروں کو تکلیف میں دیکھ کر تماشا بنانے والوں کا ساتھ دیتے ہیں۔ کیونکہ "شر" ان کے اندر بھی ایسے ہی انگڑائیاں بھرتا ہے۔ جیسے سانپ کے پیٹ میں زہر اگلنے کا درد۔ جب تک زہر نہ اگلے بے چین رہتا ہے۔

"تم کیا کرنے والی ہو؟" ناجو نے ابلتے تجسس کے ہاتھوں بے چینی سے مرتے ہوئے پوچھا تھا۔

"میں روبا کی بھابھی بننے والی ہوں۔" اس نے ایک دھماکہ کیا اور تن فن کرتی چلی گئی۔ جبکہ ناجو چنی آنکھیں پھاڑے اسے جاتا دیکھتی رہی۔ انادیہ نے بم ہی ایسا پھوڑا تھا۔

☆ ☆ ☆

وہ جامن کے پیڑ تلے چارپائی بچھا کر بیٹھی تھی۔ اماں نے سرسوں کا تیل اٹھایا اور چوکی ہاتھ میں پکڑے آگئیں۔ ان کا ارادہ روبا کے بالوں میں تیل لگانے کا تھا۔ روبا اماں کا ارادہ بھانپ گئی اور چوکی ان کے ہاتھ سے لے کر زمین پہ رکھی اور خود اس پہ بیٹھ گئی۔ اماں نے بھی چارپائی پہ نشست سنبھال لی تھی۔

"اس جنگل کو بڑھانے کا شوق ہے۔ سنبھالنے کا نہیں۔" اماں کی خفگی اور روبا کی سستی۔

"کبھی انڈا' لیموں' دہی مکس کر کے لگا لیا کرو۔" اماں کے ٹوٹکے اور روبا کا بدکنا۔

"بہت "بو" ہے اماں۔" اس نے ناک ایسے دبائی جیسے ابھی بو کا بھبکا ناک میں گھس آیا ہو۔

"بال عورت کی کھیتی ہوتے ہیں۔ ان کی حفاظت کرنا پڑتی ہے۔" وہ اسے سمجھا رہی تھیں۔ معاً" دوسری منزل کی کھڑکی سے کاشف نے روبا کو آواز دے کر اوپر بلایا تھا۔

"بھائی بلا رہے ہیں۔۔۔ میں ان کی بات سن کر آتی ہوں۔" روبا نے تیزی سے دوپٹا گلے میں لٹکایا اور کھلے بالوں کے ساتھ سیڑھیاں چڑھنے لگی تھی۔ اوپر سے اماں کی تنبیہہ۔

"بالوں کو باندھ کے چھت پہ جاؤ روبا!"

"ورنہ کوئی جن چمٹ جائے گا۔ ہے نا' ماں!" وہ سیڑھیوں کے بیچ میں کھڑی مسکرائی۔ "اور جن تو چمٹ گیا اماں! اب میں کسی چیز سے ڈروں؟" روبا کھلکھلاتی ہوئی چھت پہ پہنچی۔ کاشف جھکے برآمدے والی چھت تلے بیٹھا تھا۔ اس نے روبا کی بات

سن لی تھی۔

"اب تم چڑیلوں سے ڈرو۔ جنیوں سے ڈرو۔" کاشف اسے مسکراتے ہوئے چھیڑ رہا تھا۔ وہ گلابی سی ہوتی ہوئی آگے بڑھی۔

"للہ، بھائی نے سن لیا۔" اسے بڑی ہی شرم آئی تھی۔

"اس بات کا کیا مطلب ہوا؟" روبا ذرا ابھی نہیں سمجھی تھی۔ کاشف نے اس کا ہاتھ پکڑ کر پاس بٹھالیا۔

"عنقریب تمہاری زندگی میں ایک خوب صورت بلا آنے والی ہے۔"

"بلا؟" وہ ہکابکا رہ گئی تھی۔

"نہیں سمجھیں؟ اچھا، تو پھر بتاؤ۔ تمہاری اس سہیلی کا کیا بنا؟" کاشف نے دلچسپی سے مسکراتے ہوئے پوچھا تھا۔

اپنی منگنی کے چکر میں وہ اس کے ذہن سے نکل گئی تھی۔ وہ ہونقوں کی طرح کاشف کو دیکھتے ہوئے چونکی۔

"انادیہ؟"

"ہاں، وہی۔" کاشف کے لبوں پہ بڑا ہی خوب صورت تبسم نمودار ہوا۔ "میری قسمت پھوڑنے کا ارادہ بدل دیا ہے کیا؟" بھائی نے کندھے سے اسے ٹھوکا دے کر سوچوں کے بھنور سے باہر نکالا۔

"آہ یہ مذاق میں کہی جانے والی باتیں۔ بے ضرر سی، جانے کب؟ کیسے اور کس طرح ——— قبولیت کے سفر پہ نکل کھڑی ہوتی ہیں؟"

"تم اماں کے ساتھ دوبارہ وہاں جاؤ۔ میں نے سوچا ہے اگر قسمت پھوٹنی ہے تو اس خوب صورت بلا سے شادی کرلوں..... شادی کر کے پچھتانا ہے تو کم از کم پچھتاوا خوب صورت تو ہو۔" وہ ابھی تک خوشگوار موڈ میں تھا۔ اور ہلکے پھلکے لہجے میں اپنی "پسند" بتا رہا تھا۔

جبکہ روبا اس سوچ میں گم تھی کہ بھائی نے انادیہ کو کہاں دیکھا؟ جو بات پسندیدگی سے خواہش اور پھر "طلب" تک پہنچ گئی تھی۔

☆ ☆ ☆

بات اتنی بڑی نہیں تھی نہ خواہش ایسی انوکھی تھی پھر بھی دل میں ترازو ہو گئی۔ روبا نے اسی دن اماں کو بھائی کی "تمنا" کے بارے میں واضح لفظوں میں بتا دیا۔ اور اماں بھی روبا کی طرح حیران و پریشان رہ گئی تھیں۔

کاشف کی خواہش اور طلب؟

کاشف نے اسے کہاں دیکھا تھا؟ یا دیکھا نہیں تھا۔ بس بہن کے منہ سے تعریفیں سن سن کر اس نے اپنا ذہن بنالیا تھا؟

"ہم رشتہ لے کر تو گئے تھے۔ ادھر سے کوئی جواب نہیں ملا نہ ہاں نہ ناں۔" اماں کی گم صم سی آواز سنائی دی تھی۔

"لڑکی حسین ہے مگر ضرورت سے زیادہ تیز بھی ہے۔ میں تمہاری ساس سے بات نہ کروں؟" انہوں نے چپ بیٹھی روبا سے مشورہ لینا چاہا۔

"رہنے دیں۔ اگر بھائی کی خواہش ہے تو انادیہ بری نہیں۔ تھوڑی ماڈرن اور آؤٹ اسپوکن (منہ پھٹ) ہے۔ بھائی کے ساتھ چل جائے گی۔" روبا نے اپنی سمجھ بوجھ کے مطابق مشورہ دیا تھا۔

"اس کی ماں تو بڑی بھلی مانس ہے۔ بے چاری دوسری عورت۔ پر لڑکی بہت....." اماں کا دم بس اسی بات پہ اٹکتا تھا۔ انہیں انادیہ کچھ خاص پسند نہیں تھی۔

"اماں! انادیہ ہی ٹھیک ہے۔ نئے نئے لوگ تو نہیں ڈھونڈنے پڑیں گے۔ میری اور بھائی کی سسرال ایک بن جائے گی۔ بیچ میں ایک دیوار ہی تو ہے، اسی بہانے بھائی میری بھی "خبر گیری" کرلیں گے۔" روبا نے دل لگتی بات کی تھی۔ یہاں پہ اماں کی منفی ہوتی سوچوں کو سہارا سا ملا۔ وہ ململ کا دوپٹا ٹھیک سے اوڑھتی ابا کے کمرے میں جارہی تھیں۔ اور کسی کو پتا ہی نہ چلا۔

کاشف کا دل انادیہ پہ کیسے آیا؟

وہ ایک بوجھل سی سہ پہر تھی۔ سوکھی، ویران اور پھیکی۔

"ڈیوڑھی میں شدید گرمی اور حبس تھا۔ بجلی ندارد۔ ناجو کے بھتیجے، بھتیجیوں کے ریوڑ نے ایک ادھم

مچا رکھا تھا۔ شور اور سر میں درد کرتا ہنگامہ۔"

وہ چیل اڑتی، موٹی موٹی گالیوں سے ان کو نوازتی، دوپٹے کے پلو میں کوئی چیز باندھ کر نکل پڑی۔ اناد یہ کا گھر تین گلی چھوڑ کر تھا۔ اوپر سے چبھتا سورج۔۔۔ آگ اگلتی گرمی۔ ناجو نے ہاتھوں کا چھجا بنا کر سانولے رنگ کو دھوپ کی چبھتی کرنوں سے محفوظ کیا اور کچھ ہی دیر میں اناد یہ کے گھر پہنچ گئی۔ اناد یہ اسی کے انتظار میں تھی۔ چیل کی طرح لپک کر اس کے قریب آئی۔ اور پھر بازو سے دبوچتی اسے گھسیٹ کر اپنے کمرے میں لے گئی۔

"کب سے انتظار میں تھی۔ اتنی دیر لگادی آنے میں۔" اس نے کنڈی چڑھا کر ایئر کولر لگایا۔

"ہاں، تو اماں دیوانی کا ڈیرا قریب تھوڑی ہے۔" ناجو نے ناک کھینچ کر سڑکی تو ناد یہ نے اسے گھور کر دیکھا۔

"بتاؤ، میرا کام ہوا کیا۔۔۔" اس کی نیلی کانچ سی آنکھوں میں تجسس چھلکا پڑ رہا تھا۔ ناجو نے اترا کر کہا۔

"کوئی ایسا ویسا۔" وہ کھلکھلائی تھی۔ "پہلے کچھ کھلاؤ پلاؤ۔ پھر انعام و اکرام اور بعد میں کام۔" اس نے فوراً "آنکھیں مٹکا کر "سودے بازی" کی۔

"میں نے تیرے لیے کڑاہی بچا کر رکھی ہے۔ اور فرنی بھی۔ ٹھنڈا شربت ابھی لاتی ہوں۔" وہ تیزی سے باہر نکل گئی تھی۔ اور ناجو اپنی اتنی "عزت افزائی" پہ پھولے نہ سمائی۔ کہاں تو گھر میں سوکھی روٹی بھی نصیب نہ ہوتی تھی اور کہاں اتنی نعمتیں۔

اناد یہ جب ٹرے سجا کر واپس آئی تو ناجو کو کولر کے سامنے ٹھنڈی میٹھی نیند کے جھونکے آرہے تھے۔ ناد یہ کے ماتھے پہ شکن آئی جسے کمالِ مہارت سے اس نے چھپالیا تھا۔

"اب بتا، میرا کام ہوا؟" اناد یہ نے بے چینی سے انگلیاں مسلتے ہوئے پوچھا۔

"ہوگیا اور بڑا ٹکا کے ہوا ہے دیکھنا" ایک ہی نگاہ میں چت نہ ہوا۔" ناجو نے چٹکی بجائی تھی۔ "تمہارا کام اور میرے دام۔" اس نے دوپٹے کا پلو کھول کر ایک تعویز نما پڑیا اناد یہ کے ہاتھ میں تھمائی۔ اور دوسرا خالی ہاتھ بھی اس کے سامنے پھیلائے رکھا۔ اناد یہ نے تیزی سے تکیہ اٹھایا اور ایک ہزار روپے اس کے ہاتھ میں رکھے۔ ناجو کا منہ اتر گیا تھا۔

"صرف پانچ سو؟" وہ رو دینے کو تھی۔

"آنکھیں کھول کے دیکھ۔ ہزار ہے۔" اناد یہ نے جتلایا تھا۔ ناجو کا منہ پھول گیا۔

"پانچ سو تو اماں دیوانی کو بھجواؤں گی۔ آخر اس نے تعویذ کا خرچہ پانی بھی تو نکالنا ہے۔ سستے میں دے دیا اس نے۔ ورنہ مٹھی بھر بھر کے نوٹ لیتی ہے۔ یہ تو میری ماں کا لحاظ کر گئی۔ آخر بیس سالہ پرانی گاہک ہے میری ماں اس کی۔ اماں دیوانی کے تعویذوں سے اماں کی اپنے پہلے شوہر سے جان چھوٹی، پھر دوسرے شوہر اور ساس سے بھی۔ اب تیسرے کو بھی اوپر پہنچا کر دم لے گی۔ جس بہو سے دل خراب ہوتا یا جس داماد کو ہری جھنڈی دکھانی ہوتی اماں اپنی پرانی ٹرک آزماتی یعنی تعویذوں والی۔ اور کام چٹکیوں میں ہوجاتا۔ اماں دیوانی کا تعویذ بڑا آزمایا ہوا تعویذ ہے۔" ناجو کی فراٹے بھرتی زبان سے تنگ آکر اناد یہ نے پانچ سو اور نکال کر اس کی مٹھی میں دبائے تھا۔

"آج کے لیے اتنا ہی۔۔۔ آگے اور بھی دوں گی۔ اب چل نکل۔ ابا آئے تو غصہ کریں گے۔" اناد یہ نے گھڑی پہ نگاہ ڈالی کر تو بوکھلا سی گئی تھی۔

☼ ☼ ☼

انسان کی سب سے بڑی بدنصیبی یہ ہے کہ وہ غلط راستہ اختیار کرے اور اسے اس راستے پر کامیابی مل جائے۔ کاشف کا ساتھ لکھا جاچکا تھا۔ وہ اسے ملنا ہی تھا لیکن اناد یہ کو یقین تھا کہ یہ اسی تعویذ کا کرشمہ ہے۔

اس میدان بلکہ اس دلدل میں اتری اناد یہ کے لیے یہ ایک حیران کن معجزہ ہی تھا۔ اس رہگزر پہ چلنے والے ہر نئے گمراہ مسافر کے لیے یہ حیران کن اور اچھوتی دنیا تھی۔ تعجب میں ڈال دینے والی۔ ایک انچ کا کاغذی ٹکڑا۔ کیسے دلوں کو پھیر سکتا ہے؟ اس کے پاس عقل ہوتی تو سوچتی لیکن اس کے پاس عقل ہی نہیں

تھی کہ وہ یہ سمجھ سکتی یہ رشتہ تو تعویذ سے پہلے ہی آچکا تھا۔ اس نے خود ہی تو روبا کو منع کیا تھا۔

اسے جو دکھایا، سمجھایا اور بتایا جا رہا تھا۔ وہ اسی پہ عمل پیرا تھی۔ اور اس کی رہنما ایک جاہل عورت کی گنوار بیٹی نا جو جب "رہنما" ایسے ہوں تو رہگزر پہ چلنے والے راہیوں سے تو سمکنا ہی ہوتا ہے۔

اسی شب جب اس نے لوبان کی دھونی دے کر تعویذ گلے میں ڈالا تھا۔ ہاں، یہ اسی شب کی بات تھی ایک عجیب و غریب واقعہ۔

ہاں، یہ اس کے لیے واقعہ ہی تھا۔ تعجب انگیز، حیران کن "اماں دیوانی کے تعویذ پہ اس کا ایقان پختہ کرنے والا۔ حالانکہ یہ محض اتفاق، لیکن انادیہ کی عقل کہاں کام کرتی تھی۔

اس شب وہ افراہیم سے ملنے آیا تھا۔ اپنی سیاہ لمبی سی کار میں۔

وجیہہ، خوش لباس، بلا کا خوبرو۔

وہ افراہیم جیسا نہیں تھا مگر افراہیم سے کم بھی نہیں تھا۔

اگر انادیہ کا نصیب بن جاتا تو چچی کے منہ پر طمانچہ جا لگتا۔ ان کی بہو کا بھائی "انادیہ کا شوہر۔ وہ انادیہ جسے چچی نے مسترد کر دیا تھا۔۔۔ اور اس پہ روبا کو ترجیح دی۔ وہ بھول گئی تھی کہ روبا سے پہلے اس کے لیے کاشف کا رشتہ آیا تھا۔

وہ تذبذب کا شکار تھی۔ کیا خبر روبا اور اس کی ماں دوبارہ نہ آتیں۔ وہ ان کی خاموشی کو انکار سمجھ کے اپنی بے عزتی محسوس کر کے دوبارہ کبھی بھی نہ آتیں۔ اماں دیوانی کے تعویذ پہ ہاتھ لگتا تو اس کا دل پرسکون ہو جاتا تھا۔ اور اس سکون میں تب اضافہ ہوا تھا جب وہ افراہیم سے ملنے اس کے گھر آیا۔

وہ دونوں صحن میں کھڑے تھے۔ ڈرائنگ روم کے شیڈ تلے اور ایک دوسرے سے گفتگو میں مگن لگے تھے۔ اور انادیہ منڈیرے کی کنگری پہ ہاتھ رکھے ساکت، منجمد اور حیران۔

"کیا تعویذ اتنی جلدی بھی اثر دکھاتے ہیں؟"

وہ یک ٹک چچی کے صحن میں کھڑے کاشف کو دیکھتی دم بخود تھی اور اسی پل کاشف نے بھی نگاہوں کا زاویہ موڑ کر چھت کی طرف دیکھا تھا اور اس کے تاثرات بھی کم و بیش انادیہ جیسے تھے۔

وہ بھی اتنا ہی حیران اتنا ہی ساکت اور اسی قدر حیرت سے منجمد کھڑا تھا۔ اس ایک لمحے میں قید جس میں زعفرانی سورج کی ڈھلتی شعاعیں ایک حسین صورت کو مکمل کر رہی تھیں۔ کاشف کو لگا وہ کسی آرٹسٹ کے ایزل پہ سجی دلکش تصویر کا مبہوت کر دینے والا منظر ہے۔۔۔ کھلے ریشمی سے بال، جو ہوا سے اڑ اڑ کر اس کے دودھیا رخساروں سے شرارتیں کرتے تھے۔ نیلی دمکتی آنکھیں اور نیم وا حیرت سے کھلے ہونٹ۔ جیسے کسی کو غیر متوقع دیکھ لیا ہو۔

کاشف کو پہلی مرتبہ اپنی اماں کے ان الفاظ پہ یقین آیا تھا۔ جب روبا کو چھت پہ جانے سے وہ ٹوکتی تھیں۔

"سر شام بال کھول کر چھت پہ گھومنا نحس ہے۔ اوپری مخلوق سفر پہ ہوتی ہے۔ کوئی جن بھوت اثر نہ کر جائے۔"

کاشف کو اس لمحے جنوں اور پریوں کی اس کہانی پہ یقین آگیا تھا۔ جب وہ خود چھت پہ لٹکتی ایک پری کی حسین کھلی زلفوں کا اسیر ہو گیا۔ اس لمحے کاشف کو خبر نہیں تھی کہ اسیری کیسی ہی کیوں نہ ہو۔ زندگی کو گھنا کے رکھ دیتی ہے۔

✡ ✡ ✡

چھوٹی چارپائی کے اوپر قلاقند کا کھلا ڈبا رکھا تھا۔ جو اس وقت آدھے سے زیادہ خالی تھا۔ اور نا جو اپنی چھوٹی آنکھوں کو شمالاً" جنوباً" کھینچ کھینچ کے کھولنے، پھیلانے کے چکر میں عجیب مضحکہ خیز صورت اختیار کر چکی تھی۔ پھر بھی بے یقینی تھی کہ کم ہی نہیں ہوتی تھی۔

صرف ایک ہی رات میں ایسی کایا پلٹ؟ اتنا عظیم معرکہ؟ وہ قلاقند کھاتی حواس باختہ سی انادیہ کا بازو دبوچے ہیجانی خوشی کے اثر میں بولی۔

"تو مان گئی ہو اماں دیوانی کے تعویذ کو؟"

گم صم بیٹھی اناد یہ چونک کر سیدھی ہوئی تھی پھر بے ساختہ اپنا سر اثبات میں ہلا گئی۔ وہ اپنے اس ہاتھ کو بار بار پھیلا کر دیکھتی تھی جس کی تیسری انگلی میں ست رنگے نگینوں والی انگوٹھی کسی کے ہونے کا احساس دلا رہی تھی۔

"بس پھر اس کی پکی مریدنی بن جاؤ۔" تاجو نے دلار سے کہا تھا۔ کیونکہ اسے اپنے پیسے بھی ہاتھ سے جاتے دکھائی دے رہے تھے۔

"اکثر لوگ کام پورا ہونے کے بعد رفوچکر ہو جاتے ہیں۔ دوبارہ مشکل سر پر پڑتی ہے تو پیرنی کا آستانہ یاد آتا ہے۔ ایسے مطلبی لوگوں کو اماں دیوانی تعویذ نہیں دیتی۔" تاجو نے اسے ڈرایا کہ اسے اماں دیوانی کی دوبارہ ضرورت پڑ سکتی ہے۔

"ایسا نہیں ہوگا۔" اناد یہ نے اسے تسلی دی تھی۔

تاجو خوش ہو گئی۔

"اچھا' اپنی چچی کی سناؤ۔ اس کے سینے پہ تو سانپ لوٹ گئے ہوں گے۔" تاجو نے بڑی مزہ لیتی کیفیت میں مچلتے ہوئے پوچھا۔

"پتا نہیں... بہت چالاک عورت ہے۔ ظاہر تو کچھ نہیں کیا۔ رسم میں بھی شریک ہوئیں۔ اوپرے دل سے مجھے پیار بھی کیا تھا۔"

"ہاں' ایسی عورتوں کو بڑے حربے آتے ہیں۔" تاجو نے تنفر سے خیال ظاہر کیا۔

اناد یہ کچھ دیر وہاں بیٹھی اور پھر واپس آ گئی۔ اسے ڈر بھی لگ رہا تھا اسے احساس تھا کہ اس نے گناہ کیا ہے۔

☆ ☆ ☆

منگنی سے چار دن بعد ایک کڑکتی دوپہر میں ناصر اپنے ساتھ برقعے میں لپٹی شرمائی لجائی لڑکی کو لے آیا۔ ادھر فرزانہ کی طبیعت سخت خراب تھی اور ابا پریشان ... اوپر سے ٹوٹنے والی یہ نئی افتاد۔ اناد یہ کے ساتھ ساتھ فرزانہ بھی ہراساں تھی۔

"تین مہینے پہلے نکاح کیا تھا۔ اب میں اسے بھگا لایا ہوں۔ اس کے گھر والوں کو پتا چل گیا ہے اور وہ کتوں کی طرح ہمارے پیچھے ہیں۔" ناصر کی اطلاع نے ابا کے پیروں تلے سے زمین نکال دی تھی۔ وہ جو نکاح کی خبر پہ ہی جوتا اتار چکے تھے۔ بھگا لانے کا سن کر آپے سے باہر ہو گئے۔

اس کڑکتی دوپہر میں ابا کے گھونسے' جوتے اور لاتیں ناصر کو لہولہان کر رہے تھے۔ ان کے ہاتھ جو چیز بھی آ رہی تھی۔ وہ بے دریغ ناصر پہ برسا رہے تھے اور برقعے میں لپٹی لڑکی اپنے استقبال پہ ششدر سی کھڑی تھی۔

"قاضی صاحب! بس کریں جوان بچہ ہے۔" فرزانہ کی منتیں دھری کی دھری رہ گئیں۔

"نہیں چھوڑوں گا اس کمینے کو۔ میری عزت کو چوراہے پہ نیلام کر آیا۔" وہ غیض کے عالم میں کانپ رہے تھے۔

"ذلیل انسان! کسی دوسرے کی عزت سے کھلواڑ کرتے اپنے آنگن کی بہنوں' بیٹیوں کو سوچ لینا چاہیے۔" ابا آگ بگولہ تھے... اور فرزانہ تھر تھر کانپتی تھی۔ جبکہ اناد یہ پتھر کا جیسے کوئی مجسمہ' سب اس تعویذ کی نحوست ہے جو اس نے گلے میں ڈال رکھا تھا۔

"میں تیرا خون کر دوں گا۔" ابا ہتھیار لینے کے لیے کمرے کی طرف لپکے تو فرزانہ جانے کہاں سے ہمت کر کے ان کا بازو پکڑ کے کھڑی ہو گئی۔

"بس کریں قاضی صاحب! جو ہونا تھا ہو گیا۔ معاملہ مت بگاڑیں۔ جتنا ہنگامہ ہو گا۔ بات اتنی خراب ہو گی۔" مگر ابا پہ ایک جنون سوار تھا۔ وہ برقعے میں لپٹی لڑکی کو دیکھ کر آگ بگولہ ہوئے۔

"میں کہتا ہوں۔ اسے ابھی کے ابھی واپس چھوڑ کے آ۔" ابا کا نیا حکم سن کر خون آلود ٹھوڑی پہ رومال رکھتا ناصر زخمی شیر کی طرح غرایا تھا۔

"چھوڑنے کے لیے نہیں لایا تھا۔ یہ بات زبان سے بھی مت نکالیے گا۔"

"میں ایسی بے حیا لڑکی کو اپنے گھر میں نہیں رکھوں گا۔" ابا اپنے فیصلے سے ہٹنے کو تیار نہیں تھے۔

"یہ بیوی ہے میری۔" ناصر زہر خند ہوا۔

"گھر سے بھاگی ہوئی۔ ماں باپ کی عزت کا جنازہ نکال کر آئی ہے۔ یہ میرے گھر میں نہیں رہے گی۔" ابا نے نفرت سے منہ موڑ لیا تھا۔

"یہ اسی گھر میں رہے گی۔ میں دیکھتا ہوں۔ اسے کون نکالتا ہے۔" وہ بھپر کر بولا تھا۔

اور ان کی یہ لڑائی ابھی بیچ میں ہی تھی جب افراہیم نئی اطلاع کے ساتھ ایک اور دھماکا کرنے نازل ہوگیا تھا۔ ناصر کو کھا جانے والی نظروں سے گھورتے ہوئے افراہیم نے ابا کو بتایا تھا۔

"تایا جی! اس لڑکی کے گھر والوں نے ناصر کے خلاف اغوا کی ایف آئی آر کٹوادی ہے۔ اور نامزد ملزم آپ بھی ہیں... ناصر کو پکڑوانے کے لیے ان لوگوں نے سازش کی ہے۔ آپ کا نام اس لیے بیچ میں رکھا ہے کہ ناصر کو جلد گرفتار کرواسکیں۔ میں نے اپنا سارا رسوخ استعمال کرکے پولیس کو چھاپہ مارنے سے روکا ہے۔ اگر عدالت سے وارنٹ لے کر وہ لوگ پولیس کو مجبور کریں تو میری کوئی کوشش آپ کو بچا نہیں سکے گی۔ ناصر سے کہیں ان کی لڑکی آرام سے واپس بھیج دے۔"

افراہیم کی تجویز پہ ناصر کھول اٹھا تھا اور پھر ان دونوں میں لڑائی شروع ہوگئی۔ جو بڑھتے بڑھتے ہاتھاپائی تک پہنچ گئی۔

اور ابھی ابا ان کے درمیان بیچ بچاؤ کروا ہی رہے تھے۔ جب ڈھیر ساری گاڑیوں کے دروازے کھلنے اور بند ہونے کی آواز سنائی دی تھی۔

افراہیم اپنا گریبان ناصر کے ہاتھ سے چھڑواتا نفرت آمیز لہجے میں بولا۔

"آگئے ہیں سرکاری میزبان... تمہارا دماغ درست کرنے۔ دیکھتا ہوں 'اب تم کیسے بچتے ہو۔" وہ تیزی سے مڑا اور باہر نکل گیا تھا۔ لیکن جانے سے پہلے اس نے ابا کو تسلی ضرور دی تھی۔

"تایا جی! آپ فکر نہ کریں' میں آپ کی ضمانت کروالوں گا۔ آپ... پریشان نہیں ہونا۔ میں آج ہی وکیل کرکے مچلکے بنواتا ہوں۔" افراہیم کے نکلتے ہی وردی والے کئی لوگ ان کے گھر میں گھسے اور ناصر کے ساتھ ابا کو بھی گرفتار کرکے لے گئے۔

ابا اس حال میں صحن سے ہتھکڑی لگواکر نکل رہے تھے کہ ان کا سر جھکا ہوا اور کندھے ڈھلکے رہے تھے۔

☆ ☆ ☆

گھر میں ایک تھکا دینے والی خاموشی چھائی ہوئی تھی۔ ان دنوں برابر والے گھر میں بھی خاموشی سی۔ کبھی کبھار چچی آتی تھیں۔ اور فرزانہ کے پاس بیٹھ کر چلی جاتیں۔ ان کی تسلیوں کا دائرہ بس فرزانہ کے گرد گھومتا تھا۔

"تم پریشان مت ہو۔ افراہیم بھاگ دوڑ تو کر رہا ہے۔ اس لڑکے کی سرکشی نے تو کہیں منہ دکھانے کے قابل نہیں چھوڑا۔ ایسی ذلت جس کا کوئی انت نہیں... ہم تو صداقت صاحب کے گھرانے کے سامنے بھی شرمندہ ہیں۔ وہ کیا سوچتے ہوں گے؟ کیسے خاندان میں رشتہ جوڑ لیا۔ جو دوسروں کی عزت سے کھیلتے ہیں۔"

چچی کا ملال ان کے لہجے سے مترشح تھا۔

انادیہ کچن میں اسکوائش بنا رہی تھی۔ فوراً" بھپر کر باہر نکلی۔

"نکاح کیا ہے اس نے کوئی گناہ نہیں کیا۔ آپ لوگوں کو تو موقع مل گیا ہے۔ میرے بھائی پہ کیچڑ اچھالنے کا۔"

چچی جو فرزانہ سے ہم کلام تھیں۔ ہکا بکا سی رہ گئیں۔ "ہم کاہے کو کیچڑ اچھالیں گے۔ ساری دنیا تھو تھو کر رہی ہے۔" چچی نے انادیہ کی بدتمیزی پہ کوئی لحاظ نہ روا رکھتے ہوئے منہ توڑ جواب دیا تھا۔ جو انادیہ کے ٹھک سے جا لگا۔

"آپ نے سارے زمانے میں نشر کیا۔ ورنہ گھر کی بات گھر میں بھی رہ سکتی تھی۔" انادیہ کے اس الزام پہ چچی آگ بگولہ ہوگئیں۔

"منہ سنبھال کر بات کرو بی بی! میں کوئی فرزانہ نہیں ہوں جو تمہاری ساری بدتمیزی سن کر بھی چپ رہوں۔" چچی نے ہاتھ بلند کرکے جتلایا۔ "وہ جو لوٹوں والے

گاڑیاں بھر بھر کے آئے تھے۔ سارے محلے والوں نے دیکھا تھا۔ تب انہیں سلیمانی ٹوپی پہنا دیتیں۔"

"آپ کے بیٹے کو چین تو مل جائے۔ ناصر کی مخبری بھی اسی نے کروائی۔" انادیہ کا دماغ پھر گیا تھا۔ سارے الزامات کی آج ہی بوچھاڑ کر دی تھی۔ اوپر سے بد قسمتی ایسی کہ افراہیم دفتر سے گھر آگیا۔ ماں کو گھر میں نہ پا کر جو اس نے دیوار سے جھانکا تو اس کا خون کھول اٹھا تھا۔ دوسرے ہی پل وہ چھلانگ لگا کر نیچے تھا۔

انادیہ کے مدمقابل۔ تیوریاں چڑھی اور تیور بگڑے۔

"یہ کس لہجے میں تم میری ماں سے بات کر رہی ہو؟ اپنی زبان کو کنٹرول کرو۔ ورنہ مجھ سے برا کوئی نہ ہو گا۔" افراہیم نے زہر خند لہجے میں کہا تھا۔

"تو اس سے برا پہلے بھی کوئی نہیں.... خود کو کیا سمجھتے ہو؟ ساری دنیا کے شریف ہو؟ باقی سب آوارہ' انادیہ کا میٹر کیا گھوما تھا۔ افراہیم کا دماغ بھی چکر کھا گیا۔

"تم دونوں تایا جی کی بد بخت اولاد ہو۔" اچانک اس نے ایسے الفاظ کہے جس نے ان سب کو پتھرا کر رکھ دیا تھا۔

"ایک امتحان اور ایک آزمائش.... وہ تمہارے "ہونہار" بھائی کی وجہ سے اسپتال میں ہیں۔ میں انہیں ہسپتال چھوڑ کے آیا ہوں۔ ان کی شوگر بہت لو اور بلڈ پریشر خطرناک حد تک بڑھ چکا ہے۔" افراہیم کے انکشاف پر انادیہ کے ہاتھ سے گلاس پھسلا تھا۔ وہ ہکا بکا سی افراہیم کو دیکھنے لگی۔ جبکہ فرزانہ رو رہی تھی۔ اور افراہیم ماں سے مخاطب تھا۔

"آپ اس کے منہ نہ لگا کریں۔ اس کی زبان کو لگام نہیں ہے۔" وہ ماں کا ہاتھ پکڑ کر باہر نکل گیا تھا جبکہ انادیہ وہیں صحن کے فرش پہ بیٹھ کر اونچی آواز میں رونے لگی تھی۔

"ابا؟ میرے پیارے ابا۔" اسے ابا بڑے شدت سے یاد آئے تھے۔ ان دونوں بہن بھائی پہ جان چھڑکنے والے ابا۔ ان کے ناز اٹھانے والے ابا۔

وہ اس سے دور تھے اور اسے اندازہ نہیں تھا۔ وہ دن بدن دور ہوتے جا رہے تھے۔

شام کو فرزانہ کا دل گھبرایا اور وہ اٹھ کے انادیہ کو جھنجوڑنے لگی تھیں۔

"اٹھو اور افراہیم سے اپنے ابا کا پوچھ کر آؤ۔ جانے ان کی طبیعت اب کیسی ہے؟" انادیہ کو فرزانہ کی آواز جیسی محسوس ہو رہی تھی۔ پھر اس نے روشنی میں فرزانہ کا چہرہ دیکھا۔ وہاں آنسوؤں کے ان گنت نشان تھے۔

افراہیم اور چچی سے تلخ کلامی کے بعد انادیہ کا دل تو نہیں چاہ رہا تھا برابر والے گھر میں جانے کے لیے۔ لیکن پھر دل کی بڑھتی بے چینی سے گھبرا کر وہ ابا کی خیریت پوچھنے چچی کے گھر آ گئی تھی۔

گھر میں خاموشی پھیلی تھی۔ وہ چھوٹے چھوٹے قدم اٹھاتی کمرے کی طرف آ گئی۔ چچی افراہیم کے کمرے میں تھیں اور نماز ادا کر رہی تھیں۔

وہ ان کے فارغ ہونے کا انتظار کرنے لگی اور وقت گزاری کے لیے افراہیم کے کمرے کا جائزہ لینے لگی۔ اس کا سادہ سا کمرہ اس کی سادہ طبیعت جیسا تھا۔ ہر چیز ترتیب سے رکھی تھی۔ سامنے بلیک ٹوپیس میں اس کی شاندار تصویر ٹنگی تھی۔ انادیہ بے ارادہ ہی دیکھتی چلی گئی۔ اس تصویر اور اس کمرے کی ہر چیز کی اصل مالکن نے چند مہینوں بعد یہاں آجانا تھا۔ ہر چیز پہ قبضہ جمانے۔ افراہیم اور اس کے دل پہ اس گھر پہ اور ہر چیز پہ۔

جانے کیوں اس سوچ نے انادیہ کے دل کو بوجھل کر دیا تھا۔ اور اس کی آنکھوں میں نمی ابھر آئی تھی۔ چچی نے سلام پھیر کے دعا کی اور حیرانی سے انادیہ کی طرف دیکھنے لگیں۔

دور کہیں کسی ایمبولینس کا خوفناک ہارن سنائی دیتا تھا۔ جو لمحہ بہ لمحہ قریب آتا گیا۔ معاً گھر کے باہر بہت سی گاڑیوں کے ٹائر ایک ساتھ چرچرائے تھے۔ انادیہ دل میں اٹھتے غم کے غبار تلے دبی بے ساختہ چچی کی طرف بڑھی۔

"چچی! میرے ابا۔۔۔؟" وہ ان کے کندھے سے لگی دھاڑیں مار کر رونے لگی۔ باہر کا شور، آوازیں معاً" کوئی تھکے تھکے قدم اٹھاتا اندر کی طرف آیا تھا۔ پھر وہ دروازے کے فریم میں لحہ بھر کے لیے رکا اور آگے بڑھا۔ پھر اس نے تڑپ تڑپ کر روتی انادیہ کے سر پہ ملائمت سے ہاتھ پھیرا۔ وہ خوف زدہ سی افراہیم کو دیکھنے لگی۔ جو دھیمی، غم زدہ بوجھل آواز میں کہہ رہا تھا۔

"نہیں رہے۔" اس کے الفاظ نے انادیہ کا دل چیر ڈالا۔

وہ افراہیم کے کندھے سے لگی چیخ چیخ کر رونے لگی تھی۔

☼ ☼ ☼

ابا چلے گئے تھے اپنے پیچھے ڈھیر سارا غم چھوڑ کر اور ان کا کل اثاثہ، عاقبت نااندیش دو اولادیں۔ جن کے پاس نہ کوئی رہنما تھا اور نہ انہیں کسی رہنمائی کی ضرورت تھی۔ اپنے فیصلوں میں خود مختار، ضدی اور بے وقوف تھے۔

کچھ رشتوں میں پنپتی بدگمانیوں کی وجہ سے وہ کچھ زیادہ ہی تنہا تھے۔ اور ان بدگمانیوں کا موجب بنتی چھوٹی چھوٹی سی غلط فہمیاں؟

ناجو، جو انادیہ کی دلجوئی کے لیے روزانہ ان کے گھر آ دھمکتی تھی۔ اور اسے چچی کے گھرانے سے بدگمان کرنے میں پیش پیش رہتی۔ مگر انادیہ کا ان دنوں ہر چیز سے جی اچاٹ تھا۔ حتیٰ کہ کاشف کی دل لگی بھی اچھی نہ لگتی تھی۔

ناصر ابھی جیل میں تھا اور اس کی بیوی میکے والوں کے قبضے میں۔ ابا اپنی آخری آرام گاہ تک پہنچ چکے تھے۔ پیچھے انادیہ اور فرزانہ بچی تھیں۔

فرزانہ کو ابا کے بعد چپ لگ گئی تھی۔ سارا دن جائے نماز بچھا کر دعائیں کرتی۔ کبھی اپنے لیے، کبھی اپنے ہونے والے بچے کے لیے۔ اپنے لیے تو وہ کچھ نہیں مانگتی تھی۔ اس کی ہر دعا کا محور اس کا آنے والا بچہ تھا۔ جو پیدا ہونے سے پہلے ہی یتیم ہو چکا تھا۔

انادیہ کو ان دنوں یوں محسوس ہوتا تھا جیسے زندگی فرزانہ کی آنکھوں میں بھی دھیرے دھیرے مر رہی ہے۔ جانے کیوں فرزانہ کو کرب میں دیکھ کر اسے ایک گونا طمانیت کا احساس ہوتا تھا۔ اگر اس کا دل دکھی تھا تو اور بھی کوئی سکھی نہ ہوتا۔

پھر ایک دن ناجو ہوا کے گھوڑے پہ سوار بھاگی بھاگی چلی آئی تھی۔ "سنتی ہو! تمہاری چچی نے تاریخ پکی کر دی۔ افراہیم کی شادی ہے۔ ارے کیسا بھتیجا نکلا۔ اپنی شادی کی پڑ گئی۔ تایا کا کفن بھی میلا نہ ہونے دیا اور تمہارا بھائی جو جیل میں سڑ رہا ہے۔ اسے نکلوانے کے بجائے اپنی خوشیوں کے کندھے پہ سوار ہے۔" انادیہ کا دل غم و غصے سے بھر گیا۔ حالانکہ چچی نے بتایا بھی تھا۔

"سادگی سے نکاح کریں گے۔ افراہیم کو کورس کے لیے جانا ہے۔ کہتا ہے روبا آجائے گی تو آپ کا دھیان بٹ جائے گا۔ میرے اکیلے پن کی وجہ سے نکاح کا فیصلہ کیا ہے۔"

"رشتے دار ایسے ہی ہوتے ہیں۔ خود غرض اور مطلبی۔" انادیہ رونے لگی۔ ان دنوں آنسو اس کی پلکوں پہ دھرے رہتے تھے۔

"تم کہتیں تو سہی۔ چالیسواں تو ہونے دیتے۔" ناجو نے اسے تحریک دلائی۔

"بات کہہ کے گنواتی کیا؟ جبکہ وہ فیصلہ کر چکے ہیں۔" اس نے تنفر سے کہا تھا۔

"اور تمہاری ساس تو شادی کے لیے نہیں کہیں گی؟" ناجو کو ایک اور فکر نے ستایا تھا۔

"میرا خیال ہے کہ نہیں۔" انادیہ نے کچھ سوچ کر جواب دیا تھا۔ لیکن اس کا یہ خیال غلط ثابت ہو گیا تھا۔ ناجو تو مطمئن سی گھر چلی گئی تھی۔ لیکن اسی شام روبا کی اماں آگئیں۔

ان کا آنا غیر معمولی لگتا تھا۔ وہ بہت دیر تک فرزانہ کے پاس بیٹھی رہیں۔ یہاں تک کہ انادیہ کو بھی باہر نکل کر سلام کرنا ہی پڑا۔ اور ابھی وہ دل پہ پتھر رکھ کر ان کی تواضع کے لیے کچن میں جا رہی تھی کہ جب کاشف کی اماں کے الفاظ نے اسے آگے بڑھنے سے روک دیا تھا۔

"سادگی سے نکاح کریں گے۔ جہیز کے نام پہ تنکا بھی نہیں جانا ہے۔ میرے گھر میں اللہ کا دیا سب کچھ ہے۔ بیٹی بھیجوں گی تو بیٹی لے بھی جاؤں گی۔ میری تنہائی بھی دور ہو گی۔" ان کا دھیما، بردبار لہجہ انادیہ کو سراسر ڈراما لگا تھا۔ ابا کو مرے ہوئے چار دن بھی نہیں ہوئے تھے۔ فرزانہ عدت میں تھیں۔ ناصر جیل میں اور ان کو اپنے مطلب کی پڑی تھی۔ تنہائی دور کرنے کی۔

"ایک مذہبی اور سماجی فریضہ ہے۔ اس میں دیر کرنا عقل مندی نہیں۔ پھر آج کل کے بچے بھی تو.... کاشف نہیں رکتا۔ اسی کا دباؤ ہے سارا۔ ورنہ میں چالیسویں سے پہلے کبھی نہ آتی۔" ان کی نرم آواز انادیہ کی تیز آواز تلے اچانک دب گئی تھی۔ وہ کچن میں جاتے جاتے پلٹ آئی۔

"میرے ابا مرے ہیں۔ کسی پڑوسی کا باپ نہیں۔ میرا دل صدمے سے پھٹ رہا ہے۔ بھائی جیل میں اور میں ڈولی پہ سوار ہو جاؤں.... ایسی خود غرضی؟" اس کے رونے پہ روبا کی اماں اور فرزانہ بوکھلا اٹھی تھیں۔

گو کہ بات غلط نہیں تھی۔ لیکن اس کا انداز اچھا نہیں تھا۔ فرزانہ کو صاف لگ رہا تھا کہ روبا کی اماں کو انادیہ کا اپنی شادی کے معاملے میں بولنا پسند نہیں آیا۔ انہوں نے کہا کچھ نہیں تھا۔ تاہم ان کے چہرے پہ بڑے ناگوار تاثرات رقم تھے۔

وہ چلی گئیں تو فرزانہ نے اسے ٹوکا تھا۔

"تمہیں بیچ میں بولنے کی کیا ضرورت تھی؟ وہ غلط تو نہیں کہہ رہی تھیں۔ جانے میرا کیا بننا ہے۔ تمہارے ابا کے بعد تو مایوس ہو چلی ہوں۔ تم اکیلے کیسے رہو گی؟ شاید میں عدت اپنی خالہ کی طرف پوری کروں یا کہیں اور.... میرا یہاں تمہارے ابا کے بعد رہنا مناسب نہیں.... کل کو ناصر بھی آ ئے گا۔" فرزانہ کی دھیمی بوجھل آواز پہ انادیہ سمجھے بغیر چلا اٹھی تھی۔

"اب آپ نے کہاں جانا ہے آنٹی! خدا کا خوف کریں.... کیا اور شادی رچانیں گی؟" وہ غصے میں اتنی ہی بدلحاظ ہو جاتی تھی۔ فرزانہ نے زخمی نگاہ سے انادیہ کو دیکھا اور بس اتنا کہا۔

"تمہیں پتا چل جائے گا۔" وہ روتی ہوئی اپنے کمرے میں بند ہو گئی تھی اور انادیہ صحن کے بیچ بیٹھ کر اپنی بری قسمت کو سوچنے لگی۔

روبا کی اماں اگر دوبارہ آ گئیں؟ یا افراہیم کے ساتھ اس کا نکاح بھی فائنل ہو گیا تو؟

اور ہر مصیبت کی گھڑی میں نانجو اس کی مدد کے لیے فوراً تیار رہتی تھی۔ انادیہ کا دکھڑا سن کر دل و جان سے مدد کے لیے حاضر ہو گئی۔

"اماں دیوانی سے تعویذ لاتی ہوں۔ دیکھنا، کیسے تمہارا نکاح ملتوی ہوتا ہے۔" اس نے سینہ ٹھونک کر کہا تھا۔ اور اس کا دل چاہا.... وہ نانجو کا دانوں سے بھرا چہرہ چوم لے۔ وہ ہمیشہ آڑے وقتوں میں انادیہ کے کام آتی تھی۔

☆ ☆ ☆

ابا کی وفات کے بعد کچھ عرصہ افراہیم اور چچی نے اس کی دل جوئی کی تھی۔ مگر اس کا کھردرا رویہ دیکھ کر وہ خود بخود پیچھے ہٹ گئے تھے اور اب تو چچی کو ان کا حال پوچھنے کی بھی فرصت نہیں تھی۔ دونوں ماں بیٹا بڑے ہی مصروف تھے۔ بازاروں کے چکر، شاپنگ اور تیاریاں۔

انادیہ غصے میں پورا دن بڑبڑاتی تھی۔

"یہ سادگی سے نکاح ہو گا۔ سادگی اسی کو کہتے ہیں۔"

افراہیم کے دوستوں نے زبردستی گھر کی سجاوٹ کیا کر دی، انادیہ کے سینے پہ سانپ لوٹ گئے تھے۔ اسے آگ بگولا دیکھ کر فرزانہ سے رہا نہ جاتا تھا۔

"کیا تھا اگر تمہاری خوشی میں بھی دیکھ لیتی۔ افراہیم کی شادی میں تمہارا بھی نکاح ہو جاتا۔ افراہیم سارے انتظام خود دیکھ لیتا۔" فرزانہ کی حسرت آمیز آنکھوں میں چھپا ایک انجانا خوف دیکھے بنا انادیہ چیخ پڑی تھی۔

"آپ میرے باپ کا اچھا سوگ منا رہی ہیں؟ ہر وقت شادیانوں کی پڑی رہتی ہے۔" انادیہ چچوکے لگاتے ہوئے یہ ہرگز نہیں دیکھتی تھی کہ اس کی بات کا

وزن کتنا ہے اور مقابل کا حوصلہ کتنا ہے؟
فرزانہ کا غم زدہ چہرہ موت کی سفیدی سے نچڑ جاتا تھا اور وہ سر جھکا کر نماز کے لیے اٹھ جاتی۔ یا نفلی عبادت کرتی یا پھر ہر وقت قرآن پڑھتی۔
ناجو کے لائے تعویذ کی بدولت اس کی شادی ملتوی ہو چکی تھی۔ اور نادیہ کے دماغ سے نادیدہ بوجھ ہٹ گیا تھا۔ وہ اسے تعویذ کی کرامات ہی سمجھتی تھی۔ حالانکہ جس طرح ان نے کاشف کی ماں سے بدتمیزی کی تھی۔ اس کے بعد یہ کسی طور بھی ممکن نہیں تھا کہ وہ افراہیم کی شادی والے دن انادیہ کو رخصت کروا کے لے جاتیں۔
انہوں نے کاشف کو سمجھا دیا تھا۔ "ابھی باپ کی وفات کے صدمے میں ہے۔ یہ وقت مناسب نہیں۔" انہوں نے اپنی فراست سے بیٹے کا دل کھٹا ہونے سے بچا لیا تھا۔ انہیں اپنے بچوں کی خوشیاں بڑی عزیز تھیں۔ وہ نہیں چاہتی تھیں۔ چھوٹی چھوٹی بدگمانیوں کی وجہ سے دلوں میں کدورتیں بھر جائیں۔ حالانکہ کاشف بڑا ہی برہم ہوا تھا۔ اندر ہی اندر تلملاتا رہا۔ اور انہی بوجھل دنوں میں روبا کی شادی کا دن بھی آ گیا تھا۔
کاشف کے دل کو آس سی تھی کہ شاید وہ مختصر بارات کے ساتھ آتی دکھائی دے جائے۔ لیکن وہ مہندی اور بارات دونوں تقریبات میں نہیں تھی۔ البتہ ولیمہ کے دن دکھائی دے گئی تھی۔
سفید جوڑے میں چاندی سے تراشی کسی مورت کی طرح۔ کاشف کے من کی مراد بر آئی تھی۔ دل اسے دیکھ دیکھ کر بھرتا ہی نہیں تھا۔ تبھی افراہیم نے اسے ٹھوکا دیا تھا۔
"کہو تو ابھی قاضی کو بلوا لوں۔" اس کی آنکھوں میں ڈھیر ساری شرارت دیکھ کر کاشف کھسیانا سا ہو گیا۔
"مرواؤ گے یار... جانتے نہیں، وہ ضد کی کتنی پکی ہے۔" کاشف مصنوعی انداز میں ڈر سا گیا تھا۔ افراہیم نے ٹھنڈا سانس سا بھرا۔
"مجھ سے زیادہ بہتر بھلا کون جانتا ہے؟"
"تمہارے خاندان میں ایسا تیکھا مزاج کس کا تھا؟" کاشف نے بڑی لمبی آہ بھر کے پوچھا۔
"دادی حضور کا۔ سیرت اور صورت دونوں میں ایسی ہی باکمال تھیں۔" افراہیم نے اس کے کندھے پہ اپنا بازو دراز کرتے ہوئے ہمدردی سے بتایا۔
"پھر دادا حضور کی کیسی گزری...؟" وہ شاید اپنے مستقبل کا نقشہ سوچ رہا تھا۔ افراہیم کی بتائی گئی باتوں کے تناظر میں۔
"کچھ نہ پوچھو کیسی گزری۔" افراہیم نے ہنستے ہوئے اسے ڈرایا تھا۔ "یوں سمجھو، سانپ کے منہ میں کوڑھ کرلی آ گئی تھی نہ اگلتے بنتی نہ نگلتے۔"
"یعنی ان کا انجام...؟" کاشف بس بے ہوش ہونے کے قریب پہنچ چکا تھا۔
"انجام نہیں... قیام... پوچھو، ان کا قیام؟" افراہیم نے ذرا اور خوب صورت نقشہ کھینچتے ہوئے مسکرا کر جتایا۔
"آں... ہاں وہی ان کا قیام؟" کاشف کی پتلیاں تیزی سے گھومنے لگیں۔
"عالم بالا..." افراہیم نے ڈرامائی انداز میں دھماکا کیا تھا۔ کاشف نے اس کے کندھے پہ گر کے بے ہوش ہونے کی اداکاری کی۔
"پھر یوں سمجھو کہ میں بھی جلد ہی تمہارے دادا حضور کا پڑوسی بننے والا ہوں۔" کاشف نے ایک آنکھ کا کونا دبا کر ذرا فاصلے پہ کھوئی کھوئی سی انادیہ پہ نگاہ ڈال کر افراہیم سے کہا تھا۔ اسی پل انادیہ نے بھی اپنی نیلگوں آنکھوں سے کاشف کی طرف توجہ کی۔ نظروں سے نظریں ملیں اور کاشف آہ بھر کے بڑبڑایا۔
"ان کی نظروں کا "سم قاتل" اتنا قاتل تو نہ تھا۔"
"بس تمہیں ہی "مقتول" بننے کا شوق چڑھا تھا۔" افراہیم نے شعر کہنے کے انداز میں مصرعہ مکمل کیا۔
کاشف بے خود سا دور بیٹھی انادیہ کے چاندی میں نہائے سراپے کو دیکھتا رہا۔
"قاتل اتنا حسین ہو تو کون کافر ہے جو پھانسی نہ چڑھے۔" کاشف کی بڑبڑاہٹ افراہیم کو چونکا گئی تھی۔

وہ اسٹیج سے اتر کر نیچے گیا تو افراہیم اپنی دلربا بیوی کو محبت پاش نظروں سے دیکھتے ہوئے بڑے مدبرانہ لہجے میں بولا تھا۔

"جان جہاں! اپنے اس سونے جیسے بھائی کو بتایا نہیں تھا۔ کچھ دمکتے ہیروں کی قسمیں بڑی مہلک بھی ہوتی ہیں۔ چھوئیں تو نیل و نیل کر دیں۔ سے سمجھ کر پہنیں تو زہر زہر کر دیں۔ ہاتھ لگائیں تو سراپا آگ کر دیں۔ عشق سمجھ کر اوڑھیں تو برباد کر دیں۔"

☼ ☼ ☼

اور یہ افراہیم کی دعوت ولیمہ تھی۔

مختصر مگر باوقار مہمان۔ افراہیم کے ماتحت، افسران اور ان کی فیملیز۔ انادیہ آنکھوں میں دھند لیے "تقریب ولیمہ" میں غائب دماغی سے شامل رہی۔ دل ہر چیز سے اچاٹ تھا۔ اور آج روبا کو اتنے مان، فخر اور وقار کے ساتھ اسٹیج کی ملکہ بن کر بیٹھے دیکھ کر انادیہ کا احساس زیاں کچھ اور بڑھ گیا تھا۔

اگر آج وہ افراہیم کے پہلو میں ہوتی تو اس محفل کا رنگ کچھ اور ہوتا۔ اس کا بجلیاں بن کر کڑکتا حسن دیکھنے والوں کو جھلسا دیتا۔ آج افراہیم نے کیا کھو دیا تھا لوگوں کی توجہ؟ رشک؟ اور فخر.....؟

اس نے اپنی تلخ سوچوں اور خود پسندی کے خمار میں یہ سمجھنے کی کوشش ہی نہیں کی تھی کہ افراہیم اپنی بیوی کو مرکز نگاہ بنا کر کبھی بھی خوش نہ ہوتا۔ اس کی بیوی کے لیے بس اس کی توجہ اور نظر کرم کافی تھی۔ وہ بے دلی سے کھانا کھانے سے پہلے ہی اٹھ گئی۔

اس کے جلدی اٹھنے کی ایک وجہ کاشف کی نگاہوں کا ارتکاز بھی تھا۔ اس کی پرتپش نگاہوں کی حدت اور جذبوں کی گرمی..... وہ افراہیم کے کانوں میں گھسا یقینی طور پر انادیہ کے بارے ہی میں کچھ کہہ رہا تھا۔ اس سے مزید برداشت نہ ہوا اور وہ اٹھ کر شامیانے سے نکل کر گھر کی طرف جانے لگی۔ معاً اسے اپنے پیچھے قدموں کی ہلکی چاپ محسوس ہوئی۔ وہ دیکھے بغیر جانتی تھی کہ آنے والا کون ہے؟

اس کی مسحور کن خوشبو انادیہ کے آس پاس چکرانے لگی۔ وہ ایسا تھا کہ لاکھوں میں ممتاز نظر آتا۔ اسے دیکھ کر کچھ دیر کے لیے ہی سہی اس کا احساس زیاں کم ہونے لگا۔ وہ اس کے سامنے جم کر کھڑا تھا۔ کترا کر جانے کی راہیں مسدود تھیں۔ شامیانے کا دروازہ اتنا کشادہ نہیں تھا جو وہ برابر سے گزر جاتی۔ اس نے بے بسی کے عالم میں کاشف کی طرف دیکھا۔

"ہماری نظروں کے حصار سے بچ بچا کر آپ کہیں فرار نہیں ہو سکتیں؟" اس کی خوبصورت آنکھوں میں ان گنت جذبوں کے چراغ روشن تھے۔

انادیہ کا ان آنکھوں کے سامنے ٹھہرنا محال تھا۔ اس کی آنکھوں میں وہ سب کچھ تھا۔ جو افراہیم کی آنکھوں میں انادیہ کے لیے کبھی نہیں ہو سکتا تھا۔

"راستہ چھوڑیے۔" اس نے گھبرا کر پیچھے دیکھا۔ سب لوگ دولہا دلہن کے ساتھ تصویریں کھنچوانے میں اور سلامیاں دینے میں مصروف تھے۔ کچھ خواتین چچی کے ساتھ کھڑی باتیں کر رہی تھیں، کوئی بھی ان دونوں کی طرف متوجہ نہیں تھا۔

"اول تو ہم راستے میں آیا نہیں کرتے اور اگر آجائیں تو پھر جایا نہیں کرتے۔" کاشف کا دل فریب لہجہ اور انداز انادیہ کی ہتھیلیاں بھیگنے لگیں۔

"جائیں نا کوئی دیکھ لے گا۔" وہ محض اسے بھیجنے کے لیے ڈرانے کی کوشش کر رہی تھی اور کاشف ایسا بے نیاز جیسے اسے کسی کی پروا ہی نہیں تھی۔

"اہل حسن کو لوگ دیکھا ہی کرتے ہیں۔" وہ اپنی تعریف کر رہا تھا یا اس کی؟ اس کی سمجھ میں نہ آیا۔

"کوئی قاعدہ، قانون بھی ہوتا ہے دیکھنے کا۔ چچی ابھی افسانہ بنا دیں گی۔" اس نے جان بوجھ کر چچی کا نام لیا۔ تاکہ اسے بھی پتا چلے افراہیم کی ماں کیسی ہے؟

"محبت ہر قاعدے اور قانون سے بالاتر ہوتی ہے۔" کاشف کے اپنے ہی فلسفے تھے۔ مخمور نگاہیں اور دل میں گھر کرتی صورت اور دلنشین انداز۔ مگر وہ بھی انادیہ تھی۔ کسی کے دل میں گھر کر تو سکتی تھی۔ مگر اپنے دل میں کسی کو جگہ نہیں دے سکتی تھی۔ یہ اس

کی "خود پسندی" کی انتہا تھی۔

"ہو گی۔" انادیہ نے نخوت بھری بے نیازی سے کہا۔ "اب مجھے جانے دیجیے۔"

"کیا اپنے دل سے؟" کاشف بے ساختہ بولا۔ اناديہ لمحہ بھر کے لیے تھم سی گئی۔

"میں نے یہ کب کہا۔" وہ جز بز سی ہو گئی تھی۔ یہ کاشف تو بڑا گہرا لگتا تھا۔ وہ کچھ گھبرائی اور پھر اس نے اپنی گردن میں لٹکے تعویذ پر غیر ارادی ہاتھ پھیرا۔ اسے یہ سب تعویذ کی کرامت لگ رہی تھی۔

"تو پھر سن لو۔ محبت کے قاعدوں میں سے ایک قاعدہ یہ بھی ہے۔ جو بے دھڑک آ جائے۔ وہ کبھی جا نہیں سکتا۔ اگر ایک دفعہ چلا جائے۔ تو پھر واپس آ نہیں سکتا۔" وہ اسے فلسفہ نہیں سنا رہا تھا۔ اپنا مزاج بتا رہا تھا۔

اس کے لہجے سے وہ ٹھٹک گئی، چونک گئی۔ پھر لمحہ بھر کے لیے رکی اور تیزی سے مڑ کر مہمانوں کی بھیڑ میں شامل ہو گئی۔ اس نے گھر جانے کا ارادہ فی الوقت ترک کر دیا تھا۔ کاشف بھی شاید یہی چاہتا تھا۔ اسی لیے مسرور سا واپس اسٹیج پر آ کر بیٹھ گیا۔ وہ الگ تھلگ سی بیٹھی تھی۔ مہمان کھانا کھا رہے تھے کچھ خوش گپیوں میں مصروف تھے۔

بھیڑ چھٹی تو اس نے گھر جانے میں ہی عافیت جانی۔ اس کو جاتا دیکھ کر چچی کے پاس کھڑی ایک عورت نے چچی کو مخاطب کیا۔ اس کے لہجے میں اناديہ کے لیے ستائش ہی ستائش تھی۔

"آپ نے اپنے جیٹھ کی بیٹی کیوں نہیں لی؟ کتنی پیاری ہے۔" کیسا رشک بھرا انداز تھا۔ اسے ٹھنڈ سی پڑ گئی۔

اناديہ کے قدموں کی رفتار خود بخود سست ہو گئی تھی۔ وہ چچی کا جواب سننے کے لیے سست روی سے چلنے لگی۔ آخر چچی کیا جواب دیتیں؟ یہی نا کہ اناديہ جیسی حسین لڑکی ان کے نصیب میں نہیں تھی۔

"مگر یہ کیا؟" اس کا دم اٹکا۔

"اسے وہی اپنے گھر لے کر جائے گا جسے اپنی زندگی جہنم بنانی ہو گی۔" چچی کے استہزائیہ لہجے نے اسے سلگا دیا۔ اس کا دل چاہا ابھی پلٹ کر چچی کا مزاج ٹھکانے لگا دے۔ مگر جانے کیسے ضبط سے کھڑی رہی تھی۔ ورنہ صبر اور ضبط اس کے مزاج کا حصہ نہ تھا۔ اس کے آس پاس جیسے شعلے لپکنے لگے تھے۔

"آپ ایسی بات تو نہ کریں۔" ان خاتون کے دل میں اناديہ کی موہنی صورت کھب کر رہ گئی تھی۔

وہ چچی کے تجربات سے ناواقف تھیں۔ اور اناديہ کے مزاج سے بھی اور چچی جانتی تھیں۔ زبان کی لغزش قدموں کی لغزش سے بھی زیادہ خطرناک ہوتی ہے۔

"آپ کو شاید اناديہ کے شاہانہ مزاج کی خبر نہیں۔" چچی نے جان بوجھ کر بات ٹال دی تھی جبکہ اناديہ کے دل میں چچی کا استہزائیہ لہجہ ترازو ہو گیا تھا۔ واپسی پر تو اس کے اندر شرارے پھوٹ رہے تھے۔

"ہونہہ! دیکھوں گی، یہ روبا کیسے آپ کی زندگی جنت بناتی ہے، آپ کے گھر میں آگ نہ لگائی تو اناديہ نام نہیں میرا۔ اسی زبان سے کہیں گی۔ کیسی سبز قدم بہو گھر میں لائی۔ جس نے ہمیں برباد کر دیا۔ جس کی نحوست نے ہمیں تباہ کر دیا۔" وہ غصے توہین اور نفرت کے احساس سے بھڑ بھڑ جلتے ہوئے سوچ رہی تھی۔

چچی کے اہانت آمیز الفاظ نے سرِ محفل اسے ذلیل کر دیا تھا۔ کچھ عورتوں نے اسے ناپسندیدگی سے دیکھا تھا۔ جب وہ شامیانے سے نکل رہی تھی تو اس کے شاطر ذہن نے ایک واضح منصوبہ سوچ لیا تھا۔ جس پہ عمل کرنے کے لیے اسے ناجو کا ساتھ اور اس کے قیمتی مشوروں کی ضرورت تھی۔

☼ ☼ ☼

گرمی کا زور ٹوٹ گیا تھا۔

موسم خوش گوار ہو گیا تھا اور گزشتہ رات ہونے والی بارش کی وجہ سے فضا میں خنکی محسوس ہو رہی تھی۔ مگر اناديہ کے وجود میں ایسا شعلہ بھڑک رہا تھا جو اسے دن رات آنچ دیتا اور سلگائے رکھتا۔ اسے رہ رہ کے اپنی بے عزتی یاد آتی تھی۔

چچی ہمیشہ ہی خاندان والوں کے سامنے اسے یوں ہی ذلیل کیا کرتی تھیں۔ جب کوئی چچی کے سامنے اس کی تعریف کرتا وہ فوراً "اس کی چیدہ چیدہ برائیوں کو گنوانے لگ جاتی تھیں۔ اپنی بچی تو تھی نہیں اسی لیے دوسروں کی بیٹیوں پہ انگلی اٹھاتے انہیں ذرا خوف نہیں آتا تھا انادیہ منہ بھر بھر کے انہیں بد دعائیں دیتی تھی۔

"خدا کرے۔ آپ کی بہو کے ہاں درجن بھر لڑکیاں ہوں تاکہ آپ کو احساس ہو۔ کسی کی بیٹی کے بارے میں دو انچ کی زبان نہیں ہلاتے۔" وہ اکثر ناجو کے بھڑکانے پہ دیوار کے اوپر چڑھ کے چچی کو ڈھیروں سناتی تھی۔

دراصل ناجو کو بھڑکانے میں کمال حاصل تھا۔ اور انادیہ اس کا بڑا کارآمد ہتھیار تھی۔ مگر آج کل وہ چچی کے گھرانے کو تکلیف دینے کے لیے اماں دیوانی سے تعویذ نہیں منگوا رہی تھی۔ اور ناجو کا بزنس ٹھپ تھا۔ اسی لیے ناجو چاہتی تھی کہ کوئی ایسا مسئلہ اٹھے جس کے بعد انادیہ کو اماں دیوانی کی لمبے عرصے کے لیے ضرورت پڑ جائے۔ اور اس کی ہوائی روزی کے راستے کھلے رہیں۔

اس دن ناجو صبح سویرے ہی انادیہ کے سر پہ سوار ہو گئی تھی۔ اس کا جب دل چاہتا یوں ہی منہ اٹھا کر بے دھڑک آجاتی تھی۔ ابا تو تھے نہیں..... جو ناجو کو گھر آنے جانے سے روکتے۔ ناجو کے گھرانے کو پورے محلے میں کوئی پسند نہیں کرتا تھا۔ خود انادیہ بھی نہیں کرتی تھی۔ مگر اسے ناجو کی اکثر ضرورت پڑ جاتی تھی۔

ابا کے بعد انادیہ خود مختار ہو چکی تھی۔ فرزانہ کو تو کسی گنتی میں شمار نہیں کرتی تھی۔ مرضی سے باہر آتی جاتی۔ شاپنگ کرتی، گھومتی پھرتی اور ناجو اس کے ساتھ ساتھ رہتی۔

ناصر ابھی تک جیل میں تھا..... اور افراہیم نے اس کی رہائی کی کوئی کوشش نہیں کی تھی۔ اسی لیے انادیہ کو افراہیم پہ بہت غصہ آرہا تھا۔ جسے اپنی خوشیوں میں کھو کر نایا زادوں کی فکر تک نہیں تھی۔

اس دن ناجو چپل گھسیٹتی، مونگ پھلیاں ٹونگتی انادیہ کے گھر آئی تو فرزانہ درد سے کراہ رہی تھی۔ ناجو نے فرزانہ کی کراہوں کو ان سنی کرتے ہوئے انادیہ کو تلاش کرنا چاہا۔ وہ نیچے کہیں بھی نہیں تھی۔ نہ کچن میں نہ کمرے میں نہ اسٹور میں۔ ناجو نے احتیاطاً غسل خانہ بھی دیکھ لیا تھا۔

کمرے سے فرزانہ کی درد میں ڈوبی آوازیں ابھی تک آرہی تھیں۔

"کوئی ہے؟ کوئی ہے؟ انادیہ کو بلا دو۔ کوئی ہے؟"

ناجو ناگواری سے فرزانہ کو نظر انداز کرتے ہوئے سر جھٹک کر سیڑھیاں چڑھتی اوپر آگئی۔ انادیہ ڈیوڑھی میں جھلنگا چارپائی پہ لیٹی تھی۔ اور ریڈیو کی آواز چہار سو گونج رہی تھی۔ ناجو نے آگے بڑھ کر آواز ہلکی کی تو انادیہ چونک کر اٹھ بیٹھی۔

"تم کب نازل ہوئیں؟"

"ابھی کے ابھی۔" ناجو نے دانت نکالے۔ انادیہ اپنے لانبے سنہرے بال پونی میں جکڑنے لگی۔ جو ایک ڈھیر کی صورت اس کی پشت اور کندھے پہ بکھر رہے تھے۔ ناجو کی آنکھوں میں ستائش تھی۔

"ہائے ظالم، بڑی قیامت ہو تم..... سونے میں ڈھلی یہ افراہیم کی نظر کہیں کمزور تو نہیں تھی۔ اس ڈھلتی شام کو اٹھا لایا۔ ایسے تابناک سورج کو ٹھوکر مار کے۔" ناجو کی عادت تھی۔ اس کے زخموں کو ادھیڑنے کی۔ انادیہ نے زخمی سے انداز میں اسے دیکھا تھا۔

"اس ڈھلتی شام نے افراہیم کی زندگی کو روشن صبح بنا رکھا ہے۔" انادیہ کے منہ سے انگارے جھڑے۔

"مطلب.....؟" ناجو سمجھ تو گئی تھی۔ بس جان بوجھ کے اس کی جلن کا مزہ لیتی تھی۔ دونوں ہی مزاجاً" دوسروں کو تکلیف میں دیکھ کر خوش ہونے والوں میں سے تھیں۔

"وہ امید سے ہے۔" انادیہ نے جل کر بتایا تھا۔

"واقعی؟" ناجو اچھل پڑی تھی۔ جیسے یہ کوئی ان ہونی بات ہو۔ "ہک..... ہائے بڑی نصیب والی ہے۔" اب وہ ٹھنڈی آہیں بھر کے انادیہ کو تاؤ دلا رہی

تھی۔

"اللہ کرے، چچی کی ڈھیر ساری پوتیاں ہوں اور ان کی قینچی کی طرح چلتی گز بھر لمبی زبانیں۔" انادیہ نے منہ بھر کے بددعا دی تھی۔ ناجو کی چھوٹی آنکھوں میں چمک بھر گئی۔ وہ کھسک کر اس کے قریب آگئی تھی۔

"ہو سکتی ہیں۔ ایک چھوڑ کئی ہو سکتی ہیں۔" ناجو نے چٹکی بجاتے ہوئے اسے اکسایا۔

"مگر کیسے؟"

"اماں دیوانی کے تعویذ سے۔ ارے، جب لڑکوں کے لیے تعویذ دے سکتی ہے تو لڑکیوں کے لیے کیوں نہیں وہ شاہد ہے نا چھ لڑکیوں کے بعد اس کا لڑکا ہوا۔ اماں دیوانی کے تعویذ سے۔" ناجو نے اسے پھر پٹی پڑھائی۔

اگر ایسا ہو جاتا تو مزہ ہی آجاتا۔

چچی کو پوتے کی بڑی خواہش تھی۔ ہر ایک سے کہتی تھیں۔

"دعا کرنا میرا پہلا پوتا ہو۔ افراہیم اکیلا نہ کوئی بھائی نہ بہن.... بیٹا ہوگا، تو بازو بنے گا۔" وہی ماؤں کی پرانی سوچ۔ انادیہ سوچنے لگی۔ "اگر پوتی ہوئی تو روبا کی حیثیت میں بھی کمی آئے گی۔ اس کی پہلی سی قدر نہیں رہے گی۔ ابھی تو تائی نے اسے شہزادی بنا کر پلنگ پہ بٹھا رکھا تھا۔ ذرا سا کام بھی نہیں کرنے دیتی تھیں۔

ناجو کو دو ہزار روپے مٹھی میں تھماتے ہوئے اس نے لمحہ بھر کے لیے سوچا تھا۔ یہ دکان سے آنے والا کرایہ تھا۔ جس سے مہینہ بھی گزارنا تھا اور ابھی فرزانہ کو ہسپتال بھی لے کر جانا تھا۔ مگر ان سب باتوں پر حسد غالب آگیا اور وہ ناجو کی طرف متوجہ ہوئی۔

"کام پکا ہونا چاہیے.... حرام کے پیسے نہیں ہیں میرے۔" اس کا انداز نخوت بھرا تھا۔ ناجو نے اندر ہی اندر دانت پیسے مگر مسکرا کر چاپلوسی سے کہا۔

"پہلے کبھی کچا کام کیا ہے؟"

"نہیں۔" انادیہ کو تسلیم کرتے ہی بنی تھی۔

جس وقت ناجو دو ہزار مٹھی میں دبائے سیڑھیاں اتر رہی تھی اسے انادیہ کی چچی کسی دائی ٹائپ عورت کے ساتھ بھاگم بھاگ آتی دکھائی دیں۔ ناجو ناک پہ انگلی دھرے قدرے حیران ہوئی پھر سر جھٹک کر باہر نکل گئی تھی۔ کچھ ہی دیر بعد فرزانہ کو چچی اپنے ساتھ ہسپتال لے گئی تھیں۔

انادیہ کو پتا ہی نہ چلا... وہ اپنے گلے میں لٹکے تعویذ پہ ہاتھ پھیرتی ریڈیو پہ گانے سنتی رہی اور اگلے چار گھنٹوں میں نیچے کہرام مچ گیا۔

فرزانہ نے اپنا کہا پورا کر دیا تھا۔ وہ ابا کے پیچھے ہی اس گھر سے چلی گئی تھی۔ اپنی عدت کے دن پورے کیے بغیر، فرزانہ کو یہی دھڑکا تھا کہ انادیہ اس کے بعد اکیلی رہ جائے گی۔ لیکن جاتے جاتے بھی وہ انادیہ کی تنہائی دور کرنے کا سامان کر گئی تھی۔ ایک ننھی سی بچی اس بے رحم شہزادی کے حوالے کر کے.... فرزانہ دنیا سے منہ موڑ گئی تھی۔ انادیہ کو حواس باختہ چھوڑ کر.... اور اسے پہلی مرتبہ احساس ہوا تھا کہ فرزانہ اس گھر کے لیے کیا تھی؟ اور فرزانہ کے چلے جانے کے بعد اس کے اوپر کتنی بھاری ذمہ داری آگئی تھی۔

ایک ان چاہی ذمہ داری اور ناپسندیدہ بوجھ۔

☆ ☆ ☆

گردش حالات نے انادیہ کو حواس باختہ کر دیا تھا۔ بچی کا رونا چلانا، کھلانا پلانا، نہلانا دھلانا۔ اس جیسی نفیس اور نازک اندام لڑکی کے لیے پہاڑ توڑ دینے کے مترادف تھا۔

پھر ستم یہ کہ کاشف تین مہینے کے شارٹ کورس پہ کراچی چلا گیا تھا۔ اور یوں اس بچی سے نجات کا واحد ذریعہ بھی ہاتھ سے نکل گیا۔ اس کی شادی تین مہینے کے لیے مزید ملتوی ہو گئی تھی۔

ان ہی حالات میں انادیہ کے لیے ایک اچھی خبر یہ تھی کہ افراہیم کے ہاں لڑکی ہوئی تھی۔ انادیہ نے سنا تو ایک کمینی سی خوشی میں مبتلا ہو گئی۔ اوپر سے اسے چچی کی اداسی مزہ دے گئی تھی۔ گو کہ انہوں نے بہت زیادہ غم نہیں کیا تھا لیکن ان کے چہرے پہ عجیب سی اداسی تھی۔ انادیہ کے لیے یہ تاثرات بڑے خوش کن

تھے۔ اگلے کئی دن تک وہ مسوری رہی اور فرزانہ کے اس عذاب پہ غصہ بھی نہیں نکالا۔

دکان سے کرایہ آجاتا تھا۔ سو گزر بسر میں مسئلہ نہیں تھا۔ مگر ضروریات بہت بڑھ گئی تھیں۔ اور اناذیہ کی اچھا پہننے اوڑھنے کی خواہش مرجھانے لگی تھی۔

لیکن یہ حالات بھی محدود وقت تک کے لیے تھے۔ شادی کے فوراً" بعد وہ اپنے سارے ارمان پوری کرنے کی خواہش رکھتی تھی۔ زیورات' نئے نئے کپڑے اور خوب سیر سپاٹے۔ کاشف کے گھر مالی مسائل نہیں تھے۔ وہ معاشی لحاظ سے بہت مضبوط تھا۔ اور ابھی وہ مستقبل کے سہانے سپنے بُن ہی رہی تھی کہ وہ ہو گیا جس کی نہ اسے توقع تھی۔ نہ خواہش۔

وہ دن اس کی زندگی کا بدترین دن تھا۔ انتہائی خوفناک اور بھیانک۔ اس دن اناذیہ نے افراہیم کا ایک بھیانک روپ دیکھا تھا۔

اس دن وہ چھت پہ بنیرے سے لگی تانکا جھانکی میں مصروف تھی۔ کبھی ادھر چکراتی کبھی ادھر۔ بنیرے کے اوپر ٹوکری رکھی تھی۔ جس کے اندر کیلے رکھے تھے۔ وہ کیلے کھاتی مگن سی تھی۔ جب برابر والے صحن میں اس کی نگاہ روبا پہ پڑی تھی۔ قریباً" تین مہینے بعد وہ روبا کو دیکھ رہی تھی۔ نکھری' ستھری.... پہلے کے مقابلے میں جسم بھر گیا تھا۔ اور اس کے لہراتے خوب صورت بال۔ بال گیلے اور نم تھے۔ گویا وہ ابھی نہا کر نکلی تھی۔ وہ مصروف انداز میں بچی کے کپڑے دھو رہی تھی۔ پھر اس نے بالٹی میں کپڑے نچوڑ کر رکھے اور انہیں الگنی پر پھیلانے کے لیے چھت کی طرف جانے لگی۔

اناذیہ ذرا اوٹ میں کھڑی ہو گئی تھی۔ تاکہ روبا کی اس پہ نگاہ نہ پڑے۔ کہنے کو تو روبا اس کی سہیلی اور رشتے میں نند بھی تھی۔ لیکن اناذیہ کو پکا یقین تھا۔ چچی اور افراہیم روبا کو اناذیہ سے دور رکھنے کی کوشش کرتے ہیں۔ وہ مہینوں ایک دوسرے کی صورت نہیں دیکھتی تھیں۔ گو کہ ایک دوسرے سے ملنے کا شوق بھی نہیں تھا۔ پھر بھی روبا اناذیہ کو صحن میں بھی کم دکھائی دیتی تھی اور اناذیہ کو تو اس بات کی خبر ہی نہیں تھی کہ چچی روبا کو صحن میں بھی نکلنے نہیں دیتی تھیں۔ تاکہ اناذیہ کی نظر بد سے محفوظ رہ سکے۔ ان کے جو خدشات تھے وہ بے بنیاد ہرگز نہیں تھے۔ انہیں کہیں کوئی خطرہ اناذیہ سے لاحق ضرور تھا۔ شاید اس کی نیلی آنکھوں میں بجلی کی سی لپک انہیں خوفزدہ کیے رکھتی تھی۔

لیکن اس دن روبا کی بد قسمتی تھی جو وہ ساس کی غیر موجودگی میں کپڑے پھیلانے اوپر چلی آئی تھی۔ اپنے ہی دھیان میں مگن جب وہ بچی کے چھوٹے چھوٹے کپڑے الگنی پر پھیلا کر سیڑھیوں کی طرف آئی تو اناذیہ نے اوٹ سے نکل کر ایک کیلے کا چھلکا سیڑھی کے اوپر پھینک دیا تھا۔ اپنے تئیں یہ اس کی بے ضرر سی شرارت تھی۔

اب وہ اوٹ میں کھڑی ہو کر تماشا دیکھنے لگی۔

جیسے ہی روبا نے اپنے دھیان میں قدم چھلکے پہ پاؤں رکھا' دوسرے ہی پل وہ پھسلتی ہوئی بھیانک چیخوں کے ساتھ زمین بوس ہو گئی تھی۔ یہ صرف لمحوں کا کھیل تھا اور بس.... اور ابھی وہ پوری طرح سے اس کھیل کی کامیابی سے لطف اندوز بھی نہیں ہوئی تھی کہ کوئی قدموں کی خوفناک دھمک سے سیڑھیاں چڑھتا' دوڑتا اور دونوں چھتوں کو الگ کرتی چھوٹی دیوار کو پھلانگتا اس کے سر پہ بم کی طرح پھٹا تھا۔

وہ افراہیم تھا۔ جو "آپے" میں نہیں لگ رہا تھا۔ اور اس کے پیچھے آتی چچی خونخوار تیور لیے اور افراہیم اس کے منہ پر لگاتار تھپڑ مار رہا تھا ایک' دو' تین.... اور کسی زخمی درندے کی طرح غرا رہا تھا۔

"کمینی' ذلیل! مار ڈالا اسے۔ ڈائن کس کس کا خون چوسے گی؟"

وہ افراہیم تو نہیں تھا۔ یہ تو کوئی درندہ تھا۔ افراہیم تو بہت مہذب' نرم مزاج' حلیم الطبع تھا۔ وہ کسی عورت پہ ہاتھ کبھی اٹھانے والا نہ تھا۔

یہ افراہیم اس افراہیم سے کتنا مختلف اور الگ تھا۔ اناذیہ کو پٹتے مار کھاتے ہوئے بالکل علم نہیں تھا کہ افراہیم کے یوں بپھرنے کی کیا وجہ ہے اور نیچے سے آتی

روبا کی کراہیں۔

"یہ ناگن ہے۔ ضرور ڈسے گی۔ مجھے تو پہلے سے یقین تھا۔ اس کی بری نظر۔" اور وہ چچی تھیں جنہوں نے جوتی اتار کر اس کے منہ پہ ماری تھی۔

انادیہ کے منہ پہ۔۔۔ اپنی جوتی۔۔۔ نائیلون کی چپل۔

انادیہ کو لگا۔ جیسے اس کے منہ پر کسی نے کیچڑ مل دی ہے۔

"وہ دوسرے "جی" سے ہے ڈائن! جڑواں بچے ہیں اس کے پیٹ میں۔۔۔ اور وہ خونم خون۔" چچی نے ایک اور جوتا اس کے سر پہ مارا تھا اور پھر دھواں دھار روتی افراہیم کے پیچھے چلی گئی تھیں۔

اور انادیہ ایسی بے جان، جیسے جسم سے "روح" نکل گئی ہو۔ بے سدھ ساکت...... حتیٰ کہ اس کی آنکھ سے ایک آنسو بھی نہ نکلا۔

یہ اس کے ساتھ کیا ہوا تھا؟ کیوں ہوا تھا؟ اتنی ذلت؟ اتنی تذلیل؟ اتنی بے عزتی؟ افراہیم کے تھپڑ اور اس کی ماں کے جوتے؟ اس کا سکتہ شاید کبھی نہ ٹوٹتا۔ اگر ناجو اپنے سینے پہ دوہتڑ مارتی آگے نہ بڑھتی۔ جس نے پوری فلم اپنی آنکھوں سے دیکھی تھی۔ اور اب سینہ کوبی کرتی اس کے ساتھ فرش پہ بیٹھ گئی تھی۔ اس کے اندر غصے اور نفرت کے شعلے بھڑکانے کے لیے۔

"بڑھیا نے تجھے جوتا مارا۔۔۔ منہ پر، سر پہ اور تو چپ رہی بولی کیوں نہیں؟ اس کا ہاتھ پکڑ کر روک دیتی یا توڑ دیتی۔" وہ اس کے اندر سوئی ہوئی، وحشتوں کو جگاتی رہی۔ اسے اکساتی رہی۔

"اور اس کا بیٹا؟ بیوی کے عشق میں پاگل۔ تایا زاد بہن پہ ہاتھ اٹھایا۔ اس کی ایسی مجال؟" ناجو شعلوں پہ تیل چھڑکتی رہی۔۔۔ آگ بھڑکاتی رہی۔

"ارے، آگ لگا دے ان کو۔۔۔ ایسے جہنمی رشتے داروں کو۔" ناجو اس کے بکھرے بال سمیٹتی وحشی آنکھوں میں غصے کا زہر پھونکتی رہی۔

انادیہ نے پھٹی پھٹی نگاہوں سے ناجو کی طرف دیکھا۔ اس کا سویا ہوا دماغ بیدار ہونے لگا۔ اور ساری وحشتیں۔ غصہ۔ تذلیل۔ اور افراہیم کے تھپڑ چچی کے جوتے اس کے اندر آگ بھڑک اٹھی تھی۔

"وہ مر تو نہیں گئی تھی جس کے پیچھے تمہیں مار کے گیا ہے۔" ناجو زخموں پر نمک چھڑکنے لگی تو بالآخر انادیہ چیخ اٹھی۔

"بتا کیا کروں میں؟ بتا کیا کرتی میں؟ اس نے مجھے مارا اور اس کی ماں نے۔ وہ دو ٹکے کی روبا اسے اتنی پیاری تھی؟ اور میری اس کی نگاہ میں کوئی وقعت ہی نہیں۔ وہ مجھے مار کے گیا۔ دھتکار کے گیا۔ مجھے ذلیل کر کے گیا۔" وہ اونچی آواز میں چیختی رہی۔۔۔ اور ناجو اسے اور تاؤ دلاتی رہی۔ اس کے غصے کو بھڑکاتی رہی۔

انادیہ کو احساس ہی نہیں رہا تھا کہ وہ دو ٹکے کی روبا اس کی محبوب بیوی تھی اور اس کے ہونے والے بچوں کی ماں، اگر سیڑھیوں سے گر کر کوئی خطرناک چوٹ لگنے کی وجہ سے روبا مر جاتی تو؟

وہ اپنی غلطی کے بجائے صرف اپنی تذلیل کو سوچ سوچ کے ہلکان ہو رہی تھی۔

"بدلہ لے۔۔۔ اپنی چچی سے اور اس کے بیٹے سے۔ اور اس کی بہو سے۔" ناجو نے اس کے بہتے آنسو اپنی میلی اوڑھنی سے پونچھ کر غلاظت سے بھری ایک اوڑھنی اس کے سر پہ اوڑھا دی تھی۔ اور اس اوڑھنی کے نیچے اس کی عقل دفن ہو گئی تھی۔

✡ ✡ ✡

دلوں میں نفرتوں کی نہ ختم ہونے والی خلیج آ گئی تھی۔ انادیہ کو پتا چلا تھا کہ روبا اور افراہیم اس کا رشتہ بھی ختم کرنے کی کوشش کر رہے ہیں وہ تو ابھی کاشف وہاں موجود نہیں تھا۔ ورنہ اب تک اس کی منگنی بھی ٹوٹ چکی ہوتی۔

اپنے اس عمل کی وجہ سے وہ انادیہ کے لیے اور بھی قابل نفرین ہو چکے تھے۔ ان دونوں کے لیے انادیہ کے دل میں سوائے نفرت کے زہر، غیض اور بدلے کے اور کچھ بھی نہیں تھا۔

اسے افراہیم سے بدلہ لینا تھا۔ ان تھپڑوں کا جو اس کے منہ پہ مارے تھے اور چچی سے بھی انتقام لینا تھا۔ ان جوتوں کا جو اس کے رخساروں پہ اپنے نشان چھوڑ گئے تھے۔ ذلت کے نشان؟ اہانت کے نشان۔ روبا تو بلاوجہ ہی ان دونوں کے بیچ میں "پس" گئی تھی۔ ورنہ انادیہ کے دل میں روبا کے لیے پرخاش نہیں تھی۔ پھر بھی اس سارے "انتقام" کا بار بے چاری روبا کے سر پہ آ گیا تھا۔

وہ قصوروار نہ ہوتے ہوئے بھی قصوروار ٹھہری تھی۔ اور ایک نہ ختم ہونے والے عذاب میں مبتلا ہو گئی تھی۔ ہاں، روبا کو تکلیف ہوتی تو افراہیم بھی تڑپتا، اور اسی تڑپ کا مزہ لینے کے لیے وہ اندھا دھند چل پڑی۔

نماز ظہر کا وقت تھا۔ سرما کے دن آ چکے تھے۔ یوں چڑھتے اور یوں ڈھل جاتے۔

اس نے ناجو کے کہنے پہ برقعہ پہن رکھا تھا۔ سر سے لے کر پیروں تک۔ چہرہ نقاب میں چھپا تھا۔ اسی طرح ناجو بھی برقعے میں تھی۔ تاہم اس نے نقاب نہیں لگا رکھا تھا۔ وہ تانگے میں بیٹھی ان جانے راستے کی جانب گامزن تھی۔ اور بہت گھبرائی ہوئی تھی۔

ناجو اس کی گھبراہٹ کو سمجھتی تھی۔ اسی لیے بار بار اس کا ہاتھ دباتی، تسلی دیتی تھی۔ خنک فضا کے باوجود اس کے ہاتھ پسینے میں بھیگے ہوئے تھے۔

کچھ ہی دیر میں تانگا ایک کچے راستے پہ رک گیا تھا۔ آگے ندی تھی۔ جسے پیدل پار کرنا تھا۔ بڑا خوفناک راستہ تھا۔

"یہاں پہ میں آتی تھی تیرے لیے اور ایک نہیں، کئی دفعہ آئی ہوں۔" ناجو نے بیچ بیچ میں اپنے احسانات گنوانے بھی ضروری سمجھے تھے اور انادیہ کو آگے بڑھتے ہوئے کئی مرتبہ ناجو کی دوستی پہ فخر سا ہوا تھا۔ اس نے اس کی خاطر اپنی جان جوکھم میں ڈالی تھی۔ ایک دفعہ نہیں کئی دفعہ۔

اور اب کام ذرا دوسری نوعیت کا تھا اس لیے انادیہ کو خود ہی آنا پڑا۔

انہوں نے کم پانی والی سطح میں پیر ڈالے اور پتھروں، کنکروں پہ چلتی ندی عبور کر گئیں۔ آگے راستہ تنگ اور ہموار تھا۔ پھر سامنے ہی برگد کا خوفناک سا درخت۔ دلوں میں ہیبت کا احساس ابھرا۔ ناجو کے ہاتھ پہ اس کی گرفت ڈھیلی ہوتی جا رہی تھی۔

"ڈرو نہیں۔" ناجو نے تنبیہہ کی "یہاں آتے ہوئے خوف آتا ہے۔ جاتے ہوئے نہیں۔" اس کی تسلیاں۔ انادیہ خوف سے پیلی پڑتی چلتی رہی۔ جب سر دھڑ کی بازی لگا ہی دی تھی تو پھر ڈرنا کیسا؟

کچھ ہی دیر میں وہ اماں دیوانی کے آستانے پہ تھیں۔ یہ ویسا ہی تھا جیسا کہ "عموماً" عملیات کرنے والے ساحروں کا ہوتا ہے۔

گھٹن سے بھرا کمرہ۔۔۔ نیچی چھت، اکا دکا لوگ۔ خاموشی، سناٹا اور ہیبت۔

"آج کے دن رش کم ہوتا ہے۔۔۔ اماں دیوانی کا یہ "چلہ تہوار" ہے۔ آج کے دن وہ بہت کم کسی کا کام کرتی ہے۔ یہ تو تیرے نصیب اچھے ہیں۔ میں نے تیری درد ناک کہانی سنائی تو اماں کو ترس آ گیا۔ اس لیے آج ہی تمہیں بلا لیا۔" ناجو نے اس کے کان میں سرگوشی کی تھی۔

"آج کے بعد دوبارہ تو نہیں بلائیں گی؟" انادیہ نے دھیمی آواز میں پوچھا۔

"ہرگز نہیں۔۔۔" ناجو نے اسے تسلی دی تھی۔ "اماں دیوانی بس ایک ہی دفعہ کام کرتی ہے۔ پکا اور ٹھوس۔ جعلی پیروں کی طرح ڈراما نہیں کرتی۔ بڑی جانی مانی جادوگرنی ہے۔" ناجو اماں دیوانی کی تعریف کرتی چلی گئی اور پھر اماں دیوانی کا انتظار کرتے کرتے وہ اس کی پوری ہسٹری کو بھی جان گئی تھی۔

"بنگال کی ہندوانی تھی۔ یعنی ہندو عورت۔ ایک مسلمان مچھیرے کی محبت کا طوق گلے میں لٹکا لیا۔ اور وہ تھا پکا مسلمان۔۔۔ یہ کٹر ہندنی۔ مچھیرے نے اس کی محبت کو قبول نہ کیا اور بنگال چھوڑ کر یہاں آن بسا۔ اماں دیوانی اس کے پیچھے یہاں چلی آئی۔ وہ اپنی زندگی اور بال بچوں میں گم تھا۔ اماں نے اس کے فراق میں۔

اسے افراہیم سے بدلہ لینا تھا۔ ان تھپڑوں کا جو اس کے منہ پہ مارے تھے اور چمچے سے بھی انتقام لینا تھا۔ ان جوتوں کا جو اس کے رخساروں پہ اپنے نشان چھوڑ گئے تھے۔ ذلت کے نشان؟ اہانت کے نشان۔ روبا تو بلاوجہ ہی ان دونوں کے بیچ میں "پس" گئی تھی۔ ورنہ انادیہ کے دل میں روبا کے لیے پرخاش نہیں تھی۔ پھر بھی اس سارے "انتقام" کا بار بے چاری روبا کے سر پہ آ گیا تھا۔

وہ قصوروار نہ ہوتے ہوئے بھی قصوروار ٹھہری تھی۔ اور ایک نہ ختم ہونے والے عذاب میں مبتلا ہو گئی تھی۔ ہاں، روبا کو تکلیف ہوتی تو افراہیم بھی تڑپتا، اور اسی تڑپ کا مزہ لینے کے لیے وہ اندھا دھند چل پڑی۔

نماز ظہر کا وقت تھا۔ سرما کے دن آ چکے تھے۔ یوں چڑھتے اور یوں ڈھل جاتے۔

اس نے ناجو کے کہنے پہ برقعہ پہن رکھا تھا۔ سر سے لے کر پیروں تک۔ چہرہ نقاب میں چھپا تھا۔ اسی طرح ناجو بھی برقعے میں تھی۔ تاہم اس نے نقاب نہیں لگا رکھا تھا۔ وہ تانگے میں بیٹھی ان جانے راستے کی جانب گامزن تھی۔ اور بہت گھبرائی ہوئی تھی۔

ناجو اس کی گھبراہٹ کو سمجھتی تھی۔ اسی لیے بار بار اس کا ہاتھ دبائی، تسلی دیتی تھی۔ خنک فضا کے باوجود اس کے ہاتھ پسینے میں بھیگے ہوئے تھے۔

کچھ ہی دیر میں تانگا ایک کچے راستے پہ رک گیا تھا۔ آگے ندی تھی۔ جسے پیدل پار کرنا تھا۔ بڑا خوفناک راستہ تھا۔

"یہاں پہ میں آتی تھی تیرے لیے اور ایک نہیں، کئی دفعہ آئی ہوں۔" ناجو نے بیچ بیچ میں اپنے احسانات گنوانے بھی ضروری سمجھے تھے اور انادیہ کو آگے بڑھتے ہوئے کئی مرتبہ ناجو کی دوستی پہ فخر سا ہوا تھا۔ اس نے اس کی خاطر اپنی جان جوکھم میں ڈالی تھی۔ ایک دفعہ نہیں کئی دفعہ۔

اور اب کام ذرا دوسری نوعیت کا تھا اس لیے انادیہ کو خود ہی آنا پڑا۔

انہوں نے کم پانی والی سطح میں پیر ڈالے اور پتھروں، کنکروں پہ چلتی ندی عبور کر گئیں۔ آگے راستہ تنگ اور ہموار تھا۔ پھر سامنے ہی برگد کا خوفناک سا درخت۔ دلوں میں ہیبت کا احساس ابھرا۔ ناجو کے ہاتھ پہ اس کی گرفت ڈھیلی ہوتی جا رہی تھی۔

"ڈرو نہیں۔" ناجو نے تنبیہہ کی۔ "یہاں آتے ہوئے خوف آتا ہے۔ جاتے ہوئے نہیں۔" اس کی تسلیاں۔ انادیہ خوف سے پیلی پڑتی چلتی رہی۔ جب سردھڑ کی بازی لگا ہی دی تھی تو پھر ڈرنا کیسا؟

کچھ ہی دیر میں وہ اماں دیوانی کے آستانے پہ تھیں۔ یہ ویسا ہی تھا جیسا کہ عموماً "عملیات کرنے والے ساحروں کا ہوتا ہے۔

گھٹن سے بھرا کمرہ.... نیچی چھت اکا دکا لوگ۔ خاموشی، سناٹا اور ہیبت۔

"آج کے دن رش کم ہوتا ہے.... اماں دیوانی کا یہ "چلہ تہوار" ہے۔ آج کے دن وہ بہت کم کسی کا کام کرتی ہے۔ یہ تو تیرے نصیب اچھے ہیں۔ میں نے تیری درد ناک کہانی سنائی تو اماں کو ترس آ گیا۔ اس لیے آج ہی تمہیں بلا لیا۔" ناجو نے اس کے کان میں سرگوشی کی تھی۔

"آج کے بعد دوبارہ تو نہیں بلائیں گی؟" انادیہ نے دھیمی آواز میں پوچھا۔

"ہرگز نہیں.... "ناجو نے اسے تسلی دی تھی۔ "اماں دیوانی بس ایک ہی دفعہ کام کرتی ہے۔ پکا اور ٹھوس۔ جعلی پیروں کی طرح ڈراما نہیں کرتی۔ بڑی جانی مانی جادوگرنی ہے۔" ناجو اماں دیوانی کی تعریف کرتی چلی گئی اور پھر اماں دیوانی کا انتظار کرتے کرتے وہ اس کی پوری ہسٹری کو بھی جان گئی تھی۔

"بنگال کی ہندوانی تھی۔ یعنی ہندو عورت۔ ایک مسلمان مچھیرے کی محبت کا طوق گلے میں لٹکا لیا۔ اور وہ تھا پکا مسلمان.... یہ کٹر ہندنی۔ مچھیرے نے اس کی محبت کو قبول نہ کیا اور بنگال چھوڑ کر یہاں آن بسا۔ اماں دیوانی اس کے پیچھے یہاں چلی آئی۔ وہ اپنی زندگی اور بال بچوں میں گم تھا۔ اماں نے اس کے فراق میں۔

جنگلوں میں بیٹھ کر ہزار چلّے کیے مگر مچھیرا پھر بھی نہ ملا اور ایک روز وہ اس دنیا سے ہی چلا گیا۔ اماں غم میں دیوانی۔۔۔ تب سے آج تک یہ "اماں دیوانی" ہے۔ اسی مچھیرے کی قبر پہ اماں نے اپنا آستانہ بنا لیا۔۔۔ اور ساری زندگی لوگوں کے لیے وقف کردی۔ دکھی انسانیت کی خدمت۔ الٹے کام سیدھے اور سیدھے الٹے کرنا اماں دیوانی کے بائیں ہاتھ کا کام ہے۔

لیکن ایک بات ہے۔۔۔ اماں سب سے زیادہ چوٹی کا تعویذ محبت کرنے والوں کے لیے دیتی ہے۔۔۔ مجال ہے جو لڑکا، کسی لڑکی کا دل توڑ کر سکھی رہ جائے۔ اماں کو جلال آجاتا ہے اپنی ناکام حسرتوں کا اور پھر یا تو محبوب گیا یا محب گیا۔"

انادیہ خاموشی سے ناجو کی باتیں سن رہی تھی۔ کچھ ہی دیر میں ان کا بلاوا آگیا۔ وہ دونوں اندر پہنچیں۔ یہ ایک گھٹن زدہ نیم تاریک کمرہ تھا۔ فرشی دری پہ بیٹھی گھونسلا بالوں والی عورت۔ جس کی آنکھیں بند تھیں اور وہ اپنے دھیان میں گول گول سر کو گھماتی تھی۔

وہ ایک کریہہ چہرے والی عورت تھی۔ اگر وہ مچھیرا اسے چھوڑ کر بھاگا تھا تو ٹھیک ہی بھاگا تھا۔ اس خوفناک عورت سے شادی کے بعد بھلا اس کا کیا حشر ہوتا؟

"یہ آتشِ عشق ہے، جلا کر راکھ کرتی ہے۔ اس چہرے پہ نہ جاؤ۔ اس عشق کو دیکھو۔ جس نے چہروں پہ کالک مل دی۔" اماں دیوانی آنکھیں کھول کر غرائی۔ لگتا تھا اس نے اس کی سوچ کو پڑھ لیا ہے۔ کہنے کے ساتھ ہی اماں دیوانی ایک مرتبہ پھر دھیان گیان میں گم ہو چکی تھی اور نادیہ کے حواس ساتھ چھوڑ رہے تھے۔

پھر اس نے اچانک ہاتھ کا اشارہ دیا۔ ناجو اس اشارے کو پہچانتی تھی فوراً انادیہ کا بازو دبوچ کر کھڑی ہوگئی۔

"چل، ہمیں جانے کا حکم ہے۔" ناجو نے اس کی انگلی میں دبی سونے کی انگوٹھی اپنے ہاتھ میں دبوچی اور تیزی سے آستانے کے دروازے کی طرف بڑھنے لگی۔ "پیچھے مت دیکھنا" وہ اسے گھسیٹتی باہر لا رہی تھی۔

انادیہ کا دم گھٹ رہا تھا۔ اس نے گھومتے سر کے ساتھ آخری مرتبہ گردن موڑ کر پیچھے دیکھا تھا۔ ناجو کی تنبیہہ کے باوجود اور اس کی جیسے جان سے نکل گئی۔

وہاں کونے میں اماں دیوانی سے دور جلتی لوبان کے اٹھتے دھوئیں کے پیچھے کوئی کھڑا تھا۔ سانس لیتا ہوا مجبور بے بس، بے حد خوب صورت چہرہ اور اس چہرے پہ بے انت کرب کی اذیتیں رقم تھیں۔ وہ ایک کم عمر نورانی صورت والا لڑکا تھا۔

اس نے شادی کے بعد افراہیم کے گھر میں نہیں، اس کے دل میں قدم رکھا تھا۔ وہ اپنے شوہر کے گھر کی ہی نہیں، اس کے دل کی بھی ملکہ تھی۔ افراہیم اس سے محبت کرتا تھا اور اس کی ماں اپنے بیٹے کی محبت سے محبت کرتی تھی۔

افراہیم کی شاندار جاب کی وجہ سے زندگی میں سہولیات، امن، سکون سب کچھ تھا۔ معاشی لحاظ سے افراہیم اس کے بھائی سے کم نہ تھا۔ شادی کے دسویں مہینے میں پیاری سی بیٹی نے ان کی خوشیوں کو دوبالا کر دیا تھا۔ پھر کچھ ہی عرصے میں وہ دوبارہ امید سے ہوگئی تھی۔ اماں کو پوتے کھلانے کا بڑا ارمان تھا۔ اور روبا کی خواہش تھی۔ اب کی دفعہ بیٹا ہو اور کبھی کبھی خواہشیں ایسے بھی پوری ہو جاتی ہیں۔۔۔ خدا نے اسے ایک نہیں، دو دو بیٹوں سے نوازا۔ دونوں کی شکلیں جڑواں ہونے کے باوجود مختلف تھیں۔ بس آنکھیں، بال اور ہونٹ کا تل ایک جیسا تھا۔۔۔ افراہیم جیسا باقی دونوں میں کوئی بھی چیز مماثلت نہیں رکھتی تھی۔ بڑے ہوئے تو عادتیں، مزاج، انداز بھی مختلف اور روبا بھی اپنے بیٹوں کی پیدائش سے پہلے والے وقت کو یاد کر رہی تھی۔

جب وہ ایک تکلیف دہ حادثے سے گزری تھی۔ چھت سے اترتے ہوئے سیڑھیاں طے کرتے پھسلنا اور زمین پر گر کر بے ہوش ہو جانا۔۔۔ بڑا خوفناک وقت تھا۔ سانس سینے میں اٹکا ہوا۔ ڈاکٹر پریشان اور افراہیم بھرا ہوا

نہ بچے محفوظ تھے اور نہ ماں۔۔ روبا کو ہوش نہیں آ رہا تھا۔ ایک بری میچور ڈلیوری۔ ڈیڑھ مہینہ ہسپتال میں رہنے کے بعد اس کا آپریشن ہوا اور افراہیم کی جان میں جان آئی تھی۔

وہ خیروعافیت سے گھر آگئی تھی۔ بچے تندرست تھے۔ اماں صدقے اتارتی نہ تھکتی تھیں اور افراہیم کا اناڈیہ پہ آیا غصہ ختم ہی نہ ہوتا تھا اور اب تو روبا بھی اناڈیہ سے کھنچنے لگی تھی۔ وہ اس کی سہیلی تھی اور ہونے والی بھابھی بھی۔۔۔ بلاوجہ ہی اس کی جان لینے کے درپے تھی۔

اناڈیہ کو پہلے ہی کوئی پسند نہیں کرتا تھا اور افراہیم اور اماں کی خاص تاکید، تنبیہہ اور سمجھانے پہ روبا نے بھی اناڈیہ سے دور رہنا شروع کر دیا تھا۔

افراہیم اکثر کہتا "اس سنہری بلا میں تمہارے بھائی کو آخر کیا نظر آیا ہے؟" وہ اس سوال پہ خاموش رہ جاتی تھی۔

اس معاملے میں وہ انتہائی بے بس تھی۔ اسے لگتا تھا۔ بھائی اپنے فیصلے پہ نظرثانی نہیں کرے گا۔

"کبھی خیال آتا ہو سکتا ہے۔ اناڈیہ نے جان بوجھ کر نہ کیا ہو۔ بے دھیانی میں چھلکا پھینک دیا ہو۔ مگر افراہیم کہتے تھے۔ انہوں نے خود اپنی آنکھوں سے اناڈیہ کو چھلکا پھینکتے دیکھا تھا اور جب افراہیم نے دیکھا تو پھر شک کی کوئی گنجائش نہیں رہتی تھی۔

اس کا دل اناڈیہ سے کھٹا ہو گیا تھا۔ اسی دوران افراہیم کا دباؤ بھی بڑھ گیا تھا۔

"کاشف کو سمجھاؤ۔۔۔ وہ اناڈیہ سے بچ جائے۔ یہ بڑی خوب صورت بلا ہے۔ خون چوس ڈالے گی۔ اس کا ذہن تخریب کاری کی طرف مائل رہتا ہے۔"

روبا خود بھی اناڈیہ سے بیزار ہوتی جا رہی تھی۔ اس نے اماں سے ذکر کیا تو وہ بے بس نظر آئیں۔ "کاشف نہیں مانے گا۔"

"پہلے اس میں ہیرے لگتے تھے۔ اب کیڑے نظر آ رہے ہیں۔" وہ واقعی نہیں مان رہا تھا۔

روبا پریشان تھی۔ پھر اس کی پریشانی کا دائرہ وسیع ہونے لگا۔ سیڑھیوں سے گرنا، بچوں کی پیدائش اور اس کے بعد نہ ختم ہونے والا تکلیفوں کا سلسلہ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ اس کے ساتھ کیا ہو رہا ہے؟

پہلی مرتبہ اسے کچن میں برتن دھوتے ہوئے کچھ عجیب سا احساس ہوا تھا۔ لگتا تھا جیسے کسی بچے نے اس کی قمیص کا دامن پیچھے سے کھینچا ہے۔ پہلے اس نے نظرانداز کیا پھر خیال گزرا پاؤں پاؤں چلتی بچی کچن میں نہ آگئی ہو۔ اسی خیال کے تحت اس نے برآمدے تک بھی جا کر دیکھا۔ بچی اپنے کاٹ میں سوئی ہوئی تھی۔ وہ سر جھٹک کر اپنا وہم خیال کرتی واپس آگئی۔ لیکن پھر دوبارہ ایسا ہوا تو مارے خوف کے اس پہ کپکپی طاری ہو گئی تھی۔

اس نے کچن میں کام ادھورا چھوڑا اور اٹھ کر بچوں کے کمرے میں آگئی۔ پھر اسے جتنی بھی قرآنی سورتیں یاد تھیں باری باری سب پڑھیں اور جیسے دل سے سارا خوف نکل گیا۔

رات کو افراہیم گھر آیا تو وہ سب کچھ بھول چکی تھی۔ بلکہ اپنی سالگرہ بھی۔۔ مگر افراہیم نے بہت خوب صورت سرپرائز دیا تھا۔ انہوں نے ایک ریسٹورنٹ میں کھانا بھی کھایا اور کچھ تفریح بھی کی۔ پھر جب وہ گھر آئی تو بچوں کو سلاتے فیڈر بناتے، افراہیم کے لیے کافی تیار کرتے۔ بہت سا وقت گزر گیا تھا۔ روبا نے کچن کی لائٹ بند کرنے سے پہلے چیزیں ٹرے میں رکھیں اور ابھی ہاتھ بڑھایا ہی تھا کہ سوئچ بورڈ کے بٹن پہ کلک کی آواز کے ساتھ کچھ سرسراہٹ ہوئی اور ایک دم کچن میں اندھیرا چھا گیا تھا۔

روبا کی جیسے جان نکل گئی تھی۔ اس کے ہاتھ سے ٹرے چھوٹ گئی۔ ایک چھناکے کی آواز سن کر افراہیم افتاں خیزاں باہر آیا تو روبا تھر تھر کانپتی حواس باختہ تھی۔

"روبا! کیا ہوا؟ یہ شور کیسا تھا؟" وہ گھبرا کر پوچھنے لگا۔ اماں بھی بھاگی بھاگی پہنچ گئی تھیں۔

روبا رونے لگی تھی۔ لیکن کچھ بتانے سے قاصر تھی۔ وہ انہیں کیا بتاتی؟ بھلا کون یقین کرتا؟

(باقی آئندہ ماہ ان شاء اللہ)

صباحت عمران

پسِ مرگ

نہ کرتا۔

عسام جو ڈائری لکھا کرتا تھا، آج اس ڈائری کو اپنے سامنے کھول کر بیٹھے میں سوچ رہا ہوں کہ اس ڈائری میں اتنے صفحے خالی کیوں ہیں۔ ایسے اتنے سارے خالی صفحے چھوڑ کر وہ کیوں مر گیا۔ کیا اسے ڈائری میں اور کچھ نہیں لکھنا تھا۔ اس نے قلم کی سیاہی کو بھی کھو کھلا پایا تھا۔ یا وہ لفظوں سے بھی بدلہ لے رہا تھا! وہ ان سے

لوگ زندہ انسانوں کو مار دیتے ہیں اور پھر ان پر ماتم کرتے ہیں۔

کہتے ہیں کہ موت اچانک آتی ہے، مجھے لگتا ہے کہ کچھ لوگوں کی موت رینگ رینگ کر آتی ہے۔ وہ ایک تن آور درخت کا بیج بن کر پہلے اندر جگہ بناتی ہے۔ جڑ نکلتی ہے، تنا پھوٹتا ہے، درخت بنتا ہے، پھر درخت کی ناسور چھاؤں روح کے چپے چپے پر سایہ فگن ہو کر اسے موت کی طرف کھینچنے لگتی ہے۔

"ہم لوگوں کو ختم کر دیتے ہیں اپنے رویوں سے، اپنے لفظوں سے اور پھر ان کا سوگ مناتے ہیں۔"

لوگ یہی کہتے ہیں کہ جو زندہ تھا، دیکھو اب وہ مر گیا۔ جبکہ انہیں یہ کہنا چاہیے کہ "وہ جو ایک عرصے سے اندر سے مر رہا تھا آج اس کی موت کا دائمی خاتمہ ہو گیا۔" جب وہ اندر سے مر رہا تھا دراصل تب ہی انہیں اپنا سوگ شروع کر دینا چاہیے تھا۔ لوگ اس انتظار میں کیوں تھے کہ وہ کفن میں لپیٹ دیا جائے اور
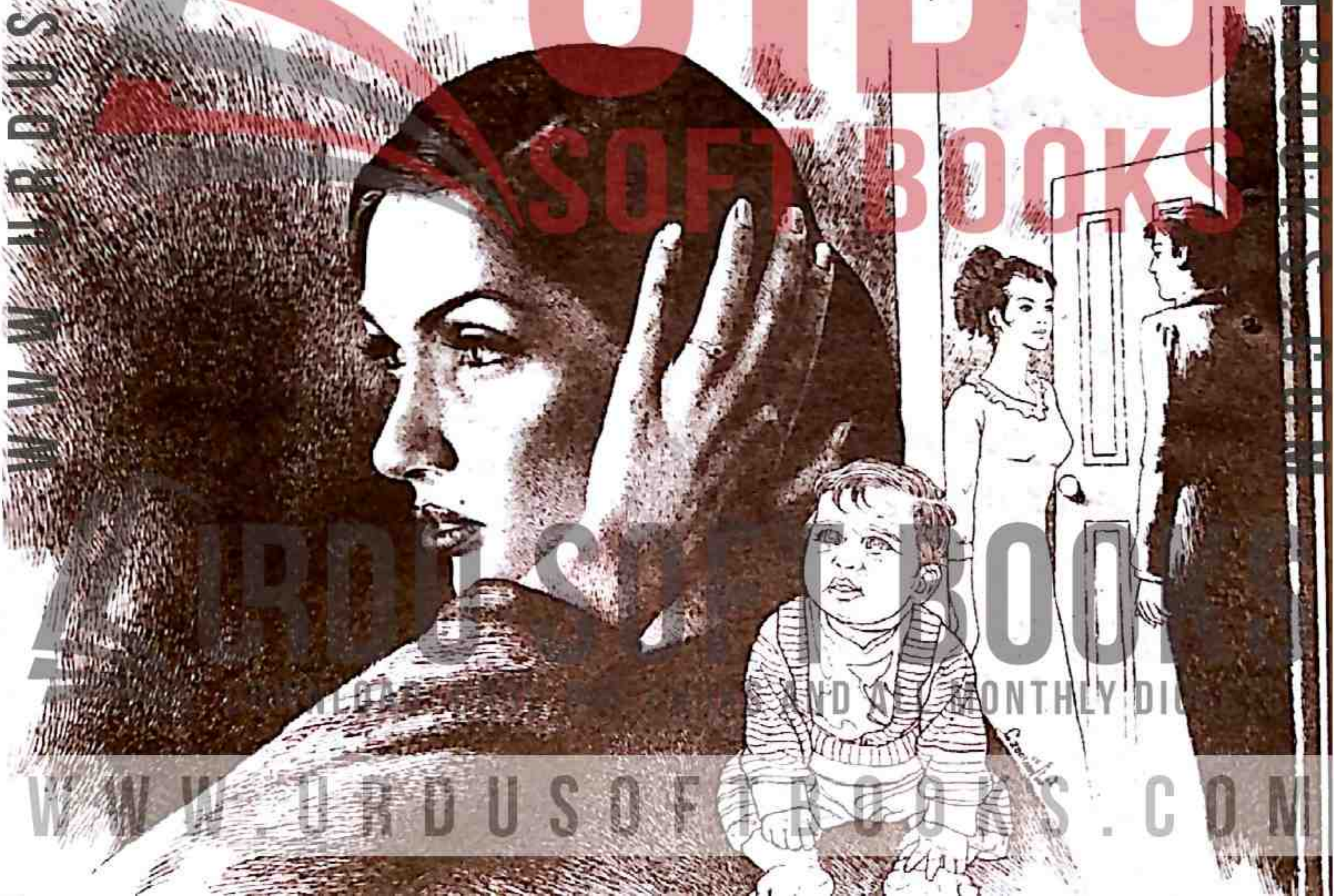
پھر ہی وہ ماتم شروع کریں۔ اس انتظار میں کہ وہ مر جائے اور وہ شور کریں کہ دیکھو وہ تو مر گیا۔ وہ کیسے مر گیا۔ کیوں کر مر گیا۔

کیا وہ نہیں جانتے وہ کب مرنا شروع ہوا۔ کیسے مرنا شروع ہوا' کیوں مرنا شروع ہوا۔

کیا وہ بیج جو سب نے مل کر اس کے اندر بو دیا تھا' اس کی روح میں دبا دیا تھا وہ پھوٹ کر موت نہ بنتا؟ وہ بیج جیسے حسد' انتقام' جلن' کم ظرفی' بے حسی' تکبر' خود غرضی' احساس برتری کا پانی دیتے رہے تھے وہ اپنی جڑیں نہ پھیلاتا۔ یہ زہریلا تن آور درخت اس کی روح میں شاخیں نہ پھیلاتا' دماغ کو مفلوج' دل کو ناکارہ

رنجیدہ تھا۔ اگر اس سے اپنی زندگی کے دن پورے نہیں ہو سکے تھے تو وہ اپنی ڈائری کے صفحات تو پورے لکھ دیتا۔ اس کی ذات پر جو چوٹ ہمیشہ پڑی رہی' وہ چوٹ وہ اس ڈائری میں ہی اٹھا دیتا۔

اس کی زندگی جو بڑھاپے تک نہیں جا سکی' کم سے کم یہ ڈائری ہی اپنے آخری صفحے تک چلی جائے۔ اسی لیے اس کے قلم سے' اسی کی ڈائری کے ایک خالی صفحے پر میں نے لکھنا شروع کر دیا ہے۔ "عصام مر چکا ہے اور اب لوگوں کا سوگ بھی شروع ہو چکا ہے۔"

میں اس ڈائری میں وہ کون کون سی بات لکھوں کہ اس کے سب خالی صفحے پُر ہو جائیں۔ کیا وہ بات لکھ دوں' جو بازار میں میرے ساتھ ساتھ چلتے اس نے ایک دن کہی تھی۔

"کل یہاں میں نے ایک کمزور سے بوڑھے کو دیکھا تھا۔ وہ ٹھنڈ سے کانپ رہا تھا۔ پھٹے پرانے سے کپڑے پہنے ہوئے تھے اس نے۔ جب میں اس کے قریب سے گزرا اور اس کی طرف غور سے دیکھا تو اس نے بھی میری طرف غور سے دیکھنا شروع کر دیا۔ میں ڈر گیا۔ مجھے ایسا لگا کہ اس نے مجھ سے کہا۔ "میں ٹھنڈ سے کانپ رہا ہوں اور تو دنیا کی بے حسی سے' اپنی بے قدری سے کانپے گا۔"

بے اختیار میری ہنسی نکل گئی۔ کچھ ہی دیر میں وہ بھی ہنسنے لگا۔ شاید اسے اندازہ ہو گیا تھا کہ وہ کچھ عجیب سی بات کہہ گیا ہے۔ لیکن اب جب یہ ڈائری اور اس کی زندگی میرے سامنے ہے تو مجھے یقین ہونے لگا ہے کہ اس بوڑھے کی آنکھوں کی تنبیہہ حقیقت تھی۔

عصام نے اس بوڑھے کی آنکھوں کو ٹھیک سے پڑھ لیا تھا۔ میں جانتا تھا کہ آنکھوں کی تحریریں پڑھنے میں وہ کتنا ماہر تھا۔ اس کا بچپن لوگوں کی آنکھوں میں جھانکتے جھانکتے بوڑھا ہو گیا تھا۔ جو باتیں اسے معلوم نہیں ہونی چاہیے تھیں' وہ بھی معلوم ہو گئی تھیں۔

اتنی سی عمر میں اس نے دوسروں کی نظروں میں ہتک اور احساس برتری کی تحریریں پڑھنی شروع کر دی تھیں' تحریریں گوشت پوست میں تھیں اور وہ ان' گوشت پوست کا کھوجی تھا۔ مجھے اس وقت معلوم نہیں تھا کہ جو چیزیں اس نے پڑھنی شروع کر دی ہیں وہ اس کے علم میں نہیں' اس کی موت کے امکانات میں اضافہ کریں گی۔ جو چیزیں وہ جاننے' کھوجنے' سوچنے لگا ہے وہ اس کی زندگی کے دن کم کر دیں گی۔ ان دیکھی تحریریں پڑھنے والے بہت جلد مر جاتے ہیں۔

ہر چیز توازن چاہتی ہے تو ہی وہ قائم رہتی ہے۔ عصام متوازن نہیں تھا۔ متوازن ہوتا تو مصنف نہ ہوتا۔ اونچی پہاڑی پر روشن الاؤ کی طرح اس کی شخصیت کا پھیلاؤ اتنا وسیع اور بلند تھا کہ مجھ جیسے شخص کے لیے کوئی ایک پہلو جان لینا بھی بہت ہوتا۔ اس کی ذات کے اتنے رخ تھے کہ اگر میں اسے ان گنت آئینوں کے سامنے کھڑا کر دیتا تو ہر آئینہ ایک الگ صورت دکھاتا۔ اتنی جہتیں رکھنے والے انسان ہوتے ہی کتنے ہیں۔ بہت کم' مٹھی میں سما جانے والے موتیوں جتنے' کچھ قائد' کچھ شاعر' کچھ استاد' کچھ عالم' کچھ خبطی سائنس دان اور کچھ اس جیسے مصنف۔

☆ ☆ ☆

اس کی پہلی کہانی چھپ گئی تھی۔ ایڈیٹر نے تعریفی خط لکھ کر بھیجا تھا۔ خط کافی لمبا تھا لیکن اس کا لب لباب یہ تھا کہ۔

”اتنی حساس تحریر کم سے کم میری نظروں کے سامنے سے آج تک نہیں گزری۔ موضوع تو وہی پرانا ہے ایک۔ بیوہ عورت اور اس کی دکھی، مشقت بھری زندگی۔ ہزاروں ایسی بیوائیں دیکھی ہیں لیکن وہ بیوہ نہیں دیکھی جو آپ نے اپنی کہانی میں دکھائی ہے یا تو آپ کا تخیل قابل تعریف ہے، ورنہ شاید آپ کا فکری مناظرہ آپ نے لفظوں کے جس فریے میں اس بیوہ کے کردار کی جوت جلادی ہے وہ حیران کن ہے۔“

میں جانتا تھا کہ اس نے کس بیوہ کی کہانی لکھی ہے۔ وہ بیوہ ہمارے اسکول کے چپڑاسی کی بڑی بیٹی تھی۔ جو اسکول کی طرف سے ہی الاٹ اپنے باپ کے دو کمروں کے کوارٹر میں اپنے چار یتیم بچوں کے ساتھ رہتی تھی۔ آدھی چھٹی کے وقت کالے چنے اور کبھی کبھی نان ٹکی لگایا کرتی تھی۔ اس بیوہ کو سارا اسکول جانتا تھا پھر سب نے وہ محسوس کیوں نہیں کیا تھا جو عصام نے کرلیا تھا۔ عصام نے کبھی اس سے نان ٹکی لے کر نہیں کھائی تھی۔ وہ آدھی چھٹی کے وقت باجی جی سے کچھ دور جاکر کھڑا ہوجاتا اور اسے دیکھتا رہتا تھا۔ کبھی کبھی اس کے روتے ہوئے چھوٹے بچوں کو بہلانے لگتا تھا۔

گھر والے سب خوش تھے لیکن وہ خوش نہیں ہوسکا۔ دو دن چپ رہنے کے بعد اس نے بس اتنا کہا۔

”کسی کے دکھ پر میں نے اپنی خوشی لکھ دی۔ ٹھیک نہیں کیا شاید۔“

ٹھیک تو اس نے واقعی نہیں کیا تھا۔ کیا ضرورت تھی اتنا غیر معمولی حساس ہونے کی۔ اسے بھی ہم سب گھر والوں کی طرح نارمل ہونا چاہیے۔ باقی دنیا کی طرح بے حس۔ اس نے اپنے دل میں اتنے سوراخ کیوں کر لیے تھے جو شگاف بن کر اسے نگل گئے۔ جب دنیا بے حسی کے چراغ، بے نیازی کے طاقوں پر رکھ کر جلا رہی تھی تو وہ بھی یہی کرتا۔ دنیا بے پیندے کی تھی تو وہ بھی کیوں نا بے پیندے کا ہوگیا۔

اس کی کہانیاں چھپنے لگی تھیں۔ لفظوں کو اس نے جو نئے معنی دیے تھے وہ اس کی کہانیوں کو غیر معمولی بنا رہے تھے۔ اہرام بنے، زمین پر پہاڑ کی طرح ڈھونکے معاشرے میں دفن لاشوں کو وہ اکھیڑ اکھیڑ کر لانے لگا۔ اس کی سوچ بنجارا تھی، جو دنیا کا کونا کونا سو گھومتی۔ اس کا تخیل زمین پر رینگتا، ہواؤں میں اڑتا۔ اس کی ذہانت سوال کھڑے کرتی، جواب ڈھونڈ کر لاتی۔ وہ جس بات کی کھوج میں نکلتا اس بات کا راز پا کر ہی لوٹتا۔

”کیسی عجیب کتاب ہے۔“ اکثر میں کسی کتاب کے چند صفحے پڑھ کر اسے ایک طرف اچھال دیتا۔ وہ کتاب اور مجھے بیک وقت دیکھتا۔ کتاب اٹھاتا اور بس پہلی چند لائنیں پڑھ دیتا۔

”اندھیروں کی چاپ اس وقت بڑھ جاتی ہے، جب روشنیوں کی چال معذور ہونے لگے۔“

اس نے بلند آواز سے پڑھا اور میری طرف دیکھا۔

”جس کتاب کا آغاز اتنی بڑی سچائی سے ہورہا ہے۔ اس کتاب کو تم عجیب کہہ رہے ہو۔“

جب وہ آہستہ آہستہ موت کی طرف بڑھ رہا تھا، اس وقت میں اندھیروں کی وہ چاپ سن رہا تھا، جو اس کی روشنیوں کو معدوم کررہی تھیں تب مجھے یاد آیا کہ جس کتاب کی پہلی سطر ایسی ہوسکتی ہے اس کتاب کا ختم شد کیا ہوگا۔ جس سمجھ داری سے اس نے ایسی باتیں سمجھنی شروع کردی ہیں اس کا۔ ”ختم شد“ بھی کیا ہوگا۔

☆ ☆ ☆

اس کی کتاب نے ادب کے حلقے میں شور برپا کردیا تھا۔ نقادوں نے اس کی کتاب کا کوئی ایسا جملہ نہیں چھوڑا تھا جسے وہ زیر بحث نہیں لائے تھے۔ تجزیوں اور تعریفوں کے ڈھیر لگ گئے تھے۔ ایک دن اس نے مجھے ایک خط دکھایا۔ وہ خط اسے ایک مصنف نے لکھا تھا۔ خط کا لب لباب تو تعریف تھا لیکن اس میں کچھ ایسے گہرے طنز چھپے تھے جنہیں صرف وہ ہی سمجھ سکتا تھا۔ اسے تنقید بری نہیں لگی تھی۔ وہ تو مصنف کے منافقانہ انداز پر ہنس دیا تھا۔ بھلا جو بچپن سے آنکھوں کی تحریریں پڑھ رہا تھا، وہ خط میں چھپے لفظوں کے مطلب نہیں پڑھ سکتا تھا؛ خط کی ایک لائن میں کیسے

بھول سکتا ہوں۔ جس میں یہ اشارہ دیا گیا تھا کہ اس نے اپنی کتاب کو دوسری کتابوں سے متاثر ہو کر لکھا ہے۔
"جن کتابوں کے زیر اثر رہ کر یہ کتاب لکھی گئی ہے یقیناً" وہ کتابیں بھی اعلا پائے کی ہوں گی۔"
زیر اثر تو وہ اس تخیل کے رہا تھا جو اس نے آنکھ کھولتے ہی جھیلا تھا۔ اس کتاب کے لیے اس نے کتنے سال تکلیف میں کاٹے تھے میں جانتا تھا۔ رات رات بھر چُپ، خاموش بیٹھ کر اس نے صرف چند جملے لکھے تھے۔ دوستوں کی گپ شپ کے دوران بسوں میں بیٹھے، موٹر سائیکل چلاتے، ٹرین کی چھک چھک کے ساتھ اس نے اپنے تخیل کے ساتھ کٹھن سفر کاٹے تھے۔ جس طرف لوگ سفر کر رہے تھے۔ وہ تو اس کی الٹی سمت کا مسافر تھا۔ ہم سالوں اور مہینوں کی باتیں کرتے اور وہ صدیوں اور قرنوں کی باتیں کرتا۔ اس کی دی ہوئی دلیلیں دم بخود کر دیتیں۔ وہ کسی کو متحرک کرنے کے لیے نہیں لکھتا تھا۔ نہ ہی اس نے عوام الناس کا کلیہ نکال کر قلم اٹھایا تھا کہ آج کل اس موضوع کی بہت مانگ ہے، چلو اس پر لکھتے ہیں۔ آج کل اس موضوع کی کتاب دھڑا دھڑ بکتی ہے میں بھی اسی موضوع پر لکھوں۔
اس کی کتاب ایک بینگ ثابت ہوئی۔ اس وقت میں جانتا تھا کہ یہ جو لوگ کہتے ہیں کہ وہ اچھی کتابیں پڑھنا چاہتے ہیں در اصل وہ یہ کہتے ہیں کہ "بس بھئی! ہماری کتاب کے ساتھ کسی اور کی کتاب اچھی نہ کہلائے۔ جو یہ کہتے ہیں کہ ہم اچھے رائٹرز کے انتظار میں رہتے ہیں، ان کا مطلب تو یہ ہوتا ہے کہ "ہمارے بعد کوئی رائٹر اچھا نہ آئے۔"
اس لیے کہ چل چلاؤ کتابوں میں اس نے "چشم پارہ" دے دیا تھا۔ تخیل جو کبھی انہیں چھو کر نہیں گزرا، وہ تخیل اسے چھو گیا، نابیناؤں میں ایک بینا ہو کر اس نے دکھا دیا۔ انہیں لگتا تھا کہ جو کام وہ نہیں کر سکے، جو وہ نہیں سوچ سکے وہ کسی اور نے کیسے کر اور سوچ لیا؟
اس کا غیر معمولی پن اس کے لیے عذاب بن گیا۔ وہ اس کتاب کو ایک ایسی کھونٹی بنا دینا چاہتے تھے۔ جس پر وہ اپنی کامیابی کا تمغہ نہ ٹکا سکے۔ ایسی کتاب دوبارہ ہرگز نہ لکھ سکے۔ چل چلاؤ کتابوں میں یہ فاش غلطی دوبارہ کر ہی نہ سکے۔ اس کی کتاب کی مقبولیت کو کم کرنے کے لیے انہوں نے ڈھول پیٹنے شروع کر دیے۔

☆ ☆ ☆

ایک دن اسے ایک پروڈکشن ہاؤس میں بلایا گیا۔ اس کی لمبی لمبی میٹنگ ہونے لگیں۔ وہ اسکرپٹ لکھنے لگا۔ کچھ عرصے بعد مجھے معلوم ہوا کہ اس نے اسکرپٹ پر کام روک دیا ہے۔
"ڈرامے کے نام پر جو عورت نامہ اسکرین پر چلتا ہے، وہ میں نہیں لکھ سکتا۔ وہ میری پوری کہانی بدل دینا چاہتے ہیں۔ میں نے ایڈیٹنگ کے لیے ہاں کہی تھی۔ کہانی کا حلیہ خراب کرنے کے لیے نہیں۔ وہ چاہتے ہیں میں بار بار لڑکی کو باپ یا بھائی کے ہاتھوں سے پٹواؤں۔ روز روز گھر میں لڑائیاں کراؤں۔ ہر قسط میں کسی نہ کسی عورت کا کردار روئے، چلائے۔ بس کہانی نہ لکھوں، سیدھی سیدھی ٹی آر پی لکھ دوں۔ وہ کہتے ہیں اسکرین پر کیا ہٹ ہوگا۔ ہم جانتے ہیں، تم ادبی لوگ کتابیں لکھنے والے تم کیا جانو کہ اسکرین پر کیا چلتا ہے۔ کس سین پر دیکھنے والے روتے ہیں، کس قسط کی ٹی آر پی زیادہ آتی ہے۔ ڈراما بنانا آرٹ نہیں کیمسٹری ہے۔ اگر ڈراما بنانا ایسی ہی کیمسٹری ہے تو پھر یہ اس کیمسٹری کے لیے رائٹرز کو زحمت کیوں دیتے ہیں۔ یہ اپنے چینل اور پروڈکشن ہاؤسز میں کیوں نہیں ایسا خام مال پیدا کر لیتے جو انہیں مشین کی طرح ان کی مرضی کی رٹی رٹائی چیزیں نکال نکال کر دیتے رہیں۔ جو چینل ہیڈ میری کتاب پر فدا تھی، وہ اسی کتاب پر لکھا میرا اسکرپٹ بار بار میرے سامنے پٹخ پٹخ کر پھینک رہی تھی۔ یہ ایسی تذلیل کے لیے رائٹر کو کیوں بلاتے ہیں۔"
"تذلیل کے لیے رائٹر کو کیوں بلاتے ہیں۔" یہ بات تو میں بھی آج تک نہیں سمجھ سکا۔ جس کہانی کو

اس نے اتنے سالوں کی محنت سے لکھا تھا اسے وہ چند لاکھ کے عوض برباد نہیں کر سکتا تھا۔ سب لوگ اس کی کتاب پر ڈراما بنانے کے لیے بے چین تھے۔ لیکن کوئی بھی اس کی بات سمجھنے کے لیے تیار نہیں تھا۔ کونٹینٹ ہیڈ اسے فون پر فون کرتے، جب بات آگے بڑھتی تو وہی ٹی آر پی، وہی کہانی کا برباد حلیہ، وہی اسکرین کی کیمسٹری جیسے معاملات سامنے آتے۔ وہ دلیلیں دیتا، سمجھاتا پھر خاموش ہو جاتا۔

"میں اس سسٹم میں سروائیو نہیں کر سکتا۔"

اس کی ڈائری کے اس صفحے پر بس یہی ایک جملہ لکھا ہے۔ اگلے صفحے پر مہینوں کے وقفے کے بعد لکھا ہے۔

"ادب عالیہ کے ساتھ توفیق عالیہ کا ہونا بہت ضروری ہے۔ کتابیں اور کہانیاں جتنی بلند پایہ کی ہوں، اس سے کہیں زیادہ بلند پایہ عوام الناس کو ہونا ہوگا۔ ورنہ یہ کتابیں زندہ رہیں گی نہ انہیں لکھنے والے۔ میرا ذہن تخلیقات کی بھرمار سے بھرا ہوا ہے، میں انہیں باہر لانے کے لیے بے تاب ہوں لیکن لوگ انہیں اپنی ناقص عقل سے رد کر دیں گے۔ یہ خوف مجھے ست کر دیتا ہے۔ میں اپنی کہانیوں کو اپنے سامنے دم توڑتے ہوئے دیکھتا ہوں۔ کوئی بھی غیرت مند مصنف اپنی کتاب پر جاہلوں کی نکتہ چینی نہیں سہ سکتا۔ یہ جاہل تخلیق کو "طوائف" سمجھتے ہیں کہ گالی دے لی، دھتکار دیا، ورنہ نیکی کے پلڑے میں تول کر بدی کے پلڑے کی طرف اچھال دیا کہ لو یہ اسی قابل ہے، بدکردار، غیر شرعی، ہونہہ۔

جن لوگوں نے سارے زندگی دو ڈھنگ کی کتابیں نہیں پڑھیں وہ مجھے کہتے ہیں کہ "یہ میں نے کیا لکھا ہے، یہ تو ٹھیک نہیں۔"

جو لوگ ایک جملہ لکھنا نہیں جانتے وہ میرے جملوں پر ریڈ پین سے لائن لگاتے ہیں کہ "یہ بے معنی کا جملہ اسکرین پر نہیں آئے گا۔"

جو لوگ فون پر فون کر کے مجھے چینل بلاتے ہیں وہ مجھے پاس بٹھا کر سمجھاتے ہیں کہ "آپ بھی پیسے کمائیں، جو جی میں آتا ہے ہمیں لکھ کر دے دیں، پھر ایڈیٹر جانے اور ڈائریکٹر۔ آپ کو اپنے پیسوں سے مطلب ہونا چاہیے۔"

مجھے ہنسی آتی ہے ان لوگوں پر جنہوں نے کبھی اسکرین آرٹ کی تعریف نہیں پڑھی وہ مجھے اسکرین کی کیمسٹری سمجھاتے ہیں۔ جو لوگ اسکرین پلے کی الف بے سے واقف نہیں ہیں وہ مجھے بتاتے ہیں کہ سین میں اسکرین پلے کتنا لکھنا ہے۔ کچھ تو کہتے ہیں کہ کیا ضرورت ہے اسکرین پلے لکھنے کی، بس کام چلاؤ، اپنا وقت بچاؤ، پیسہ کماؤ۔

ایک کونٹینٹ ہیڈ میری کہانی کی تعریف میں رطب اللسان ہوتی رہی۔ پھر اس نے ہفتوں مجھے یہ سمجھانے میں لگا دیے کہ دیکھو تم اچھے مصنف تو ہو گے لیکن اچھے اسکرپٹ رائٹر نہیں ہو۔ تم اچھی کہانی لکھ سکتے ہو لیکن اچھا ڈراما نہیں، اس لیے جو میں کہہ رہی ہوں وہ کرو۔ سب ٹھیک ہو جائے گا۔ یہ وہ کونٹینٹ ہیڈ ہے جس کے کریڈیٹ پر ایک بھی ڈراما نہیں۔ جو مجھ جیسے رائٹرز کے ساتھ رابطہ تو بہت شوق سے کرتی ہے اور اسی شوق سے انہیں "اسکرین کیمسٹری" سمجھاتے سمجھاتے برباد کر دیتی ہے۔ یہ سب چینل پالیسی، ٹی آر پی، عوامی رائے، عورتوں کی پسند ناپسند کی آڑ میں اسکرپٹ کا حلیہ برباد کر دیتی ہیں کیونکہ یہ خود کسی قابل نہیں ہوتیں۔ انہیں یہ معلوم ہی نہیں کہ اسکرپٹ لکھنا کسے کہتے ہیں۔ اپنے اندر وہ قابلیت کے نام پر "کام" رکھتی ہیں اور ہماری قابلیت کو بھی "صرف کام" بنا دینا چاہتی ہیں۔ وہ خود کچھ نہیں سمجھ سکیں تو ہمیں بھی سمجھنے نہیں دینا چاہتیں۔

ایک نے میرا لکھا اسکرپٹ میز پر اچھال کر کہا "اس کی ٹو پوائنٹ ٹو سے زیادہ ریٹنگ آگئی تو میں ریزائن کر دوں گی۔" جس نخوت اور ہتک سے اس نے فقرہ کہا، اس نے مجھے یہ فیصلہ کرنے پر مجبور کر دیا کہ مجھے ڈراما نہیں لکھنا چاہیے۔ اتنی جلدی ان لوگوں نے مجھے اپنے حساب کتاب سے ناکارہ ثابت کر دیا۔ جبکہ یہ سب مل کر سسٹم ناکارہ کر رہے ہیں۔

میں سمجھ گیا کہ عصام ایسے لوگوں کے روبرو ہو گیا

تھا جو رتی ماشہ تولہ ہر کم وزن پر بھی اس جیسے مصنفوں سے وزنی تھے۔ جس کھوٹ کے وہ مالک تھے، عصام اس کھوٹ سے ناواقف تھا۔ وہ سمجھتے تھے وہ تو پیتل کو رگڑ رگڑ مار مار کر سونا بنا کر پیش کر رہے ہیں۔ وہ تو الٹا سمجھ داری کر رہے ہیں۔

"عصام کہانی تو لکھ سکتا ہے لیکن ڈراما نہیں۔"

ان سب نے مل کر مشہور کر دیا۔ یہ بھی کہا جانے لگا کہ وہ ان پروفیشنل ہے۔ وہ واقعی میں ان پروفیشنل تھا۔ پروفیشنل ہوتا تو خود غرض ہوتا، مطلبی، دھوکے باز، حاسد، مکار، بے حس، مغرور، منافق ہوتا۔ اس وقت زندہ ہوتا۔

☆ ☆ ☆

ڈراما لکھنے کا فیصلہ چیونٹیوں کی قطار کی طرح کچھ وقت تک تو سیدھ میں نبھتا رہا۔ لیکن وہ یہ نہیں جانتا تھا کہ اس کے فیصلے اور حالات کے فیصلوں میں فرق ہوتا ہے۔ گھر کے معاشی حالات ایسے نہیں تھے کہ وہ ضد کی سیدھ میں چلتا ہی جاتا یا تو اسے کوئی جاب کرنی تھی یا اسے اپنے لکھنے کے کام سے پیسے کمانے تھے۔ تنگ دستی وہ سانپ تھی جو اس کے قلم کی بین پر ناچنے والی نہیں تھی۔

اس نے پھر ڈراما لکھنے کا فیصلہ کیا۔ جس رائٹر کا وہ بہت بڑا فین تھا اس بار اس کے ساتھ۔ اسے یقین تھا کہ جو چیز دوسرے نہیں سمجھ سکے وہ ایک رائٹر سمجھے گا۔ ذہنی مطابقت جو دوسروں کے ساتھ نہیں ہو سکی تھی وہ ایک رائٹر کی دوسرے رائٹر کے ساتھ ہو جائے گی۔ ایک ہی طرح کے دو لوگ مل کر ایک پروجیکٹ پر کام کریں گے تو نتیجہ بہترین آئے گا۔ یہ اس کی زندگی کا وہ فیز تھا، جس میں اس نے بہت سی چیزوں کے ساتھ کمپرومائز کرنا شروع کر دیا تھا۔

"فی الحال میں نے خود کو ذہنی طور پر کمپرومائز کے لیے تیار کر لیا ہے۔ ضروری نہیں کہ جس آزادی سے میں کہانیاں لکھتا ہوں اسی آزادی سے اسکرپٹ بھی لکھوں۔ سسٹم کے ساتھ تھوڑا بہت کمپرومائز کرنا ہی پڑتا ہے۔ لیکن تم دیکھنا ایک دن میں اپنی مرضی کا کام بھی کرنے لگوں گا۔ اسکرین پر ایک دن مجھے پوری آزادی حاصل ہو گی۔ پھر لوگ دیکھیں گے اسکرین آرٹ کسے کہتے ہیں۔"

اس کا جوش دیکھ کر مجھے بہت خوشی ہوئی۔ کہانیوں میں اس کی مہارت، کردار نگاری کا عروج، لفظوں کا سحر طاری کرتا جال یہ بتانے کے لیے کافی تھا کہ اس کا اسکرپٹ کس پائے کا ہو گا۔ وہ بیک وقت پچاس کردار لکھ سکتا تھا۔ ایک کہانی کو ہزار رنگ دے سکتا تھا۔ اس کے قلم کی نوک سنگ تراش کا اوزار تھی، ضرب و نقش بیک وقت بھی اور بروقت بھی۔

اب لوگ کہہ رہے ہیں کہ وہ باقاعدہ مصنف تھا، قدرت نے اسے بنیاد سے مصنف بنایا تھا۔ میں کہتا ہوں وہ باقاعدہ ادیب اس بے قاعدہ دنیا میں بے بنیاد آ گیا تھا۔ اس کی مہارت، اس کا فن، اس کے شعور کی گہرائی، اس کی لفاظی، اس کی شخصی لغت بھی اسے اس بے قدری جیسے ناسور سے بچانے میں ناکام رہی تھی، جو کچھ کامیاب لوگوں کا تکبر اور احساس برتری مہارت سے اس کے اندر کھود کر دبا رہا تھا۔ میں آج تک سمجھ نہیں سکا کہ لوگ اسے تسخیر کرنا چاہتے تھے یا شکستِ فاش سے دوچار۔ اس کے شعبے کے لوگ اس سے متاثر زیادہ تھے یا حاسد؟ اس کی مردہ ڈائری کا فوری لفظ میری انگلیوں کی پوروں کے نیچے آخری سانسیں لینے لگے ہیں۔

اس نے کام شروع کر دیا۔ کاش اس نے وہ کام شروع نہ کیا ہوتا۔ کاش میں نے بھی اس سے نہ کہا ہوتا کہ اپنے رویے میں لچک لاؤ۔ کاش میں نے اسے پچاس دوسرے رائٹرز کی مثال نہ دی ہوتی کہ دیکھو وہ کہاں سے کہاں پہنچ گئے۔ یہ نہ کہا ہوتا کہ خود کو برباد نہ کرو، جو مل رہا ہے وہ کرو، کر لو کمپرومائز۔ آرٹ کی خدمت کا تم نے ٹھیکہ نہیں لیا ہوا۔ جہاں سب "کام" لکھ رہے ہیں تمہیں "آرٹ" لکھنے کی ضرورت نہیں ہے۔ تم کتابوں سے اتنے پیسے نہیں کما سکتے ڈراما لکھ کر ہی تم کچھ اچھے پیسے حاصل کر سکتے ہو۔ ہمارے ملک میں ادیب کبھی امیر نہیں ہوتا، تم ڈراما

لکھو اور ان سب معاشی مسائل سے نکل آؤ۔
پہلی قسط لکھنے سے پہلے تک وہ ہر روز اپنی ڈائری لکھتا رہا تھا۔ ان دنوں اس کے لفظ موتی تھے۔ ان کی خوشبو پھول سی تھی۔ کافور نہیں۔ اسکرپٹ کی پہلی، دوسری قسط لکھنے کے بعد اس کی ڈائری خاموش رہنے لگی۔ صفحے خالی نظر آنے لگے۔ ہفتوں گزر گئے' ان پر سیاہی کا ایک دھبا بھی نہ پڑا۔ پھر ایک صفحے پر کچھ مبہم سا لکھا تھا۔

"میں نے سنا تھا' مصنف حساس ہوتا ہے۔ کیا حساسیت یک طرفہ ہوتی ہے؟ یا وقت پڑنے پر استعمال میں لائی جاتی ہے؟"

پھر بہت سے صفحات کی خاموشی اور چند لائنیں۔

"میرا بہترین سین کاٹ دیا جاتا ہے۔ معمولی سی باتوں پر لمبی لمبی بحث صرف یہ ثابت کرنے کے لیے کہ میں کوڑھ مغز ہوں۔ مجھے کچھ نہیں معلوم۔ ہمیں کوڑھ مغز ہی ہوں' مجھے کچھ معلوم نہیں لیکن کیا اسے ثابت کرنے کے لیے ایک مناسب انداز نہیں اپنایا جاسکتا۔ ایک تخلیق کار کے الفاظ اور لہجے میں اتنی رعونت' میں سوچتا ہوں کہ انکساری کیا صرف ایک لفظی حقیقت ہے جسے زبان سے ادا کیا جاتا ہے۔ بس؟ کیا اس انکساری کو عمل میں نہیں لایا جاسکتا؟ میں یہ بھی سوچنے لگتا ہوں کہ برا انسان دراصل ہوتا کون ہے، وہ جس کا ظرف برا ہوتا ہے؟ یا وہ جس میں انسانیت کا مزاج برا ہوتا ہے "میں بلند" ہوجاتا ہے تو اسے زیادہ جھکنے والا ہوجانا چاہیے تاکہ زیادہ اکڑنے والا "تکبر کا وکیل تو ہر دلیل پر ذلیل ہے۔"

ڈائری کے اس صفحے نے مجھے مجبور کردیا کہ میں یہیں رک جاؤں' آگے پڑھنے کی کوشش نہ کروں۔ پنکھے کی ہوا سے ڈائری کے صفحات پھڑپھڑا رہے ہیں۔ یہ میری انگلیاں' یہ کیوں کپکپا رہی ہیں۔

"میں نے اسکرپٹ کی تین قسطیں بھجوادی ہیں۔ تعریف کے بدلے میں مجھے لمبی تقریر سننے کے لیے ملتی ہے۔ میں سمجھ نہیں پارہا کہ وہ کس بات پر خفا ہیں۔ اس سے کہ جو انہوں نے کہا۔

میں بالکل ویسا ہی لکھ کر دے رہا ہوں یا اس چیز سے کہ آخر میں وہ کیسے لکھ کر دے رہا ہوں' جو جو انہوں نے کہا۔ میں غلطی کیوں نہیں کر رہا' میں کہیں کوئی کمی کیوں نہیں رہنے دے رہا۔ انہوں نے انڈسٹری کو ہٹ ڈرامے دیے ہیں۔ اس بنا پر صرف انہیں ہی علم ہے کہ ڈراما کیسے لکھا جاتا ہے۔ مجھے بار بار احساس دلایا جاتا ہے میں نے ابھی تک کوئی کام نہیں کیا میں کیسے صحیح اور غلط کو جان سکتا ہوں۔ کیا میری قابلیت اسی وقت ثابت ہوگی جب میں ڈراموں کی ایک لمبی لائن لگادوں۔ اگر ایسا ہی تھا تو میری پہلی کہانی کو شائع نہیں ہونا چاہیے تھا کیونکہ میری پہلی کہانی سے پہلے میری کہانیوں کی کوئی لمبی لائن نہیں لگی تھی۔ مصنف کے قلم پر اعتماد نہیں کیا جائے گا تو ادب کے نام پر دہرائی ہوگی۔"

اس کی ڈائری نے ایک لمبی خاموشی اختیار کرلی۔ مجھے وہ دن یاد ہیں' ان دنوں اس کا گھر میں کوئی پارسل نہیں آتا تھا۔ وہ دنیا اور اس دنیا کے کارخانے سے لاتعلق ہونے کی کوشش کررہا تھا۔

"تم اسکرپٹ نہیں لکھ رہے؟" ایک دن میں نے پوچھا۔

"جانتے ہو ٹو پوائنٹ ٹو کتنے ہوتے ہیں؟"

مجھے یاد تھا کہ ایک چینل کی ایڈیٹر نے اس کے اسکرپٹ کے بارے میں کیا کہا تھا۔ اسی لیے میں یہ چاہتا تھا کہ اس کی یادداشت اتنی اچھی نہ ہو۔ اسے شیزوفرینیا کا مرض لاحق ہوجائے۔ وہ باتیں بھولنے لگے۔

"تم نے میری کتاب پڑھی اور رندا قا" کہا کہ تم میری کتاب کو از خود مین بکر پرائز کے لیے سلیکٹ کرتے ہو۔ تم نے یہ کیوں نہیں کہا کہ میں دوسرے درجے کا ناکارہ رائٹر ہوں۔"

میں خاموش اس کی شکل دیکھ رہا تھا۔ وہ غصے میں تھا یا غمگین' میں جان نہیں سکا۔ اس کی آنکھیں دھندلائی ہوئی تھیں۔ ہاتھ بڑھا کر اس نے میرے سامنے کچھ پیپرز رکھے۔ یہ اس کے اسکرپٹ کا پلندہ

تھا۔ جسے وہ رات دن ایک کر کے لکھتا رہا تھا۔ اس نے کمپرومائز کرنے کے لیے خود کو تیار کر لیا تھا اسی لیے اس اسکرپٹ کو نہ جانے کتنی بار تبدیل کر چکا تھا۔ جو سین اور مکالمے ٹھیک تھے انہیں بھی وہ ہدایات پر بدلتا رہا تھا۔ اس اسکرپٹ پر جگہ جگہ ریڈ پین سے کراس کے نشانات تھے۔

"یہ تمہارا اسکرپٹ ہے عصام؟"

"یہ اسکرپٹ نہیں ہے۔ یہ تو ایک ناکام رائٹر کا وہ پرچا ہے، جس پر اسے دو نمبر ملے ہیں۔ میری ساری محنت پر مجھے یہ سننے کو ملا۔

"مسٹر عصام! اگر آپ کو اس اسکرپٹ پر بہت زیادہ نمبر بھی دیے جائیں تو یہ دو سے زیادہ نہیں ہوں گے۔"

میں دنگ اس کی شکل دیکھ رہا تھا۔ ایک رائٹر دوسرے رائٹر کو نمبر دے رہا ہے۔

"ہم دوبارہ مجھے کبھی اسکرپٹ لکھنے کے لیے نہیں کہو گے۔ میں بچوں کو ٹیوشن پڑھا لوں گا۔ کوئی جاب ڈھونڈ لوں گا۔"

اس کے بعد اس کی ڈائری پھر سے خاموش ہو جاتی ہے۔ اس لمبی خاموشی میں ایک اور فقرہ گونجتا ہے۔

"آپ اپنے بچوں کے لیے کیا مثال سیٹ کر رہے ہیں۔ سستی اور کاہلی آگ کا دریا ہے آپ کے لیے، آپ اسے پار نہیں کر سکتے۔ آپ کبھی کامیاب نہیں ہو سکتے مسٹر عصام۔"

اس ڈائری نے مجھے بوڑھا کر دیا ہے۔ دکھ سے یا شاید پھر خوف سے کپکپا رہا ہوں۔ عصام جو اپنی پہلی تحریر کی خوشی اس لیے نہیں منا سکا کہ اسے لگا اس نے کسی کے دکھ پر کامیابی حاصل کی ہے۔ وہ عصام ان فقروں کو اپنے اندر ناسور بننے سے کیسے روک سکا ہو گا۔ میں تو ابھی بھی اندازہ نہیں لگا سکا کہ اس ناسور کا پیچ کہاں سے پھوٹا جو اسے زندگی سے اتنا دور لے گیا۔ اس نے جاب کے لیے کوشش شروع کر دی۔ جو اس کی مداح ہونے کا دعوا کرتی تھی ان میں سے اس نے ایک سے کہا۔

"میں نے سنا ہے آپ کے پروڈکشن ہاؤس کو کونٹینٹ ہیڈ کی ضرورت ہے۔ آپ پروڈکشن کی ہیڈ سے میرے لیے بات کریں۔ میں کہانیوں اور اسکرپٹ کو بہت اچھی طرح سے سمجھتا ہوں۔ بہت سے فریش آئیڈیاز پر اچھے اسکرپٹ لکھوا سکتا ہوں۔ ڈراما انڈسٹری میں نئے تھیم لا سکتا ہوں۔"

"ہاں ہاں کیوں نہیں۔ میں تمہارے لیے بات کرتی ہوں۔ میں تو ویسے ہی تمہاری بہت بڑی فین ہوں۔"

بات اس نے واقعی یہی کی، لیکن کسی اور کے لیے۔ اس کے لیے جو اس سے قابلیت میں کم تھا، جو ان کے اندر رہ سکتا تھا۔

اس کی ڈائری کے خالی سوگوار صفحے پر ایک فقرہ لکھا تھا۔

"مجھے یقین ہونے لگا ہے، دنیا ناک تک لالچ اور خود غرضی کی علت سے بھر چکی ہے۔ مجھے لگتا تھا کہ میں لوگوں کو جانتا ہوں۔ یہ لوگوں کی خرابی ہے کہ ان کے اصلی چہرے دکھائی نہیں دیتے۔ یا میری اپنی خامی کہ اصلیت جان نہیں سکتا۔"

اگر دنیا لالچ اور خود غرضی کی علت میں گرفتار تھی تو وہ بھی ہو جاتا لیکن زندہ تو رہتا۔ لوگ مر جاتے ہیں، پھر دنیا اپنے سوگ کا ڈراما شروع کرتی ہے۔ اب اس کے لیے لمبے لمبے کالم لکھے جا رہے ہیں۔ اس کی قابلیت پر تبصرے کیے جا رہے ہیں۔ پوسٹ پر پوسٹ آ رہی ہے۔ وہ کتنا عظیم اور بیچارا رائٹر تھا، سب کو یاد آ رہا ہے۔ اس کی کتابوں کے اقتباسات شیئر کیے جا رہے ہیں۔

کیا میں بھی اس کی ڈائری شیئر کر دوں۔ وہ خالی صفحات جن پر اس نے کچھ نہیں لکھا، ان پر ان کا کہا لکھ کر سب کے سامنے رکھ دوں۔

اب جب میں نے اس کی بند آنکھوں کی ساری تحریر پڑھ لی ہے تو کیا میں سرخ روشنائی سے لکھ دوں کہ "وہ تو مر گیا لیکن ہم سب منافق، متکبر، حاسد، بے حس، خود غرض، کم ظرف زندہ ہیں۔"

نورین غوری

گلابی دنیا

"اسپورٹس چینل لگاؤ۔" حمزہ نے ٹی وی لاؤنج میں رکھے صوفے پر بیٹھتے ہوئے کہا۔
تو میں نے بھی اسی ٹون میں جواب دیا۔ "نہیں، مجھے یہ شو دیکھنا ہے۔"

"نہیں، مجھے میچ دیکھنا ہے لگاؤ۔۔۔۔ ورنہ میں ٹی وی توڑ دوں گا۔" حمزہ کی ہٹ دھرمی جاری تھی۔ مجھے پریشان کرنے کا کہاں کوئی موقع چھوڑتا تھا۔

"حمزہ! یہ کیا زبردستی ہے۔" میں نے زچ آکر کہا تو وہ مسکرایا۔ مجھے کمزور پڑتا دیکھ کر اور اپنی فتح کے جھنڈے لہرا کر اسے دلی سکون جو ملتا تھا تو پھر بھی کبھی وہ میری بات مان بھی لیا کرتا تھا۔

عجیب سی طبیعت کا مالک تھا۔ میں نے بھی چینل نہیں بدلا تھا۔ شو دیکھ رہی تھی کہ بڑی امی کی آواز پر چونک گئی۔

"حرا! جاؤ میرے لیے چائے لے کر آؤ۔" بڑی امی کی بات پر کیسے انکار کرتی 'میرا ڈانٹ کھانے کا بالکل بھی موڈ نہیں تھا۔ اس لیے خاموشی سے اٹھ کر چلی گئی۔ اگر کچھ دیر رک کر شو مکمل ہونے کا انتظار کرتی تو نہ جانے کیا کیا سننے کو ملتا۔ میں وہاں سے غصے میں اٹھی اور اپنا غصہ جاتے جاتے ریموٹ پر نکالا۔ جب غصے سے میں نے وہ ریموٹ حمزہ کی طرف پھینکا تو حمزہ نے فوراً ریموٹ سے چینل بدل کر اسپورٹس چینل لگا دیا۔

بڑی امی کے سامنے حمزہ میرے لیے اکثر نرم پڑ جاتا' پتا نہیں وہ بڑی امی سے ڈرتا تھا یا پھر اسے مجھ پر ترس آجاتا تھا۔ بڑی امی میری دل آزاری کا بھی کوئی موقع ہاتھ سے نہیں جانے دیتی تھیں اب تو میں بڑی امی کے اس لہجے کی عادی ہو چکی تھی۔ بڑے ابو تو حمزہ سے بھی زیادہ پیار مجھ سے کرتے ہمیشہ رانی بیٹی کی طرح رکھا۔ ان کی وجہ سے ہی تو آج میں یونیورسٹی میں بزنس ڈپارٹمنٹ میں زیر تعلیم تھی۔

بڑی امی غصے میں کچھ بھی بول دیتیں۔ وقتی طور پر بہت دکھ ہوتا' خاص طور پر جب وہ مجھے امی ابا کے نہ ہونے کا ذمہ دار ٹھہراتیں۔ تو میں گھنٹوں خاموش رہتی اور دادی کی گود میں سر رکھ کر رو لیتی۔ تو دل کا بوجھ تھوڑا کم ہو جاتا۔ دادی کی گود میں سکون ہی اتنا ہوتا کہ سارے دکھ کہیں دور چلے جاتے۔

بڑے سے ہال میں ایک طرف لاؤنج تھا تو دوسری طرف کھانے کی میز' کارنر میں امریکن کچن میں آسائش کی ہر چیز موجود تھی۔ دادی کے کمرے کا دروازہ بھی ہال میں کھلتا تھا۔ اوپر والے پورشن کی سیڑھیاں ہال میں اترتی تھیں۔ سیڑھیوں کے ایک طرف دادی جی کا کمرہ تھا کیونکہ ان کو سیڑھیاں اترنے چڑھنے سے گھٹنوں میں درد ہو جاتا تھا اس لیے بڑے ابو نے ان کو نیچے ہال میں کمرہ دیا ہے باقی اوپر والے پورشن میں کمرے تھے۔

میں اپنے روم میں بیٹھی پڑھ رہی تھی۔ کل فنانس کا ٹیسٹ تھا۔ جس کی تیاری میں مصروف 'دنیا و جہاں کو بھول کر صرف اور صرف کتاب اور ذہن کے درمیان جنگ جاری رکھے ہوئے تھی۔ بڑی امی میرے کمرے میں آئیں' کچھ پل مجھے دیکھتی رہیں پھر بولیں۔ "میں مارکیٹ جا رہی ہوں۔۔۔۔ رات کا کھانا بنا دینا۔ پڑھائی کے ساتھ کام کرنا بھی اتنا ہی ضروری ہے۔ اتنے سکھ تو ماں کے ہوتے ہوئے بھی نہ ملتے جتنے۔" وہ کہتے کہتے رک گئیں۔

میں نے خالی نظروں سے انہیں دیکھا۔ دوسرے ہی لمحے میری آنکھیں پانی سے بھر گئیں۔

انہوں نے دوبارہ وار کیا۔ "مہارانی کی طرح رہتی ہو۔۔۔۔" بڑی امی کی آنکھوں میں میرے لیے حقارت تھی۔

میں آج تک یہ بات سمجھ نہ پائی تھی کہ انہیں مجھ پر اتنا غصہ کیوں آتا ہے۔ "جی ابھی بنا دوں گی۔" "بنا دوں گی مطلب۔۔۔۔ ابھی اٹھو اور رکھو کتاب۔" میں نے ان کی بات پر کتاب بند کی تو وہ چلی گئیں۔ میں نے ایک بار پھر بند کتاب کو دیکھا پھر میں نے سوچا کہ رات میں بیٹھ کر پڑھ لوں گی۔

رات کے کھانے کی میز پر دادی نہیں تھیں۔ حمزہ نے کھانا شروع کرتے ہی دادی کا پوچھا تو بڑے ابا نے بتایا کہ ان کے گھٹنے میں درد ہے بڑے ابا نے میری طرف دیکھتے ہی کہا کہ دادی کا کھانا ان کے کمرے میں پہنچا دوں میں نے اثبات میں سر ہلا دیا۔ جب میں کھانا

لے کر دادی کے کمرے میں گئی تو وہ درد سے کراہ رہی تھیں۔ ان کے گھٹنے میں شدید درد ہو رہا تھا میں نے آیوڈیکس لگائی اور پھر سکائی کرنے لگی۔ دو سے تین گھنٹے کی مشقت کا نتیجہ یہ ہوا کہ دادی کو نیند آنے لگی۔ وہ مجھے دعائیں دیتی نہ جانے کب سو گئیں۔ میں آرام سے آہستہ سے دروازہ بند کر کے اپنے کمرے میں آ گئی۔

کتاب کھول کر دیکھا تو آنکھیں نیند سے بھری تھیں پھر بھی زبردستی پڑھنے کی کوشش کرنے لگی تو کتاب کے لفظ جھومنے لگے دل نے یہی کہا کہ حرا سو جاؤ صبح دیکھا جائے گا میں نے بھی بیڈ کی چادر درست کی اور لیٹتے ہی آنکھیں موند لیں۔

ناشتے کی ٹیبل کے پاس کھڑی میں بڑے ابا کے لیے چائے نکال رہی تھی کہ جب بڑی امی زینے سے اترتے ہی مجھ سے مخاطب ہوئیں، وہ کہیں جانے کے لیے تیار تھیں۔ ہاں یاد آیا آج ان کے فلاحی ادارے کی خاص میٹنگ تھی۔ "حرا! حمزہ کی بلو شرٹ نہیں مل رہی ہے کل تو رانی نے دھوئی تھی۔" بڑی امی نے میرے علم میں اضافہ کرتے ہوئے کہا رانی ہمارے گھر میں جھاڑو، برتن اور کپڑے دھونے کا کام کرتی تھی جبکہ باقی تمام کام میری ذمہ داری شمار ہو جاتے۔

میں نے سعادت مند اور فرمانبردار بیٹی کی طرح کہا "جی بڑی امی، وہ میں نے تہ کر کے حمزہ کے کمرے میں رکھی تھی۔"

"جاؤ اب اسے ڈھونڈ کر دو۔" بڑی امی کے حکم کی تکمیل کرنے میں حمزہ کے کمرے کی طرف بڑھ گئی۔

حمزہ نے الماری کے سارے کپڑے زمین پر ڈھیر کیے ہوئے تھے۔ میں نے زمین پر ڈھیر ہوئے کپڑوں کو دیکھا اور پھر حمزہ پر نظر ڈالی اور حمزہ سے کہا۔

"یہ کیا کیا تم نے؟ ایک شرٹ نہیں ڈھونڈ سکتے؟ دھیان سے کام کرو تو پتا چلے تمہیں۔" میں بلو شرٹ مسلسل ڈھونڈ رہی تھی اور ساتھ ساتھ بول رہی تھی۔

"جلدی ڈھونڈو۔ لیکچر بعد میں بھی دے سکتی ہو۔ مجھے دیر ہو رہی ہے۔" شیشے کے سامنے بال بناتے ہوئے حمزہ نے شیشے میں سے ہی مجھ پر نظر ڈالی۔

وہ میری باتوں سے بے زار ہو رہا تھا اور صاف ظاہر تھا کہ اسے میرا بولنا برداشت نہیں ہو رہا ہے۔ اسے برداشت کرنا آتا ہی کہاں تھا۔ اتنے میں، میں نے شرٹ کپڑوں کے ڈھیر سے کھینچ کر نکالی۔

"یہ لو۔" میں نے شرٹ حمزہ کے سامنے لہرائی۔

اس نے غور سے دیکھا اور میرے ہاتھ سے لیے بغیر استری کرنے کو کہا کیوں کہ وہ خوب صورت شرٹ سلوٹوں سے مزین ہو چکی تھی۔ ایک پل کے لیے مجھے غصہ تو آیا غصے میں ہی استری اسٹینڈ پر شرٹ کو پھینکنے کے انداز میں رکھا اور استری کرنے لگی۔ پھر میں نے دیوار پر لگی گھڑی کو دیکھا۔ جو ساڑھے آٹھ بجا رہی تھی۔

"جلدی کرو۔" حمزہ کی آواز میری سماعت سے ٹکرائی تو دل چاہا ادھر ہی چھوڑ دوں۔

"نوکر نہیں ہوں میں اور بھی کام ہیں مجھے۔" پھر زبان کھولنے کے بعد یاد آیا کہ یہ تو بڑی امی کا حکم تھا۔ ان کی گستاخی تو وبال جان ہو سکتی ہے۔ میں نے استری کی ہوئی شرٹ حمزہ کی طرف پھینکی جو سارے کام کاج چھوڑے اسی کے انتظار میں میری طرف چہرہ کیے ہوئے تھا اور شرٹ کو پہننے کے انتظار میں کھڑا تھا۔

شرٹ پہن کر بٹن بند کرنے لگا تو پہلے سے دوسرا بٹن غائب تھا، میں کمرے سے باہر آنے کو ہی تھی کہ حمزہ کی آواز پر مڑی۔

"حرا۔۔۔" میں نے دل میں سوچا۔ "خدایا! اب کیا مصیبت ہے۔" پہلے سے دوسرا بٹن غائب تھا۔ حمزہ نے اس بٹن پر ہاتھ رکھے میری طرف دیکھا تو میں حمزہ کی سوالیہ نظروں کو سمجھ نہ پائی۔

"اب کیا ہوا؟" میں نے بے زاری سے پوچھا۔

"تم نے استری کرتے وقت دیکھا نہیں تھا۔" حمزہ بولتے ہوئے ــــ بٹن بند کر رہا تھا، اس بات کی وجہ اب تک نہ جان پائی تھی۔ اس لیے غصے میں بول

اٹھی۔

"استری ہو گئی نا' یہی بہت بڑی بات ہے۔"

"اچھا جی۔۔۔ اس بڑی بات کے ساتھ بٹن لگانے جیسی چھوٹی بات بھی کر دو۔" حمزہ نے اسی ٹون میں جواب دیا۔

میں واپس کمرے میں آئی۔ میز پٹختے ہوئے ٹیبل کے پاس پہنچی دراز سے سوئی دھاگا نکال کر اس کی طرف بڑھی میری بے زاری میرے چہرے سے ظاہر تھی جب کہ حمزہ مسکرا رہا تھا۔ جیسے وہ لطف اٹھا رہا ہو۔ اس کی مسکراہٹ میرے چہرے پر غصے کے بل نمایاں کر گئی۔ میں نے بٹن شرٹ پر رکھا اور لگانا شروع کیا۔ میرے ماتھے کے بل حمزہ کو صاف دکھائی دے رہے تھے۔ اس لیے اس کی مسکراہٹ گہری ہو گئی' میں نے آنکھیں اٹھا کر اسے دیکھا تو وہ بات بنانے لگا۔

"غصے میں کہیں میری اسکن بھی اس کے ساتھ سلائی نہ کر دینا۔" حمزہ کی اس بات پر بھی میرا وہی انداز تھا جیسے سنا ہی نہ ہو۔

دل تو چاہا یہ سوئی اس کے سینے میں اتار دوں۔ میں نے سوئی کو غور سے دیکھا' پھر اسے پتا چلے گا کہ تنگ کرنا کیا ہوتا ہے۔ حمزہ مسلسل میرے چہرے کو دیکھ رہا تھا اور میں پورے دھیان سے بٹن ٹانک رہی تھی۔ دھاگا کاٹنے کے لیے میں نے قینچی کے لیے دیکھا تو حمزہ کی طرف دیکھ کر میں تھوڑا جھینپ گئی تو اس نے نظریں مجھ پر سے ہٹا لیں۔

"قینچی کہاں ہے؟"

"مجھے کیا پتا۔" حمزہ نے اس جملے کو اتنا چبا کر کہا جیسے واقعی نہیں جانتا تھا۔

میں نے دانت سے کاٹنے کی کوشش کی تو میرا چہرہ حمزہ کے سینے پر تھا' جہاں میں اس کے دھڑکتے دل کی آواز سن سکتی تھی۔ اتنے قریب سے کچھ عجیب سا احساس ہوا جیسے بجلی کے ننگے تاروں کا کرنٹ لگا ہو۔ میرے دل کی دھڑکنوں میں ہلچل سی مچ گئی۔ میرے اندر کی ہلچل میرے ہاتھ سے ظاہر ہو رہی تھی' میں نے جلدی سے دھاگا شرٹ سے چھڑایا اور دراز میں رکھ کر حمزہ کو دیکھے بنا کمرے سے باہر آ گئی۔

"مجھے کیا ہو رہا ہے۔" میں نیچے کچن میں گئی۔ کھانے کی ٹیبل پر پانی کا جگ۔۔۔۔ بھرا ہوا تھا' میں نے پانی گلاس میں بھرا اور پھر ایک سانس میں پی لیا۔ پھر اپنا بیگ اٹھایا اور گیٹ کی طرف بڑھی اس سے پہلے کہ حمزہ سامنے آئے اور اس کی آنکھوں میں میرے لیے مذاق ہو مجھے چلنا چاہیے۔ میری حالت اس پر واضح تو ہوئی ہو گی وہ پتھر تو نہ تھا۔ زیادہ نہ سہی ہلکا سا جھٹکا اسے بھی محسوس ہوا ہو گا۔

گیٹ کے باہر حمزہ بائیک پر سوار تھا۔ وہ اپنی بائیک کو ریس دے رہا تھا' میں نے نظر چرا کر اسے دیکھا تو وہ سامنے دیکھ رہا تھا۔ میں اسے نظر انداز کر کے چلنے لگی تو اپنی بائیک لے کر میرے سامنے آ گیا۔ میری طرف دیکھے بغیر ہی بولا جس سے صاف ظاہر تھا کچھ تو احساس حمزہ کو بھی ہوا تھا کہنے لگا۔ "میری وجہ سے لیٹ ہوئی ہو نا۔۔۔ چلو میں چھوڑ دوں۔"

"اتنی مہربانی کی ضرورت نہیں ہے۔ مجھے تمہاری مدد نہیں چاہیے۔ میں چلی جاؤں گی۔" میرا لہجہ برف میں ڈوبا ہوا تھا۔ میں اس کے قریب نہیں آنا چاہ رہی تھی۔ حمزہ کا لہجہ بھی کچھ مختلف نہ تھا۔

"ٹھیک ہے جاؤ۔۔۔ مرو۔" حمزہ اپنی بائیک تیزی سے لے کر چلا گیا۔ یونیورسٹی سے گھر پھر گھر کے کام' ان کے ساتھ حمزہ کی نوک جھونک میں وقت ایسے گزر گیا جیسے اسے پر لگ گئے ہوں۔

☼ ☼ ☼

میرے امتحانات اگلے مہینے تھے۔ میں چاہ رہی تھی کہ زیادہ سے زیادہ وقت پڑھائی میں گزرے۔ میں کتاب کے صفحے کو الٹ پلٹ کر کے دیکھ رہی تھی' یہ اکاؤنٹنگ اتنی مشکل کیوں ہے کیا کروں؟ کس سے مدد لوں؟ میں نے کتاب اور نوٹ بک اٹھائی اور سیدھی حمزہ کے کمرے میں پہنچ گئی۔ وہ تو دنیا سے بے خبر سو رہا تھا۔

"حمزہ اٹھو۔۔۔" حمزہ میری آواز پر کہاں اٹھنے والا تھا'

میں نے دوبارہ حمزہ کے کان کے پاس جاکر زور سے آواز لگائی۔ "حمزہ اٹھو۔"
"کیوں اتنا چلا رہی ہو.... ؟سونے دو.... " مجھے حمزہ پر شدید غصہ آیا پھر سائیڈ ٹیبل پر رکھا گلاس میں نے اٹھایا جس میں پانی تھا۔ چند بوندیں میں نے حمزہ کے منہ پر چھڑک دیں۔ وہ ایک دم سے اٹھا، غصہ اس کی آنکھوں سے چھلک رہا تھا، میں نے بھاگنے میں عافیت سمجھی۔

حمزہ نے اوڑھی ہوئی چادر کو ایک طرف پھینکتے ہوئے کہا۔ "حرا کی بچی.... "

حمزہ میرے پیچھے بھاگا۔ میں سیڑھیوں پر تیزی سے بھاگی اور سامنے سے آتی بڑی امی سے ٹکرا گئی۔ اب ایک اور قیامت، میں وہیں ٹھٹک کر کھڑی ہو گئی۔

"لڑکی! تمہیں عقل نہیں.... لڑکیوں کو اس طرح کی حرکتیں زیب نہیں دیتیں۔" بڑی امی ابھی غصہ کر ہی رہی تھیں کہ پیچھے سے حمزہ کو آتے دیکھا تو ان کا غصہ اور بڑھ گیا۔ "بچی نہیں رہیں اب تم۔ ہوش کے ناخن لو.... تمہارے ماں باپ بھی مصیبت کی گھنٹی ہمارے گلے باندھ گئے۔" بڑی امی کی ان جلی کٹی باتوں سے آنسو میری آنکھوں میں تیرنے لگے۔ وہ وہاں سے چلی تو گئیں پر، میرے سلے ہوئے زخموں کو ادھیڑ گئیں۔ جاتے ہوئے حمزہ کو ساتھ لے گئیں کہ فلاحی ادارے کی کچھ فائلز چیک کروانی تھیں۔ حمزہ خاموشی سے بڑی امی کے ساتھ چلا گیا۔ جب بڑی امی مجھ پر برستیں تو کچھ بوندیں حمزہ اپنے دل پر بھی محسوس کرتا کیوں کہ اسے لگتا تھا کہ اس میں اس کی بھی غلطی ہے۔ میں کچن میں کھڑی تھی اور رو رو کر میری آنکھیں بھی سرخ ہو رہی تھی۔ آج امی ابو کی بہت یاد آئی۔ چھوٹی سی بات پر اتنی باتیں اگر میں آج اپنے ماں باپ کے ساتھ اپنے گھر میں ہوتی تو یہ بے جا روک ٹوک، ڈانٹ شاید میرا مقدر نہ ہوتی۔ دادو میری ہمدرد تھیں۔ وہ میری وجہ سے پریشان ہوں، میں ایسا ہرگز نہیں چاہتی تھی، اس لیے ان کے سامنے آنسو بہا کر اپنے دل کا بوجھ بھی ہلکا نہ کر سکتی تھی۔ بس زیادہ پریشانی میں ان کی گود میں سر رکھ کر کچھ پل کو آنکھیں موند لیتی جس سے حمزہ کو جیلسی ہوتی۔ اس وقت بھی میں دادو کے کمرے میں داخل ہونے ہی والی تھی کہ دروازے پر ہی حمزہ کی آوازیں آنے لگی۔ وہ دادو کے کمرے میں ان سے باتیں کر رہا تھا۔ دادو نے کبھی ہم دونوں میں فرق نہ کیا تھا، اگر ایک ان کی آنکھیں تھا تو دوسرا ان آنکھوں کی روشنی۔

دادو، حمزہ سے کہہ رہی تھیں کہ "کیوں تنگ کرتے ہو اسے۔ بہت اکیلی پڑ جاتی ہے وہ۔"

"دادو.... حرا نے آپ سے شکایت کی۔" گود میں سے اٹھ کر دادی کو دیکھتے ہوئے حمزہ نے کہا۔

"نہیں حمزہ، وہ تو کچھ نہیں بولتی۔ دیکھنا جب اس کی شادی ہو جائے گی اور وہ چلی جائے گی تو پھر تمہیں اس کی بہت یاد آئے گی۔"

"دادو اس سڑی سے شادی کرے گا کون؟" حمزہ کے چہرے پر مسکراہٹ تھی۔

"چل ہٹ بدمعاش.... " دادو نے حمزہ کو چپت لگاتے ہوئے کہا تو میں نے بھی پھر حمزہ اور دادو کو ڈسٹرب نہ کیا اور اپنے کمرے میں چلی گئی۔

میں اپنے کمرے میں اسٹڈی ٹیبل پر بیٹھی پڑھ رہی تھی۔ آج دل پر ایک بوجھ سا تھا پتا نہیں کیوں، آج دل نہیں چاہ رہا تھا کہ میں کسی سے بات کروں اس لیے شام سے ہی اپنی کمرے میں تھی جب کہ اب تو رات کے نو بج رہے تھے۔ خاموش کمرے میں نظریں تو کتاب پر تھیں پر سوچ کہیں اور ہی سفر کر رہی تھی۔ میں شام سے کہاں ہوں، کسی کو کوئی فرق ہی نہیں پڑا۔ کوئی دیکھنے پوچھنے بھی نہیں آیا۔ آج تو بڑی امی کی آواز بھی نہیں گونج رہی، بڑی امی اور بڑے ابا شاید پارٹی میں گئے ہوں گے۔ ورنہ بڑے ابا مجھے نہ پا کر ضرور پوچھتے۔ حمزہ تو بڑی امی کی طرح ہے، ضرورت ہوئی تو پوچھ لیا ورنہ کیا فرق پڑتا ہے۔ میں جیوں یا مروں۔ ابھی ان سوچوں میں ہی تھی کہ ایک دم دروازہ کھلا اور حمزہ اندر آیا۔

"پاگل لڑکی! کیا کر رہی ہو....؟"

"حمزہ! یہ کیا طریقہ ہے۔ تم دروازہ ناک کر کے بھی آسکتے ہو۔"

"کیوں؟ تمہارا دروازہ ناک کر کے آؤں' نوکر سمجھ رکھا ہے۔"

"حمزہ! اب ہم بچے نہیں ہیں سنا نہیں تھا بڑی امی نے کیا کہا تھا۔" میرے دکھ اور غصے کے ملے جلے احساس کو حمزہ سمجھ گیا تھا اس لیے اس کا لہجہ بھی دھیما ہو گیا جس میں قدرے اپنا پن چھلکنے لگا۔ حمزہ اسٹڈی ٹیبل سے ٹیک لگائے' میری طرف دیکھتے ہوئے محبت بھرے لہجے میں کہنے لگا۔

"حرا میری طرف دیکھو۔" میں نے بہ مشکل حمزہ کے چہرے کو دیکھا۔

"اگر یہ چھوٹی چھوٹی خوشیاں میرا بچپنا ہے تو مجھے برا نہیں ہوتا۔ تم بات نہیں کرتیں' دن میں ایک دو بار جھگڑا نہیں کرتیں تو میرا دن مکمل نہیں ہوتا اور ویسے بھی آج جو تم نے کیا ہے اس کی سزا دادو تمہیں دیں گی۔"

"میں نے کیا کیا ہے؟" میرے چہرے سے پریشانی نمایاں ہوئی تو حمزہ کے چہرے پر شریر سی مسکراہٹ پھیل گئی۔

"یہ تو دادو ہی بتائیں گی چلو اٹھو۔" میرے کان پکڑ کر کھینچے اور مجھے دادو کے کمرے کی طرف لے گیا۔

کمرے میں داخل ہوتے ہی میں نے کیک پر لگی موم بتیوں کی روشنی سے کمرہ روشن ہوتے ہوئے دیکھا۔ دادو کے چہرے پر مسکراہٹ سجی ہوئی تھی انہوں نے بانہیں میری طرف پھیلائیں تو میں دادو سے لپٹ گئی۔ ساتھ میں میری آنکھوں کے کنارے بھی نم ہو گئے۔

حمزہ نے چھری میری طرف بڑھائی۔

"ہیپی برتھ ڈے حرا۔" تو میری آنکھوں میں آنسو بھر آئے۔ اس دن کو تو میں نے خود بھلا دیا تھا اور یہ ہی سوچ چکا تھا کہ سب بھول چکے ہیں میرا اس دنیا میں آنا کچھ خاص نہیں ہے جیسا دوسرے لوگوں کا ہوتا ہے۔

میری سوچ غلط تھی کسی کے لیے نہ ہو حمزہ اور دادو کے لیے تو خاص ہی تھا۔ میرے چہرے پر بھی مسکراہٹ کھل اٹھی۔ کیک کا ٹکڑا میں نے دادو کی طرف بڑھایا تو حمزہ نے بھی اپنا بڑا سا منہ کھول دیا۔ حمزہ کی طرف بنا دیکھے میں کیک اس کے منہ میں رکھ کر جلدی سے دادو کی طرف مڑی۔

"دادو آپ کو ۔۔۔ یاد تھا ۔۔۔؟"

"بالکل ۔۔۔ اور یہ شیطان بھولنے کب دیتا ہے۔"

دادو نے حمزہ کی طرف اشارہ کیا تو میں نے بھی حمزہ کی طرف مسکراتے ہوئے دیکھا جس کی آنکھوں سے خوشی ظاہر ہو رہی تھی۔

عجیب تھا یہ حمزہ بھی' کبھی جھگڑا کرتا' تو کبھی بڑی امی سے ڈانٹ پڑوا کر خوش ہوتا' تو کبھی میرے درد کو کم کرنے کی ہر ممکن کوشش کرتا۔ کتنے خوب صورت تھے یہ پل ۔۔۔ یہ پل جو آج حمزہ کی وجہ سے ۔۔۔ میری زندگی کے چند ایک خوب صورت پلوں میں شمار ہونے لگے۔ میری زندگی کے یادگار ہیں یہ پل۔

پھر کیک کاٹنے کے بعد ہم کافی دیر تک دادی کے پاس بیٹھ کر باتیں کرتے رہے۔ وقت کا احساس تب ہوا جب بڑی امی کمرے میں داخل ہوئیں' وہ لوگ پارٹی سے آچکے تھے۔ میں ایک دم سے ڈر گئی کیوں کہ ان کا سارا غصہ ہمیشہ کی طرح مجھ پر نکلنے والا تھا۔

"حمزہ! یہ کیا ہو رہا ہے؟ تمہیں اس وقت اپنے کمرے میں ہونا چاہیے۔" حمزہ بڑی امی کی بات پر اپنی جگہ سے اٹھ گیا اور حمزہ کے پیچھے میں بھی دادو کے کمرے سے باہر چلی گئی' میں نے جاتے ہوئے ایک نظر بڑی امی پر ڈالی۔ غصے سے ان کی دماغ کی رگیں بھی پھول گئی تھیں جو ان کے چہرے سے صاف ظاہر تھیں میرے جاتے ہی بڑی امی نے دروازے سے باہر کی طرف دیکھا پھر ان کی آواز نے میرے قدم روک لیے' جب تک حمزہ اپنے روم میں جا چکا تھا۔

"ماں جی! آپ حمزہ کے دماغ میں ایسا کچھ نہیں ڈالیں گی جو مجھے منظور نہ ہو۔۔۔"

"رخسانہ میں تو بس۔۔۔"

"مجھے امید ہے آپ آئندہ اس بات کا خیال رکھیں گی۔" بڑی امی نے دادو کو اپنی بات بھی پوری نہ

کرنے دی اور اپنی بات کہہ کر چلی آئیں۔

میں بھاگ کر اپنے کمرے میں داخل ہوئی اور اپنا دروازہ بند کر کے بیٹھ گئی۔ کیوں بڑی امی داود سے اس طرح سختی سے بات کر رہی تھیں۔ بڑے ابا کے سامنے تو وہ خود کو بڑا خدمت گزار بنا کر پیش کرتی ہیں اور ان کا اشارہ کس طرف تھا' ان کو کیا نامنظور تھا میں اپنے دماغ پر زور ڈال کر بھی سمجھ نہیں پا رہی تھی اس لیے اپنی آنکھیں موند لیں اور سونے کی کوشش کرنے لگی۔

جو بھی تھا آج اچھا دن تھا صرف حمزہ کی وجہ سے کچھ پل خوب صورت بنے جو میری خود کی دنیا میں شمار کرنے لائق تھے۔ اس لیے میں مزید بڑی امی کے بارے میں سوچ کر اپنا موڈ خراب نہیں کرنا چاہ رہی تھی۔

آج آخری پرچہ دے کر آئی تو دیکھا کہ رانی اب تک گھر کی صفائی میں مصروف تھی اور اس سے کام بڑی امی اپنی نگرانی میں کروا رہی تھیں۔ میں کمرے میں بیگ رکھ کر چینج کر کے آئی تو بڑی امی نے مجھے دیکھتے ہی کہا۔

"حرا! کھانے کو دیکھ لو اور ہر چیز رانی سے صاف کروا کے رکھ دو۔ میں ذرا اپنے روم میں جا رہی ہوں۔"

میں نے ایک فوجی کے سلوٹ کرنے کے انداز میں "جی بڑی امی جی" کہا اور کچن کارنر کی طرف بڑھ گئی۔

اتنی تیاری کرنے کی تفصیل رانی نے بتائی۔ "بڑی بی بی جی کی دوست کی بیٹی دبئی سے آرہی ہیں۔ اس کے لیے یہ سب تیاری ہے اور حمزہ صاحب انہیں ایئرپورٹ لینے گئے ہیں بس اب تو وہ آنے والی ہوں گی۔ بڑی تعریفیں کر رہی تھیں جی....."

"اچھا چلو' بس اب جلدی سے کام ختم کرو' تمہیں کہیں ڈانٹ نہ پڑ جائے۔" میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔

رانی پھر جلدی جلدی ہاتھ چلانے لگی۔ ٹھیک ایک گھنٹے بعد مس زویا ہمارے گھر پہنچ چکی تھیں بڑی امی نے بڑی گرم جوشی سے ان کا استقبال کیا تو زویا بھی نہایت سچی محبت کے ساتھ استقبال کا یہ روپ دیکھ کر خوب خوش ہوئی۔ زویا خود بھی بہت خوش مزاج لڑکی تھی وہ اپنی پڑھائی کے کسی اسائنمنٹ کو مکمل کرنے پاکستان آئی تھی۔ آج میں دیر سے اٹھی۔ تقریباً" دس کے قریب کا وقت تھا۔ اسی لیے صبح کافی تازہ دم تھی۔ تھکن جیسے ختم ہو گئی تھی دماغ ہر سوچ سے پاک تھا۔ میں فریش ہو کر ہال میں گئی تو سب کو دیکھ کر یاد آیا کہ آج اتوار ہے اس لیے آج سب گھر پر ہیں۔

بڑے ابا نے مجھے دیکھتے ہی پوچھا۔ "میرے بچے کے پیپرز کیسے ہوئے ہیں؟"

"بہت اچھے ہوئے ہیں بڑے ابو....." بڑے ابو کے لہجے میں اتنی مٹھاس تھی کہ بڑی امی کا منہ کڑوا ہوتے ہوئے محسوس ہوا۔ زویا نے چہرے پر مسکراہٹ سجاتے ہوئے میری طرف دیکھا تو میں اس کے پاس بیٹھ گئی۔

"کیسی ہیں زویا آپ؟"

"بہت خوش' ان فیکٹ میرا بھی کام تقریباً" ختم ہونے والا ہے۔" بڑی امی زویا کو مسکراتے ہوئے دیکھ رہی تھیں۔

میں اٹھ کر کچن کارنر کی طرف گئی اور اپنے لیے چائے بنانے کے ارادے سے چولہے پر چائے کا پانی رکھا دیکھا تو بڑے ابا ٹی وی لاؤنج سے اٹھ کر دادی کے کمرے کی طرف جا رہے تھے اور جاتے ہوئے مجھے تاکید کر رہے تھے کہ حمزہ کے لیے بھی چائے بنا دو۔ اس نے ابھی ناشتا نہیں کیا تو میں نے بڑے ابو کی بات سن کر چائے کا پانی مزید بڑھا دیا۔ جب کہ بڑی امی زویا کے ساتھ مصروف تھیں۔ میں نے چائے نکالی۔ بریڈ ٹوسٹر سے نکالے' آملیٹ بنا کر ناشتے کی ٹرے تیار کر کے حمزہ کے لیے لے جانے لگی تو بڑی امی نے روک لیا۔

"بیٹا حرا! تم آرام سے ناشتا کرلو حمزہ کا ناشتا زویا دے آتی ہے۔" میں نے ایک نظر بڑے ابا پر ڈالی اور پھر ٹرے زویا کی طرف بڑھا دی۔ بڑی امی کی محبت بھری آواز پر میں ششدر رہ گئی تھی۔ ایک زمانہ بیت گیا تھا کہ کبھی انہوں نے مجھ سے اتنی اپنائیت سے بات کی ہو۔ زویا

کے جاتے ہی انہوں نے مجھے اپنے پاس بیٹھ کر ناشتا کرنے کو کہا تو میں ناشتا لے کر وہیں بیٹھ گئی۔

چائے پیتے ہوئے میں نے رسمی انداز میں پوچھا۔

"بڑی امی! آپ کو بھی چائے دوں۔" تو انہوں نے منع کر دیا۔

"حرا میں چاہتی ہوں کہ زویا اس گھر کی بہو بنے۔"

بڑی امی کے یہ الفاظ میرے اندر جیسے شیشے کے گھر میں پتھر کا کام کر گئے۔ یہ دل تو جیسے دھڑکنا ہی بھول گیا۔ مجھے کوئی فرق تو نہیں پڑنا چاہیے تھا پھر کیوں چائے کا گھونٹ میرے حلق سے نیچے اترنا مشکل ہو گیا تھا۔

میں نے بڑی امی کو دیکھا تو وہ اپنی بات مکمل کرنے لگیں۔ "میں چاہتی ہوں کہ تم زویا کو حمزہ سے بات چیت کرنے کا موقع دیا کرو۔" بڑی امی کے اس جملے پر میں نے ان کو دیکھا۔ یہ جملہ تھا یا تیز دھار سے وار ہوا تھا۔ میرے اختیار میں کہاں تھا جو میں انہیں موقع دیتی پھر بھی اثبات میں سر ہلانے کے علاوہ کوئی چارہ نہ تھا۔

میں نے بڑی امی کی بات پر ابھی سے عمل کرنا شروع کر دیا تھا۔ اب صرف دادو تھیں جن کے سامنے میں اپنے دل کا بوجھ ہلکا کر سکتی تھی۔ اس لیے میں دادو کے کمرے میں گئی اور ادھر ادھر کی باتیں کرنے لگی۔

میں بات کرتے کرتے مسکرا تو رہی تھی پر میری آنکھیں نم ہو رہی تھیں۔ دادو کہیں نہ کہیں بھانپ گئی تھیں کہ مجھے بڑی امی نے کچھ کہا ہے۔ اس لیے پھر مجھے سمجھانے لگیں کہ میں کسی کی بھی باتوں کو دل سے نہ لگاؤں، خاص طور پر بڑی امی کی۔ کوئی لاکھ آپ کا برا چاہے پر جو خوشیاں آپ کی قسمت میں ہیں وہ اپنا راستہ بنا کر آپ تک پہنچ جاتی ہیں۔ بات اتنی مشکل تو نہ تھی پھر کیوں مجھے یہ بات مشکل اور پیچیدہ معلوم ہو رہی تھی؟

میں سامنے رہتے ہوئے بھی حمزہ سے جدائی سہنے کے لیے اپنے دل کو آمادہ کر رہی تھی اور پاگل دل ان سب باتوں کے لیے آمادہ نہ تھا۔ دل کہاں دنیاداری کو جانتا ہے یہ دل تو اپنی ہی من مانی کرتا ہے۔ یہ کون سا راستہ تھا جس پر دل نے سفر کرنا شروع کر دیا تھا۔ یہ بات میں کسی سے شیئر بھی نہیں کر سکتی تھی۔ یہ سب کیا ہے؟ کیوں ہے؟ میرے لیے یہ سب پریشان کن تھا۔ میرے اندر جنگ چل رہی تھی کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ کیا کرنا چاہیے کیا نہیں۔ کیا درست ہے اور کیا غلط، فیصلہ نہیں ہو پا رہا تھا۔

میں آج سارا دن اپنے کمرے میں ہی رہی، نیچے جانے کو دل ہی نہ چاہا۔ نہ ہی کھانا کھایا۔ وقت بھی گزرنے کا نام نہیں لے رہا تھا۔ کیوں آج کا دن پہاڑ کے جیسا لگ رہا تھا، میں چادر اوڑھے بیڈ پر لیٹی تھی، جب حمزہ آیا۔

دروازہ کھولتے ہی مجھے آواز دینے لگا۔

"حرا۔۔۔"

میں نے ایسے ظاہر کیا کہ جیسے میں سو رہی ہوں۔ تب اس نے چادر میرے چہرے سے ہٹائی تو مجھے غصہ آ گیا کیوں کہ مجھے بڑی امی کی بات یاد آ گئی تھی۔

"حمزہ! یہ کیا بدتمیزی ہے تم بنا ناک کیے کمرے میں گھس آتے ہو۔ کتنی بار منع کیا ہے۔ تمہاری سمجھ میں کیوں نہیں آتا کیا اس گھر سے بھی اب چلی جاؤں میں۔۔۔" غصے اور غم سے ۔ میری آواز بھر آئی تھی۔

حمزہ ایک دم ساکت سا ہو کر مجھے دیکھنے لگا۔ جیسے میری باتوں سے اس کی روح فنا ہو گئی ہو۔

"تم ایسے کیوں ری ایکٹ کر رہی ہو۔" اسی پل مجھے احساس ہوا کہ میں کچھ زیادہ ہی بول گئی ہوں۔ اس لیے موڈ کو بدلا۔

"حمزہ جاؤ، پلیز جاؤ۔۔۔"

"میں تم سے پوچھنے آیا تھا کہ تم نے کھانا کیوں نہیں کھایا؟"

"مجھے بھوک نہیں ہے حمزہ۔۔۔ اب اور سوال نہیں۔۔۔ مجھے اب سونے دو۔" حمزہ میرے سرد لہجے کو محسوس کرتے ہوئے الٹے قدموں باہر جانے لگا۔ اسے ابھی بھی کچھ امید باقی تھی کہ میں کچھ کہوں گی۔ "ہاں! جاتے ہوئے دروازہ بند کر دینا۔"

حمزہ کو مجھ سے ایسے رویے کی توقع نہ تھی۔ اس لیے دروازہ بند کرتے وقت اس نے کچھ پل مجھے دیکھا

جب کہ میں کھڑکی کی طرف دیکھ رہی تھی۔ ہمت نہ ہوئی کہ اس کے چہرے کو دیکھ سکوں اور پھر حمزہ دروازہ بند کرکے چلا گیا۔ اس وقت واقعی مجھے اتنا دکھ ہوا کہ آنسو آنکھوں سے گر کر میرے چہرے پر پھیل گئے۔

☼ ☼ ☼

دل کا دکھ درد بانٹنے والا کوئی ہمدرد ہو تو زندگی کتنی آسان ہو جاتی ہے۔ دکھ بانٹنے سے کم ہو جاتا ہے۔ اس دکھ میں کوئی آپ کے ساتھ دکھی ہو تو آپ کو کسی اپنے کے ہونے کا احساس دنیا کے دیے ہوئے دکھوں سے مقابلہ کرنے کا حوصلہ دیتا ہے۔ حمزہ کے بعد میری ایک ہی خاص دوست تھی فاریہ، جو میری ہر مشکل کا حل ڈھونڈتی۔ میں نے جب اسے اپنے دل کا حال بتایا تو اس نے بنا سوچے سمجھے ایک نئی بات کا انکشاف کر ڈالا۔

"حرا! تمہیں محبت ہو گئی ہے۔ اس لیے تم حمزہ اور زویا کو ایک ساتھ برداشت نہیں کر پا رہی ہو۔" میں نے فاریہ کی بات کو ہنسی میں اڑا دیا۔ مجھے پتا تھا کہ وہ میرے موڈ کو بدلنے کے لیے یہ سب مذاق کر رہی ہے۔ کالج سے واپسی پر میرا موڈ کافی بہتر ہو گیا تھا۔ جس سے تھکن اور بوریت ختم ہو گئی۔ ذہن پُرسکون ہو تو ہر چیز خوش گوار محسوس ہوتی ہے۔ اسی خوش گوار موڈ کے ساتھ میں گھر میں داخل ہوئی تو سامنے حمزہ اور زویا کو خوش گوار موڈ میں محوِ گفتگو پا کر دماغی سکون کہیں کھونے لگا۔ اور میں خاموشی سے اپنے کمرے میں چلی گئی۔

پتا نہیں کیوں میری آنکھیں اتنا جل رہی تھیں۔ کمرے میں داخل ہوتے ہی بیگ کو بیڈ پر پھینکا اور فون نکال کر کان سے لگاتے ہوئے دروازہ بند کرنے لگی تو سامنے حمزہ کو کھڑا پایا۔

"کیا ہو گیا ہے تمہیں؟ کیوں اس طرح کا برتاؤ کر رہی ہو حرا؟" میرے فون کی بیل مسلسل جا رہی تھی۔ دوسری طرف ہیلو کی آواز سنتے ہی میں نے فون پر کہا کہ "ماموں جان مجھے لے جائیں، کچھ دن نانو کے پاس رہوں گی۔" میری اس بات پر حمزہ کو یقین نہ آیا۔ وہ تو میرے جواب کا منتظر تھا۔

"کیوں جاؤ گی تم؟" حمزہ نے پھر ایک اور سوال کیا اور اب جیسے میرے صبر کا پیمانہ لبریز ہو رہا تھا۔

مجھے ڈر تھا کہ کہیں میں کمزور نہ پڑ جاؤں۔ کہیں میرے دل کا حال میری آنکھیں نہ عیاں کر دیں۔ میں نے حمزہ کو بازو سے پکڑ کر دروازے کی طرف کیا اور باہر دھکیلتے ہوئے دروازہ بھی بند کر دیا۔ دروازہ بند کرتے ہی میری آنکھوں کا سمندر بند توڑ کر بہہ نکلا۔

امی ابو کے بعد ماموں جان مجھے اپنے ساتھ رکھنا چاہتے تھے، مگر بڑے ابا نہ مانے کیوں کہ میں ان کے بھائی کی آخری نشانی تھی۔ اسی طرح دادو بھی مجھے اپنی آنکھوں کے سامنے بڑا ہوتے ہوئے دیکھنا چاہتی تھیں تو میں اس گھر میں ہی آ گئی۔ پھر کبھی نانو کے گھر جاتی تو ایک دن بعد ہی حمزہ ضد کرکے بڑے ابو کو لے آتا اور مجھے واپس لے جاتے جب کہ آج میں نے ہمیشہ کے لیے جانے کا فیصلہ صرف اپنے دل میں ہی کر لیا تھا۔

اس بات کا علم بڑے ابا اور دادو کو ہوتا تو وہ کبھی نہ مانتے۔ آج بھی حمزہ اس بات کو قبول نہ کر پا رہا تھا کہ میں کچھ دنوں کے لیے ہی نانو کے ہاں جاؤں۔ اب تو میں بھی اس گھر سے مانوس ہو گئی تھی، جانا ہی نہیں چاہتی تھی۔ جانے کی وجہ بھی تو صرف اتنی تھی کہ بڑی امی کے حکم کے مطابق مجھے حمزہ اور زویا کو اکیلے چھوڑ دینا چاہیے تھا۔ دوسرے یہ کہ حمزہ کو کسی اور کے ساتھ دیکھ کر میرے دل کو تکلیف ہوتی۔ عجیب خود غرضی پر اتر آیا تھا یہ پاگل دل لاکھ سمجھانے کے باوجود سمجھنے کی کوشش نہیں کر رہا تھا۔ اس ضدی بچے کی طرح تھا جو اپنا من پسند کھلونا کسی کے ساتھ شیئر کرنے کو تیار نہ تھا۔

میں نے اپنے رخساروں پر اپنے ہاتھ کی انگلیاں رگڑتے ہوئے اپنے چہرے پر بہتے ہوئے آنسوؤں کو صاف کیا اور اٹھ کر الماری سے بیگ نکالا اس میں کپڑے اور کچھ ضروری سامان رکھا۔ اس کے بعد دادو سے ملنے ان کے کمرے میں گئی جہاں حمزہ پہلے سے

موجود تھا۔ مجھے دیکھ کر اس کی آنکھوں میں کئی سوال تھے۔ وہ دادو کو بھی میرے جانے کا بتا چکا تھا۔ وہ شاید دادو سے مجھے روکنے کی سفارش کرنے گیا تھا۔ وہ جانتا تھا کہ میں دادو کا کہنا کبھی نہیں ٹالوں گی۔
دادو کے گلے لگ کر میرے آنسو نکل آئے۔ "کیا ہوا میرے بچے؟"
میں نے آنسو صاف کرتے ہوئے دادو سے کہا۔
"کچھ نہیں دادو! بس کچھ دنوں کے لیے نانو کے پاس جا رہی ہوں۔ آجاؤں گی۔" میں دادو سے نظریں نہیں ملا پا رہی تھی۔
اسی لیے وہ جان چکی تھیں کہ کچھ تو بات ہے جو میرے اندر اتنی توڑ پھوڑ ہو رہی تھی کیوں کہ دادو بڑی امی کی طبیعت سے بہ خوبی واقف تھیں۔ اب حمزہ سے برداشت نہ ہوا تھا وہ دادو سے التجا کرنے لگا۔
"دادو پلیز! روکیں اسے....." اور میں نظریں جھکائے کھڑی تھی جیسے میں نے حمزہ کی بات سنی ہی نہ ہو۔
"جانے دو حمزہ اسے کچھ دن، نانو، ماموں اور ممانی کے ساتھ رہے گی تو اسے اچھا لگے گا اور اب تو اس کے امتحان بھی ختم ہو چکے ہیں۔" دادو کی ان باتوں پر میں نے دادو کو غور سے دیکھا۔ تو ان کی آنکھیں بھی نم ہی نظر آئیں۔
تب ہی رانی، دادو کے کمرے کے دروازے پر کھڑی تھی۔ "حرا..... آپ کے ماموں ہال میں آپ کا انتظار کر رہے ہیں۔" تو میں دادو کے ساتھ باہر آ گئی حمزہ بھی ہمارے پیچھے تھا۔ میرا بیگ اسی نے گاڑی میں رکھا۔ بڑے ابا تو آفس میں تھے جب کہ بڑی امی زویا کے ساتھ مارکیٹ گئی ہوئی تھیں۔ گھر میں، میں، دادو اور حمزہ ہی تھے۔ دادو لاؤنج تک میرے ساتھ آئیں۔ میں گاڑی میں بیٹھ چکی تھی جب کہ ماموں دادو سے بات کر رہے تھے۔ جو گاڑی سے کچھ فاصلے پر تھے۔ حمزہ نے مجھے دیکھتے ہوئے کہا۔
"حرا! یہ آخری بار ہے۔ اس کے بعد تم میری اجازت کے بنا کبھی بھی کہیں نہیں جاؤ گی۔" میں نے حمزہ کی طرف دیکھا تو میں جیسے پتھر کی ہو گئی۔ اس کی آنکھوں میں عجیب سی مقناطیسی کشش تھی۔ جس نے مجھے باندھ ہی لیا تھا۔ میں اس کے چہرے کے ہر نقش کو جیسے حفظ کرنے لگی تب ہی دوسرا دروازہ ماموں نے کھولا اور حمزہ دروازے سے ہٹ گیا۔ اور ماموں سے بات کرنے لگا۔
میں نے دل میں سوچا کہ اب میں کبھی اس گھر میں واپس آؤں گی تو تمہاری اجازت درکار ہو گی۔ اب میں کبھی بھی اس گھر میں لوٹ کر نہیں آؤں گی حمزہ.....
میں سوچ میں گم تھی اور گاڑی سوسائٹی سے کراس کر کے کشادہ سڑک پر رواں دواں تھی۔ کچھ دیر بعد ہم دوبارہ ایک شاندار سوسائٹی میں داخل ہو گئے۔ ان ہی کشادہ گھروں میں ایک کشادہ گھر نانو کا تھا جس کے گیٹ پر ہارن دیتے ہی چوکیدار نے گیٹ کھول دیا۔ بڑے سے لان کے ایک طرف پارکنگ ایریا تھا گاڑی وہیں کھڑی کر کے ماموں میرا بیگ لے کر گھر کی طرف بڑھے۔ میں بھی پیچھے ہی تھی۔
ممانی شازیہ اور ان کی بیٹی عالیہ داخلی دروازے پر ہمارے ہی استقبال کے لیے کھڑی تھیں۔ مجھے دیکھ کر عالیہ بے حد خوش ہوئی، وہ مجھ سے ایک سال ہی چھوٹی تھی۔ اس لیے ہم دونوں میں کافی گہری دوستی تھی۔ ممانی مجھے پیار سے اندر لے گئیں، میں نے گھر میں نظر دوڑاتے ہی نانو کا پوچھا۔
ممانی کہنے لگیں۔ "ان کی کمر میں درد ہے۔ جس کی وجہ سے ڈاکٹر نے بیڈ ریسٹ کی تاکید کی ہے۔ تم جا کر مل لو۔" میں اٹھ کر کھڑی ہو گئی۔ میرے ساتھ عالیہ بھی چل دی۔
نانو ہمیشہ مجھے دیکھ کر خوش ہوتی تھیں۔ آج بھی مجھے دیکھ کر بہت خوش ہوئیں اور ہمیشہ کی طرح آج بھی ان کے وہی کلمات تھے۔
"حرا میری بچی! تم آتی ہو تو ایسا لگتا ہے کہ میری حاجرہ آ گئی ہے۔ خوش رہو میری بچی۔" میرے ماتھے پر بوسے دیے۔ کتنی ہی دعائیں ان کی زبان پر رواں تھیں جن میں پوری پوری سچائی تھی۔ ممانی نے بھی

رات کے کھانے کا خاص اہتمام کیا تھا۔ میرے پسندیدہ کھانے تیار کروائے تھے۔ عالیہ اور نانو کے ساتھ وقت گزرنے کا احساس ہی نہ ہوا۔ اب ممانی نے کھانے کے لیے آواز لگادی۔ میں اور عالیہ کھانے کی میز پر پہنچے تو وہاں ماموں موجود تھے۔ وہ مجھے گھر پر چھوڑ کر کہیں کام سے چلے گئے تھے اس لیے دوبارہ نظر نہ آئے اور اب وہ یہاں تھے۔ ماموں نے میری پلیٹ میں خود کھانا ڈالا۔

اور میرے سر پر ہاتھ پیار سے پھیرتے ہوئے کہنے لگے۔ "حرا کے آنے سے ہمارے گھر کی رونق دوبالا ہوجاتی ہے۔"

"وہ تو ہے جناب۔۔۔" ممانی نے بھی ماموں کا پورا پورا ساتھ دیا اور میں مسکرادی اور پلیٹ میں چمچہ گھمانے لگی۔

میرے ذہن میں اب بھی وہی گھر تھا اور یہاں میرا دل نہیں لگ رہا تھا۔

تب ممانی نے کہا۔ "کھاؤ بیٹا۔" تو میں نے چمچے سے نوالہ منہ میں رکھا۔

☆ ☆ ☆

یہ یادوں کا قافلہ رک کیوں نہیں جاتا۔ یہ لمحہ بہ لمحہ بدلتے احساس کا طوفان تھم کیوں نہیں جاتا۔ نادان سوچ اس پر بضد ہے۔ جو میرا نہیں، جس کا خیال میرا نہیں۔ یہ پاگل دل اتنی سی بات نہ سمجھ سکا اور اندھے گھوڑے کی طرح سراب کا پیچھا صرف خالی پن کے سوا کیا دے سکتا تھا۔ ان سوچوں میں غرق نیند نہ جانے کہاں کھو گئی تھی۔ میں نے اپنے برابر میں دیکھا تو عالیہ دنیا سے بے خبر سو رہی تھی۔

کچھ دن پہلے میں بھی ایسے ہی بے خبر، بے فکری کے ساتھ سویا کرتی تھی۔ جب کہ آج کا دن بالکل مختلف تھا۔ اس میں غلطی کس کی تھی میری، حمزہ کی یا پھر میرے دل کی۔ یہی سوچتے سوچتے میں نے اپنی آنکھیں موندلیں پھر میری بند آنکھوں میں حمزہ کا چہرہ نمودار ہونے لگا۔ اس کی وہ بات کہ "حرا آئندہ نہ جانے دوں گا۔" میں من ہی من مسکرادی کیوں کہ وہ وقت کبھی آنے والا نہیں تھا۔ پھر نہ جانے کب نیند کی پری مجھ پر حاوی ہوگئی۔ صبح کی کرنیں میرے کمرے کو روشن کر رہی تھیں جن کی نرم گداز گدگدی سے میری آنکھ کھل گئی۔ میں نے دیکھا کہ عالیہ اٹھ چکی ہے اور وقت بھی خاصا گزر چکا ہے تو میں بھی اٹھ کر فریش ہوئی۔ ہال میں گئی تو ممانی مجھے دیکھ کر مسکرادیں۔ وہ یقیناً میرا ہی انتظار کر رہی تھیں۔ مجھے دیکھتے ہی انہوں نے نوری کو ناشتا تیار کرنے کا حکم دیا۔ میں ٹی وی لاؤنج میں بیٹھ گئی تو نوری ناشتا لے کر وہیں آگئی، ساتھ ہی ممانی بھی آکر بیٹھ گئیں۔ میں چائے پینے لگی۔

"حرا۔۔۔ تم خوش تو ہونا۔۔۔ کوئی پریشانی تو نہیں ہے نا۔۔۔؟" ممانی کی کھوجتی نظروں کو دیکھ میں چائے کا گھونٹ لینا بھول گئی ایک پل کے بعد چائے کا گھونٹ میں نے حلق سے نیچے اتارا اور مصنوعی مسکراہٹ سجا کر ممانی کو بتانے لگی۔

"ایسی کوئی بات نہیں ممانی جان۔۔۔ میں خوش ہوں۔۔۔"

"خدا ہمیشہ تمہیں خوش رکھے۔ میں بھی ایک بیٹی کی ماں ہوں۔ اصل مسکراہٹ اور مصنوعی مسکراہٹ کا فرق جانتی ہوں۔" ممانی کی اس بات پر میں شرمندہ سی ہوگئی اور نظریں جھکالیں۔

ممانی کی نظریں اب بھی مجھ پر گڑی تھیں۔

"وقت آنے پر میں آپ کو ضرور بتاؤں گی۔"

میرے اس جملے سے جیسے ان کو تسلی ہوئی تو انہوں نے مسکرا کر بات بدل دی اور ادھر ادھر کی باتوں میں مشغول ہوگئیں۔

میں ان سے باتیں اور ناشتا ساتھ ساتھ کرتی جا رہی تھی۔

☆ ☆ ☆

بوندا باندی نے ہوا میں خنکی کا تناسب بڑھا دیا تھا، سردی کی آمد تھی۔ موسم کی طرح احساس بھی سرد ہو رہے تھے جب کہ اندر ارمانوں کو آگ لگی ہوئی

تھی۔ جو جل جل کر راکھ ہو رہے تھے۔ میں کھڑکی میں اداس بیٹھی باہر بارش کی برستی بوندوں کو دیکھ رہی تھی کہ میری نظر لان میں لگے اس پودے پر پڑی جو بڑے بڑے پودوں میں چھوٹا سا مگر نمایاں نظر آرہا تھا۔ اس پر ایک عدد سرخ رنگ کا پھول کھلا ہوا تھا جس کے ساتھ بارش کی بوندیں چھیڑ چھاڑ کر رہی تھیں۔ بارش کی بوند پڑتے ہی وہ پھول بھی جھوم جاتا اور کئی بل کھا کر رکتا کہ ایک اور شریر بوند اس کی مستی میں اضافہ کر دیتی میں اسے دیکھ کر مسکرا رہی تھی کہ اچانک میرے فون کی گھنٹی بجی تو میں نے فون پر دیکھا۔ حمزہ کا نمبر تھا میں نے واپس رکھ دیا۔

پھر میں بارش کو کھدی ہوئی زمین میں گرتے دیکھنے لگی۔ جہاں شاید نئے پودے لگانے کے لیے زمین تیار کی گئی تھی۔ اس کے اردگرد ہری بھری گھاس کی چادر بچھی ہوئی تھی۔ جبکہ بارش کی بوندیں اس کھدی ہوئی مٹی میں جذب ہو رہی تھیں۔ کچھ ہی وقت میں وہ زمین تر ہو گئی۔ میرے موبائل پر مسیج کی رنگ ہوئی تو میں نے موبائل پر دیکھا' حمزہ کا مسیج تھا۔ ”حرا! آئی مس یو۔“ وہ مسیج پڑھتے ہی میرے چہرے پر مسکراہٹ کھل اٹھی گستاخ دل نے ہلچل مچادی۔ اس ہلچل میں سرگوشیاں ہونے لگیں کہ میں بھی جواب میں لکھ دوں ”آئی مس یو ٹو ویری مچ“ اور وہ سارے جذبات' جو اس کے لیے ہیں۔

پھر سوچ کا رخ بدلا کہ ایک لڑکی کا اپنی محبت کا اظہار کرنا کچھ معیوب سمجھا جاتا ہے۔ مشرقی لڑکی اپنی لاج اور شرم کی حد کس طرح پھلانگ سکتی ہے۔ بالکل نہیں..... اور وہ بھی مجھ جیسی لڑکی جس کے سر پر ماں باپ کا سایہ موجود نہ ہو۔ جو لوگوں کی باتوں کا منہ توڑ جواب دے سکتے ہوں' مجھ بے سہارا کے لیے اپنے جذبات کا گلا گھونٹنے میں ہی سمجھ داری ہے۔ ان سوچوں نے جیسے مجھے تھکا دیا تھا میں کھڑکی سے ہٹ کر اپنے بیڈ پر لیٹ گئی اور کئی خوش فہمیوں اور سوچوں میں غرق دنیا سے بے نیاز ہو گئی کہ میرے فون کی پھر سے گھنٹی بجی تو میں پھر سے واپس اسی دنیا میں آگئی۔

میں نے فون پر دیکھا تو گھر کا نمبر تھا۔ جس کو زیادہ استعمال دادو کرتی تھیں۔ میں نے فون اٹھایا تو اس وقت بھی دادو ہی تھیں۔

”کیسی ہو میری بچی؟“ حال احوال پوچھ کر کتنی ہی دعائیں دے ڈالیں۔ ”خوش رہو! اللہ خوش رکھے' جگ جگ جیو۔“

اور ان دعاؤں میں اتنا اثر تھا کہ میری ساری تھکن دور ہونے لگی۔

”بیٹا۔ میں نے کہا تھا نا کوئی کسی کو لاکھ باندھ کر رکھے' قسمت کو کوئی نہیں باندھ سکتا۔ اگر کوئی کسی کی خوشیوں کے راستے میں کھڑا بھی ہو جائے تو خوشیاں اپنا راستہ خود بنا کر اپنے حقدار کی جھولی میں سما جاتی ہیں۔“ میں کچھ سمجھ نہیں پا رہی تھی جبکہ دادو کی بوڑھی آواز میں خوشی کی کھنک تھی۔ تو میں بھی ہنس دی۔ ”شام تک انتظار کرو سب واضح ہو جائے گا۔“

”کیا دادو؟“

”میری دعاؤں کا اثر۔“ دادو نے مسکراتے ہوئے کہا۔

ان کی آواز کا ترنم میرے کانوں میں رس گھول رہا تھا۔ جبکہ میں بات کی وجہ بھی نہ جانتی تھی۔ دادو کے فون بند کرنے کے بعد دل وسوسوں کے شہر کے انجان راستوں پر سفر کرنے لگا۔

کیا بات ہو سکتی ہے؟ دادو کس کا غرور چکنا چور ہونے کی بات کر رہی تھیں اور شام تک ایسا کیا ہونے والا تھا۔ جس سے ہر چیز واضح اور شفاف نظر آنے والی تھی۔ میرا دماغ ان سوچوں سے تھک چکا تھا۔ تو آنکھیں بند کر کے میں سکون محسوس کرنے لگی اور میری آنکھ لگ گئی۔

شام میں جب اٹھی تو گھڑی پر نظر دوڑائی پانچ بج رہے تھے۔ کمرے سے باہر آئی تو دیکھا کہ ہال میں بڑی امی اور بڑے ابا بیٹھے باتیں کر رہے تھے۔ حیران کن بات تو یہ تھی کہ ساتھ میں دادو بھی تھیں۔ ویسے دادو ان کے ساتھ کم ہی جاتیں۔ بڑے ابا پھر بھی دادو کو کہیں لے جاتے مگر رخسانہ بیگم کے ساتھ کبھی بھی

نہیں۔ ان کا رویہ ہی کچھ عجیب ہوتا اس لیے ان سب کو ساتھ دیکھ کر یہی سوچا کہ زویا اور حمزہ کی شادی کا دعوت نامہ دینے آئے ہوں گے جبکہ بڑی امی کے چہرے پر خوشی کی جگہ ناخوش گواری جھلک رہی تھی جبکہ بڑے ابا بہت مطمئن تھے اور دادو تو بہت خوش نظر آ رہی تھیں۔

میں نے آگے جا کر سب کو سلام کیا۔ بڑے ابا نے سر پر پیار سے ہاتھ پھیر کر دعائیں دیں جبکہ دادو ایسے ملیں جیسے وہ بھی میری طرح اداس تھیں جبکہ مجھے دیکھ کر بڑی امی کے چہرے پر جو پر مسکراہٹ تھی وہ غائب ہوگئی۔

پھر نانو کی آواز ابھری "یہ آپ کی بچی ہے، ہمارے گھر تو ویسے ہی مہمانوں کی طرح آتی ہے۔ پھر بھی آپ نے ہم سے پوچھ کر جو عزت ہمیں بخشی ہے ہم اس کے لیے تہہ دل سے شکر گزار ہیں۔" نانو کی بات میرے پلے نہ پڑی تو بھی میں مسکرا کر بڑے ابا کے پاس صوفے پر بیٹھ گئی۔ انہوں نے ایک بار پھر ہاتھ بڑھا کر میرے سر پر پھیرا اور کہا "تو آج سے ہمیشہ ہمیشہ کے لیے حرا بیٹی میری ہوئی۔" تو ماموں اور ممانی کے چہرے پر بھی مسکراہٹ پھیل گئی۔

ماموں جی خوشی سے کہنے لگے۔ "بہت بہت مبارک ہو ماں جی آپ کو۔" تو جیسے میرا دل بند مٹھی سے آزاد ہوا۔ ساری دھڑکنیں بیک وقت دھڑکنے لگیں۔ پھر میں سب سمجھ گئی کہ یہاں میرے اور حمزہ کے رشتے کی بات ہو رہی ہے تو میں شرماتے ہوئے وہاں سے اٹھ کر کمرے میں آ گئی۔ میں خود پر ہنسی۔ شرمانے کی کیا بات ہے، سب میرے اپنے ہی تو ہیں۔ میں مسکرانے لگی اور دل میں کئی ارمان سجانے لگی۔

تھوڑی دیر بعد ممانی، دادو کا ہاتھ پکڑے میرے کمرے کے اندر داخل ہوئیں۔ ممانی دادو کو چھوڑنے ہی آئی تھیں۔ دادو بیڈ پر بیٹھی ہی تھیں کہ میں اپنا سر ان کی گود میں رکھ کر لیٹ گئی تو پیار سے وہ میرے سر کو سہلانے لگیں۔ کتنا سکون میسر آ رہا تھا جسے میں بیس دن سے مس کر رہی تھی۔

دادو۔ یہ سب کیسے ہوا؟

"بیٹا! اللہ کی مصلحتیں اللہ ہی جانتا ہے۔"

"دادو کیا حمزہ نے مجبور کیا ہے۔" میں نے دوبارہ سوال کر کے کریدا کہ وہ ان بیس دنوں میں جو ہوا ہے کچھ تو بتائیں۔

"ہاں۔۔۔!" دادو کی ایک ہاں نے جیسے میری زندگی خوشیوں سے بھر دی۔ میں نے مزید پوچھا۔

"پھر دادو۔۔۔" میں مسکراتے ہوئے مزید پوچھنے لگی۔

"جب اس آدھی انگریز زویا کے ہتھکنڈے نہ چل سکے تو رخسانہ نے صاف کہہ دیا کہ میں زویا کی شادی حمزہ سے کرنا چاہتی ہوں جس کے لیے زویا کے گھر والوں کو بھی آگاہ کرنے والی تھیں کہ حمزہ نے کہا کہ میں زویا کا دوست ضرور ہوں مگر اس سے شادی نہیں کروں گا۔ حمزہ نے رخسانہ بیگم سے کوئی سخت رویہ اختیار نہ کیا بس خاموش ہوگیا۔ زیادہ وقت گھر سے باہر گزارتا، گھر پر بھی کسی سے بات نہیں کر رہا تھا۔ تو پھر تیرے بڑے ابا نے اس سے پوچھا تو اس نے کہا کہ وہ شادی صرف حرا سے کرے گا۔" اس بات پر دادو بھی مسکرائی تھیں اور پیار سے میرا ماتھا بھی چوم لیا۔ "میں تو ہمیشہ سے یہی چاہتی تھی۔ بس رخسانہ کی بد زبانی سے ڈرتی تھی۔ اس کا ذکر تمہارے بڑے ابا نے مجھ سے کیا تو میں نے شکرانے کے نوافل پڑھے اور کہا کہ نیک کام میں دیر کیوں، رخسانہ کو منانا تو بہت مشکل کام تھا۔ ویسے تو وہ مان ہی نہیں رہی تھی مگر پھر جب شوہر نے اپنی اہمیت جتائی تو وہ مان گئی۔"

"دادو! حمزہ کیسا ہے؟" میں نے ان کی گود سے اٹھ کر سامنے بیٹھتے ہی پوچھا تو وہ مسکرا دیں۔

"بہت بہت خوش ہے وہ۔ جس دن سے اسے پتا چلا ہے کہ تم اس کی زندگی میں آنے والی ہو۔ خوشی سے پھولے نہیں سماتا، بے حد خوش ہے۔" تب ہی مسکراتی ہوئی عالیہ کمرے میں داخل ہوئی اور دادو کو دیکھتے ہی کہا۔ "آنٹی لوگ جا رہے ہیں آپ بھی آ جائیں۔" تو دادو میرے سر پر ہاتھ پھیرتے اور میرے

گال پر پیار سے تھپتھپاتے ہوئے اٹھ گئیں۔ میں ایک بار پھر دادو کے گلے سے لگ گئی۔ کتنے خوب صورت پل تھے یہ جنہیں میں دل سے محسوس کر رہی تھی۔

اس گھر کی بیٹی ہوں۔ آج مجھے اپنی قسمت پر ناز محسوس ہو رہا تھا۔ دل چاہ رہا تھا کہ گھٹنوں بیٹھ کر اس رب العزت کا شکریہ ادا کروں جس نے میری زندگی کو خوشیوں سے بھر دیا۔

☼ ☼ ☼

"اٹھ جائیے۔۔۔ گھر میں بہت کام ہیں اور وقت بھی بہت کم ہے۔" ممانی نے کمرے میں آتے ہی پردے ایک طرف کیے تو روشنی کی کرنوں سے کمرہ روشن ہو گیا۔ میں نے آنکھیں کھولتے ہی سائیڈ ٹیبل سے موبائل اٹھا کر دیکھا کہ حمزہ کا کوئی میسج یا کوئی مس کال تو نہیں، موبائل پر کچھ بھی نہ تھا یہ کیا بات ہوئی، یہی سوچ رہی تھی کہ ممانی کی آواز پھر کانوں سے ٹکرائی۔

"جلدی اٹھو حرا مارکیٹ جانا ہے۔ لسٹ تیار کرنی ہے، شادی والا گھر ہے۔"

"اوہو۔۔۔ ممی اٹھ جاتے ہیں۔" عالیہ یہ کہتے ہوئے چادر ڈھانپنے لگی تو ممانی اور دیکھتے ہوئے بولیں۔

"او خدایا! اس لڑکی کو کبھی کسی چیز کا ہوش نہیں۔ حرا تیار ہو کر نیچے آجاؤ اور اس لڑکی کو بھی لے آؤ ساتھ۔" ممانی نے مجھے دیکھتے ہوئے کہا اور جاتے جاتے ساتھ لانے والا جملہ جو بولا وہ عالیہ کے لیے تھا جو پھر سونے جا رہی تھی۔ فوراً! "اٹھ گئی آج کی صبح میرے لیے نہایت ہی خوب صورت اور خوشگوار تھی۔ سردی کے باوجود دل میں جو خوشی کی حرارت تھی۔ وہ سردی کے احساس کو زائل کر رہی تھی۔ میں نے الماری سے کپڑے نکالے اور واش روم میں جانے سے پہلے عالیہ کو جگا دیا۔ ہم تیار ہو کر ہال میں آئے تو ممانی ڈیکوریشن، کیٹرنگ والوں کو لائن میں کھڑا کر کے کچھ سمجھا رہی تھیں۔ ڈیکوریشن والا تو کچھ پھول بھی ساتھ میں لایا تھا۔۔۔ ممانی ان پھولوں کو دیکھ کر اپنا حتمی فیصلہ سنا رہی تھیں۔ جبکہ ایک طرف نانو اور ماموں بیٹھے شادی میں بلائے جانے والے مہمانوں کی لسٹ تیار کر رہے تھے۔ میں نے اس گھر میں اتنا وقت نہیں گزارا تھا پھر بھی اس گھر کے لوگ ایسے تیاریوں میں مصروف تھے جیسے میں

☼ ☼ ☼

"بارات آگئی۔۔۔"

ایک لڑکی بھاگتی ہوئی کمرے میں داخل ہوئی۔ میرے دل کی دھڑکنیں تیز ہو گئیں۔ "حمزہ بھائی تو بہت اچھے لگ رہے ہیں۔ ایسے جیسے کسی ریاست کے راج کمار۔۔۔" وہ دوبارہ بولی۔ یہ لڑکی عالیہ کی دوست تھی جبکہ میرے چہرے پر آتے جاتے رنگ نمایاں تھے۔ میں آئینے کے سامنے بیٹھی تھی اور میک اپ ایکسپرٹ مجھے تیار کر رہی تھی۔ وہ بھی مجھے دیکھ کر مسکرا دی۔ اور عالیہ کی بات کا جواب دے ڈالا۔

"تو ہم بھی اپنی حرا کو راج کماری کی طرح بنا دیں گے بلکہ تیار ہونے کے بعد ہماری حرا ملکہ لگے گی۔" ابھی یہ باتیں چل ہی رہی تھیں کہ ممانی کمرے میں داخل ہو گئیں۔ وہ بھی بہت خوب صورت لگ رہی تھیں۔

"جلدی کرو لڑکیوں! نکاح کی رسم ہونے والی ہے۔"

ممانی دوسری لڑکیوں کو ساتھ لے کر چلی گئیں تاکہ باقی کی رسمیں ادا ہو جائیں۔ آخر کار وہ وقت بھی آہی گیا جب نکاح کے لیے قاضی، ماموں اور ان کے ساتھ دو گواہ اور بھی تھے اندر آگئے۔ نکاح کی رسم ادا ہو گئی۔ سب نے مبارک باد دی اور پھر آج میں حرا سے حرا حمزہ ہو گئی۔ کچھ عجیب سا احساس ہوا جیسے میں اندر سے بھی بدل چکی ہوں۔

☼ ☼ ☼

عروسی جوڑے میں جہازی سائز بیڈ پر بیٹھی میں حمزہ کا انتظار کر رہی تھی۔ کمرہ بھی دلہن کی طرح سجا ہوا تھا۔ تازہ گلابوں کی خوشبو سے سارا کمرہ مہک رہا تھا۔ بھینی بھینی سی خوشبو عجیب سا احساس طاری کر رہی تھی۔ خواہشیں سرگوشیاں کر رہی تھیں۔ میں اپنی ہی

آہٹ سے چونک رہی تھی۔ پھر دروازہ کھلنے کی آہٹ ہوئی تو میں نے گھونگھٹ کی اوٹ سے ہی دیکھا تو حمزہ تھا، وہ مسلسل مسکرا رہا تھا۔ اس کی خوشی اس کے چہرے سے عیاں تھی۔ جیسے لمبی ریاضتوں کے بعد اس کے دل کی مراد پوری ہوئی ہو۔ سچی مسکراہٹ اس کے چہرے پر رقصاں تھی۔

وہ میرے مقابل آکر بیٹھ گیا۔ اس نے اپنے ہاتھوں سے میرے کام والے دوپٹے کو میرے چہرے سے ہٹایا تو شرم سے میں نے نظریں جھکالیں۔ اس کی مسکراہٹ اور گہری ہوئی۔ اب تو شرارت بھی اس کے چہرے سے ٹپک رہی تھی۔ اس نے اپنی انگلیوں کی پوروں سے میری ٹھوڑی سے میرے چہرے کو اوپر کیا۔ اور غور سے دیکھنے لگا پھر اپنی جیب سے ایک مخملی ڈبیہ نکالی۔ جگمگاتی انگوٹھی نکال کر میرے ہاتھ کی انگلی میں پہنانے لگا تو مجھے اچانک زویا کا خیال آگیا۔

"زویا کیوں چلی گئی؟"

"میں کہاں چاہتا تھا کہ وہ جائے مگر کیا کرتا اسے کوئی آدھا انگریز پسند آگیا تھا۔ مجھے چھوڑ کر وہ ہمیشہ کے لیے چلی گئی۔ بے چارہ میں یہاں پھنس گیا۔" آخری الفاظ پر حمزہ کی ہنسی چھوٹ گئی تو میں سر سے پاؤں تک جل گئی اور اس کے ہاتھ سے اپنا ہاتھ چھڑا کر کھڑکی کے پاس کھڑی ہوگئی۔ حمزہ گرتے ہوئے انداز میں بیڈ پر پیچھے کو ہٹ گیا۔ پھر کچھ لمحوں بعد اٹھ کر میرے قریب آگیا۔ میرے چہرے کے بدلتے تاثرات کو دیکھنے لگا۔ پھر ایک ہاتھ سے میرے چہرے کو اپنے مقابل کرتے ہوئے مجھ سے گویا ہوا۔

"میں یہ نہیں چاہتا تھا کہ میری شرٹ کے بٹن ٹانکنے کا حق میں تمہارے علاوہ کسی اور کو دوں، کسی اور کے قریب آنے سے مجھے وحشت سی ہوتی ہے۔ شاید میں کسی اور کے بارے میں سوچنا ہی نہیں چاہتا تھا۔" اس کی مدھم ہوتی آواز سے مدہوشی جیسے سُر بکھر رہے تھے۔ اور میرے اردگرد کی دنیا گلابی ہوتی جا رہی تھی۔

دلِ آباد کا برباد ہونا بھی ضروری ہے
جسے پانا ضروری ہے، اسے کھونا ضروری ہے

مکمل کس طرح ہوگا تماشا برق و باراں کا
ترا ہنسنا ضروری ہے، مرا رونا ضروری ہے

بہت سی سرخ آنکھیں شہر میں اچھی نہیں لگتیں
ترے جاگے ہوؤں کا دیر تک سونا ضروری ہے

کسی کی یاد سے اس عمر میں دل کی ملاقاتیں
ٹھٹھرتی شام میں ایک دھوپ کا کونا ضروری ہے

یہ خود سر وقت لے جائے کہانی کو کہاں جانے
مصنف کا کسی کردار میں ہونا ضروری ہے

جنابِ دل بہت نازاں نہ ہوں داغِ محبت پر
یہ دنیا ہے یہاں یہ داغ بھی دھونا ضروری ہے

شعیب بن عزیز

خوش ہوں کہ میرا حسنِ طلب کام تو آیا
خالی ہی سہی میری طرف جام تو آیا

کافی ہے میرے دل کی تسلی کو یہی بات
آپ آ نہ سکے آپ کا پیغام تو آیا

اپنوں نے نظر پھیری تو دل نے دیا ساتھ
دنیا میں کوئی دوست مرے کام تو آیا

وہ صبح کا احساس ہو یا میری کشش ہو
ڈوبا ہوا خورشید سرِ بام تو آیا

لوگ ان سے کہتے ہیں کہ کتنے ہیں شکیل آپ
اس حسن کے صدقے میں میرا نام تو آیا

شکیل بدایونی

دل پہ جو بوجھ ہے اس بار کہاں تھا پہلے
تیرے جیسا کوئی غم خوار کہاں تھا پہلے

اپنے لاچار مسیحا تو نہیں ہوتے تھے
اتنا مایوس یہ بیمار کہاں تھا پہلے

عمر گزری تو تعارف کی شروعات ہوئی
یہ بتا اے میرے دلدار کہاں تھا پہلے

اس سے پہلے بھی سنایا ہے تجھے حال اپنا
تُو سماعت کا روادار کہاں تھا پہلے

یہ تو کچھ تازہ جدائی کا اثر لگتا ہے
ورنہ تُو اتنا ملنسار کہاں تھا پہلے

اعتبار ساجد

دُعائے نُور پہ محفل کا اختتام ہوا
اُس ایک شخص پہ سارا سخن تمام ہوا

حصار کھینچتے رہنے سے، اسم پڑھنے سے
چراغِ فجر مرے ساتھ ہمکلام ہوا

ہماری چھت پہ پرندوں نے رات گریہ کیا
وہ رات جس میں چراغوں کا قتل عام ہوا

ہمارا قتل شہادت کے باب میں لکھنا
ہمارے بعد محبت کا احترام ہوا

بنامِ عشق سرِ دشتِ رائیگاں میثم
ہماری خاک اُڑانے کا اہتمام ہوا

میثم علی آغا

سرجیکل اسٹرائیک

جج : قتل کس نے کیا؟
ملزم : میں نے قتل کیا۔
جج : لاش کہاں ہے؟
ملزم : لاش میں نے جلادی۔
جج : وہ جگہ دکھاؤ جہاں لاش جلائی تھی؟
ملزم : میں نے وہ ساری زمین کھود دی۔
جج : تو کھودی ہوئی مٹی کدھر ہے؟
ملزم : اس کی میں نے اینٹ بنادی۔
جج : تو وہ اینٹ دکھاؤ؟
ملزم : میں نے ان سے مکان بنالیا۔
جج : وہ مکان کدھر ہے؟
ملزم : زلزلے میں گر گیا۔
جج : تو ملبہ کدھر ہے؟
ملزم : وہ میں نے بیچ دیا۔
جج : کس کو بیچا؟
ملزم : پڑوسی کو۔
جج : پڑوسی کو بلاؤ؟
ملزم : وہ مار اگیا۔
جج : کس نے مارا؟
ملزم : میں نے مارا۔
جج : تو لاش کدھر ہے؟
ملزم : لاش میں نے جلادی۔
جج : ابے الو کے پٹھے! تو نے قتل کیا ہے یا سرجیکل اسٹرائیک؟ قتل کو قبول بھی کیے جارہا ہے اور کوئی ثبوت بھی نہیں دے رہا۔

حرا کاشف۔ڈی آئی خان

لیش انت روبا کستان

لیش انت روبا کستان
(تم کیوں پاکستان گئے)

کویت میں بسلسلہ روزگار انڈر کنسٹرکشن بلڈنگ میں تین انڈین اور ایک پاکستانی خان صاحب کام کر رہے تھے۔ اب انہوں نے یہ سوچ کر کہ ہمیں اس اکیلے پاکستانی آدمی پر برتری حاصل ہے کیوں کہ ہم تعداد میں تین ہیں اور یہ ایک ہے۔ تو بس! انہوں نے خان صاحب سے مذاق کرنا شروع کردیا کہ ہم پاکستان کو یہ کردیں گے ہم پاکستان کو وہ کردیں گے۔ ہم پاکستان کو سبق سکھادیں گے۔ ہم پاکستان کے اندر گھس کر پاکستانیوں کو ماریں گے۔

خان صاحب پہلے تو چپ چاپ سنتے رہے یہاں تک کہ ان کا ضبط جواب دے گیا۔ تو انہوں نے ہاتھ میں پکڑے بیلچے سے زمین پر ایک لکیر کھینچی اور حب الوطنی سے بھرپور لہجے میں فرمایا۔

"خو چہ پاکستان اور انڈیا کی سرحد تو دور ہے ہم یہ سمجھ لو اس لکیر کے میری طرف پاکستان ہے اور تمہاری طرف انڈیا ہے اب اگر تم تینوں مرد کا بچہ ہے تو پاکستان کے طرف کی لکیر پار کرکے دکھاؤ۔" بس اتنا کہنا ان کی مردانگی کو للکارنا تھا اور یہ ان ہندوستانیوں کی عزت نفس کا مسئلہ بن گیا۔ ان تینوں نے پاکستان کے بارڈر پر بھرپور حملہ کرکے بارڈر کراس کرنے کی کوشش کی۔ لیکن پاکستانی سرحد کی حفاظت پر مامور محافظ نے بیلچے سے مار مار کران کا براحال کردیا۔

کافی دیر مرمت کروانے کے بعد بھی جب وہ بارڈر کراس نہ کرسکے۔ تو خان صاحب نے فرمایا۔

"مڑا! تم ایک لکیر تو پار نہ کر سکے پاکستان کی حدود کیسے پار کرو گے۔ جہاں ہمارے جیسے لاکھوں جوان بیٹھے ہیں۔ اب دوبارہ بھی بھول کر بھی کسی کے سامنے یہ بات نہ کہنا کہ ہم پاکستان کے اندر گھس کر مارے گا۔"

یہ الفاظ کہہ کر خان صاحب اپنا سامان سمیٹ کر گھر کو روانہ ہو گئے۔ اور وہ ہندوستانی ہسپتال سے علاج کے بعد زخموں کی رپورٹ لے کر انہوں نے سوچا کہ اب کیا کیا جائے تو ان میں سے ایک نے مشورہ دیا کہ اقوام متحدہ میں یہ معاملہ پیش کیا جائے یعنی کہ پولیس اسٹیشن میں تو جناب تین عدد زخمی پولیس اسٹیشن میں شکایت لے کر حاضر ہوئے کہ ان کو ایک پاکستانی نے تشدد کا نشانہ بنایا ہے۔ اس کا نوٹس لیا جائے اور ہمیں انصاف دلایا جائے۔

پولیس اسٹیشن سے بلڈنگ کے مالک کو فون کیا گیا اور پوچھا گیا کہ آپ کے پاس کوئی خان صاحب کام کرتے ہیں ان کا فون نمبر چاہیے۔ پھر کال کر کے خان صاحب کو پولیس اسٹیشن بلایا گیا اور دوران تفتیش خان صاحب سے پوچھا گیا کہ آپ نے ان کو کیوں مارا تو خان صاحب نے پورا قصہ تھانیدار کے گوش گزار کیا۔

قصہ سنتے ہی پولیس اسٹیشن میں سب کے سب پیٹ پکڑ کر ہنسنے میں مصروف تھے۔ کوئی زمین پر گرا ہنس رہا ہے تو کوئی ہنسی کنٹرول کرنے کے چکر میں کھانسی سے دوچار ہے اور ہنستے ہنستے ان کے منہ سے کچھ الفاظ نکلتے تو وہ یہی ہوتے کہ.....

"لیشں انت روباکستان" (تم پاکستان کیوں گئے؟)

اس سارے واقعے کا مطلب صرف انڈیا میں پاکستان مخالف عناصر کو اتنا بتانا ہے کہ یہ نہ ہو کہ کل کو پوری دنیا یہ کہے کہ "لیشں انت روباکستان۔"

عروبہ خان۔ کراچی

نتیجہ

ایک دن ایک لڑکا ایئرپورٹ پر سگریٹ پی رہا تھا۔

لڑکی "ایک دن میں کتنے سگریٹ پیتے ہو؟"

لڑکا "کیوں؟"

لڑکی "اگر اب تک زندگی میں سگریٹ پر خرچ کیے ہوئے پیسے بچا لیتے تو سامنے کھڑی BMW گاڑی تمہاری ہوتی۔"

لڑکا "آپ سگریٹ پیتی ہیں؟"

لڑکی "نہیں۔"

لڑکا "تو کیا وہ گاڑی آپ کی ہے؟"

لڑکی "نہیں۔"

لڑکا "مشورہ دینے کا شکریہ۔ میں سگریٹ بھی پیتا ہوں اور وہ گاڑی بھی میری ہے۔"

نتیجہ! زیادہ لیکچر دینے سے بے عزتی ہو جاتی ہے حالاں کہ لڑکا بعد میں چنگ چی پر گیا تھا۔

زینب خان۔ کراچی

مینیو

ایک آدمی کی شادی موبائل کمپنی میں کام کرنے والی لڑکی سے ہو گئی۔ شوہر گھونگھٹ اٹھانے لگا تو بیوی بولی۔

"برائے مہربانی اس مینیو سے انتخاب کریں۔"

"گھونگھٹ اٹھانے کے لیے ایک دبائیں۔ باتیں کرنے کے لیے دو دبائیں۔ منہ دکھائی کے لیے تین دبائیں۔ انگوٹھی پہنانے کے لیے چار دبائیں۔"

شوہر غصے سے۔ "اب یہ بھی بتا دو طلاق دینے کے لیے کیا دباؤں؟"

بیوی بولی۔ "آپ کا موجودہ بیلنس اس کام کے لیے ناکافی ہے۔ برائے مہربانی! پہلے حق مہر کے پیسے جمع کرائیں اور مزید معلومات کے لیے میری امی سے رابطہ کریں۔"

"مجھ سے شادی کرنے کا شکریہ۔"

مریہ عمران۔ لاہور

زمین

ٹیچر۔ "بتاؤ سندھ کی زمین اچھی ہے یا پنجاب کی؟"

پپو۔ "مس! کراچی کی۔"

ٹیچر۔ "بیوقوف! پنجاب کی! جہاں سے ہم سبزی

پھل حاصل کرتے ہیں۔"

پپو۔ "مس! اگر انڈیا سے جنگ ہوئی تو ہم کیا سبزی پھل سے حملہ کریں گے۔ یہاں کراچی میں جہاں کھدائی کریں اسلحہ نکلتا ہے۔"

ماہ نور۔ عثمان کراچی

خطرناک سفر

بس خطرناک پہاڑی سڑک پر مشکل سے آگے بڑھ رہی تھی اور ڈرائیور پوری حاضر دماغی سے اسٹیئرنگ پر کنٹرول رکھنے کی کوشش کر رہا تھا ایسے میں اس کے پاس بیٹھا ہوا مسافر باتوں سے مسلسل اس کے کان کھا رہا تھا۔

"ایسے جان جوکھوں کے سفر میں 'میں بہت گھبراتا ہوں مجھے پچھلی دفعہ ایسے ہی ایک سفر کے دوران دل کا شدید دورہ پڑا تھا" مسافر نے پریشان ہو کر کہا۔

"کاش آپ اس دورے میں چل بسے ہوتے۔" ڈرائیور نے تنگ آ کر کہا۔

صائمہ الطاف احمد۔ کراچی

قابل دید

تھانے دار گشت پر روانہ ہونے کے لیے تھانے سے نکلا تو اس کے سامنے سے ایک ٹیکسی سست رفتاری سے گزر رہی تھی وہ تیزی سے آگے بڑھا اور اچھل کر اس کا دروازہ کھول کر بیٹھتے ہوئے ڈرائیور سے بولا۔

"یہ تمہارے آگے آگے گاڑی جا رہی ہے اس کا پیچھا کرو۔۔۔ یہ مجھے مشکوک لگتی ہے' مجھے ہر حال میں اس کا تعاقب کرنا ہے۔"

"صاحب جی!" ڈرائیور نے عاجزی سے کہا۔

"وہی گاڑی تو میری خراب ٹیکسی کو باندھ کر لے جا رہی ہے۔"

مسرت الطاف احمد۔ کراچی

بیچارہ رائٹر

خاوند (اخبار پڑھتے ہوئے بیوی سے) ایک رائٹر نے لکھا ہے کہ شوہروں کو گھر میں بولنے کا حق ملنا چاہیے۔۔۔ بیوی (تاسف سے) "چچ چچ! بیچارہ رائٹر! گھر میں کہہ نہ سکا اسی لیے اسے اخبار میں کالم لکھنا پڑا۔"

شازیہ گلزار بھٹی۔ بھکر

قسطیں

ایک عورت نے اپنے مایوس اور دل گرفتہ شوہر سے کہا۔

"آخر یہ کہنے سے تمہارا کیا مطلب ہے کہ کوئی چیز ایسی نہیں ہے جس کے لیے تم زندہ رہنے کی آرزو کرو۔ جب کہ ایسی ایک نہیں کئی چیزیں موجود ہیں۔ ابھی فلیٹ کی قسطیں ادا نہیں ہوئی ہیں۔ کار کی قسطیں ادا نہیں ہوئیں۔ ٹی وی کی قسطیں ادا نہیں ہوئی ہیں۔"

لیلیٰ انعم شیخ۔ گدو بیراج

شہد کی مکھی

ایک نہایت نازک اندام خاتون ایک باغ کی سیر کر رہی تھیں۔ اتفاق سے کسی درخت پر شہد کی مکھی کا چھتا بھی تھا۔ خاتون گھبرا کر باغ کے مالی کے پاس گئیں اور نہایت ناراض ہو کر بولیں۔

"کتنے احمق آدمی ہو تم۔ شہد کی مکھیاں پال رکھی ہیں۔ ایک مکھی نے مجھے ڈنک بھی مارا ہے۔"

"میں معافی چاہتا ہوں خاتون!" مالی نے نہایت معذرت خواہانہ انداز میں کہا۔ "آپ مجھے بتایئے کس مکھی نے یہ گستاخی کی ہے۔ میں اسے سزا دوں گا۔"

رخسار ظفر۔۔۔ لاہور

کھلتا کسی پہ کیوں مرے دل کا معاملہ

خالدہ جیلانی

اقصیٰ ناصر ——— کراچی

غرورِ تجمّل مگر زخم خوردہ
شکست محبت مگر فاتحانہ

آمنہ اُجالا ——— ڈہرکی

تم نے میرے ساتھ اُٹھائے ہیں دُکھ بہت
خوش ہوں کہ راہِ شوق میں تنہا نہیں ہوں میں

کبریٰ عباسی ——— ہری پور

یہ بات بتائی ہے مجھے بادِ صبا نے
کلیوں سے ملاقات کا چرچا نہیں کرتے

رافعہ بتول ——— گھوٹکی

یہ دل ہے مرا یا کسی کُٹیا کا دیا ہے
بجھتا ہے دمِ صبح تو جلتا ہے سرِ شام

مسرت اسلم ——— سیووالا

تمہاری طرح جینے کا ہُنر آتا، تو پھر شاید
مکان اپنا وہی رکھتے پتا تبدیل کر لیتے

ناظمہ زیدی ——— اعظم چوک

یہ وصال ہے کہ فراق ہے دلِ مبتلا کو پیار ہے
جو یہ پھول ہے تو کھلا رہے جو یہ زخم ہے تو ہرا رہے

زوباریہ خالد ——— لاہور

پیاس کہتی ہے کہ چل دریا اُٹھا لائیں یہیں
درد کہتا ہے کہ رُک پایاب ہونے دے مجھے

نجمہ، نادیہ ——— گلستانِ جوہر

اپنی آنکھوں کے سمندر میں اُتر جانے دے
تیرا مجرم ہوں مجھے ڈوب کے مر جانے دے
زخم کتنے تیری چاہت سے ملے ہیں مجھ کو
سوچتا ہوں کہ کہوں تجھ سے، مگر جانے دے

سیدہ نسبت زہرا ——— کہروڑ پکا

یزداں نے مسکرا کر بڑی دیر میں لکھا
اک لفظ آرزو میرے دل کی کتاب میں

عائشہ ناظم ——— لودھراں

تجھے سوچوں تو محسوس ہوتا ہے
زندگی کتنی خوبصورت ہے

صدف عمران ——— کے ڈی اے سوسائٹی

اپنے خلاف فیصلہ خود ہی لکھا ہے آپ نے
ہاتھ بھی مل رہے ہیں آپ، آپ بہت عجیب ہیں
دائرہ وار ہی تو ہیں عشق کے سلسلے تمام
راہ بدل رہے ہیں آپ، آپ بہت عجیب ہیں

لاریب، ماہ زیب ——— چونیاں

مجھے لگتا ہے باقی اِک اِک شے ہے بے گانی
بس اک تنہائی ذاتی ہے میرے ویران کمرے میں
بھلے کتنی ہی خاموشی ہو لیکن غم کی سرگوشی
ہمیشہ گونج جاتی ہے میرے ویران کمرے میں

ثمرہ، اقرا ——— کراچی

جو حرفِ حق تھا وہی جا بجا کہا سو کہا
بلا سے شہر میں میرا لہو بہا سو بہا
شکست و فتح میرا مسئلہ نہیں ہے فراز
میں زندگی سے نبرد آزما رہا سو رہا

ارم ذوالفقار ——— کراچی

ایک تو دل کے رستے دُشوار بہت تھے
پھر میں پیاسا اچھے سائیں دُھوپ بہت ہے
کون تھا جس سے دل کی حالت کہتا میں
کس سے کہتا، اچھے سائیں دُھوپ بہت ہے

ندا، فضہ ——— فیصل آباد

اپنے مسیحا سے اب کوئی امید نہ رکھ ساغر
وہ تنگ دل ہے اور تیرے زخم کی گہرائی بہت

شگفتہ حامد

حسن خیال یادوں کے جھروکے

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا،

حضرت انس جہنی رضی اللہ عنہ کے والد فرماتے ہیں کہ میں نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ ایک غزوہ میں گیا۔ وہاں لوگ اس طرح ٹھہرے کہ آنے جانے کے لیے راستے بند ہو گئے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے لوگوں میں اعلان کرنے کے لیے ایک آدمی بھیجا کہ

"جو اس طرح ٹھہرا کہ آنے جانے کا راستہ بند کر دیا، اسے جہاد کا ثواب نہیں۔"

(ابوداؤد)

کچھ موتی چنے ہیں،

- علم کے بغیر جو چیز لکھی جائے وہ بے علمی کا اشتہار ہوتا ہے۔ (مولانا وحیدالدین)
- اتنا پڑھو، اتنا پڑھو کہ ابلنے لگو۔ اس کے بعد لکھو۔ (مولانا سید سلیمان ندوی)
- عمر رسیدہ بیوی، بوڑھا کتا اور نقد رقم وفادار دوست ہوتے ہیں۔ (فرینکلن)
- جو کسی سے حسد کرتا ہے، وہ اپنی کمتری کا اعتراف کرتا ہے۔ (لاطینی کہاوت)

عائشہ جہانگیر مرالی۔ کبیر والا

پھول جیسے لفظ،

- کچھ تعلق انا سے ٹوٹ جاتے ہیں لیکن کچھ رشتوں کو قائم رکھنے کے لیے انا ضروری ہو جاتی ہے۔
- جب لوگوں کی نیت میں ایک دفعہ کھوٹ آجائے تو وہ ساری زندگی سفر میں رہتے ہیں۔ زندگی ان کے لیے دکھ درد والی مسافرت بن جاتی ہے۔
- ہمیشہ یاد رکھیں ان لوگوں کو جو آپ کی جیت کے راستے میں اپنا سب کچھ ہار دیتے ہیں۔
- زندگی ایک ایسی ٹرین ہے، جو ہمیشہ ایسے اسٹیشن پہ رکتی ہے جہاں آپ اترنا نہیں چاہتے۔
- ہمارے ہاں ایک عام آدمی کا بچپن پیار لینے، بڑھاپا پیار دینے اور جوانی پیار کرنے کی کوششوں میں گزر جاتی ہے۔
- دوستوں کو معاف کرنا انتہائی مشکل ہے بہ نسبت دشمنوں کے۔

فوزیہ ثمر بٹ۔ گجرات

ایک حکایت ایک سبق،

عرب کے معروف شاعر فرزدق کہتے ہیں کہ میں ساٹھ ہجری میں اپنی والدہ کے ہمراہ مکہ مکرمہ آیا۔ جب میں حرم کی حدود میں داخل ہوا اور مقام صفاح تک پہنچا تو دیکھا کہ وہاں بہت سے اونٹ ہنکائے جا رہے تھے۔ میں نے لوگوں سے پوچھا۔

"یہ اونٹ کس کے ہیں؟"

لوگوں نے بتایا۔ "یہ اونٹ امام حسین رضی اللہ عنہ کے ہیں۔"

فرزدق کہتے ہیں کہ اسی اثنا میں میری نگاہ امام حسین رضی اللہ عنہ پر پڑی۔ میں نے ان کی خدمت میں حاضر ہو کر سلام پیش کیا اور عرض کیا۔

"اے نواسۂ رسول صلی اللہ علیہ وسلم! اللہ آپ کی مرادیں پوری فرمائے اور میرے ماں باپ آپ پر قربان ہوں۔ آپ حج کی ادائیگی کے بغیر مکے سے کیونکر روانہ ہو رہے ہیں؟"

امام حسین رضی اللہ عنہ نے میرے سوال کا جواب دینے کے بجائے مجھ سے پوچھا۔

"تم کون ہو؟"

میں نے بتایا۔ "میں آل رسول صلی اللہ علیہ وسلم کا غلام ہوں۔"

میری بات سن کر امام حسین رضی اللہ عنہ نے پوچھا۔

"تم عراقیوں کی بابت کیا جانتے ہو؟"

میں نے عرض کیا۔ "میں عراقیوں کو خوب جانتا ہوں۔ ان کے دل آپ کے ساتھ ہیں اور ان کی تلواریں ابن زیاد کے ساتھ ہیں۔"

میری یہ بات سن کر امام عالی مقام نے فرمایا۔ "تم ٹھیک کہتے ہو، اب معاملہ اللہ ہی کے ہاتھ میں ہے۔ وہ جو چاہتا ہے وہی ہوتا ہے۔"

یہ کہہ کر آپ نے اپنی سواری آگے بڑھادی۔

(تاریخ طبری)

جھوٹا انسان،

وہ انسان جھوٹا ہے جو حق گوئی کے موقع پر خاموش رہے یا ایسی بات کہے جس سے ابہام پیدا ہو۔

(واصف علی واصف)

نادیہ، نجمہ۔ گلستان جوہر

اقوال زریں،

- حقیقت یہ ہے کہ بدنظری ہی بدکاری کے راستے کی پہلی سیڑھی ہے۔
- اس زمین پر بہت زیادہ لوگ اور بہت کم انسان بستے ہیں۔
- علم یہ ہے کہ آپ کو معلوم ہو کہ "کیا" کہنا ہے اور حکمت یہ ہے کہ آپ کو معلوم ہو کہ "کب" کہنا ہے۔
- تیری داڑھی تیرے بعد پیدا ہوئی مگر سفید ہو گئی لیکن تو ابھی تک ویسے کا ویسا کالا ہے۔
- دنیا کی ساری دلیلیں، جواز اور وکالتیں تو ہم اپنی ذات کے لیے رکھتے ہیں مگر ساری سزائیں دوسروں کے لیے منتخب کرتے ہیں۔

شبنم شمشاد۔ یزمان

بیمار دلوں کا علاج،

عبداللہ انطاکی نے فرمایا۔ "پانچ چیزیں ایسی ہیں جو دل کی تمام بیماریوں کے لیے اکسیر کا درجہ رکھتی ہیں۔

- نیک لوگوں کی ہم نشینی۔
- قرآن کا پڑھنا۔
- پیٹ کا خالی رکھنا۔
- نماز تہجد کی ادائیگی۔
- نالۂ سحرگاہی۔

حنا حلیم اعوان۔ آخن پانڈی

ہیرا اور کوئلہ،

ایک دفعہ کوئلے نے ہیرے کو مخاطب کر کے کہا۔

"ہم دونوں ایک جیسی کان میں سے نکلتے ہیں لیکن میں نہ صرف سیاہ رنگ کا ہوں اور تو سفید بلکہ لوگ مجھے دیکھتے ہی سیدھا انگیٹھی میں ڈال کر جلا دیتے ہیں اور تیری رسائی بادشاہوں کے تاج تک ہو جاتی ہے کیا تو بتا سکتا ہے کہ لوگ مجھے میری بدصورتی کی وجہ سے ناپسند قرار دیتے ہیں اور کیا تو اپنی خوشنمائی کی بنا پر لوگوں کے دلوں میں جگہ پاتا ہے؟"

ہیرے نے بڑے غرور سے کوئلہ کی بات سنی اور بڑے وثوق کے ساتھ کہا۔

"اے نادان! میری عزت و احترام کا راز میری قوت سختی اور پختگی میں ہے جبکہ تو کچا ہے۔ ذرا سی چوٹ سے ٹوٹ جاتا ہے اس لیے وہ تجھے کم تر اور کمزور سمجھ کر ذلیل کرتے ہیں اور تجھے جلا دیتے ہیں جبکہ میں مضبوط ہوں اور لوگوں سے آسانی ٹوٹ نہیں سکتا اس لیے لوگ میری عزت کرتے ہیں لہٰذا مضبوطی زندگی کی آبرو ہے لہٰذا اگر تو عزت چاہتا ہے تو خود میں پختگی پیدا کر۔"

مسرت الطاف احمد۔ کراچی

حضرات حسنینؓ کی مثالی سخاوت،

حضرت امام غزالیؒ نے "احیاء العلوم" میں حضرات حسنینؓ کی سخاوت کا عجیب واقعہ ذکر کیا ہے۔

ابوالحسن مدائنیؒ کہتے ہیں کہ حضرت امام حسنؓ اور حضرت امام حسینؓ اور حضرت عبداللہ بن جعفرؓ حج کے لیے تشریف لے جا رہے تھے۔ راستے میں ان کے

سامان کے اونٹ ان سے جُدا ہو گئے۔ یہ بھوکے پیاسے چل رہے تھے۔ ایک خیمے پران کا گزر ہوا جس میں ایک بوڑھی عورت تھی۔ ان حضرات نے ان سے پوچھا۔

"ہمارے پینے کو کوئی چیز (پانی یا دودھ لسی وغیرہ) تمہارے پاس موجود ہے؟"

اس نے کہا: "ہے۔"

یہ لوگ اپنی اونٹنیوں پر سے اُترے۔ اس بڑھیا کے پاس ایک معمولی سی بکری تھی، اس کی طرف اشارہ کرکے کہا: "اس کا دودھ نکال لو اور اس کو تھوڑا تھوڑا پی لو۔"

ان حضرات نے اس کا دودھ نکالا اور پی لیا۔

پھر انہوں نے پوچھا۔

"کوئی کھانے کی چیز ہے؟"

اس بڑھیا نے کہا: "یہی بکری ہے، اس کو تم میں سے کوئی ذبح کرے تو میں پکا دوں گی۔"

انہوں نے اس کو ذبح کیا اور بڑھیا نے پکایا۔

یہ حضرات جب کھا پی کر شام کو چلنے لگے تو انہوں نے اس بڑھیا سے کہا۔

"ہم ہاشمی لوگ ہیں، اس وقت حج کے ارادے سے جا رہے ہیں۔ اگر ہم زندہ سلامت ——— مدینہ واپس گئے تو ہمارے پاس آنا، تیرے احسان کا بدلہ دیں گے۔"

یہ حضرات تو فرما کر چلے گئے، شام کو جب اس کا خاوند (کہیں جنگل وغیرہ سے) آیا تو اس بڑھیا نے ہاشمی لوگوں کا قصہ سنایا۔ وہ بہت خفا ہوا کہ تونے اجنبی لوگوں کے واسطے بکری ذبح کر ڈالی۔ معلوم نہیں وہ کون تھے، کون نہیں تھے۔" غرض وہ خفا ہو کر چپ

ہو گیا۔ کچھ زمانے کے بعد جب ان دونوں میاں بیوی کو غربت نے بہت ستایا تو یہ محنت مزدوری کی نیت سے مدینہ منورہ گئے۔ دن بھر مینگنیاں اکٹھی کرتے اور ان کو بیچ کر گزر کیا کرتے۔

ایک دن وہ بڑھیا مینگنیاں اکٹھی کر رہی تھی۔ حضرت حسنؓ اپنے دروازے کے آگے تشریف رکھتے

تھے۔ جب یہ وہاں سے گزری تو اس کو دیکھ کر حضرت حسنؓ نے اسے پہچان لیا۔ آپؓ نے فرمایا۔

"میں تیرا وہی مہمان ہوں دودھ اور بکری والا۔"

بڑھیا نے پھر بھی نہ پہچانا اور کہا۔

"کیا خدا کی قسم تم وہی ہو؟"

حضرت حسنؓ نے فرمایا: "ہاں میں وہی ہوں۔"

اور یہ فرما کر آپؓ نے اپنے غلاموں کو حکم دیا کہ اس کے لیے ایک ہزار بکریاں خریدی جائیں۔ چنانچہ بکریاں خریدی گئیں اور ان بکریوں کے علاوہ ایک ہزار دینار (اشرفیاں) نقد بھی عطا فرمائے اور اپنے غلام کے ساتھ اس بڑھیا کو اپنے چھوٹے بھائی حضرت حسینؓ کے پاس بھیج دیا۔

حضرت حسینؓ نے دریافت فرمایا "بھائی نے کیا بدلہ عطا فرمایا؟"

بڑھیا نے کہا: "ایک ہزار بکریاں اور ایک ہزار دینار۔"

یہ سن کر اتنی ہی مقدار دونوں چیزوں کی حضرت حسینؓ نے عطا فرمائی۔

اس کے بعد حضرت عبداللہ بن جعفرؓ کے پاس بھیج دیا گیا۔ انہوں نے تحقیق فرمائی

"ان دونوں نے کیا کیا مرحمت فرمایا؟"

اور جب معلوم ہوا کہ یہ مقدار ہے تو انہوں نے دو ہزار بکریاں اور دو ہزار دینار عطا فرمائے اور یہ فرمایا۔

"اگر تو پہلے مجھ سے مل لیتی تو میں اس سے بہت زیادہ دیتا۔"

یہ بڑھیا چار ہزار بکریاں اور چار ہزار دینار (اشرفیاں) لے کر خاوند کے پاس پہنچی اور کہا۔

"یہ اس ضعیف اور کمزور بکری کا بدلہ ہے۔"

(فضائل صدقات)

آپ کے خطوط اور ان کے جوابات لیے حاضر ہیں
آپ کی سلامتی، عافیت اور خوشیوں کے لیے دعا ہیں
اللہ تعالیٰ آپ کو، ہم کو اور ہمارے پیارے وطن کو اپنے حفظ و امان میں رکھے۔ آمین

پہلا خط شہداد پور سے آمنہ حسین کا ہے، لکھتی ہیں

شعاع اکتوبر کا شمارہ مجھے لاہور اسٹیشن سے ملا۔ شادی پر گئی ہوئی تھی۔ سوچا واپسی میں پتا نہیں کب ملے۔ ٹائٹل بہت پیارا تھا۔ "پیال ساز" کا شدت سے انتظار تھا جسے میں نے ٹرین میں بیٹھتے ہی پڑھنا شروع کر دیا۔ سائرہ رضا کوئی ناول لکھیں اور ہمیں پسند نہ آئے نا ممکن ہے۔ افسانے سب ہی زبردست تھے "رشتے ناتے" قانتہ رابعہ کا اس دفعہ بازی لے گیا۔ پنجاب سے واپسی پر پتا چلا کہ میرے کزن جو میرے منگیتر بھی ہیں۔ ابوظہبی میں جاب کی وجہ سے جا رہے ہیں۔ مجھے خوشی بھی ہے اور تھوڑی پریشان بھی.... خوشی اس بات کی کہ فیوچر اچھا ہو گا اور پریشانی یہ ہے کہ اتنی دور پہلی دفعہ گئے ہیں۔ میں 6 اکتوبر کی رات 11 بجے ایئرپورٹ کے لیے نکلی اور صبح 7 بجے فلائٹ تھی۔ بس میں بہت روئی اللہ تعالیٰ حمید خان (منگیتر) کو کامیابی عطا فرمائے اور 10 اکتوبر کی رات عمر سعید کی وفات کی خبر ملی۔ مجھے یقین ہی نہیں آیا۔ آپ میرے کزن کے لیے دعا کریں کہ وہ بھی وہاں سیٹ ہو جائیں۔

ج۔ پیاری آمنہ! اتنا چھوٹا سا دل ہے آپ کا۔ مانا کہ محبتوں میں دلوں کو دھڑکا سا لگا رہتا ہے لیکن اب دبئی اتنا بھی دور نہیں ہے کہ آپ جانہ سکیں اور وہ آنہ سکیں اور اب تو رابطوں کے ذرائع اتنی ترقی کر گئے ہیں کہ جب چاہیں روبرو بیٹھ کر بات کر لیں۔ فی الحال اپنی توجہ ڈاکٹر بننے پر لگائیں۔ ان شاء اللہ وہ جاب پر سیٹ ہو جائیں گے اور پھر آپ کو بھی اپنی دلہن بنا کر دبئی لے جائیں گے۔
شعاع کی پسندیدگی کے لیے شکریہ۔ ایمل رضا، قانتہ رابعہ اور دیگر مصنفین تک آپ کی تعریف ان سطور کے ذریعے پہنچائی جا رہی ہے۔

ریحانہ چوہدری نے مدوکے رندھیر سے شرکت کی ہے، لکھتی ہیں

میں اگست کے شمارے میں اپنا اپریل کا بھیجا ہوا شعر موجود پا کر جہاں حیران ہوئی وہاں بہت خوش بھی۔ خوشی

دوشیزہ جمیل

خط آپ کے

خط بھجوانے کے لیے پتا
ماہنامہ شعاع - 37 - اُردو بازار، کراچی۔
Email: shuaa@khawateendigest.com

اپنے گاؤں کا نام دیکھ کر ہوئی۔ جوش میں آکر فوراً" ہی خط لکھ دیا۔ مگر ستمبر کے شمارے میں خط شامل نہ تھا۔
ایک دفعہ پھر سے تیاری شروع کر لی۔ آپ کی محفل میں قدم رکھنے کی جگہ ملے نہ ملے کوئی شکوہ نہیں۔ ماڈل واقعی ماڈل لگ رہی ہے۔ روایتی دلہن نہیں۔ پہلی شعاع میں چیف ایڈیٹر اور بانی محمود ریاض صاحب کی اہلیہ کے انتقال کی خبر پڑھ کر دل دکھا۔ اللہ تعالیٰ انہیں جنت الفردوس میں جگہ عطا فرمائے۔ حمد و نعت کا تو کیا لکھوں۔ پیارے نبی کی پیاری باتیں ایک ایسا سلسلہ ہے جو قلب و نظر کی تطہیر کا سامان بنتا ہے۔ بھئی کوثر خالد جڑانوالہ بہت خوب۔ یک نہ شد دو شد۔ میری بیٹی مہ نور تو ویسے ہی آپ کی فین ہو چکی ہے۔ اب نسرین علیم جڑانوالہ کے "جب تجھ سے ناتا جوڑا ہے" یہ تصویر دیکھ کر اس نے فوراً" پہچان لیا کہ چشمے والی محترمہ آپ ہیں۔ "خط آپ کے" سلسلہ ڈائجسٹ کی جان ہے۔
بھئی یہ طیبہ نذیر ساہیوال کہاں غائب ہیں۔ دراصل

میں اپنے میکے کی نگری کا نام دیکھ کر بہت خوش ہوتی ہوں بات ہو جائے۔ عفت سحر طاہر کے "خواب شیشے کا" کی جناب۔

خواب تو کانچ سے بھی نازک ہیں
ٹوٹنے سے انہیں بچانا ہے

صباحت یاسمین کا ایک چپ سو سکھ میں عائشہ ایک استعارے کی مانند تھی، اس کا کردار بہت کچھ یاد دلا گیا۔

بہت سی ایسی باتیں جو بھولے سے بھی یاد کرنے کو دل نہیں کرتا مگر یہ معاشرے کا مثبت رُخ دکھاتا کردار ہمیں ہمیشہ اپنے اردگرد موجودگی کا احساس دلاتا رہتا ہے۔

ایمل رضا کا پیال ساز جب بھی پڑھا ایک ماہر نفسیات کی طرح اس نے ہپناٹائز کر لیا۔ اسے پڑھتے ہوئے تو سانسیں بھی رکتی ہوئی محسوس ہوتی ہیں۔ آنسو کب بہنا شروع ہوتے ہیں۔ پتا ہی نہیں چلتا، میں تو یہ سمجھتی ہوں کہ زبان پہ تھوڑا سا کنٹرول رکھ لیا جاتا تو اتنے المیے ظہور پذیر نہ ہوتے بہرصورت ایمل رضا اتنا اچھا ناول لکھنے پر مبارک باد کی مستحق ضرور ہیں۔ یہ ناول انہیں ہمیشہ لکھاری بہنوں کی فہرست میں ممتاز رکھے گا۔

ام سعدی نے ابامیاں اور زرمینے گل میں صباحت جی کی طرح بہت سے آئینے دکھا کر ہمیں ان کے روبرو کر دیا ہے۔ اتنی ٹھوس حقیقت کو اتنے سہل انداز میں صفحہ قرطاس پر بکھیرنے کی بہت بہت مبارک ہو۔

فرزانہ کھرل کے مکمل ناول "چھپا کے چھپئی" کی بات کریں تو کیا بات کریں، یوں لگتا ہے دھنک کے سارے رنگ اس ایک ناول میں فرزانہ کھرل نے جمع کر لیے ہوں۔ فرزانہ ناول لکھیں یا افسانہ دونوں لاجواب ہیں۔

میرا بہت دل چاہتا ہے کہ میں کسی رسالے کا کوئی دفتر دیکھوں، جہاں ہزاروں کہانیاں بکھری ہوں۔ خطوط کا ایک ڈھیر توجہ کا طالب ہو۔ ردی کی ٹوکری بلکہ ٹوکرا منہ کھولے پڑا ہو۔ اور آپ لوگ سر پکڑے بیٹھے ہوں کہ الفاظ کے خزانوں میں سے کس گوہر کو نکالیں کس کو چھوڑیں۔

سمیرا حمید کیوں غائب ہیں۔ ہم ان کے انتظار میں چشم براہ ہیں۔

ج : پیاری ریحانہ! ہمیں احساس ہے کہ دور افتادہ گاؤں میں رہنے والی قارئین کو پرچا بہت تاخیر سے ملتا ہے۔ پرچا پڑھ کر اپنی رائے کا اظہار کرنا اور پھر خط پوسٹ کرنا کافی وقت طلب کام ہے۔

آپ کے خط شامل نہ ہو سکے۔ اس کا ہمیں دلی افسوس ہے۔ خاص طور پر اس لیے بھی کہ آپ واقعی بہت اچھا خط لکھتی ہیں۔ شعاع کی پسندیدگی کے لیے تہہ دل سے شکریہ۔

خواب زادی + زمین زادی لکھتی ہیں

شعاع پہلی بار کب ہاتھ میں آیا ہم اچھی طرح یاد نہیں شاید تب جب لفظوں سے آشنا ہوئے، عرصے بعد روانی سے اردو پڑھنا سیکھا تو شعاع کو اپنی سہیلی بنا لیا۔ ایک دفعہ مس ساجدہ نے کہا۔ عائشہ کی فطرت لڑاکا ہے مگر اس کے شعاع نے اس کو تبدیل کر دیا ہے۔

پہلے "قراقرم کا تاج محل" پھر "دل کے رستے دشوار بہت تھے" اور اب تین سال پہلے والی جنت کے پتے بہت زبردست کہانیاں تھیں اب اس کے علاوہ "پیال ساز" کے لیے ایمل رضا کا بہت بہت شکریہ۔

پلیز پرانی رائٹر کو واپس لے آئیں، وہ شعاع کے ایسے چمکتے ستارے ہیں جس سے شعاع کی روشنی تھوڑی کم سی ہو گئی ہے اور ان رائٹرز سے گزارش ہے کہ اپنے محسن کو بھولنا اچھی بات نہیں مطلب شعاع۔

زمین زادی! خط شائع کرانے کے لیے ضروری ہے کہ خط میں شمارے پر جامع اور مختصر تبصرہ ہو۔ کوئی جواب طلب بات ہو۔ بہت سی قارئین اس بات کا خیال نہیں رکھتیں اس لیے ان کے خط شائع نہیں ہوتے۔

دوسرے خطوط کا یہ سلسلہ ادارے اور قارئین کے درمیان رابطے کا ہے۔ برائے مہربانی اسے دوستوں کو سلام، نیک تمناؤں یا رشتہ داروں سے محبت جتانے کا سلسلہ ہرگز نہ سمجھا جائے۔ امید ہے آئندہ اپنے اس نام کے ساتھ "جو آپ کے والدین نے بڑے پیار سے آپ کا رکھا ہو گا۔" شامل بزم ہوں گی۔ پرانی مصنفین تک آپ کا پیغام پہنچا رہے ہیں۔

سحرش مصطفیٰ نے میانوالی سے لکھا ہے

شعاع اور خواتین میرے پسندیدہ ڈائجسٹ ہیں اس خط سے پہلے تقریباً میں چار خطوط بھیج چکی ہوں اور دو افسانے بھی مگر شائع نہیں ہوئے بہت دکھ ہوا اور سوچا اب نہیں لکھوں گی مگر پھر شعاع نے لکھنے پہ مجبور کر دیا۔ ڈائجسٹ میری فرصت کے اوقات میں میرے ساتھی ہوتے ہیں اور

بہت اچھا ساتھ نبھاتے ہیں۔
مجھے شکوہ نہیں ہے۔ بس کچھ خواتین اور شعاع سے پیار ہی کچھ ایسا ہے کہ غصے میں بھی پیار جھلکتا ہے۔

ج : پیاری سحرش! ایک بات آپ کو سچ بتائیں۔ سچ سے شکایتی خط پڑھ پڑھ کر چکر آ رہے ہیں۔ یقین کریں جب ہم آپ کی تحریریں شامل نہیں کر پاتے تو خود بھی بہت دکھی ہوتے ہیں۔ سحرش آپ نے بہت اداس کر دینے والی کہانیاں لکھی ہیں کسی ہلکے پھلکے موضوع پر قلم اٹھائیں۔ ہمارا اندازہ ہے کہ آپ ضرور اچھا لکھیں گی۔

آپ کے خطوط کی ہماری نظر میں بہت اہمیت ہے بس صفحات کی مجبوری آڑے آتی ہے۔

ثمرین حبیب لکھتی ہیں

شہر خطا۔۔۔ ایک بہت بہت عمدہ تحریر نایاب کی۔ مگر میں ان تین دوستوں میں کنفیوز ہو گئی ہوں بہت مشکل سی ہو رہی ہے کہ کون کہاں سے آیا۔ کس کی منگنی، کون دکھی، کون غصے میں؟

افسوں مشہدی نام بھی پیارا اور کام بھی۔ آبگینے واقعی ایک اچھی ماں ہے۔ اور وہ جو ہجر والم کا مارا لڑکا ہے۔ جانے دنیا کے جیل خانے سے افسوں مشہدی کے دل کے قید خانے کو چنا۔۔۔ کیا وہ مر جائے گا؟ اگر ایسا ہوا تو شہر خطا ویران ہو جائے گا۔ اس بندے کے بنا اور ابھی تو کہانی بھی ادھوری ہے۔ اسے کون مکمل کرے گا۔

نایاب کے کردار بہت شدت پسند ہوتے ہیں اور یہی ان کے ناول کا حسن ہوتا ہے۔ نایاب نے پہلی قسط میں ظہران کے ایئرپورٹ پر گرمی کا جو نقشہ کھینچا تھا۔ بہت عمدہ تھا۔ گرمی کی حدت کو اتنے رنگوں میں بیان کرنا ایک اچھے رائٹر کی پہچان ہے۔ شہر خطا ایک اچھا ناول ہے۔ آگے دیکھتے ہیں کیا رخ اختیار کرتی ہے کہانی۔

ج : پیاری ثمرین! کہانی ابھی شروع ہوئی ہے۔ اگرچہ کہانی کے بارے میں پہلے سے بتانے سے لطف کرکرا ہو جاتا ہے لیکن آپ کا کہنا صحیح ہے کہ تینوں دوستوں کے کردار بہت الجھے ہوئے ہیں اس لیے وضاحت کر دیتے ہیں۔ ان تینوں دوستوں کے نام حریر، مدید اور فاتح ہیں۔ مدید اور فاتح دوست ہونے کے ساتھ ساتھ رشتہ دار بھی ہیں۔ فاتح یا الگٹ ہے۔ ہجر والم کا مارا لڑکا رافع ہے۔ وہ زندہ رہے گا یا نہیں؟ یہ آگے چل کر پتا چلے گا۔

اس ماہ کہانی ماضی میں چل رہی ہے جہاں انڈیا اور رعنا کے کردار ہیں۔

حمنی اقبال منڈی فیض سے شرکت کر رہی ہیں لکھا ہے

میں ایک اسکول ٹیچر ہوں۔ منڈی میں ہمارا ایک خوب صورت سا گھر ہے۔ مجھے اپنے گھر سے اور گھر والوں سے بہت پیار ہے۔ ہمارا گھرانہ ایک مذہبی گھرانہ ہے۔ منڈی فیض آباد کے لوگ بہت پیارے اور مخلص ہیں۔ اللہ کرے کہ میرا ملک اور منڈی فیض آباد ہمیشہ سلامت رہے۔

جب سے شعاع میں 'جب تم سے ناتا جوڑا' شروع ہوا ہے۔ میرا دل کرتا تھا کہ میں بھی کچھ تو لکھوں ان کے لیے۔ میں گھر میں چھوٹی ہوں اس لیے میرا دل بہت چھوٹا ہے اور میں بہت حساس بھی ہوں۔ میں سب سے پہلے یہ سلسلہ پڑھتی ہوں۔ لڑکی کا گھر کون سا ہوتا ہے۔ میکے والے کہتے ہیں کہ لڑکی پرائی ہے۔ اور سسرال والے کہتے ہیں پرائے گھر سے آئی ہے۔ تو اللہ نے لڑکی کس گھر کے لیے بنائی ہے؟

ج : اوہو پیاری سی 'چھوٹی سی حمنی'! اتنی بات سمجھ لیں کہ لڑکی ہو یا لڑکا۔ انسان کو اللہ نے اپنے لیے بنایا ہے اور یہ پوری دنیا اللہ نے آپ کے لیے بنائی ہے پھر اس کے چکر میں نہ پڑیں۔ کہ گھر کس کا ہے کس کا نہیں ہے۔ یہ دنیا کسی کا گھر نہیں ہے۔ بس تھوڑی دیر کے لیے یہاں آتے ہیں۔ اس اصلی گھر کی فکر کریں جہاں ہمیشہ رہیں گے۔

شازیہ الطاف ہاشمی نے شجاع آباد سے لکھا ہے

ایک چپ سو سکھ۔ صباحت یاسمین جی ویل ڈن! بہت بڑھیا بھئی! ہاجرہ ریحان کی تحریریں مجھ سے زیادہ اشتیاق سے اور کون پڑھتا ہو گا (بتائیں ذرا) چھپا کے چھپی کچھ عجیب نہیں بھلا؟ پیال ساز ہاؤ نائس۔ ایمل جی تم جیو ہزاروں سال۔ غزلوں میں ناصر زیدی نمبر لے گئے۔ موسم کے پکوان خالدہ جی! کبھی شامی ٹکیوں کی مختصری ترکیب ضرور دیں کیونکہ مجھے ٹکیاں بھی بنانی نہیں آتیں۔
پچھلی تحریروں کا جواب خاموشی میں ہے تو خاموشی کا وہی

مطلب ہے ناں جو آپ نے اس شمارے میں ماہوش طالب کو دیا ہے اگر آپ نے جواب نہ دیا تو میں نے یہی سمجھنا ہے۔

ج : پیاری شازیہ! آپ کے بہت سارے افسانے موصول ہوئے ہیں۔ ان میں سے بیشتر ابھی پڑھے نہیں گئے۔ کچھ قابل غور ہیں یعنی ان کے شائع کرنے کا فیصلہ نہیں ہوا۔ اس لیے ہماری خاموشی کا مطلب یہ نہیں ہے کہ آپ کی تحریریں ناقابل اشاعت ہیں۔ چھپا کے چھپنی پانی میں پیر مارنے کی آواز کو کہا ہے۔
شعاع کی پسندیدگی کے لیے شکریہ۔

فرح ناز آبرو نے ضلع مکھیانہ گجرات سے لکھا ہے

آپ سب نے مجھے بھولی بسری یاد کی طرح فراموش کر دیا۔
اس دفعہ ٹائٹل پر صحت مند سی بھرے بھرے رخساروں والی ثناء امجد سیدھی پسند کی سند پا گئی۔ یار بیک گراؤنڈ کلرفل دیا کریں نا "سیاہ حاشیہ" جلدی جلدی سمیٹا گیا۔ "خواب شیشے کا" موضوع اولڈ اولڈ (ذاتی رائے) "شہر خطا" اکٹھا کر کے پڑھوں گی۔ یہ خط خصوصاً "خصوصاً" ناول سیریز کے لیے لکھ رہی ہوں اس دفعہ کی بھی بہت اچھی تھی۔ فرزانہ کھرل زبردست۔ تبصرہ جلدی جلدی میں لکھا ہے۔ دل میں تشنگی برقرار ہے۔

ج : پیاری فرح! اتنی جلدی کاہے کی تھی۔ اطمینان سے تبصرہ کرتیں خط کا شائع ہونا اتنا اہم نہیں جتنا ہمارے لیے آپ کی رائے جاننا ہے۔ اور بھولے کہاں ہیں بس مصروفیات ہمیں بھی سر اٹھانے کا موقع نہیں دیتیں ورنہ اس وقت بھی کتنے ہی نام ذہن میں گردش کر رہے ہیں جنہوں نے خط لکھنا بند کر دیے ہیں۔ کسی ایک کا نام بھی لکھنے سے چوک گئے تو پھر انہیں شکایت ہو گی ویسے اتنے قلیل وقت میں یہ جو خط کے آخر میں آپ نے گل بوٹے بنائے ہیں اچھے لگے۔

عظمیٰ شفیق نے جڑانوالہ سے لکھا ہے

دلکش سا سرورق بہت اچھا لگا۔ خاص طور پر ماڈل کا ڈریس۔ تصویر "ناتا جوڑا" کے اوپر یقیناً "کوثر خالہ جی اور ان کی مندھی ہیں شناسا لگیں گیلانی محلے پانچ منٹ کا راستہ ہے یہاں سے شاید اس لیے دیکھا ہو نسرین علیم جی کے جوابات بالکل سچے لگے۔ کوثر خالہ جی ایک طرف آپ کا کہنا کہ کاش میں غصہ پینا سیکھ لوں اور آپ کا المیہ یہ کہ آپ کسی پر غصہ ہوہی نہیں سکتیں یہ تو کھلا تضاد ہے۔
کچھ قاری بہنوں کا یہ لکھنا۔ میری پہلی اور آخری خواہش یا پھر میرا پہلا اور آخری خط۔ یہ کیسی بلیک میلنگ ہے بھئی؟ مجھے بالکل اچھی نہیں لگی یہ بات۔
اس ماہ راشدہ رفعت کا افسانہ بہترین تھا۔ شمن کی تالی جان کا گھرانہ مجھے بھی اچھا لگا۔ ماورا خان کا افسانہ گھسا پٹا تھا۔ قانتہ رابعہ اور حاجرہ ریحان کے افسانے نارمل لگے۔ ایک چپ سو سکھ افسانہ بظاہر تو اچھا تھا پر عاکفہ کی چُپ جیسی چُپ تو سراسر ظلم ہے خود پر۔ سائرہ رضا اس بار متاثر نہ کر پائیں۔ انتہائی پھیکا پن تھا ناول میں۔ فرزانہ کھرل بزم سجانے میں کامیاب رہیں۔ نایاب جیلانی کا ناول بس گزارے لائق ہے۔
سیدہ لوبا سجاد کی شاعری زبردست ہوتی ہے۔

ج : پیاری عظمیٰ! کہاں تھیں؟ اب ایسی بھی کیا مصروفیت کہ اشعار بھیجنا بھی چھوڑ دیے۔ شمارے پر بہت اچھا تبصرہ کیا آپ نے اور ایک بات ہم پر پہلی اور آخری خواہش یا آخری خط جیسے الفاظ کا کوئی اثر نہیں ہوتا۔ ہمیں تو آپ ہر قاری بہن بہت عزیز اور پیاری ہے۔
کوثر خالد کے تضاد کا جواب وہ خود دیں گی۔ ویسے ہماری نظر میں یہ تضاد نہیں ہے کیونکہ نارمل انسان کو غصہ بھی آتا ہے اور پیار بھی.... ہاں کسی بھی چیز کو حد سے نہیں بڑھنا چاہیے۔

سمیرا، حنا اور انعم سیالکوٹ سے شریک محفل ہیں

اس ماہ کا ٹائٹل بہت پیارا تھا۔ "جب تجھ سے ناتا جوڑا ہے" بہت اچھا سلسلہ شروع کیا ہے۔ سیالکوٹ اتنا پیارا شہر ہے کبھی اس کا ذکر شعاع میں نہیں کیا آپ نے۔ کراچی کا تو بہت ذکر کرتی ہیں۔ ہماری باجی نے اپنے شوہر سے بڑی جھڑکیاں کھائی ہیں لیکن شعاع پڑھنا نہیں چھوڑا۔ "خواب شیشے کا" "پیال ساز" "شہر خطا" بہت اچھا جا رہے ہیں۔ اس ماہ کا چھپا کے چھپی بہت اچھا ناول تھا۔ مکمل ناول زیادہ اور اچھے دیا کریں۔

ج : پیاری سمیرا، حنا، انعم! او بھئی سیالکوٹی کڑیوں! آپ ضرور ہمیں اپنے پیارے شہر کے بارے میں لکھ بھیجیں ہم شائع کریں گے ویسے۔ علامہ اقبال اور فیض صاحب کی

وجہ سے سیالکوٹ کا نام ہم سب ہی جانتے ہیں۔ آپ کو پرچا پسند آیا شکریہ۔ مگر آئندہ ذرا جامع تبصرے کے ساتھ تشریف لائیے گا۔ باجی کے لیے کیا کہیں "محبت میں ایسے سخت مقام تو آتے ہی ہیں۔"

اور بھئی کراچی کے بارے میں تو ہم نے کبھی نہیں لکھا' آپ نے کہاں سے پڑھ لیا۔

سیرت امین نے میاں چنوں سے شرکت کی ہے' لکھتی ہیں

ایک خط شادی سے پہلے لکھا تھا۔ پانچ سال ہو گئے۔ ویسے شعاع سے ناتا تب سے ہے جب سے ہوش سنبھالا ہے۔ اس ماہ سرورق اچھا تھا (فریش سی ماڈل) حمد اور نعت کے کیا ہی کہنے (سبحان اللہ) "پیارے نبی کی پیاری باتیں"

بہت پیارا سلسلہ ہے "جب تجھ سے ناتا جوڑا" اچھا سلسلہ ہے۔ نسرین علیم نے اچھا لکھا (گڈ) زاہد احمد سے ملاقات زبردست رہی "شعاع کے ساتھ" بھی پیارا سلسلہ ہے "پیال ساز" کیا بات ہے بھئی ایمل رضا! الفاظ کا چناؤ زبردست۔ الفاظ کی گہرائی اور شدت بے مثال "شہر خطا" اور "خواب شیشے کا" زبردست جا رہے ہیں۔ منجھی ہوئی رائٹرز کمال ناول! "وہ جب ملے" زبردست رہا۔ کیا جادوئی قلم ہے! فرزانہ کھرل نے بھی بہت اچھا لکھا۔ قلم پہ عبور رہا مکمل (خدا داد صلاحیت ہے بھئی یہ) افسانوں میں زرمینے گل ٹاپ رہا۔ بے وفائی' تجھے چاہا' رشتے ناتے سب ہی پرفیکٹ تھے اور ایک چپ سو سکھ افسانے کی حد تک ٹھیک تھا۔

ج : پیاری سیرت! افسانے بھیج دیں' اس کے لیے اجازت کی کیا ضرورت اور ہاں تیسرا خط کب لکھیں گی؟ جب دادی بن جائیں گی؟

جامع تبصرے کے لیے شکریہ۔

امید بخاری نے چوک اعظم سے لکھا ہے

شعاع کی اپنائیت اور سب بہنوں کی محبت کا بہت شکریہ کہتے ہیں کہ رلانا تو بہت آسان ہے مزہ تو جب ہے کسی کو روتے سے ہنسا دو' جن بہنوں کو میرا احوال اچھا لگا' ان کی محبتیں میرا سیروں خون بڑھا گئیں۔ خاص طور پر نادیہ صدیقہ' رضوانہ شکیل' صبا طارق اور کوثر خالد جی خاص طور پر آپ کے الفاظ تو میرے لیے سند ہیں' ایک ڈگری جو خود اتنا اچھا لکھتی ہیں۔

ج : پیاری امید اولا دستوں کو خط لکھنے کے لیے بھی حوصلے کی ضرورت ہوتی ہے کیا؟ اور زندگی پہلے ہی اتنی مسالے دار ہے کہ مزید تیکھے پن کی ضرورت نہیں۔ ہم تو ویسے بھی میٹھی چیزوں کے رسیا ہیں۔ دو میٹھے بول زندگی کو کتنا آسان اور دل کو کتنا ہلکا کر دیتے ہیں' خواتین سے زیادہ کون جانتا ہو گا۔

ناظمہ زیدی چوک اعظم سے لکھتی ہیں

ٹائٹل خوب صورت مگر ناخن ایسے لگے جیسے کوئی جنگی ہتھیار ہوں' پیاری باتیں دل اور روح خوش کر گئیں۔ "ناتا" اچھا تھا بس اور "خط آپ کے" زبردست مگر محفل سونی سونی تھی میرے نام کے بغیر "شعاع کے ساتھ" میں بھی جوابات لکھ کر بھیجنا چاہتی ہوں' بھیجوں کیا؟

"خواب شیشے کا" اچھا جا رہا ہے "پیال ساز" زبردست میرے اندازے کے مطابق نانو گلناب عالم ہی ہیں۔ آگے دیکھو۔ سانس روک کے پڑھ رہے ہیں بس۔ ام سعدی کا چھوٹا سا افسانہ بھی اچھا تھا' کیا ضروری ہے کہ اپنے اولاد سے ہی ٹھوکر لگے بندہ ویسے ہی سنبھل جائے تو "جب وہ ملے" ہمیشہ کی طرح شگفتہ سی تحریر' نایاب جی آپ کا ناول کچھ پیچیدہ سا لگا' فرزانہ کھرل کا ناول بھی دل کی تاروں کو چھو گیا۔ "رشتے ناتے" صلہ رحمی کا ننھا سا درس۔ باقی تمام افسانے اچھے تھے جو پڑھے ہیں بقیہ ابھی زیر مطالعہ۔ سائرہ علی آپ کا لطیفہ بیسٹ تھا گڈ۔ تاریخ ہمیشہ کی طرح بیسٹ۔ اسامہ اعجاز کا انٹرویو بہت پسند آیا۔ ویل ڈن جوان' پورا شعاع ہی ہمیشہ کی طرح مزیدار جیسے دال روٹی کے ساتھ آم کا اچار......

ج : پیاری ناظمہ! افسانہ لگ جائے گا۔ باری آتے آتے تھوڑی دیر لگ جاتی ہے۔ شعاع کے ساتھ ساتھ میں ضرور شرکت کریں۔ پوچھنے کی ضرورت نہیں۔

سالانہ خریدار بننے کا یہ فائدہ کیا کم ہے کہ بک اسٹال کے چکر نہیں لگانا پڑتے۔ گھر بیٹھے پرچا مل جاتا ہے۔

فوزیہ ثمروٹ' ہانیہ عمران اور آمنہ رئیس گجرات سے شریک محفل ہیں' لکھا ہے

سرورق پہلی نگاہ میں دل کو بھا گیا۔ مستقل سلسلے ہمیشہ کی طرح توجہ کے قابل لگے۔ پیاری باتیں لاجواب ہوتی

ہیں۔ شاہین صاحب نے دل خوش کردیا۔ زاہد احمد کا انٹرویو کر گے۔ قسمت کا دھنی ہے مجھ سے ناتا جوڑا ہے۔ واہ جی واہ کیا بات ہے دونوں نندوں بھاوج کی۔ اللہ پاک نظر بد سے بچائے۔ کوثر جی سے یہ کہوں گی سادگی میں اک حسن کا جہاں آباد ہے کیا صورت کیا سیرت ہر چیز منفرد اور دلکش ہے۔ چلو جی کسی دن چنبھہ اسپتال گیلانی محلہ ہو ہی آئیں۔ شعاع کے ساتھ ساتھ میں دونوں بہنوں کے شعر اچھے لگے۔ پہال ساز لازوال داستان۔ نگار ایک چھوٹی سی غلطی کا زندگی بھر تاوان بھرتی رہی۔ ناقابل فراموش تحریر۔ ناولٹ "شہر خطا" کرداروں کے اتنے اوکھے اوکھے نام ہیں اور پھر شاید ماضی حال دونوں ساتھ ساتھ چل رہے کنفیوز ہو جاتی ہوں ویسے کہانی ہے دل چسپ نایاب جیلانی اس بار بھی آئیں اور دلوں پہ راج کرنے لگیں۔

چھپاکے چھپئی بہت اچھی تحریر تھی۔ افسانے ایک سے بڑھ کر ایک تھے۔ ام سعدی کا زرمینے گل آج کی سچائی کا بولتا ثبوت ایسی ہی کہانی مجھے بھی آتی ہے۔

مستقل سلسلوں میں شعاع کے ساتھ ساتھ شامل ہونے کا ارادہ ہے۔ جب نئے گھر شفٹ ہو جائیں گے تب۔

پچھلے ماہ کی شاعری زیادہ اچھی لگی تھی۔ تاریخ کے جھروکوں سے۔ غدار بیوی ہائے ہائے یہ دنیا تو ازل سے چالاک لوگوں سے بھری پڑی تھی۔ آئینہ خانے میں واصفہ جی کے کمنٹس کچھ پھیکے پھیکے لگے۔

خط آپ کے بہنوں کی خوب صورت محفل جہاں ہر کسی کو اظہار آزادی دی گئی ہے۔ بنت حوا اللہ تمہارے بھائی کو سدا سلامت رکھے۔ زوبابیہ خالد، ثمینہ اکرم، کوثر خالد بہت بہت شکریہ اتنی محبتوں سے نوازنے کا نوال افضل گجرات سے کراچی تک کے سفر کی داستان اگلے خط میں لکھوں ناں.....

ج : پیاری فوزیہ! خط تو آپ ہمیشہ ہی بہت اچھا لکھتی ہیں مگر آپ کی مختصر کہانی پڑھ کر دل کو بہت ٹھیس لگی۔ بہت دکھ ہوا۔ دل چھوٹا نہ کریں۔ یہ تو ہر گھر کی کہانی ہے، بس اللہ سے ہی امید رکھیں وہی محنت اور صبر کا صلہ دیتا ہے۔ ان شاء اللہ آپ کو بھی صبر کا میٹھا پھل ضرور ملے گا۔ اپنی کہانی افسانے کی شکل میں لکھ کر بھجوائیں تاکہ ہماری طرح اور لوگ بھی پڑھ سکیں۔ اللہ تعالیٰ سے دعا گو ہیں، آپ کو اتنی خوشیاں دے کہ سب دکھ بھول جائیں۔ شعاع پر تبصرہ ہمیشہ کی طرح جامع اور مکمل ہے۔

جڑانوالہ سے کوثر خالد نے محفل کو رونق بخشی ہے، لکھتی ہیں

کوثر خالد آج بہت خوش ہے کہ حمد و نعت کی کتاب "حوض کوثر" مجھ تک رسائی پا چکی ہے اور بیٹا کمپوزر ہے۔ سب سے پہلے یاسمین کی جی سے کہنا ہے۔ ہمیں تو خود اپنا "تاتا" سمجھ میں نہ آرہا تھا۔ کچھ پیراگراف حذف اور کچھ بے ترتیب ہو گئے تھے۔ کمال ہے ہم تم کے علاوہ کسی نے اپنی الجھن نہ بتائی۔ واہ بھئی واہ... سرورق... مجھے تو اپنی بیٹی ہی لگی۔ "حمد" فرسٹ کلاس سادہ مگر بہترین... نعت پرانی، دونوں کو ترنم سے پڑھا۔ نبی جی کی باتیں... کھانے کے آداب۔ ایک بات پر ہم نادم ہوئے کہ موٹاپے کی وجہ سے کبھی ٹیک لگا کر کھاتے ہیں۔ یا اللہ معافی... "تاتا" پچ تصویر دیکھ کر مزہ آگیا اور سروے پر تبصرہ کا بے چینی سے انتظار ہے۔ امید ہے یاسمین کو یہ مختصر سا "تاتا" بھائے گا۔ "دستک" زبردست۔ اسامہ حیرت انگیز، پاک بچے، زندہ باد۔ "چھپاکے چھپئی" ہائیں یہ کیا نام ہوا؟ جی بولی... کوئی گانا ہے۔ بہرحال فرزانہ کا قلم رواں اور دلچسپ لگا۔ "شہر خطا" ایک بار پھر نایاب کا قلم جولانیوں پہ آیا تھا۔ عرب داستاں، افسوں نام، کتنا پیارا ہے۔ "خط آپ کے" بے حد دلچسپ ہوتے جارہے ہیں۔ ایک کارزواں سا بنتا جارہا ہے۔ رضوانہ تمہیں بھی، ہم فوزیہ کے ساتھ ہی بیٹی لکھ چکے ہیں۔ ماں بننا مبارک ہو... ثمینہ جی میں ہی کیا جو بھی اس محفل میں بار بار شائع ہو خط... وہ نام دل و نظر میں محفوظ ہو جاتے ہیں جیسے مہناز... ناظمہ، ارم، سبین، عائشہ، انیقہ، حرا وغیرہ "موسم کے پکوان" چانپ ٹرائی کی۔ پہلی بار واہ واہ ہوئی دوسری بار چانپ کا حلوہ بن گیا گل گل کر... گل گئیں جو نہ تھی۔ کبھی کبھار یہی کرتی ہوں۔ گوشت کچا پکا کھا جو نہیں سکتی۔

ج۔ کوثر جی! نعت کے مجموعے پر دلی مبارک باد۔ رضا کی خوش بختی کہ اس نے ماں کی خوشنودی حاصل کی۔ تبصرہ تو آپ کا ہمیشہ ہی بے ساختہ اور بے لاگ ہوتا ہے۔ بہت شکریہ شعاع کی پسندیدگی کا۔ جٹھانی کا سروے اور تصویر مل گئی۔ ان شاء اللہ آئندہ ماہ شامل اشاعت ہوگی۔ چھپاکے چھپئی جب پانی میں تیز تیز چلا جائے تو اس سے جو آواز نکلتی

ہے اسے چھپاکے چھپئی کہتے ہیں۔ ایک انڈین گانے میں یہ لفظ استعمال ہوا ہے لیکن فرزانہ نے اس ناول کو گانے پر نہیں لکھا تھا۔

عائشہ جہانگیر مرالی نے کبیروالا سے لکھا ہے

ایمل رضا کا "پیال ساز" بہت ہی اچھا جارہا ہے۔ بہت ہی منفرد لکھا ہے ایمل رضا نے۔ عفت سحر طاہر کا "خواب شیشے کا" بھی بہت ہی اچھا ناول ہے۔ آپی آپ سے پوچھنا تھا کہ اگر ہم کوئی شعر بھیجیں تو وہ اس ماہ کے رسالے میں شائع نہ ہو۔ تو کیا اگلے ماہ کے رسالے میں شائع ہوجائے گا یا دوبارہ بھیجنا ہوگا؟

ج:۔ شعر دوبارہ بھجوانے کی ضرورت نہیں۔ ہم شعر محفوظ رکھتے ہیں' لفافے پر سلسلے کا نام لکھنا بھی ضروری نہیں۔

صباخان' بہاول پور سے لکھتی ہیں

ایک بات کہنا چاہتی ہوں کہ مجھے جانے کیوں ایسا لگنے لگا ہے کہ اس ادارے نے بھی لکھاریوں کو دو حصوں میں بانٹ دیا ہے۔ حالانکہ میں نے ہمیشہ آپ لوگوں کو غیر جانب دار جانا مگر اب کیا ہو گیا ہے۔ بعض لکھنے والوں کے عام سے افسانوں اور ناولز کی بھی بے جا تعریف چھاپی جاتی ہے' صرف اس وجہ سے کہ یا تو وہ مذہب پر لکھتے ہیں۔ یا بے جا قسم کی مشکل زبان کا استعمال کرتے ہیں۔ کچھ صرف منظر نگاری کرتے ہیں۔ ان کے ہاں کہانی کا پلاٹ بہت کمزور ہوتا ہے' پھر بھی انہیں بلاوجہ کی پبلسٹی ملتی ہے مگر کچھ بہت اچھا' سادہ اور بہترین لکھنے والوں پر کی گئی ایسی ایسی تنقید کو چھاپا جاتا ہے جو میرے حساب سے تنقید کے زمرے میں نہیں آتی۔ کیا آپ لوگوں نے بھی اپنے رائٹرز کو دو قطاروں میں تقسیم کردیا ہے۔

ج ۔ پیاری صبا! ہماری قارئین ہمیں جو خط لکھتی ہیں۔ ہم اس میں کوئی ردوبدل نہیں کرتے۔ ہم نے خطوط کا سلسلہ آپ کی بے لاگ رائے شائع کرنے کے لیے شروع کیا ہے۔ قارئین جن کہانیوں کی تعریف کرتی ہیں۔ ان کا موضوع ہمیشہ مذہب نہیں ہوتا' نہ ہی ہمیشہ مشکل الفاظ پر مبنی کہانیوں کی تعریف ہوتی ہے۔ اس بار فرزانہ کھرل کا ناول بہت سادہ اور عام سے موضوع پر تھا۔ اس میں مشکل الفاظ بھی نہیں تھے۔ ہماری تقریباً سب ہی قارئین نے اس ناول کو بے حد پسند کیا اور ہمیں تعریفی خطوط لکھے۔ اس ماہ محفل میں یہ تمام خطوط شامل ہیں۔ آپ یقین رکھیں ہم اس سلسلے میں مکمل غیر جانب دار ہیں۔

کراچی سے تسنیم کوثر نے لکھا ہے

اس دفعہ سائرہ رضا کا ناول جب وہ ملے بہت ہی زبردست رہا۔ کیا نایاب ناول لکھا ہے۔ نازک اندام اور اخفش کا نام پڑھتے ہی بچپن کی کہانی فوراً یاد آگئی۔ "چھپاکے چھپئی" فرزانہ کھرل کا ناول بھی ماشاء اللہ اپنے نام کی طرح اچھوتا' پیارا سا شاہکار ناول لگا اور "پیال ساز" تو دھما کا ناول ہے۔ اس جیسا خوب صورت ترین ناول ہم نے کبھی نہیں پڑھا۔ ایمل رضا کو بہت دعائیں اور مبارک باد۔ صباحت یاسمین کا افسانہ "ایک چپ سو سکھ" نصیحت آمیز کہانی تھی۔ راشدہ رفعت نے اپنی چھوٹی سی کہانی میں عمدہ پیغام دیا ہے۔ "خواب شیشے کا" معذرت کے ساتھ اس میں دل نہیں لگ رہا۔ اس کے علاوہ شہر خطا میں بھی مزا نہیں آرہا۔ "زرمینے گل" اچھا ہے مگر اس کا اینڈ سمجھ میں نہیں آیا۔ ماورا خان کا "تجھے چاہا" بے حد اچھا افسانہ تھا۔ "رشتے ناتے" بس گزارا تھا۔ "تاریخ کے جھروکوں" میں بہت پسند آیا۔ "پیارے نبیﷺ کی پیاری باتیں" تو شعاع کی شان اور جان ہیں۔

ج ۔ پیاری تسنیم! ہمیں بے حد افسوس ہے کہ آپ کا پچھلا خط شامل نہ ہوسکا۔ شعاع کی پسندیدگی کے لیے ممنون ہیں۔

عائشہ رباب کراچی سے تریک محفل ہیں' لکھا ہے

سرورق ماڈل بہت ہی پیاری لگی۔ بہت ہی خوب صورت انداز تھا۔ کافی عرصے بعد کوئی نیا چہرہ آیا ہے۔ ناول "خواب شیشے کا" دلچسپیوں سے بھرپور' کبیر میاں! کون ہیں بھئی؟ جلدی سے اس راز سے بھی پردہ اٹھائیں۔ برائے مہربانی تزئین کو بھی ایک ہیرو دلا دیں' تاکہ اس کی منفی سوچوں میں کمی واقع ہو۔ "پیال ساز" کہانی بہت خوش اسلوبی سے اختتام کی جانب رواں دواں ہے۔ اس قسط میں جتنے بھی انکشافات ہوئے ہیں' سب ہی یونیک تھے۔ زل اور باسل کو جدا نہیں کیجیے گا۔ "وہ جب ملے" سائرہ رضا کا نام پڑھتے ہی دل خوش ہوگیا' لیکن اس بار انہوں نے پورا حق ادا نہیں کیا۔ "شہر خطا" کہانی بہت الجھی ہوئی ہے کوئی

سرا ہاتھ نہیں آرہا ہے۔ لیکن بہت اسٹرانگ سی کہانی ہے۔ "چھپا کے چھپی" بہت ہی زبردست کہانی تھی۔ "جیئں تو ایسے" ثمن کی تائی نے بہت ہی زبردست بدلہ لیا۔ "رشتے ناتے" "تجھے چاہا" بہت اچھی لگی۔ "بے وفائی" بالکل پسند نہیں آئی۔ لکھی پی آدھی ادھوری کہانی تھی۔ شوہر صاحب نے نہ کبھی نفرت کا اظہار کیا نہ کبھی تعلق توڑنے کی دھمکی دی۔ خالہ جان نے بس آنا" فانا" طلاق کے کاغذات پکڑا دیے' کوئی ساس اتنی اچھی نہیں ہوتی۔ اولاد کے لیے محبت ہر ماں کی دل میں بہو سے زیادہ ہوتی ہے۔

قارئین متوجہ ہوں!

1- ماہنامہ شعاع کے لیے تمام سلسلے ایک ہی لفافے میں بھجوائے جاسکتے ہیں، تاہم ہر سلسلے کے لیے الگ کاغذ استعمال کریں۔

2- افسانے یا ناول لکھنے کے لیے کوئی بھی کاغذ استعمال کرسکتے ہیں۔

3- ایک سطر چھوڑ کر خوش خط لکھیں اور صفحے کی پشت پر یعنی صفحے کی دوسری طرف ہرگز نہ لکھیں۔

4- کہانی کے شروع میں اپنا نام اور کہانی کا نام لکھیں اور اختتام پر اپنا مکمل ایڈریس اور فون نمبر ضرور لکھیں۔

5- مسودے کی ایک کاپی اپنے پاس ضرور رکھیں، نا قابل اشاعت کی صورت میں تحریر واپسی ممکن نہیں ہوگی۔

6- تحریر روانہ کرنے کے دو ماہ بعد صرف پانچ تاریخ کو اپنی کہانی کے بارے میں معلومات حاصل کریں۔

7- ماہنامہ شعاع کے لیے افسانے، خط یا سلسلوں کے لیے انتخاب، اشعار وغیرہ درج ذیل پتے پر رجسٹری کروائیں۔

ماہنامہ شعاع
37-اردو بازار کراچی

ج - پیاری عائشہ! خوش ہو جائیں۔ ایمل نے زیل اور باسل کو جدا نہیں کیا۔ شعاع کی پسندیدگی اور جامع تبصرے کے لیے شکریہ۔

مسرت الطاف، کراچی سے لکھتی ہیں

اس بار بھی شعاع کے ہاتھ میں آتے ہی پھیکی مسکراہٹ نے میرے لبوں کا احاطہ کیا کبھی کبھی مجھے ایسے فیل ہوتا ہے جیسے میری تحریروں کو انتہائی مجبوری کے تحت شائع کیا جارہا ہے۔ اکتوبر کا ٹائٹل بہت زبردست تھا' ڈریسنگ اور میک اپ تو دل کو چھوتا ہوا محسوس ہوا "رقص بسمل" ایک بار پھر غائب دیکھ کر دل پر صبر کرلیا۔ "خواب شیشے کا" مائی موسٹ فیورٹ ناول "جب ہم ملے" سائرہ رضا کا ناول زبردست تھا۔ بس نوال کے نخرے کچھ زیادہ ہی تھے۔ "چھپا کے چھپی" بہت ہی نائس تحریر تھی پڑھ کر بہت انجوائے کیا۔ نایاب جیلانی نے اس بار اپنے مزاج سے ذرا ہٹ کر لکھا اور کیا خواب لکھا۔ سچ میں مزا آیا بہت ہی منفرد اور سحر انگیز تحریر ہے۔ "پیال ساز" کی ایسی سوڈ دھما کا دار تھی نانو ہی گلناب عالم ہے اُکس شاکنگ۔ افسانوں میں "ایک چپ سو سکھ" قابل تعریف تحریر تھی۔ "جیئں تو ایسے" بہت متاثر کن تحریر تھی۔ "تجھے چاہا" یہ تحریر بھی بہت پسند آئی۔ باقی سب افسانے ایک سے بڑھ کر ایک تھے۔ اکتوبر کا پورا شمارہ بہت پسند آیا۔

ج - پیاری مسرت! ذرا مجبوری کی وضاحت بھی کردیتیں۔ ہمیں بھی تو پتا چلے کہ خط شائع کرنے کے لیے ہمیں کون سی مجبوری کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ ہاں خط نہ شائع کرنے میں یہ ہماری مجبوری ہے کہ صفحات بہت محدود ہوتے ہیں۔ لکھنے والوں کی تعداد بہت زیادہ ہے۔

آمنہ اصغر

تاریخ کے جھروکوں سے

عدل کا کرشمہ

سمرقند کی ایک گہری سرد رات میں ایک شخص اپنے گھر سے نکلتا ہے' چاروں طرف گھپ اندھیرا ہے۔ اس کا رخ شاہی محل کی طرف ہے۔ وہ آہستہ آہستہ قدم اٹھاتا اندھیرے میں راستہ تلاش کرتا بالآخر محل کے قریب جا پہنچتا ہے۔ اس کے ایک جانب معبد ہے۔ اس کے دروازے پر ایک بہت بھاری پتھر رکھا ہوا ہے جس میں مورتیاں کھدی ہوئی ہیں۔ اس پر رعب طاری ہے۔ وہ زندگی میں پہلی مرتبہ معبد میں داخل ہونے والا ہے۔ اس سے پہلے اس کو کبھی یہ موقع میسر نہیں آیا۔

یہ بھاری بھر کم نوجوان بزدل نہیں بلکہ نہایت بہادر شخص ہے۔ اس کا قد خاصا لمبا ہے۔ نہایت ذہین و فطین ہے۔ سوچ اور فکر بلند ہے' وہ نہایت مدبر ہے۔ مقامی زبان تو اس کی مادری ہے مگر اس میں ایک نمایاں خوبی یہ بھی ہے کہ اس کو عربی زبان پر عبور حاصل ہے اور وہ فرفر عربی زبان بولتا ہے۔ اسے معبد کے سب سے بڑے عہدے دار نے ملاقات کے لیے بلوا رکھا ہے۔ اس ملاقات کے شوق اور خوف نے اسے ایک عجیب کیفیت میں مبتلا کر رکھا ہے' اس کا جسم کانپ رہا ہے۔ اس معبد میں بہت کم لوگ داخل ہو سکتے ہیں اور جو اس کے ذمہ داران ہیں' وہ بس ایک مرتبہ اندر داخل ہوتے ہیں اور پھر ساری زندگی ان کو سورج کی روشنی نصیب نہیں ہوتی۔

وہ دھیرے دھیرے آگے بڑھتا گیا۔ اس کے لیے دروازہ کھول دیا گیا۔ اگلے کمرے کے وسط میں اس نے ایک عظیم الجثہ شخص کو دیکھا۔ اس کی سفید لمبی داڑھی تھی۔ اس نے اس کو اس کے نام سے پکارا اور اپنے پیچھے آنے کا اشارہ کیا۔ وہ سمجھ گیا کہ یہ معبد کا چوکیدار ہے۔ وہ اس کے پیچھے پیچھے چلتا گیا۔ کئی غلام گردشوں سے گزرنے کے بعد کاہنوں کے سردار کے سامنے جا پہنچا۔ ان کو کسی نے نہیں دیکھا ہوا تھا۔ وہ معبد سے نہیں نکلتے تھے۔ بہت کم لوگ ہی ان سے ملاقات کر پاتے۔ اس ملک کے حقیقی حکمران یہی کاہن تھے۔ کوئی بھی ان کی مخالفت کی جرات نہ کر سکتا تھا۔ لوگوں میں یہ بات مشہور تھی کہ ان کی حکم عدولی دراصل خداؤں کی نافرمانی کے مترادف ہے اور ایسے لوگ لعنت کے مستحق ہوں گے۔

نوجوان نے دائیں بائیں دیکھا۔ کاہن ایک صف میں کھڑے تھے۔ اس نے بڑے کاہن کی طرف اپنے کان لگا دیے' وہ سمرقند کی تاریخ اور اس کا ماضی بیان کرتے ہوئے کہہ رہا تھا کہ کس طرح مسلمانوں نے اس ملک پر قبضہ کر لیا ہے۔ اس نے نوجوان سے کہا۔

"ہم نے اس قبضے کے خلاف کتنی ہی ناکام کوششیں کیں مگر ان کا اقتدار بتدریج پکا ہوتا جا رہا ہے۔ اب ہم ترپ کا پتا پھینکنا چاہتے ہیں اور وہ یہ کہ ہم نے سنا ہے کہ اس قوم کا بادشاہ نہایت عادل شخص ہے' وہ دمشق میں رہتا ہے۔ ہم نے فیصلہ کیا ہے کہ اس کے پاس اپنا ایلچی بھیجا جائے' اور ہم اپنی شکایت ارسال کریں۔ ہم دیکھتے ہیں کہ وہ اس بارے میں کیا کرتا ہے۔ چونکہ تم عربی زبان سے واقف ہو' لہٰذا ہم نے تمہیں منتخب کیا ہے۔ تم نہایت ذہین اور دلیر بھی ہو۔ گفتگو کا فن جانتے ہو۔ کیا تم اس کام کے لیے آمادہ ہو؟"

نوجوان نے اثبات میں سر ہلا دیا۔

بڑا کاہن کہنے لگا۔

"پھر فوری طور پر اپنے سفر پر روانہ ہو جاؤ۔ تمہیں

زادِ راہ وافر مہیا کر دیا جائے گا۔"
نوجوان وہاں سے نکلا تو خوشی اور مسرت اس کے چہرے پر عیاں تھی۔ آج سب سے بڑے کاہن نے مجھے شرفِ باریابی بخشا ہے۔ مجھے ایک عظیم مشن کے لیے منتخب کیا ہے۔ اب وقت ہے کہ میں اپنی صلاحیتوں کا مظاہرہ کر سکوں۔

وہ گھر واپس آیا اور سفر کی تیاری کرنے لگا۔ معبد کی طرف سے اس کو زادِ راہ وافر مقدار میں مہیا کر دیا گیا۔ اس کا تیز رفتار گھوڑا اس کے ہمراہ تھا۔ وہ اس پر سوار ہوا اس کا رخ بخارا کی طرف تھا۔ وہ مہینوں کا سفر ہفتوں میں طے کرتا حلب پہنچ گیا۔ دمشق اس کی آخری منزل تھی جواب بالکل قریب تھی، اور وہ دن بھی آیا جب وہ دمشق میں داخل ہو رہا تھا۔

دمشق جو مسلمانوں کا دارالخلافہ تھا، ان کی عظمت کا نشان، بہت بڑا شہر، نہایت صاف ستھرا، تہذیب یافتہ تھا۔ اسے یہ سمرقند سے کہیں بڑا نظر آیا۔
وہ ایک سرائے میں اترا اور اس کے مالک سے پوچھا
"امیر المومنین سے ملنے کا کیا طریقہ ہے؟"
سرائے کے مالک نے کہا ہمارے امیر المومنین سے ملنا نہایت آسان ہے۔ تم مسجد کی طرف چلے جاؤ۔ وہاں کسی بھی شخص سے ان کے گھر کا راستہ پوچھ لینا۔ وہاں کوئی پہرے دار نہیں ہے، نہ ملاقات پر کوئی پابندی ہے۔"

وہ مسجد میں داخل ہوا۔ ایسی خوب صورت عمارت اس نے آج تک نہیں دیکھی تھی۔ اس نے خیال کیا کہ یہی شاہی محل ہو سکتا ہے، چنانچہ اس نے ایک شخص سے پوچھ ہی لیا۔ اس کے لہجے اور شکل سے معلوم ہو رہا تھا کہ وہ اس شہر میں اجنبی ہے۔ اس شخص نے کہا۔
"کیا تم قصرِ خلافت کے بارے میں جاننا چاہتے ہو؟"
"دیگر کیا یہ قصرِ خلافت نہیں ہے؟" اس نے تعجب سے پوچھا۔

اس شخص نے مسکراہٹ بھرے لہجے میں کہا۔
"نہیں، اجنبی دوست، یہ تو اللہ کا گھر ہے، یہ مسجد ہے۔ کیا تم نے نماز پڑھ لی ہے؟"
"نماز۔ میں کیسے نماز ادا کر سکتا ہوں؟ میں تو سمرقند کے کاہنوں کے دین پر ہوں۔ اس دین کو کاہنوں کے علاوہ کوئی نہیں جانتا اور وہ اسرار سے بھرا ہوا ہے۔"

اس نے پوچھا، تمہارا دین کیا ہے؟
کہنے لگا۔ "میں سمرقند کے کاہنوں کے دین پر ہوں۔"
"سوال ہوا۔" ان کا دین کیا ہے؟"
"جواب ملا۔ "مجھے معلوم نہیں۔"
سوال ہوا۔ "پھر تمہارا رب کون ہے؟"
اس نے جواب دیا۔ "معبد کا خدا۔"
اب اس نے اگلا سوال کیا۔ "اگر تم اس سے مانگو تو کیا تمہیں عطا کرتا ہے اور اگر تم بیمار ہو تو تمہیں شفا دیتا ہے؟"
"کہنے لگا۔ مجھے معلوم نہیں۔"
اس شخص نے موقع غنیمت جانا کہ ایک شخص شکل و صورت سے ذہین و فطین ہے، اجنبی ہے۔ اس کا کوئی دین اور مذہب نہیں، اس کو دین کے اصول بتائے جائیں۔ چنانچہ اس نے اسلام کی خوبیاں بیان کیں اور پھر چند لمحوں کی بات تھی، اس سمرقندی کے دل کا غبار چھٹ گیا اور اس نے کلمہ توحید پڑھ لیا اور دین اسلام میں داخل ہو گیا۔
اب اس شخص نے اپنے اس نو مسلم بھائی سے کہا۔
"چلو ہم امیر المومنین سے ملنے کے لیے چلتے ہیں۔ ہر چند کہ یہ وقت انہوں نے گھر والوں کے لیے مختص کیا ہوا ہے، پھر بھی وہ بڑے متواضع ہیں۔"
مسجد سے نکل کر وہ گلی میں آئے۔ نہایت ہی سادہ سے دروازے کی طرف اشارہ کر کے اس نے بتایا کہ یہ امیر المومنین کا گھر ہے۔ اس کو تعجب ہوا۔ اس کا خیال تھا کہ بڑا عالی شان محل ہو گا۔ مگر یہ تو معمولی گھر ہے۔

اس نے دروازہ کھٹکھٹایا۔ خلیفہ عادل عمر بن عبدالعزیز نے اس کا حال پوچھا اور آنے کا مقصد معلوم کیا۔

"بتاؤ کیا مسئلہ ہے؟"

اس نے کہا "عظیم سپہ سالار قتیبہ بن مسلم نے ہمارے ملک پر قبضہ کیا ہے۔ یہ دھوکے سے قبضہ ہوا ہے، نہ تو اعلان جنگ ہوا اور نہ ہمیں اسلام کی دعوت دی گئی، ہمارے ساتھ ظلم ہوا ہے۔"

عمر بن عبدالعزیز رحمتہ اللہ فرمانے لگے۔ "اللہ کے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ہمیں ظلم کرنے کا حکم نہیں دیا بلکہ ہمیں عدل و انصاف کرنے کی تلقین کی ہے۔ اس میں مسلم اور غیر مسلم کی کوئی تخصیص نہیں ہے۔"

پھر آواز دی۔ "اے غلام! کاغذ اور قلم لایا جائے۔"

غلام کاغذ کا ایک چھوٹا سا ٹکڑا لے کر حاضر ہو گیا۔ اس پر دو سطریں لکھیں، اس پر مہر لگائی، پھر اس کو سربمہر کر کے سمرقندی سے کہا کہ

"اسے اپنے شہر کے حاکم کے پاس لے جاؤ۔"

سمرقندی واپس ہوا۔ اب اس کا سینہ توحید کے نور سے بھرا ہوا تھا۔ جہاں جاتا وہاں سیدھا مسجد میں داخل ہوتا۔ نماز پڑھتا، اور اپنے مسلمان بھائیوں سے ملاقات کر کے اپنی منزل کو روانہ ہو جاتا۔ سفر کی ایک عجیب لذت تھی۔ اب اس کے لیے کوئی شخص اجنبی تھا نہ وہ دوسروں کے لیے اجنبی۔ وہ جس مسجد میں نماز ادا کرتا، لوگ اس کی طرف دیکھتے۔ اس کی شکل و شباہت سے پتا چل جاتا کہ وہ مسافر ہے۔ اس علاقے کا رہنے والا نہیں ہے۔ اور پھر نمازیوں میں اس کی مہمان نوازی کے لیے سبقت لے جانے کی کوشش ہوتی۔ ہر کوئی اسے اپنے گھر میں لے جانے اور اس کی ضیافت کرنے کے لیے اصرار کرتا۔ اب اس کو مسجد کی اہمیت اور اس دین حنیف کی بے شمار خوبیوں کا ادراک ہو چلا تھا۔ پھر ایک دن آیا جب وہ سمرقند میں داخل ہو رہا تھا۔ وہ سیدھا معبد کی طرف گیا۔

اس نے کاہنوں کو رپورٹ دینی تھی۔ ان کو مسلمانوں کے خلیفہ کے جواب سے مطلع کرتا تھا۔ وہ معبد میں داخل ہوا۔ اب وہ اس کی تاریک گلیوں اور غلام گردشوں سے خائف نہیں تھا۔

پتھروں سے بنے ہوئے بت جو کبھی اس کے لیے معبود سے کم نہ تھے، اب ان کی حقیقت سے واقف ہو گیا تھا۔ یہ بت تو ہاتھوں سے بنائے ہوئے تھے۔ کسی کاریگر کے ہاتھوں کا کمال، نہ نفع و نقصان کے مالک اور نہ اپنے آپ کو کلہاڑے کی ضرب سے بچا سکنے والے۔ وہ ان پر ایک حقارت کی نظر ڈالتا ہوا بڑے دروازے پر جا پہنچا۔ دربان اس کو خوب پہچانتا تھا اور پھر اس کے لیے دروازے کھلتے چلے گئے اور وہ چند منٹوں کے بعد بڑے کاہن کے سامنے کھڑا تھا۔ کاہن کو اسے دیکھ کر اعتبار نہ آیا۔ اس کا خیال تھا کہ اس کو قتل کر دیا گیا ہو گا۔ مگر ان کا ایلچی ان کے سامنے کھڑا تھا۔

اس نے ان کے سامنے تفصیل سے سفر کے حالات بیان کیے۔ کیسے گیا، کہاں کہاں سے گزرا۔ اپنا اسلام لانے کا واقعہ وہ جان بوجھ کر گول کر گیا۔ خلیفہ سے ملاقات اور حکم نامہ حاصل کرنے تک ایک ایک بات ان کے گوش گزار کی گئی۔ کاہنوں کے ہونٹوں پر مسکراہٹ چھا گئی۔ بشاشت ان کے چہروں سے عیاں تھی۔ "ہماری آزادی کا وقت آ گیا ہے۔ خلیفہ کی طرف سے واضح حکم ہے کہ قاضی کے سامنے اس مقدمے کو پیش کیا جائے۔ کاہنوں کو مکمل آزادی ہو گی کہ وہ اپنے دلائل دیں۔ سپہ سالار قتیبہ بھی عدالت کے کٹہرے میں کھڑا ہو گا اور پھر قاضی جو فیصلہ دے اس کو نافذ کیا جائے۔"

پھر وہ دن آ گیا جس کا اہل سمرقند کو انتظار تھا۔ بے شمار لوگ اس تاریخی مقدمے کی کارروائی سننے کے لیے چلے آئے۔ عدالت مسجد میں لگی ہوئی ہے۔ وہ کاہن جن کو کبھی کسی شخص نے نہ دیکھا تھا، مقدمے کی پیروی کے لیے حاضر ہیں۔ مسلمانوں کا سپہ سالار، امیر قتیبہ بھی حاضر ہے۔ سب کے سب قاضی کے منتظر ہیں۔

کاہن کس بات کی امید اور مقدمے لے کر آئے ہیں؟ ذرا غور کیجیے، یہ کہ ایک فاتح قوم مفتوح علاقوں سے نکل جائے۔ مقدمہ جس شخصیت پر دائر کیا گیا وہ عظیم قائد اور سپہ سالار ہے۔

نگاہیں مسجد کے دروازے کی طرف لگی ہوئی ہیں کہ کب قاضی داخل ہوتا ہے۔ حاضرین کو بہت زیادہ دیر انتظار نہیں کرنا پڑتا۔ ایک چھوٹے قد اور نحیف جسم والا شخص، معمولی لباس پہنے، سر پر عمامہ رکھے ہوئے دروازے سے داخل ہوتا ہے۔ اس کے پیچھے اس کا غلام ہے۔ لوگوں میں سناٹا چھا گیا ہے۔ بعض نے اپنی انگلیاں منہ میں دبالی ہیں۔

"اچھا یہ ہے مسلمانوں کا قاضی۔ یہ خلیفہ اور سپہ سالار قتیبہ بن مسلم کے خلاف فیصلہ دے گا۔"

قاضی مسجد کے ایک کونے میں اپنی نشست سنبھالتا ہے۔ اس کا غلام اس کے سر پر کھڑا ہے۔ بغیر کسی لقب کے امیر کا نام لے کر اسے بلایا جا رہا ہے کہ وہ عدالت کے سامنے حاضر ہو۔

امیر شہر حاضر ہوا۔ عدالت نے اسے بیٹھنے کا اشارہ کیا اور اب غلام کاہنوں کے سردار کو بلوا رہا ہے جو امیر کے ایک طرف بیٹھ گیا ہے۔ اور اب عدالت کی کارروائی شروع ہوتی ہے۔

قاضی اپنی نہایت پست آواز میں کاہن سے مخاطب ہے۔ "بتاؤ تم کیا کہتے ہو؟" کاہن نے کہا۔

"قائد امیر قتیبہ بن مسلم ہمارے ملک میں دھوکے سے داخل ہوئے۔ اعلان جنگ نہیں کیا اور ہمیں اسلام کی دعوت بھی نہیں دی گئی۔"

قاضی نے اب امیر کی طرف دیکھا "تم کیا کہتے ہو؟"

اس نے قاضی کو دیکھا اور گویا ہوا۔

"لڑائی تو دھوکا ہوتی ہے۔ یہ ملک بہت بڑا ملک ہے، اس کے باشندوں کو اللہ تعالیٰ نے ہماری وجہ سے کفر و شرک سے محفوظ فرمایا ہے۔ اور اسے مسلمانوں کی ملکیت اور وراثت میں دے دیا ہے۔"

قاضی نے پوچھا "کیا تم نے حملے سے پہلے اہل سمرقند کو اسلام کی دعوت دی تھی یا جزیہ دینے پر آمادہ کیا تھا یا دونوں صورتوں میں انکار پر لڑائی کی دعوت دی تھی؟"

"نہیں ایسا تو نہیں ہوا۔" سپہ سالار نے جواب دیا۔

"تو گویا آپ نے اپنے قصور کا اعتراف کر لیا۔"

اب آگے قاضی کے الفاظ پر غور کریں۔

"اللہ رب العزت نے اس امت کی مدد اس لیے کی ہے کہ اس نے دین کی اتباع کی اور دھوکا دہی سے اجتناب کیا۔ اللہ کی قسم! ہم اپنے گھروں سے جہاد فی سبیل اللہ کے لیے نکلے ہیں، ہمارا مقصود زمین پر قبضہ جمانا نہیں ہے۔ اور نہ حق کے بغیر وہاں حکومت کرنا ہمارا مقصد ہے۔ میں فیصلہ دیتا ہوں کہ مسلمان اس شہر سے نکل جائیں۔ اور شہر اس کے اصل باشندوں کو واپس کریں۔ پھر ان کو دعوت دین دیں، جنگ کا چیلنج دیں اور ان سے لڑائی کا اعلان کریں۔"

اہل سمرقند اور کاہنوں نے اس فیصلے کو سنا، ان کے کانوں اور آنکھوں نے جو سنا اور دیکھا اس پر یقین نہیں آ رہا تھا۔ انہوں نے سوچا، ہم کہیں خواب تو نہیں دیکھ رہے۔ قاضی نے حکومت کے خلاف فیصلہ دے دیا۔ بہت سوں کو تو پتا ہی نہ چلا کہ عدالت برخاست ہو چکی ہے اور قاضی اور امیر روانہ ہو چکے ہیں۔

سمرقندی (مسلم) سفیر بڑی حیرت سے بڑے کاہن کی طرف دیکھ رہا ہے۔ اس کے چہرے کا رنگ بدل رہا ہے۔ وہ گہری سوچ میں مبتلا ہے۔ اس نے اپنی سابقہ زندگی پر غور کرنا شروع کیا ہے۔ اپنے عقیدے کے بارے میں سوچتا ہے، کتنا عجیب و غریب عقیدہ ہے۔ اس کا دائرہ کتنا مختصر اور چھوٹا ہے جو صرف کاہنوں کے درمیان گھومتا ہے؟ اور اب اس کا ذہن دین اسلام کے حوالے سے سوچ رہا ہے۔ اس کا دائرہ کتنا وسیع اور بڑا ہے۔ خیر سے بھرپور، عدل و انصاف کرنے والا دین، جس کی بلندیوں کو سورج کی شعاعیں اور چاند کی روشنی بھی چھونے سے قاصر ہیں۔

وہ آنکھیں بند کر کے کتنی ہی دیر بیٹھا سوچتا رہتا ہے۔ اس کا ذہن مسلسل بدل رہا ہے۔ میں کب تک اندھیروں میں رہوں گا؟ روشنی تو بڑی واضح ہے۔ یقیناً "اسلام عدل وانصاف کا دین ہے۔ اس میں چھوٹا بڑا سب برابر ہیں۔ آج عدالت میں سب لوگوں نے دیکھا قاضی کے سامنے حاکم کس طرح سرنگوں ہو کر بیٹھا تھا۔ کیا ہمارا بادشاہ اس طرح عدالت کے سامنے پیش ہو سکتا ہے؟

وہ ابھی اسی غور و فکر میں تھا کہ اسے گھوڑوں کے چلنے کی آوازیں سنائی دیں۔ لوگ بازاروں سے گزر رہے تھے۔ شور برپا تھا۔ اس نے آنکھیں کھولیں۔ آوازوں کی طرف کان لگائے اور پھر اس نے اپنے ساتھیوں سے پوچھا۔

"کہ یہ شور کیسا ہے؟"

اسے بتایا گیا کہ قاضی کے فیصلے پر عمل درآمد شروع ہو چکا ہے اور فوجیں واپس جا رہی ہیں۔

ہاں وہ عظیم افواج جن کے سامنے مدینہ سے لے کر سمرقند تک کوئی چیز رکاوٹ نہ بن سکی، جنہوں نے قیصرو کسریٰ اور خاقان کی قوتوں کو پاش پاش کر کے رکھ دیا۔ جو طاقت بھی مسلمانوں کے راستے میں آئی اسے وہ خس و خاشاک کی طرح بہا کر لے گئے۔ مگر آج اسلامی افواج ایک کمزور سے نحیف جسم کے مالک قاضی کے فیصلے کے سامنے دست بردار ہو گئی ہیں۔

کاہن اپنے ساتھیوں کی باتیں سنتا جا رہا تھا اور پھر اس نے اپنے آپ سے سوال کیا۔

"کیا ہمارا دین باطل اس حق کے سامنے ٹھہر سکے گا؟ کیا وہ نور اسلام کا مقابلہ کر پائے گا؟

نہیں ہرگز نہیں۔ رب کا فیصلہ آچکا ہے۔ اس نور کے مقابلے میں کوئی بھی نہیں ٹھہر سکتا۔

اس نے اپنے ساتھیوں کی طرف دیکھا اور پوچھا "تمہاری کیا رائے ہے؟ ہمیں کیا کرنا چاہیے؟ کیا ان کا مقابلہ کر سکیں گے؟ وہ سب خاموش رہے۔

"سمرقندی مسلم اچھی زور سے کہنے لگا" ساتھیو! میرا فیصلہ اور مشورہ سنو۔" کان اس کی طرف لگ گئے۔" اس نے کہا۔

"میں گواہی دے چکا ہوں کہ اللہ کے سوا کوئی معبود حق نہیں اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم اللہ کے بندے اور اس کے رسول ہیں۔"

اب بڑے کاہن کی یہ کہنے کی باری تھی۔ "اور میں بھی گواہی دیتا ہوں کہ اللہ کے سوا کوئی معبود برحق نہیں اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم اس کے بندے اور رسول ہیں۔"

اور پھر چشم فلک نے دیکھا کہ سمرقند کی گلیاں اور چوک اللہ اکبر کے نعروں سے گونج رہے ہیں۔ لوگ جوق در جوق اسلام میں داخل ہو رہے ہیں۔ انہوں نے گھوڑوں کی باگیں پکڑلی ہیں۔ اس ملک سے واپس مت جائیں۔ ہمیں اسلامی عدل وانصاف کی ضرورت ہے۔ ہم نے اپنوں کا راج دیکھا' ان کے ظلم و ستم سے ہم خوب واقف ہیں۔ آپ سب لوٹ آئیں۔ ہم نے بھی آپ کے دین کو قبول کر لیا ہے۔"

اور پھر تھوڑی دیر کے بعد کیا دیکھتے ہیں کہ مسلمان فوج واپس ایک مفتوح شہر میں داخل ہو رہی ہے۔

اس طرح سمرقند کی سرزمین میں اسلام کی دولت داخل ہو گئی اور پھر کبھی نہیں نکل سکی۔

(عبدالمالک مجاہد)

شعاع کے ساتھ

ادارہ

طیبہ سعدیہ عطاریہ مغل ..... کھٹیالہ سیالکوٹ

(1) شعاع سے وابستگی تو شاید بچپن سے تھی مگر باقاعدہ نہیں۔ کیونکہ میرے ننھیال میں میری آنٹی پڑھتی تھیں اور جب کبھی امی وہاں جاتیں تو شعاع یا خواتین لے آتیں۔ تو میں میرا رشتہ بس اشعار پڑھنا اچھی اچھی باتیں پڑھنا' تصاویر دیکھنا بس پھر جب چہارم میں تھی امی حویلی گئی تھیں شعاع پڑھتے پڑھتے رکھ کے گئی تھیں میں نے اٹھا کے دیکھا اور یونہی ایک کہانی پڑھنا شروع کی جو کہ افسانہ تھا۔ جو آج بھی ذہن میں ہے تو مگر نہ تب سمجھی تھی نہ آج بے ربط سی بجی پھر سمجھ میں تو آئی نہیں تھی' باہر گلی میں جو پھیری والا نمکو لے کر آتا ہے۔ چار پانچ شعاع اکٹھے کر کے اسے دیے کہ نمکو دے دو مگر وہ لینے لگا (باجی دس سال کی بچی اس آدمی کی باجی ہی تو تھی جیسے) میں وہ کتابیں نہیں لیتا جن میں اللہ کا نام ہو۔ میں نے کہا کہ بھائی پلیز لے لو اس میں نہیں ہے اللہ کا نام۔ اس نے کہا باجی بے ادبی ہوتی ہے نہیں لیتا میں میں نے کہا نیچے نہ گرانا آپ بس مجھے تھوڑی سی نمکو دے دو۔ یعنی اتنے ترلے منتیں کی کہ اس بے چارے کو نمکو دیتے ہی بنی۔

بعد میں جب امی کو پتا چلا کہ میں نے شعاع لے لیا ہے۔ تو امی نے وہ صلواتیں سنائیں اور مار لگائی کہ آج بھی یاد ہے۔ اس کے بعد آٹھویں میں ناول پڑھا مکمل نام یاد نہیں پھر نائنتھ سے باقاعدگی سے پڑھ رہی ہوں اور اب چھ سال ہونے کو ہیں اور اسی طرح واقعات تو بہت سے ہیں۔ مگر اب اسی پہ اکتفا کریں یارو!.....

(2) صبح ہمیشہ امی کی آواز سے آنکھ کھلتی ہے۔ آنکھ کھلتے ہی کبھی کبھار اٹھ جاتی ہوں' کبھی سستی سی آڑے آجاتی ہے بستر چھوڑنے میں' پھر آخر پانچ دس منٹ بعد اٹھتی ہوں تو نماز فجر اور قرآن پاک کی تلاوت کے بعد بستر کرتی ہوں اتنے میں آہستہ آہستہ سبھی جاگ جاتے ہیں۔ بھائی مسجد میں ہوں امی نماز قرآن کے بعد آٹا گوندھتی ہیں بلی سے مکھن نکالنے کے لیے ساتھ ہی چاٹی میں مدھانی چلا دیتی ہیں میں ساتھ سب چیزیں سمیٹتی ہوں' برتن دھوتی ہوں' آگ جلاتی ہوں چولہے میں (ہم لکڑیاں اور گوبر کے اُپلے جو امی ہاتھ سے خود تھاپنے جاتی ہیں حویلی ان پہ آگ جلاتے ہیں) رات کا بچا سالن گرم کیا پھر امی چولہے کے آگے بڑھ کے روٹیاں بناتی ہیں سب ہی پاس بیٹھ جاتے ہیں۔ وہ پکاتی جاتی ہیں ساتھ جو لڑائی کر رہے ہوں انہیں چمٹا دکھا کے وارن کرتی ہیں۔ کہ نہ لڑو تم لوگ' کھانے پہ بیٹھ کے لڑنا تم لوگوں کی عادت ہے۔ یعنی آٹھ بجے تک سبھی ناشتہ کر لیتے ہیں۔

میں ساتھ تھوڑی بہت صفائی بھی کر لیتی ہوں' بچے اسکول' ابو کام پہ' امی حویلی اور باقی کے سارے کام میرے سپرد' اکیلے ہی صفائی گھر کی' دھلائی برتنوں کی سے فارغ ہو کے آرام..... ٹی وی نہیں ہے جو دیکھوں پھر دوپہر کا کھانا جب اسکول سے بچے آتے ہیں۔ تب دے کر ساتھ ہی شام کی تیاری جو کہ مجھے ہی تیار کرنا ہوتا ہے۔ البتہ ساتھ بہن ہیلپ کروا دیتی ہے۔ مرضی سے کھانا تیار ہے۔ سب کھاتے ہیں کچھ دیر بچے پڑھتے ہیں۔ ہم چھت کے صحن پہ چارپائیاں بچھا کے بستر کر دیتے ہیں۔ جس کو جب جب نیند آئے سو جاؤ۔ اور شعاع پڑھنے کا ٹائم' جب شعاع آجاتا ہے۔ تو امی کی صلواتوں کے ساتھ ساتھ' ہر کام کے دوران پڑھا جاتا ہے کہ مجھ سے صبر ہوتا ہی نہیں یعنی 2 دن میں پڑھنا جیسے مرضی ہو.....!

(3) بے شمار تحریریں ہیں جو دل میں ذہن میں یاد ہیں

کے نقش ہیں۔ جیسے سرسوں کا پھول اور اس میں آمنہ کا کردار، ضبط عشق، مصنفہ نمو احمد کا جنت کے پتے بھی بہت فنٹاسٹک تھی اور یارم پھر نمل، من و سلویٰ یعنی کے اتنی تحریریں ہیں اچھی اچھی کہ لکھنے بیٹھوں تو کم از کم 2 صفحات تو کالے ہوں گے ہی مگر اب اسی پہ اکتفا کریں۔ کہانی پڑھتے ہوئے کوئی کوئی ایسے جیسا لگتا ہے کسی کی فیلنگز مگر مینوں یاد نہیں تے ضمن میں کی لکھاں؟ اور میری یادداشت کو داد ملنی چاہیے کہ مجھے یہ بھی یاد نہیں کہ کون سی تحریر پڑھ کے میں الجھی ہوں

خیر جان دے او۔

(4) ایسی بہت سی تعریفیں ہیں جنہیں سن کے خوشی ہوتی ہے جیسے کہ میری دادی مرحوم (اللہ انہیں غریق رحمت کرے آمین) بقول تم کھانا بہت اچھا بنا لیتی ہو آگے جا کے یہی کام آتا ہے عورت کے یعنی گھرداری۔ پھر میری کزن + دوست سدرہ کی دوست فریحہ ابھی کچھ دن پہلے ہی مجھے کہہ رہی تھی کہ آپ میں وفا بہت ہے۔ میں نے کہا یہ بات واقعی ٹھیک ہے۔ کوئی مخلص ہو تو مجھے دوگنا زیادہ مخلص پائے گا اور جب کوئی دھوکا دے تو کہاں کی وفا اور بے وفائی۔۔۔! پھر میں دوسروں پر جلد اعتبار کر لیتی ہوں جو ٹوٹ بھی جلدی جاتا ہے۔ اسی لیے تو اب تنہائی پسند ہو گئی ہوں۔ غصہ بہت جلدی آجاتا ہے۔ وہ تو میں چیخ چلا کے نکال لیتی ہوں۔ جب غصے کے ساتھ اور بھی جذبات ہوں دکھ، اذیت تو چپ رہ کے جلتی کڑھتی رہتی ہوں بقول سدرہ "تم دل کی بہت اچھی اور صاف ہو، باقیوں کے ساتھ کیسی ہو پتا نہیں کیونکہ مجھے ہر بات صاف سچ بتا رہی ہو۔" (تمہارا دیا اعتبار ہے یار! تھینکس) خامی "تمہیں کوئی بات بتانے کا کوئی فائدہ نہیں کہ کوئی بھی بات میرے پیٹ میں زیادہ دیر ٹکتی نہیں (یار اج نہ آکھ۔ میری بری عادت جلد اعتبار کرنے والی خوار کرتی ہے مجھے) بس آج کے لیے اتنا ہی کافی ہے۔ بہت ہو گیا بھئی۔۔۔!

(5) اب جب میں یہ جوابات لکھ رہی ہوں تب بھی ہلکی ہلکی سی بارش ہو رہی ہے۔ ٹھنڈی سی ہوا اتنا دلفریب موسم ہے کہ اف کی دساں۔۔۔؟ کیوں سدرہ مزے کا ہے نا یا شاذی سے پوچھوں۔۔۔ وہ بھی بے چارے پردیس میں تنہا صرف کام، کام اور بس کام۔ کیوں سدرہ تم سے بہتر اور کون سمجھ سکتا ہے جانی۔۔۔ البتہ میری ایسی کوئی یاد نہیں جو مجھے یاد ہو جائے۔۔۔ میری یادداشت (کدی غور ای نئیں کیتا)

(6) پسندیدہ لطیفہ تو کوئی نئیں نہ (ای کدی غور کیتا اے) البتہ اشعار بہت سے ہیں کوئی ایک تو۔۔۔! سنو!

تم مجھے دعا دیتے ہو تاکہ

خدا تمہیں ہمیشہ خوش رکھے
جہاں بھی رکھے، جس کے ساتھ بھی رکھے
پھر نہ جانے کیوں۔۔۔؟
اس آخری جملے پر مجھے
بددعا کا سا گمان ہوتا ہے۔

(بقول شاہدی کے)

کوئی اچھی تحریر پڑھتے ہوئے کئی اقتباس کئی اچھی باتیں اچھے جملے نظروں سے گزرتے ہیں جن میں اکثر پنسل سے نشان لگا دیتی البتہ کوئی ایک۔۔۔!

"دوسروں کے تجربے سے ہمیشہ سیکھو کہ جب انسان خود تجربے سے گزرتا ہے تو نہ صرف سیکھتا ہے بلکہ روتا بھی ہے۔" اور پتا نہیں کسی ناول میں پڑھا تھا یہ بہت اچھا لگا اور میں نے لکھ لیا ڈائری میں۔

"تم نے کبھی موت کو دیکھا ہے۔ وہ بالکل ویسی ہی ہے جیسی زندگی میں تمہارے بغیر گزار رہا ہوں۔ اف

اور پسندیدہ کتاب بہت سی ہیں۔

مگر نسیم حجازی کی کتب بہت پسند ہیں پھر ہر اچھی اسلامک بک اور اپنی پسندیدہ رائٹرز کی تحاریر۔

شازیہ الطاف ہاشمی۔۔۔۔ شجاع آباد

(1) شعاع سے وابستگی تب سے ہے جب سے میں نے پڑھنا شروع کیا۔ اپنی ستائیس سالہ زندگی میں میرے خیال میں زندگی کا کوئی لمحہ نہیں گزرا جب میں

نے کچھ پڑھا نہ ہو اور سوچا نہ ہو۔ میرے ابو علم دوست آدمی تھے 'وہ بھی رسالوں کے شوقین تھے مگر بعد میں نظر کمزور ہونے کی وجہ سے یہ عادت چھوٹ گئی ابو بہت بڑے لکھاری بن سکتے تھے مگر انہیں اس بات کا علم نہیں تھا وقت حالات نے بہت سے پاپڑ بیلنے۔ ابو ہمیں چھوڑ کر چلے گئے مگر ان کی پڑھنے کی عادت مجھ میں آئی۔ انہوں نے بھی میرے پڑھنے پر پابندی نہیں لگائی بلکہ وہ چاہتے تھے کہ میں بہت سا پڑھوں اور اچھی پوزیشنز بھی لوں مگر کبھی رفعت سراج 'نزہت شبانہ حیدر "راحت جبیں" کو پڑھتے ہوئے کب سورج زردی میں تبدیل ہوتا تھا 'پتا بھی نہیں چلتا تھا ہمارے گھر میں بے شمار جنگلی کبوتر اور طوطے وغیرہ رہتے تھے (پرانی حویلی کے چھجوں میں گھونسلے بنا کر) تو میں ان کبوتروں کو تکتی رہتی تھی۔

ایک مرتبہ ایک کبوتر بلی سے ڈر کر زمین پر گر پڑا تھا جسے میں نے اٹھا کر پانی پلایا تھا اور پھر علی کو دکھایا تھا۔ ہم دونوں کتنی دیر کبوتر کو غور سے دیکھتے رہے تھے (علی تمہیں یاد ہے) وہ دن 'وہ لمحے 'وہ فراغت 'فرصت ڈھونڈنے سے بھی نہیں ملتی۔ امی کی پیار بھری ڈانٹ ابو کا صافہ اور لسی اور تندوری روٹیاں سب چھوٹا مگر شعاع کا ہاتھ آج تک تھام رکھا ہے۔ وقت ایک سا نہیں رہتا۔

میں جب بھی گاؤں جاتی ہوں 'ابو سے ملنے جاتی ہوں۔ وہ میرے سامنے مٹی کے ڈھیر کی صورت پڑے ہیں۔ کہنے کو وہ زندہ نہیں ہیں مگر وہ دلوں میں زندہ ہیں۔ کتنے لمحے ریت مٹی اور گرد کی طرح آنکھوں کے سامنے سے اڑ گئے۔ ابو مجھے رسالے لا دیتے تھے چیدہ چیدہ سنتے بھی تھے۔ احادیث اقوال وغیرہ۔ گرمیوں کی بھری دوپہروں میں پرانی حویلی کی کھوؤں میں کبوتر سہمے چھپے بیٹھے ہوتے اور نیچے نیم کی چھاؤں میں ہمیں رسالے پڑھتی رہتی تھی مجھے ہمیشہ سے پکوڑے چٹنیاں اور نئے نئے پکوانوں کے بجائے پڑھنا اور لکھنا پسند رہا ہے اور یہ شوق اور شعور مجھے شعاع ہی سے ملا اور بے شمار 'بے حد و حساب ملا۔

اب بھی پڑھتے رہنے کی عادت باقی ہے اور نجانے سفر کتنا باقی ہے۔ میکے میں رسالوں کا ڈھیر موجود ہے اور یہاں بھی سنبھال کر رکھا ہوا ہے 'میری ادبی ذوق میں بالکل خالی برتن جیسی تھی 'مجھے اکثر بد مو کہتی تھی۔ میں اسے کہانیاں سنانے کی اپنی سی کوشش کرتی تھی مگر وہ نظر انداز کر دیتی تھی۔ اس کا اپنا طریقہ تھا زندگی جینے کا

میرا اپنا مگر میری اور اس کی دوستی مثالی تھی۔ جو آج تک ویسی ہی ہے اللہ اسے ہمیشہ آباد رکھے۔ (آمین)

(2) روز و شب کوئی خاص نہیں ہیں۔ صبح کی نماز پڑھنے کی پوری کوشش کرتی ہوں 'کبھی کامیاب کبھی ناکام۔ پھر ناشتہ 'میاں ملتان اسپیشل کورٹ میں ریڈر ہیں 'وہ دفتر روانہ ہوتے ہیں بڑی بیٹی فاطمہ زہرا ٹو میں ہے وہ اسکول روانہ ہوتی ہے پھر خود ناشتہ کرتی ہوں۔ چھوٹی بیٹی آمنہ الطاف کو کھانا کھلاتی ہوں پھر تھوڑی دیر لیٹ کر رسالے وغیرہ پچھلے دن کا اخبار پڑھتی ہوں۔ اس کے بعد صفائی شروع کرتی ہوں دونوں کمرے اچھی طرح صاف کر کے پوچھا لگا کر برتن دھو کر تقریباً ڈھائی گھنٹے لگتے ہیں۔ کپڑے وغیرہ دھوتی ہوں 'دوپہر کے لیے سالن چڑھا کر پھر رسالے سنبھال لیتی ہوں اتنی دیر میں فاطمہ زہرہ واپس آجاتی ہے۔ اور آتے ہی پیارا سا سلام جھاڑتی ہے اور بیگ پھینک کر "چھم چھم" والے ڈرامے کا پوچھتی ہے (چینی ڈرامہ) پھر جم کر ماں بیٹیاں ڈرامہ دیکھتی ہیں کھانا کھاتی ہیں 'اور آمنہ اور فاطمہ بے چینی سے اپنے ابو کا انتظار کرتی ہیں' میاں صاحب کا خلوص بھرا سلام اور مسکراہٹ دن بھر کی تھکن غائب کر دیتی ہے 'بچیوں کی بھی اور میری بھی۔

(3) "زرد موسم 'من و سلویٰ" اور ثمرہ بخاری کے شبلی جوادی 'ایک تھی مثال کی بشریٰ اور عدیل اور اب "جب سے تجھ سے ناتا جوڑا ہے" ساری بھول ہماری تھی 'دل کہاں نہیں الجھتا 'راستہ کانٹوں سے بھرے اور دل ریشمی کپڑا۔ دل الجھتا ہے بہت بار الجھا ہے مگر اپنے ارد گرد کے ماحول کو دیکھ کر لوگوں کے رویے دیکھ کر۔

ہر کردار جو حساس دل اور محبت سے بھرا ہو محبت کے بدلے محبت مانگتا ہوں وہ کردار میں ہوں۔

(4) ایک مرتبہ میاں کے منہ سے "شازی تمہاری سوچ کتنی اچھی ہے۔" سن کر خوش ہوئی اور ایک بار ابو نے کہا تھا (جب 9th میں B گریڈ آیا تھا) شازی تم بہت آگے تک جاؤ گی۔" اور میڈم نے بھی تعریف کی تھی "شازیہ نے محنت کی ہے" اور میں خوشی سے پھول گئی تھی۔

خوبی "سادگی" ہے جو عذاب بن گئی ہے دنیا میں دہرے چہرے چلتے ہیں اور ہم ایک چہرے کے ساتھ کیا کریں؟ جھوٹے اور گہرے لوگوں سے نفرت کرتی ہوں۔ چاہتے ہیں سب انصاف کریں اور انصاف ملے مگر دنیا شاید جنت نہیں بن سکتی (جنت تو اوپر ہے ناں) ایک اچھی بات یہ ہے پریشان نہیں ہوتی گھبراتی نہیں اپنا مسئلہ خود حل کرتی ہوں اور کامیاب رہتی ہوں۔ خوش رہتی ہوں اور دوسروں کو بھی خوش رکھتی ہوں۔ حساس بہت بہت زیادہ ہوں۔ جہاں عام آدمی کی نظر نہیں جاتی میں وہاں سے بھی دکھ ڈھونڈ نکالتی ہوں۔ ایک تعریفی جملہ جو میری جٹھانی نے کہا۔ (سن لیں جٹھانی نے کہا ہے)

"شازی بہت سگھڑ ہو۔" واہ واہ واہ۔

(5) بارش سے محبت کرتی ہوں۔ پہلی بوند گرنے سے لے کر آخری تک غور سے دیکھتی رہتی ہوں ایسا لگتا ہے جیسے دل میں بھی بارش ہو رہی ہو۔ بارش کے بعد کا منظر دل لبھانے والا ہوتا ہے اس موسم میں لوگ چائے کافی پکوڑے کھاتے پیتے ہیں مگر میں چکن پلاؤ بناتی ہوں۔ بارش میں گرما گرم پلاؤ کھانے میں جو مزہ ہے وہ نہ دہلی ہے نہ بخارے نہ پھپھو کے چوبارے اور میاں چائے کی فرمائش کرتے ہیں۔ شام کو اکثر مجھے لگتا ہے کہ باہر بارش ہو رہی ہے۔ کن من کی آواز سنائی دیتی ہے۔ میاں باہر جا کر پتا کرتے ہیں اور پھر فرماتے ہیں کہاں بارش ہو رہی ہے پاگل تو نہیں ہو گئیں بارش کے بعد (اگر رات کو ہوئی ہو یا ہو رہی ہو) جو مزے کی نیند آتی ہے ایسی کہاں آتی ہے گھر (میکے میں) جب بارش ہوتی تھی تو جھاڑو پکڑ کر بارش کے پانی سے فرش دھویا کرتے تھے بارش میں نہاتے تھے اب بھی نہاتی ہوں۔ میں اور بچیاں بہت خوش ہوتے ہیں بارش میں بھیگ کر۔

(6) محسن نقوی، احمد فراز، مرزا غالب پسندیدہ شعراء ہیں اور جاوید چوہدری اور اشفاق احمد (بابا جی) بہت پسند ہیں۔ اوریا مقبول جان اور جاوید چوہدری کے کالم شوق سے پڑھتی ہوں۔ پسندیدہ شخصیت رحمت عالم حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم ہیں، آپ کے متعلق ہر جملہ، ہر فقرہ پسند ہے اور کتابوں میں قرآن مجید میں سورۂ یٰسین بہت شوق سے پڑھتی ہوں۔ شعر اب کوئی یاد نہیں آرہا اور نہ ہی اقتباس۔ ایک شعر یاد آرہا ہے پیش خدمت ہے۔

جانتی ہے اک دنیا درد دل
جان کر وہ بے خبر ہونے لگے

واصفہ سہیل

پرفارمنس

ایک ڈراما یا فلم اگر ہٹ کر ہو تو یقیناً "ہٹ ہوتا ہے۔ سجل علی نے بھی مختلف ڈراموں میں مختلف کردار ادا کرتے ہوئے اپنی خوب صورتی اور اداکاری سے لوگوں کو اتنا متاثر کیا کہ پڑوسی ملک تک ان کی شہرت پہنچ گئی اور انہیں ایک فلم میں سری دیوی کی بیٹی کا کردار دے دیا گیا جس میں عدنان صدیقی سری دیوی کے شوہر بنے ہیں۔ خیر ہم بات کر رہے تھے سجل کی تو سجل کی حال ہی میں ریلیز ہونے والی پاکستانی فلم "زندگی کتنی حسین ہے" بھی لوگوں کو بہت پسند آئی۔ اب سجل نے اس کا سہرا اپنی اور فیروز خان کی جوڑی کو دے دیا۔ سجل کہتی ہیں کہ اس فلم کی کامیابی سے میرا حوصلہ بڑھا ہے (اب وزن مت بڑھا لینا کیوں کہ۔۔۔؟) میری اور فیروز خان کی جوڑی بھی بہت پسند کی جا رہی ہے۔ (یہ تو حقیقت ہے لیکن آپ بھول رہی ہیں آپ دونوں کی جوڑی ایک مشہور ڈراما سیریل سے ہٹ ہوئی ہے۔) بھارتی فلم میں کام کرنے کے حوالے سے سجل نے کہا کہ "میری بھارتی فلم "مام" بھی شائقین کو بہت پسند آئے گی (اگر وہ ریلیز ہوئی تو کیوں کہ موجودہ حالات میں پاکستانی فنکاروں پر پابندی لگ گئی ہے۔) اس میں ان کا کردار مرکزی نوعیت کا ہے۔ لیکن ہیروئن بن جانا کوئی کمال نہیں (یعنی ہیروئن کوئی اور ہے؟) اگر آپ کی پرفارمنس متاثر کن ہو تو کوئی بھی کردار پسند کیا جا سکتا ہے۔ (جی جیسے آپ کی فلم میں چھوٹے بچے کی پرفارمنس کی وجہ سے فلم ہٹ ہوئی)

واپسی

پی ٹی وی دیکھنے والوں کو یقیناً" وہ لڑکی یاد ہوگی جو سوئمنگ پول میں دوپٹہ پہن کر کود گئی تھی، جو سوتے میں بھی سر پر دوپٹا اوڑھتی تھی۔ جی جی ہم بات کر رہے ہیں عروسہ کا کردار ادا کرنے والی فنکارہ مشی خان کی جنہوں نے اور بہت سے ڈراموں میں کام کیا اور اپنی ایک شناخت بنائی پھر یکدم وہ غائب ہو گئیں پھر کچھ عرصہ قبل وہ واپس تو آئیں مگر ڈراموں میں دکھائی نہ دیں۔ ان کے بارے میں مشہور کر دیا گیا کہ وہ اداکاری نہیں کرنا چاہتی (تو پھر واپسی۔۔۔؟) پھر یہ خبر پھیلی کہ وہ مارننگ شوز تک محدود رہنا چاہتی ہیں۔ لیکن پھر اچانک وہ فلم "جانان" میں اداکاری کرتی نظر آئیں۔ مشی خان نے اس بارے میں بتایا کہ "جانان کی ریلیز کے بعد انہیں پی ٹی وی کے ایک ڈرامے میں کاسٹ کر لیا گیا ہے۔ (ہائیں 'جانان' سے پہلے کیا پروڈیوسرز مشی کو پہچانتے نہیں تھے یا۔۔۔؟) اور کراچی اور لاہور کے کچھ پروڈیوسرز نے ان سے رابطہ بھی کیا ہے (بھئی ڈراموں

میں کاسٹ کرنے کے لیے اور کس لیے۔) اب ہما نواب کے بعد آپ مشی کو بھی ممی یا اماں کے کردار میں دیکھ سکیں گے۔ کیوں کہ۔۔۔ (خالی جگہ آپ خود پر کریں ناں۔)

پابندی

لیجیے جناب! ہمایوں سعید ایک اور فلم "میں پنجاب نہیں جاؤں گی" کی عکس بندی کا آغاز رواں ہفتے سے شروع کر رہے ہیں۔ یہ لاہور ٹو کراچی اور کراچی سے لاہور اور اب پنجاب۔ کیا ہو گیا بھئی ایک نام کیا ہٹ ہو گیا سب ہی اس کے پیچھے پڑ گئے ہیں۔ اور کاسٹ ـــــ مہوش حیات سہیل احمد، احمد بٹ اور (اور کیا ہیرو تو ہمایوں ہی ہوں گے بھئی فلم بنانے کا اور مقصد بھی کیا ہے؟) شامل ہیں بھارتی فلموں پر پابندی کے بارے میں بات کرتے ہوئے ہمایوں سعید کا کہنا ہے کہ میں بنیادی طور پر بھارتی فلموں پر پابندی کے حق میں نہیں ہوں (وجہ۔۔۔؟) بلکہ مقابلہ بازی کے حق میں ہوں (مقابلہ۔۔۔؟ کون سا۔۔۔؟) البتہ بھارتی فلم پروڈیوسر ایسوسی ایشن کے پاکستانی فنکاروں پر پابندی عائد کرنے کے فیصلے کی مذمت کرتا ہوں (کرتے رہیں انہیں کون سی پروا ہے آپ کی۔۔۔ بھئی مذمت کی ناں۔) اگر بھارتی تنظیمیں تعصب پسندی کا مظاہرہ کر رہی ہیں تو ضروری نہیں کہ ہم بھی ویسا ہی جواب دیں۔ (وجہ۔۔۔؟ بھئی جواب نہ دینے کی؟)

ترجیح

اداکارہ سوہائے علی ابرو کا کہنا ہے کہ "فلم میں کام کرنے کے بعد مجھے ماڈلنگ میں جو پذیرائی ملی ہے (وہ جو آپ نے کیا تھا وہ کام تھا؟) اس کا تصور کوئی آئٹم نمبر کرنے والی اداکارہ نہیں کر سکتی (یعنی آپ خود کو اداکارہ نہیں آئٹم نمبر کرنے والی سمجھتی ہیں؟) انہوں نے مزید کہا کہ نئی فلموں کی آفرز موجود ہیں لیکن میں نے اس کے باوجود ٹی وی ڈراموں کو ترجیح دینے کا فیصلہ کیا ہے (سچ کہا ہے یہ تو۔۔۔؟) سوہائے ابرو نے مزید کہا کہ اب تو مجھے ٹی وی ڈراموں میں بھی ڈانس پرفارمنس پر مجبور کیا جاتا ہے۔ (ہائیں۔۔۔! ویسے ڈراموں اور پروڈیوسرز کا نام بھی بتا دیتیں تو۔۔۔؟) اس لیے ڈراموں سے بھی دور ہو گئی ہوں (ویسے مہوش حیات نے بھی آئٹم نمبر کیا تھا مگر ڈرامے میں۔۔۔؟) لیکن ابھی تو آپ نے کہا کہ ترجیح دی۔" (کیا یہ کھلا تضاد نہیں؟)

اِدھر اُدھر سے

میڈیا کی "خدمات" دیکھتے ہوئے یہ اندازہ لگانا مشکل نہیں کہ "دجال" کے آنے پر میڈیا اسے "انسانیت کا نجات دہندہ" سے کم لقب نہیں دے گا۔

(سوشل میڈیا)

☆: کسی کے خلاف بات نہیں کرنا چاہتا لیکن تعریف میں جماعت اسلامی کی کروں گا۔ جس کے خلاف کرپشن کا کوئی الزام تک نہیں ہے۔

سابق چیف جسٹس افتخار چودھری

موسم کے پکوان

خالدہ جیلانی

ویجیٹبل چائینز چکن

ضروری اشیاء:

چکن ونگز	آدھا کلو
لہسن ادرک پسا	ایک چائے کا چمچہ
لیموں کا رس	ایک چائے کا چمچہ
پسے ٹماٹر	آدھا چائے کا چمچہ
پسی سفید مرچ	ایک چوتھائی چائے کا چمچہ
پسی کالی مرچ	ایک چوتھائی چائے کا چمچہ
نمک	حسب ذائقہ
تیل	حسب ضرورت
گاجر	ایک عدد
شملہ مرچ	ایک عدد
ہری پیاز	ایک عدد
ٹماٹر	ایک عدد

ترکیب:

ایک برتن میں لیموں کا رس، لہسن، ادرک، پسے ٹماٹر، سفید مرچ کالی، نمک اور چکن ونگز ڈال کر اچھی طرح ملا کر — تیس منٹ کے لیے رکھ دیں۔ فرائی پین میں تیل گرم کر کے اس میں سبزی ڈال کر ہلکا سا تل کر نکال لیں۔ ونگز ڈال کر ڈھکن ڈھک کر ہلکی آنچ پر پکائیں پھر اس کو بھون کر تلی ہوئی سبزی شامل کر کے ڈش میں نکال لیں۔ من پسند چٹنی اور چاولوں کے ساتھ پیش کریں۔

بیف اینڈ چلی

ضروری اشیاء:

گوشت	آدھا کلو
سویا ساس	ڈھائی کھانے کے چمچے
نمک	ایک کھانے کا چمچہ
میدہ	ڈھائی کھانے کے چمچے
کٹی کالی مرچ	ایک کھانے کا چمچہ
لہسن	ایک چائے کا چمچہ
ادرک	ڈیڑھ کھانے کا چمچہ
ہری مرچیں	چار عدد
پیاز	دو عدد
تیل	آدھا کپ

ترکیب:

گوشت میں لہسن، میدہ، سویا ساس، نمک، کالی مرچ ملا کر آدھے گھنٹے کے لیے رکھ دیں۔ پتیلی میں تیل گرم کر کے اس میں گوشت ڈال کر پندرہ منٹ تک تیز آنچ پر بھونیں۔ اس کے بعد دو کپ پانی ڈال کر دھیمی آنچ پر گلنے دیں۔

جب گوشت گل جائے تو ایک گلاس پانی ڈال کر پیاز (چوکور کاٹ لیں) ادرک اور ہری مرچیں ڈال کر دس منٹ تک دھیمی آنچ پر پکائیں۔ جب پانی خشک ہو جائے تو سادہ چاولوں کے ساتھ پیش کریں۔

اسپگیٹی میرینارا

ضروری اشیاء:

اسپگیٹی	دو سو گرام
مرغی کا گوشت	ایک پاؤ
مکھن	ایک کھانے کا چمچہ
کارن فلور	دو کھانے کے چمچے
انڈا	ایک عدد
ٹماٹو پیسٹ	تین کھانے کے چمچے
مٹر	ایک چوتھائی کپ
گاجر	ایک عدد
بند گوبھی	آدھا کپ
شملہ مرچ	ایک عدد
ہری پیاز	ایک عدد

پسی سفید مرچ	آدھا چائے کا چمچہ
پسی کالی مرچ	ایک چوتھائی چائے کا چمچہ
چلی ساس	ایک کھانے کا چمچہ
سویا سوس	دو کھانے کے چمچے
چائنیز نمک	آدھا چائے کا چمچہ
تیل	حسب ضرورت
نمک	حسب ذائقہ

ترکیب :

اسپگھٹی کو الگ سے ——— اُبال لیں۔

گوشت دھو کر چھلنی میں خشک کریں۔ گوشت پہ اچھی طرح کارن فلور، مکھن، نمک، چائنیز نمک اور سفید مرچ لگا کر بیس منٹ کے لیے رکھ دیں۔

پین میں تیل گرم کر کے گوشت کے پارچوں کو انڈے میں ڈبو کر تل کر نکال لیں۔

علیحدہ پین میں تیل گرم کر کے اس میں پسے ہوئے ٹماٹر ڈال کر دو منٹ پکائیں۔ مٹر، شملہ مرچ، گاجر، بند گوبھی، (لمبائی میں کاٹ لیں) ہری پیاز (چوکور کاٹ لیں) سفید مرچ، کالی مرچ، چائنیز نمک، نمک، اسپگھٹی، تلا ہوا گوشت، سویا ساس اور چلی ساس ڈال کر دو سے تین منٹ پکائیں ڈش میں نکال کر کیچپ کے ساتھ گرم گرم نوش فرمائیں۔

کسٹرڈ کیک

اجزا :

کسٹرڈ کے لیے۔

دودھ	ایک کلو
چینی	ایک کپ
کسٹرڈ پاؤڈر	ایک کپ
کریم	آدھا کپ

سجانے کے لیے۔

مکھن	دو سو گرام
اسٹرابری جیلی	ایک پیکٹ
بنانا جیلی	ایک پیکٹ
بسکٹ	دو پیکٹ
کریم	آدھا کپ

ترکیب :

سب سے پہلے ایک پین میں ڈیڑھ کپ پانی گرم کر کے اس میں اسٹرابری جیلی ڈال کر اچھی طرح ملائیں مکس ہو جانے پر ایک پیالے میں نکال کر جمالیں۔ اسی طرح بنانا جیلی بھی بنالیں۔ دونوں جیلیز کو فریزر میں ٹھنڈا ہونے کے لیے رکھ دیں۔

ایک کپ ٹھنڈے دودھ میں اپنی پسند کے فلیور کا کسٹرڈ ملالیں۔ باقی بچے ہوئے دودھ کو ابال لیں۔ پھر آنچ ہلکی کر کے اس میں چینی ملا دیں جب چینی اچھی طرح گھل جائے تو اس میں اگر چاہیں تو کریم ملا دیں۔ اب اس میں کسٹرڈ کو تھوڑا تھوڑا کر کے شامل کریں اور ساتھ ساتھ چمچے سے چلاتے رہیں۔ جب آمیزہ گاڑھا ہو جائے تو چولہا بند کر دیں اور ٹھنڈا ہونے کے لیے رکھ دیں۔

اب بسکٹ کا چورا کر کے اس میں مکھن ڈال کر اچھے طریقے سے ملالیں کہ دونوں چیزیں یکجان ہو جائیں۔

اب کسی سانچے میں پہلے مکھن ہلکی سی تہ لگائیں۔ اور پھر مکھن اور بسکٹ کا آمیزہ اس میں جمادیں۔ اب

میک اپ وہ بھی صرف پانچ منٹ

کم وقت میں میک اپ کرنے کا طریقہ ہر ملازمت پیشہ اور گھریلو خاتون کو آنا چاہیے۔ اس بارے میں کچھ کر کی باتیں پڑھیے۔

روزانہ صبح کام پر جاتے وقت جیسے تیسے شیشے میں دیکھ کر چہرے پر کچھ نہ کچھ لیپ لینا میک اپ نہیں۔ نہ تو ایسی لپائی آپ کو خوب صورت بنائے گی اور نہ ہی سکون ملے گا، اگر گھر میں یا باہر کامیاب ہونا ہو تو چست، اسمارٹ اور دلکش نظر آنا بہت ضروری ہے۔ جیسے تیسے الٹی سیدھی لپ اسٹک رگڑ کر اور فاؤنڈیشن کے دھبے چہرے پر پھیلا کر یا مسکارا گھرے انداز سے پلکوں پہ لگا کر باہر جانا ٹھیک نہیں اور اسی طرح بغیر بنے سنورے باسی منہ یا سپاٹ چہرہ لیے بھی باہر چلے جانا ٹھیک نہیں۔

کچھ لوگ دفتر یا کام کی جگہ پر تیار ہوتے ہیں، لیکن وہاں جلدی میں سب سے نگاہیں بچا کر کیا گیا میک اپ بھی ٹھیک نہیں ہوتا۔ اگر آپ مصروف ترین خاتون ہیں تو آپ کے لیے جاذب نظر لگنا بہت ضروری ہے۔

اس کے لیے اگر آپ ذرا سی کوشش کریں تو پانچ منٹ میں قرینے سے میک اپ کر کے باہر نکل سکتی ہیں۔ اس کے لیے پہلے سے پلان بنائیں اور پھر کام کریں۔ اس کی پلاننگ یہ ہے۔

روز کا میک اپ ایک سا ہو گا، نہ حیرت ناک اور نہ ہی عجوبہ، بس آنکھوں اور ہونٹوں کے لیے رنگوں میں سے مناسب چناؤ کر کے دوسرے کے ساتھ رنگ ملانے سے تھوڑی تبدیلی آسکتی ہے۔

فاؤنڈیشن جلد کے رنگ سے ملتا جلتا لگائیں۔ کہیں داغ دھبے چھپانے ہوں تو نیچرل شیڈ سے چھپائیں اور پھر فاؤنڈیشن کا مناسب رنگ لگائیں اور دونوں کو صفائی سے ملا دیں۔ بلش آن کا رنگ بھی ایک سا ہونا چاہیے۔ دن کے وقت ہلکے گلابی اور نیچرل رنگ چنیں اور چوڑے برش سے اسے لگائیں، اس سے وہ قرینے سے لگے گا۔

آنکھوں کے لیے لائنر اور شیڈو چاہیے۔ لائنر یا کاجل کی ہلکی لکیر کھینچیے۔ اس کے بعد شیڈو لگانا چاہیں تو نیچرل یا گلابی یا ہلکا سلیٹی رنگ چنیں اور اگر شیڈو نہیں لگائیں گی تو کوئی حرج نہیں۔ جب لپ اسٹک لگائیں تو ہونٹوں کو خوب صورت اور پر کشش بنائیں۔ گہرا رنگ ہو یا ہلکا، لیکن بھڑکیلے، زیادہ چمک دار رنگوں سے بچیں۔

دیکھا آپ نے ذرا سی دیر میں دن کا میک اپ ہو گیا اور آپ پہلے سے کہیں زیادہ جاذب نظر لگ رہی ہیں۔ اب ذرا جلدی سے اپنی کلائی کی گھڑی پر نظر ڈالیں تو معلوم ہو گا کہ بس پانچ منٹ ہی تو گزرے ہیں۔

☆

Join Us on Facebook

Get Notificatons of Newly Uploaded Books

Find us on: facebook

Follow below Image to Get Notifications of Newly Uploaded Books